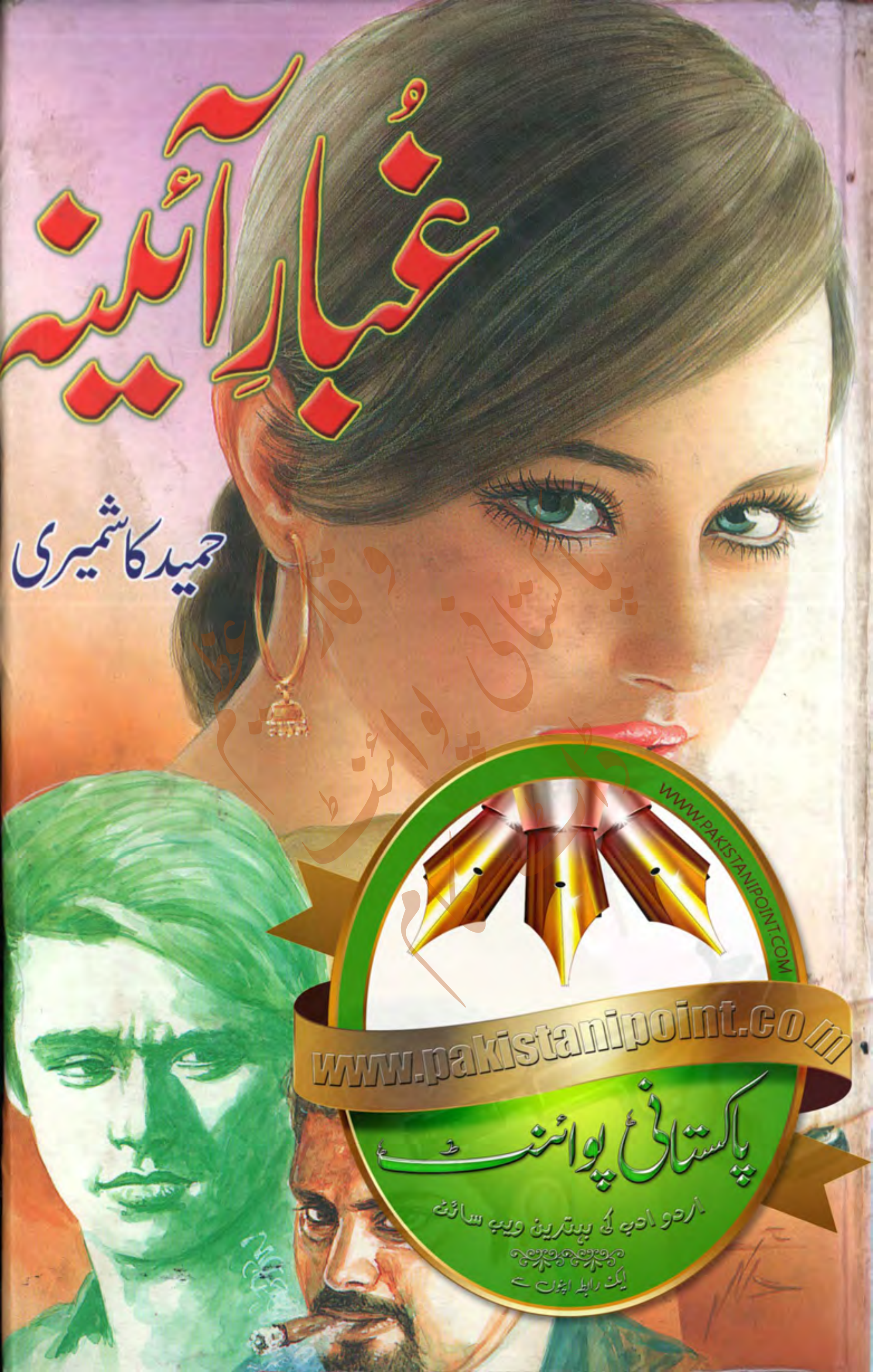

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

قدرت کی ستم ظریفی کے شکار ایک نوجوان کی لہورنگ ایڈونچرس داستان

غبارِ آئینہ

حمید کاشمیری

اسٹاکسٹ:۔

مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ

اردو بازار، لاہور۔ فون: 7668958

E:mail: al_quraish@hotmail.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام: محمد علی قریشی

[illegible]

بار اول ——— 2006ء

مطبع ——— نیر اسد پریس

سرورق ——— ذاکر

کمپوزنگ ——— وسیم احمد قریشی

قیمت ——— [redacted] روپے

انتساب:

ہماری بیٹیوں

دُرِ افشاں، دُرِ شہوار اور زرِ افشاں

کے نام

پاکستانی وقار عظیم

[illegible] ڈاٹ کام

دیباچہ

مجھے پبلشر نے "غبارِ آئینہ" کے لئے دیباچہ لکھنے کو کہا ہے۔ اپنی تصنیف کا دیباچہ تو خود مصنف لکھتا ہے۔ مگر "غبارِ آئینہ" کے مصنف خود تو چلے گئے، بہت دور، ہمیشہ کے لئے۔

جانا تو ہم سب نے ہے۔ جو دنیا میں آتا ہے، اس نے واپس بھی جانا ہے۔ میرے لئے خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ میرے رفیق حیات گل تھے، گلزار تھے، گلستان تھے۔ ان کی رفاقت میں مجھ میں بھی ایک مہک آئی ہے۔ اسی وجہ سے میں بھی یہ چند سطور لکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ افسوس کہ وہ ذرا جلدی چلے گئے۔ میں ان کی خوشبو سے کچھ اور معطر ہوتی۔ ان سے کچھ اور فیض حاصل کرتی۔

انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائیوں، بھتیجوں اور بیٹیوں کو بیاہا، لیکن ہمارے بیٹے جس میں ان کی جان تھی اس کی خوشی نہ دیکھ سکے۔

میرے رفیق حیات ایک مہربان شوہر، ایک شفیق باپ، ایک مخلص بھائی اور تابعدار بیٹے تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ بہت اچھے انسان تھے۔

وہ مہذب، با اخلاق اور حد سے زیادہ مہمان نواز تھے۔ ان کے ڈاکٹر دوستوں نے انہیں سیڑھیاں اترنے چڑھنے سے منع کر رکھا تھا اس کے باوجود ہر چھوٹے بڑے کو رخصت کرنے کے لئے زینہ اتر کر نیچے جاتے تھے۔

وہ امیر تو نہیں تھے مگر ان کا دل دریا تھا۔

وہ میرے شوہر ہی نہیں میرے دوست بھی تھے۔

وہ نہ صرف کراچی میں واقع میرے چھوٹے سے گھر کے سربراہ تھے بلکہ اپنے خاندان کے سردار بھی تھے۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کا ہر لفظ شائع کرا سکوں۔ مجھے توقع ہے کہ پبلشر میرے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور حمید کاشمیری کی تخلیقات ہمیشہ قائم رہیں گی اور آنے والی نسلیں انہیں پڑھیں گی۔

بیگم خورشید حمید کاشمیری

پاکستان وقار عظیم
پیدائش ڈاٹ کام

''اس کو کیا ہو گیا ہے آج؟'' ریسٹورنٹ میں بیٹھے ایک مستقل گاہک نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔ ''اس کو پہلے تو کبھی اس طرح نہیں دیکھا''۔

''پتہ نہیں۔'' دوسرے نے عدم دلچسپی کا اظہار کیا اور پھر دونوں اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھے دیگر لوگ بھی اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ کہیں نوجوانوں کا گروہ زور زور کے اور بے تکے قہقہے لگا رہا تھا۔ کسی جگہ ایک کونے میں کوئی رومانٹک جوڑا ماحول اور اطراف سے بے خبر سرگوشی کے انداز میں راز و نیاز میں مصروف تھا۔ ایک جگہ تین چار بزنس ایگزیکٹوز بیٹھے اپنی کمپنی کے تجارتی نفع و نقصان اور نشیب و فراز پر سنجیدہ گفتگو کر رہے تھے۔ اس طرح مختلف میزوں پر مختلف لوگ اپنی اپنی دھن میں مصروف تھے جبکہ زاہد علی ایک کونے میں بیٹھا ریسٹورنٹ کے شیشوں سے باہر سڑک پر آتی جاتی اور رکتی کاروں کو دیکھ رہا تھا بلکہ دیکھ بھی نہیں رہا تھا محض اس کی نگاہ باہر تھی اور دل و دماغ کہیں اور تھا۔

اس کے سینے میں ایک تلاطم تھا، ایک طوفان کا زیر و بم تھا۔ غم، دکھ اور کرب کا ایک جوار بھاٹا تھا جس کی لہروں کو وہ چہرے پر آنے سے روکنے کی شعوری کوشش کر رہا تھا لیکن چہرہ تو پھر چہرہ ہوتا ہے جسے انسان کے دل کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ اگر خوشی کی لہر اس آئینے پر بے اختیار آ سکتی ہے تو پھر غم کی لکیروں کو اسی آئینے پر نمایاں ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ سو اندرونی مدافعت کے باوجود زاہد کے دکھ کا مدوجزر اس کے چہرہ پر بکھر گیا تھا۔ اس کے سر کے بالوں کی طرح جو اس طرح بکھرے ہوئے اور بے ترتیب تھے کہ جیسے وہ ابھی ابھی سمندری ہواؤں کے تھپیڑے کھا کر یہاں بیٹھا ہو، اس کے سینے کا درد بڑھتا چلا گیا۔

اس ریسٹورنٹ میں شام کو تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنا اور چائے کا ایک کپ لینا اس کا معمول بن گیا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے زاہد علی ایک لیکچرار تھا۔ وہ اردو پڑھاتا تھا۔ وہ صبح سویرے بس پکڑ کر کالج چلا جاتا۔ اس کی بیوی شائلہ تین لنچ بکس بناتی، دو بچوں کے لئے

اور ایک زاہد کے لئے۔ بچوں کی وین کے نکلتے ہی زاہد اپنی بیوی شمائلہ کو الوداع کرتا۔ شمائلہ بہت پیار اور الفت سے اسے رخصت کرتی اور پھر تقریباً دس منٹ پیدل چلنے کے بعد زاہد کو کالج کے لئے اپنی بس مل جاتی۔ کالج سے ڈیڑھ دو بجے فارغ ہونے کے بعد وہ گھر جانے کی بجائے سیدھا ایک کوچنگ سینٹر میں چلا جاتا۔ جہاں وہ تین سے چار بجے تک میٹرک کے لڑکوں کو ریاضی پڑھاتا تھا اور کوچنگ سینٹر کا مالک یا پرنسپل اسے کالج کے مقابے میں زیادہ تنخواہ دیتا تھا۔ زاہد ٹیچر تو اردو کا تھا لیکن اس کا میتھ بہت اچھا تھا اور کوچنگ سینٹر کا مالک زاہد علی سے بہت خوش تھا کیونکہ سینٹر کے اسٹوڈنٹس کے میتھ کا رزلٹ سو فیصد آتا تھا اور زاہد کو میتھ پر بہت عبور حاصل تھا اور وہ ایسے آسان طریقے سے پڑھاتا تھا کہ نالائق سے نالائق لڑکا بھی میتھ کا پرچہ پاس کر لیتا۔ وہ چار سے پانچ بجے تک انٹر والوں کو اسلامک ہسٹری پڑھاتا اور پانچ سے چھ تک بی اے کی اردو کی ایک کلاس اس کے پاس آجاتی اور چھ بجے جب وہ فارغ ہوتا تو اس کا دماغ تھک کے چور ہو چکا ہوتا لیکن کالج کا پرنسپل زاہد سے بہت خوش تھا کہ اس نے اپنی ذہانت اور محنت کے سینگ پر پورے کوچنگ سینٹر کو اٹھا رکھا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ کوچنگ سینٹر کے پرنسپل کو زاہد کی وجہ سے زیادہ داخلے ملتے تھے اور کالج والوں کو معلوم تھا کہ زاہد علی دوپہر کے بعد کوچنگ سینٹر میں پڑھاتے ہیں لیکن کالج والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ کالج کے اندر وہ بہت فرض شناسی اور محنت سے پڑھاتے تھے اور کالج کا کوئی نقصان بھی نہیں تھا اور کوچنگ سینٹر کا فائدہ ہی فائدہ تھا بلکہ کوچنگ سینٹر کے مالک کلام نے کئی مرتبہ زاہد کو پیشکش کی کہ وہ کالج کو خیر باد کہہ کر کوچنگ سینٹر کے پرنسپل بن جائیں لیکن زاہد کالج کی پکی نوکری چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم کوچنگ سینٹر کا مالک انہیں خوش رکھنے کے لئے بہت اچھے پیسے دے رہا تھا جس سے زاہد کے گھر میں مالی آسودگی آ گئی تھی۔ اس نے ایک موٹر سائیکل لے لیا تھا اور اب وہ بس سے جانے کی بجائے اپنے دونوں بچوں عینی اور علی کو بائیک پر لے جاتا۔ دونوں کا ایک ہی اسکول تھا۔ وہ پہلے انہیں اسکول چھوڑتا اور پھر اگر وقت ہوتا تو پہلے گھر کا چکر لگا لیتا ورنہ سیدھا اپنے کالج چلا جاتا اور دوپہر میں کالج کے بعد کوچنگ سینٹر کا رخ کرتا۔

کوچنگ سینٹر سے فارغ ہو کر راستے میں وہ اپنا موٹر سائیکل ایک فور اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ کے باہر روک کر ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتا اور اس وقت تک اس کا دماغ اتنا تھک چکا ہوتا کہ کبھی کبھار چائے کی پیالی کے ساتھ وہ جیب سے ایک سر درد کی گولی بھی نکال کے

کھا لیتا کیونکہ اسے اسٹوڈنٹ کے ساتھ صبح سے شام تک اتنا سر کھپانا پڑتا کہ وہ سر درد کی گولیوں کا ایک پتا ضرور جیب میں رکھ لیتا۔

یہاں اس ریسٹورنٹ کے اندر دو چار لوگوں سے اس کی علیک سلیک بھی رہتی۔ کبھی کبھار موڈ ہوتا تو کسی سے گپ شپ بھی کر لیتا ورنہ وہ عام طور سے اکیلا ہی بیٹھ کے چائے کی پیالی پی کر دن بھر کی تھکن اتارتا۔

ایک چھٹی کا دن ہفتے میں ضرور آتا جب وہ بہت پرسکون ہوتا۔ اس دن کوئی اسٹوڈنٹ اس کے پاس نہیں آتا تھا۔ اس نے منع کر رکھا تھا کہ جب تک کوئی بہت ہی ضروری بات نہ ہو اسے چھٹی کے دن ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ چھٹی کا سارا دن وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزارتا۔ عینی اور علی دونوں اس دن بہت خوش ہوتے کہ باپ شام کو انہیں بائیک پر بٹھا کے کلفٹن کی سیر کو لے جائے گا اور یہ اس کی چھٹی کے دن کا معمول بھی تھا کہ سہ پہر کی دھوپ کی تپش کم ہونے کے بعد اپنے بائیک کی وائرنگ، نٹ بولٹ چیک کرتا، اسے صاف کر کے چمکاتا اور پھر وہ اپنی بیوی شمائلہ اور دونوں بچوں کو ساتھ بٹھا کر ہوا کھانے نکل جاتا۔

عینی اس کے آگے ٹینکی پر بیٹھتی۔ زاہد کے پیچھے اس کی بیوی شمائلہ ہوتی اور اس کے پیچھے کیریئر پر علی اس طرح بیٹھتا جیسے گھوڑے کی دم پر بیٹھا ہو اور گھوڑے کی پیٹھ ہی کی طرح وہ اچھل اچھل کے تماشے کرتا۔ زاہد اور شمائلہ نے کئی بار علی سے کہا بھی کہ وہ ماں باپ کے درمیان میں بیٹھے لیکن علی کو پھنس کے بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ وہ ضد کر کے پیچھے ہی بیٹھتا اور اس کے پیچھے بیٹھنے سے شمائلہ اور زاہد شاید اندر سے خوش ہی ہوتے کہ شمائلہ ایک ہاتھ زاہد کی کمر میں حائل کرتی اور اپنی مخروطی انگلیاں زاہد کی کمر میں بہت آہستگی اور نرمی سے پیوست کر کے رکھتی اور کبھی کبھار جب اچانک کوئی گڑھا آ جاتا یا سگنل بند ہونے پر زاہد ایمرجنسی بریک لگاتا تو ایک جھٹکا چاروں کو لگتا اور عینی ڈر جاتی جبکہ علی لطف اندوز ہو کر اچھلتا اور شمائلہ مزید زاہد کے قریب ہو جاتی۔ زاہد کو بہت اچھا لگتا پھر کبھی چھیڑتے ہوئے شمائلہ زاہد کو گدگدا بھی دیتی، زاہد بھی اس چھیڑ چھاڑ سے خوش ہو کر ہنستے ہوئے کہتا۔ ''دیکھو کسی دن بائیک الٹ جائے گی''۔

دونوں بچے ماں باپ کی زیر لب باتوں سے بے خبر سڑک کی ٹریفک دیکھنے میں مگن رہتے اور انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی امی ابو سے سرگوشی میں کیا باتیں کر رہی ہیں اور بچوں کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کے، بچوں کی موجودگی میں جو قربت میسر آتی تو اس قربت کو

انہوں نے کبھی تنہائی میں اتنا انجوائے نہیں کیا تھا جتنا انہیں موٹر سائیکل پر لگتا تھا۔ شاید اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ بھری پری سڑک پر سب کے سامنے اتنے قریب بیٹھے ہیں لیکن انگلیاں نہیں اٹھتی ہیں اور نہ ہی کسی طرف سے کوئی اعتراض ہوتا ہے، نہ ہی کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر تو ان جوڑوں کو بھی کوئی نہیں دیکھتا جو پالکس پر بیٹھے عجیب عجیب حرکتیں کرتے گزرتے تھے۔ سب جوڑے اپنی اپنی بائیکوں پر مگن ہو کے کلفٹن کے ساحل کی طرف دوڑ لگاتے۔ کوئی زاہد اور شمائلہ کے اسکوٹر سے آگے نکل جاتا اور کبھی کسی اسکوٹر یا بائیک سے یہ لوگ آگے نکل جاتے لیکن یہ سب کچھ کسی ریس کے نتیجے میں نہیں بلکہ بے ارادہ ہوتا۔

اور پھر اس دن ایک چوک کا سگنل بند ہونے پر موٹر سائیکل رکی تو دونوں کی نگاہ سامنے لگے ہوئے ایک بڑے بورڈ پر پڑی جس پر ایک موٹر سائیکل پر دو میاں بیوی اور دو بچے سوار تھے۔ میاں بیوی نے بہت خوشگوار موڈ میں رازداری سے سر جوڑ رکھا تھا۔ مصور نے چہروں پر بہت دلکشی اور شرماہٹ نمایاں کی تھی اور تصویر کے اوپر سرخی یوں تھی۔ ''بس اور گنجائش نہیں۔'' یہ بچے دو ہی اچھے کے حوالے سے ایک منہ بولتی تصویر تھی۔ زاہد اور شمائلہ جو پہلے ہی سے کچھ راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے اس تصویر کو دیکھ کر دونوں ایک ساتھ چونکے انہیں یوں لگا جیسے کسی نے انہیں کے خاندان کو بائیک پر دیکھ کر یہ فوٹو بنائی ہے۔ زاہد اور شمائلہ کو گزشتہ رات کی کوئی راز و نیاز کی بات یاد آ گئی۔

''دیکھا......'' زاہد نے جیسے فاتحانہ انداز میں از راہِ شرارت آہستہ سے کہا کیونکہ زاہد کو اس بورڈ کی تصویر میں اپنی بات کی تائید نظر آ رہی تھی۔

''میں نے کہا تھی وہ دیکھا سامنے بورڈ پر اسکوٹر کے اوپر اور گنجائش نہیں ہے۔'' زاہد شرارت سے بولا۔

''تو کیا ہوا'' شمائلہ نے اپنے ہونٹ زاہد کے کان کی لو کے ساتھ لگائے اور زیر لب بولی۔ ''کار لے لیں گے۔'' اور پھر دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑے اور دونوں بچے جو اپنے اردگرد بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے میں مگن تھے کچھ نہ سمجھ سکے کہ ماں باپ کس بات پر ہنسے ہیں۔ اتنے میں سگنل کھل گیا اور موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔

''ہم تھوڑی ہی دیر میں کراچی کے قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں، مسافروں سے درخواست ہے کہ......''

اچانک جہاز کے مائیک پر میوزک کی ہلکی سی ''ٹنگ'' کے ساتھ ایئر ہوسٹس کی نقرئی آواز گونجی اور مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر آگے پیچھے ہونے لگے۔ شمس جو پندرہ برس کے بعد کراچی آ رہا تھا جہاز کی کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ رات ابھی ابھی شروع ہوئی اور جگمگ جگمگ روشنیوں کا ایک سیلاب حد نظر تک دکھائی دے رہا تھا۔ روشنیاں دیکھ کر ہی شمس نے اندازہ لگایا کہ شہر بہت بڑا ہو گیا ہے۔ وہ جب یہاں سے گیا تھا تو اس وقت بھی کراچی کو روشنیوں کا شہر کہا جاتا تھا لیکن اتنی زیادہ روشنیاں نہیں تھیں، کبھی کسی تہوار کے موقع پر روشنیاں دکھائی دیتی تھیں اور پسماندہ بستیوں کے مکین اپنے پورے پورے خاندان کے ساتھ صدر کے علاقے میں روشنیاں دیکھنے آیا کرتے تھے پھر اس نے سنا تھا کہ اب یہ شہر روشنیوں کا شہر نہیں رہا بلکہ یہاں بہت قتل و غارت گری ہو رہی ہے۔ بتیاں سرِ شام بجھ جاتی ہیں اور اکثر شہر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے لیکن جہاز کی کھڑکی سے اسے ایسا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ روشنیوں کا شہر تاریکیوں میں ڈوب گیا ہے بلکہ اب وہ اسے پہلے سے زیادہ روشن اور جگمگاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''باؤ جی ٹیکسی چاہیے...... ٹیکسی سر جی...... صاحب ٹیکسی...... ٹیکسی ٹیکسی۔''

ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی ایک دم کئی ٹیکسی ڈرائیوروں نے اسے گھیر لیا۔ کچھ اس طرح کہ اسے جان چھڑانی مشکل ہو گئی اور انتخاب کرنا بھی مشکل ہو گیا کہ وہ کس ڈرائیور کی ٹیکسی انگیج کرے اور کسے نہ کرے کیونکہ پاکستان سے جانے والے کچھ لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ کراچی ایئر پورٹ پر سواری کا نظام بہت ناقص ہے اور صرف ناقص ہی نہیں بلکہ ایک مافیا کی سی شکل اختیار کر گیا ہے اور بہت سے لوگوں کو راستے میں ٹیکسی والے موقع پا کر لوٹ بھی لیتے ہیں۔ شمس بہت محتاط ہو گیا تھا اس نے مڈل ایسٹ سے کمائی ہوئی بڑی رقم تو ہنڈی کے ذریعے کراچی بھجوا دی تھی جسے وہ اگلے دن بحفاظت وصول کر سکتا تھا لیکن اس وقت بھی اس کے پاس کثیر تعداد میں غیر ملکی کرنسی موجود تھی تاہم اس کے ساتھ راستے میں ایسا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایک ٹیکسی والے نے بہت مہذب اور شریفانہ طریقے سے اُس کو اس فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچا دیا جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ اس نے راستے میں دیکھا کہ اگرچہ یورپ کی طرح نہ سہی لیکن پھر بھی شہر کی ظاہری صورت میں ناقابل یقین حد تک تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ جب وہ گیا تھا تو محض یادگار کے طور پر دو چار ہی اونچی بلڈنگیں تھیں لیکن ان پندرہ بیس برسوں میں تعمیراتی کام اتنا ہوا تھا کہ اسے ہر طرف فلک بوس پلازے دکھائی دے رہے تھے جنہیں وہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا کیونکہ اسے کافی

تھکان ہو چکی تھی اور وہ جلد سو جانا چاہتا تھا۔

اگلے دن سویرے ہی ناشتے کے بعد اس نے ہوٹل ہی سے ''رینٹ اے کار'' والوں سے ایک گاڑی مع ڈرائیور کرائے پر لی اور شہر کی طرف چل پڑا۔ پہلے تو اس نے کچھ چھوٹے موٹے کام کیے۔ اپنی ملازمت، صلاحیت اور تجربے کی دستاویزات کی فوٹو کاپیاں بنوا کے ایک مضبوط فائل میں انہیں محفوظ کیا۔ ہنڈی والے سے اپنی رقم لے کر اس نے بینک میں اکاؤنٹ کھولا اور کچھ بچت کے سرٹیفکیٹس بھی لے لئے تاکہ کچھ ماہانہ آمدنی کا ذریعہ بن جائے کیونکہ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ پاکستان میں اسے کس قسم کی ملازمت ملے گی اور اس کے معیار اور تجربے کے مطابق ملے گی بھی یا نہیں۔ کیونکہ مشرق وسطیٰ کی جس کمپنی میں وہ کام کر رہا تھا، وہاں اسے اتنی تنخواہ ملتی تھی کہ یہاں کسی بڑی کارپوریشن یا فرم کے چیئرمین اور ایم ڈی کو بھی نہیں ملتی ہوگی لیکن اس نے اس رقم کو ان پندرہ برسوں میں کچھ زیادہ پس انداز نہیں کیا تھا۔ اکیلی جان تھی، نہ شادی کی تھی نہ کوئی اور ذمہ داری تھی، پیسہ بے دریغ خرچ کرتا تھا۔ سال میں ایک دو بار یورپ چھٹیاں منانے چلا جاتا اور خوب کلبوں میں جاتا اور پُرتعیش راتیں گزارتا اور یوں اسے شادی کی بھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

اس کی زندگی کھلے پیسے کے ساتھ ایک کھلی ڈگر پر چل رہی تھی۔ دور دراز صحراؤں کے اندر بننے والے پروجیکٹس پر خوب محنت کرتا، خون پسینہ بہا کے پیسے کماتا لیکن بے دردی سے خرچ کر دیتا اور صرف اپنی ذات پر ہی صرف نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اکثر اپنے ساتھیوں کی مالی امداد کرتا جو اپنے خاندانوں کو پیچھے چھوڑ کر آئے ہوتے۔ وہ شاہ خرچ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں میں ایک نرم مزاج رکھنے والے آدمی کی حیثیت سے بھی معروف تھا لیکن اسی دوران کمپنی کے اندر کچھ گھپلا ہو گیا جس کی ذمہ داری براہ راست شمس پر پڑی اور ساتھ ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی گاڑی کی زد میں آ کر کوئی راہ گیر ہلاک بھی ہو گیا۔ پولیس نے یہ ثابت کیا کہ شمس نشے میں گاڑی چلا رہا تھا لہٰذا ایک ساتھ اس پر دو مقدمے چل پڑے اور وہاں کے قانون کے مطابق جس کی سزا بہت کڑی اور انتہائی ہو سکتی تھی کیونکہ اس کا پاسپورٹ بھی ضبط ہو گیا تھا لیکن اس نے چکر چلا کے کسی طور اپنا پاسپورٹ قبضے میں کیا اور اس سے پیشتر کہ اسے سزا ہو جاتی یا قانونی طور پر ملک بدر ہو جاتا وہ کسی طرح راتوں رات وہاں سے نکلنے اور جہاز پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

شاہ خرچی کے باوجود کافی پیسے اس کے پاس تھے جو کچھ تو اس نے ہنڈی کے

ذریعے بھجوادیئے تھے اور کچھ وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

یہ پہلا دن اس کو رقم کو سنبھالنے اور اپنے ڈاکومنٹس وغیرہ کی فائل بنوانے میں صرف ہو گیا۔ اس نے دوپہر کا کھانا ایک دوسرے فائیو اسٹار ہوٹل میں کھایا۔ شام کی چائے ایک تیسرے ریسٹورنٹ میں پی اور پھر بتیاں روشن ہونے پر وہ کلفٹن کا نظارہ کرنے ساحل سمندر کی طرف چلا گیا۔ جہاں نئی نئی بلڈنگیں پوش ریسٹورنٹس، حسین جوڑے ہنستے کھیلتے خاندان اور نوجوانوں کی ٹولیاں سائیلنسر نکلی موٹر سائیکلوں کی سمع خراش آوازیں، بھیڑ بھاڑ اور جگمگاتی روشنیوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

وہ کبھی مڈل ایسٹ یا یورپ میں ایسے فرسٹریشن کا شکار نہیں ہوا تھا جو فرسٹریشن اسے یہاں ہونے لگا تھا۔ اتنا غیر متوقع ہنگامہ اس نے دیکھا کہ اسے تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ اتنے لوگ تھے، اتنا ہجوم تھا اور وہ کسی دیارِ غیر میں نہیں بلکہ اپنے وطن میں تھا اس کے باوجود اتنے سارے لوگوں میں اس کا کوئی اپنا نہیں تھا۔ کوئی شناسا چہرہ بھی اسے نظر نہیں آیا۔ پردیس میں اسے یہ تنہائی کبھی محسوس نہیں ہوئی کہ نائٹ کلبوں میں کیبرے ڈانس دیکھتے ہوئے، کوئی اپنا نہیں ہوتا نہ کسی اپنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور پھر پردیس تو پردیس ہوتا ہے لیکن دیس میں بھی اپنا کوئی نہ ہو تو جتنا زیادہ ہجوم ہوگا اتنا زیادہ سناٹا محسوس ہوگا اور شمس کے دل و دماغ کے اندر اس وقت ایسا ہی سناٹا سائیں سائیں کرنے لگا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ پندرہ بیس برس پہلے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ شام گزارنے کلفٹن آتا رہا ہے لیکن اس وقت کے کلفٹن اور آج کے کلفٹن میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت کلفٹن کے ساحل سمندر کا علاقہ رومانٹک ہونے کے باوجود آسیب زدہ لگتا تھا۔

شمس کبھی کبھار اپنے اور یونیورسٹی کے دو چار دوستوں کے ساتھ مہنے دو مہینے میں ایک بار شام کو آجایا کرتا تھا۔ اس کے دوستوں میں سے ایک کے پاس کار ہوتی تھی جسے وہ کنارے پر پارک کر کے اور جوتے اتار کے تھوڑے سے آگے، پاؤں گیلے کرنے کے لئے گیلی ریت میں اتر جاتے تھے جہاں ختم ہوتی ہوئی لہریں ان کے پاؤں اور پنڈلیوں کو چھو کر واپس چلی جاتی تھیں۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ کاریں فاصلے فاصلے پر کھڑی ہوتی تھیں اور کوئی کوئی کار تو ایسی ہوتی تھی جس میں کوئی جوڑا بیٹھا ہوتا جو کار سے باہر ہی نہیں آتا تھا۔ ظاہر ہے اس طرح گاڑی میں بیٹھ کے چھپ چھپا کے تماشے کرنے والے میاں بیوی تو نہیں ہو سکتے تھے۔

اس زمانے میں ساحل پر مکمل اندھیرا ہوتا۔ کنارے تک بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لوگ باگ چاندنی راتوں کو زیادہ ترجیح دیا کرتے تھے۔

شمس ان دوستوں کے بارے میں سوچنے لگا کہ کتنے گہرے دوست تھے اس کے اور کتنا اچھا گروپ تھا۔ ان میں شاید ایک علیم تھا جو کچھ دن کسی کالج میں پڑھانے کے بعد امریکہ چلا گیا تھا۔ نفیس کینیڈا کوچ کر گیا تھا کہ اس زمانے میں کینیڈا والوں کو پاکستان سے پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت تھی، اکبر بھی کینیڈا چلا گیا اور زاہد علی......

''اوہ گاڈ ...... زاہد کتنا پیارا دوست تھا۔'' شمس نے اپنے آپ کو زاہد کی یاد کے جھونکے کے ساتھ ایک جھٹکا دیا اور پرانے ویران ساحل سمندر سے کلفٹن کی جگمگاتی بھیڑ میں واپس آ گیا۔ اپنے دوستوں کے گروپ سے ہٹ کر اس کی زاہد کے ساتھ بہت گہری دوستی تھی۔ رات کو وہ سوتے الگ الگ تھے ورنہ جب تک جاگتے ساتھ ساتھ کھانا پینا، گھومنا پھرنا، ونڈو شاپنگ کرنا، سیاسی بحث، ادبی گفتگو، حسیناؤں کے تذکرے اور اسی طرح بے شمار باتیں اور بے شمار موضوعات ان کے درمیان مشترکہ تھے۔ دونوں کے الگ الگ ڈیپارٹمنٹس تھے۔ زاہد اردو پڑھاتا تھا اور شمس انگریزی ...... لیکن ایک دوسرے کے پروگرامز اور ٹائم ٹیبل وہ جانتے تھے کہ کس کا کون سا پیریڈ خالی ہے، کب پڑھانا ہے کب نہیں پڑھانا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اگر چاروں نہیں تو یہ دونوں دوست شہر کی طرف آتے اور سیدھے ایک کافی ہاؤس میں آن بیٹھتے اور محض ایک ایک چائے یا کافی کی پیالی کے سہارے گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ پھر جب کافی ہاؤس بند ہو جاتا تو بھی یہ دونوں گھروں کو نہیں جاتے تھے بلکہ کسی اور ریسٹورنٹ کی تلاش میں نکلتے جو گیارہ بارہ بجے کے بعد بھی کھلا رہتا اور یوں پھر ایک دو بجے تک ہوٹلوں میں گپیں ہانکنے کے بعد وہ شہر کی سنسان اور ویران سڑکوں پر آوارہ گردی یا چہل قدمی کرتے رہتے۔ دونوں کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ شمس کو رشتے کے ایک چچا نے اپنے مکان کا ایک کمرہ دے رکھا تھا جس کا دروازہ الگ تھا اور چابی شمس کے پاس رہتی تھی۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی کہ جب آیا تالا کھولا اور بیڈ پر پڑ گیا۔ اگر کھانے کے وقت تک شمس آ جاتا تو کھانا بھی چچا کے گھر کھا لیتا ورنہ صبح یونیورسٹی جانے سے پہلے چچی اسے ناشتہ تو بہرحال کرا دیتی تھی اور شمس کا وہاں رہنا اس کے چچا چچی کو مہنگا نہیں پڑتا تھا کہ چچا کے دونوں بچے انگریزی میں بہت کمزور تھے اور شمس فارغ اوقات میں انہیں پڑھاتا تھا اور ان کی انگریزی بہت اچھی کر دی تھی اور خاص کر بچوں کے امتحانات کے دنوں میں شمس اپنی تمام مصروفیات اور آوارہ گردیاں کم کر کے ساری توانائی

چچا کے دونوں بچوں کو پڑھانے میں صرف کر دیتا۔ انہیں امتحانات کے گیس پیپر لا کے دیتا۔ امتحان میں آنے والے متوقع سوالات سمجھاتا اور نہ صرف انگریزی بلکہ امتحانات کے دنوں میں شمس انہیں تمام مضامین پڑھاتا اور چچا کے دونوں نالائق بچے چچا چچی کی مایوسیوں کے برعکس بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتے اور اس طرح شمس کا چچا کے پاس رہنا یا کبھی کبھار دونوالے کھالینا مہنگا نہیں پڑتا تھا۔

پھر وہ ملازمت ملنے پر مڈل ایسٹ جب گیا تھا تو چچا چچی کراچی میں ہی تھے لیکن بعد میں شمس کو پتہ چلا کہ چچا اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ کی کسی ریاست میں منتقل ہو گیا ہے اور یہی اس کے بچے کھچے رشتہ دار تھے جو پاکستان میں تھے لہٰذا شمس کے پاکستان سے رابطے ٹوٹ گئے اور وہ کبھی کبھار سوچتا تھا کہ اس کے کئی رشتہ دار، یا دوست اور جاننے والے امریکہ کی کم وبیش ہر ریاست میں مقیم ہیں جبکہ پاکستان کے کسی شہر میں اس کا کوئی عزیز نہیں اور وہ اکثر یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ پورا پاکستان اینٹی امریکہ ہے اور سارے پاکستان نے امریکہ کو اپنا چچا بھی بنا رکھا ہے۔ کیونکہ مڈل ایسٹ یا یورپ میں اس کی جس پاکستانی سے ملاقات ہوتی تھی وہ امریکہ پر تنقید کرتا تھا۔ اس کی پالیسیوں کو مسترد کرتا تھا بلکہ کچھ لوگ اس طرح گالیاں دیتے تھے جیسے کوئی اپنے بدترین دشمن کو دیتا ہے لیکن یہ گالیاں دینے والے امریکی ویزے کے لئے ذلیل وخوار ہوتے تھے اور جن کو ویزے ملتے اور وہ بھی جن کو نہیں ملتے، سب امریکہ کے بدترین مخالف تھے اور یوں شمس کو بعض اوقات مخالفت کرنے اور ذلیل ہونے والوں پر نہیں بلکہ امریکہ پر ترس آتا تھا کہ جسے دنیا میں کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ اس نے مڈل ایسٹ میں بھی ہر آدمی کے منہ سے امریکہ کے لئے بدخواہی کے الفاظ سنے تھے اور اب پاکستان میں زندگی کیسی ہے اور لوگ کس طرح جی رہے ہیں اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آج پندرہ برس کے بعد اس کا پاکستان میں پہلا دن تھا۔ وہ جو کچھ بھی پاکستان کے بارے میں جانتا تھا وہ اخبارات اور ٹی وی کے مختلف چینلز کے حوالے سے جانتا تھا عملی طور پر ابھی اسے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا اور وہ کلفٹن کے جگمگاتے ساحل کے کنارے تفریح کے لئے آنے والے ایک اژدہام کے درمیان بیٹھا دور سمندر میں دیکھ رہا تھا اور اسے سمندر کے اندر بھی روشنیوں کی ایک کہکشاں دکھائی دے رہی تھی اور اس کے اردگرد خاندانوں کے ساتھ کئی پری چہرہ تیز ہوا میں اڑتے اپنے بالوں کو قابو میں کرتے ہوئے بکھرنے سے بچانے اور سنوارنے میں مصروف تھے اور کچھ اتنے خوش شکل چہرے تھے جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا کہ

''ان پری چہروں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام''

اور شمس سوچ رہا تھا کہ وہ تو یورپ کے نائٹ کلبوں میں چن چن کر ان پری چہروں سے انتقام لے چکا ہے کہ خلد کا انتظار کون کرے لیکن یہ پری چہرہ لوگ اور یہ رونق، یہ بھیڑ بھاڑ، یہ چہل پہل، اسے اور تنہا کر رہی تھی کہ وہ اپنے دیس میں دیس کے جم غفیر کے درمیان تھا لیکن اس کا اپنا اس کا شناسا کوئی نہیں تھا اور وہ بار بار ماضی کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے اسے وہ ویران تاریک اور مختصر سا کلفٹن بہت اچھا لگتا تھا جو اس کا اپنا تھا اور جہاں سب اس کے اپنے تھے اور آج اسے اپنا جگری دوست زاہد بہت یاد آ رہا تھا جو اس کا ہمدم دیرینہ اس کا ہمزاد اور ہم راز تھا۔

''معلوم نہیں اب کہاں ہو گا۔'' اس نے سوچا اور پھر سر کو جھٹک کے ماضی کے جھروکوں سے واپس ساحل کلفٹن کے حال کے پر رونق میلے میں آ گیا۔

''اٹھ جاؤ بھئی...... واپس چلنا ہے۔'' اس نے رینٹ اے کار والوں سے لی ہوئی گاڑی کے ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کو ہلکا سا بجا کر کہا جہاں ڈرائیور کلفٹن کے جھلملاتے حسن اور جگمگاتی روشنیوں سے بے خبر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا۔

''یہ بھی مست قلندر ہے۔'' شمس نے دل میں کہا اور ڈرائیور ہڑبڑا کر بیدار ہوا۔ شمس گاڑی میں بیٹھ کے واپس اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

لیکن شمس بہت زیادہ دن تک فائیو اسٹاروں کے سطح مرتفع پر ٹھکانہ نہیں کر سکا۔ اسے جلدی احساس ہو گیا کہ فائیو اسٹار ہوٹل کے وہ اس طرح مزے نہیں لے سکتا جس طرح ملازمت کے دوران اپنی عالیشانی تنخواہ کی بدولت لیتا تھا کیونکہ آمدنی بند ہو گئی تھی اور اب خرچ ہی خرچ رہ گیا تھا۔ ہوٹل کا کمرہ، کھانا اور کار وغیرہ کے ملا جلا کے اسے تقریباً پانچ ہزار روپے روز کے پڑ جاتے تھے جو کہ اس کے لئے مالی طور پر ایک خطرے کا سگنل تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اب اس ملک میں ملازمتیں عنقا ہو چکی ہیں۔ بے روزگاری انتہا کو چھو کر آگے نکل چکی ہے۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور ایسے میں اب وہ فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس نے جلد ہی فائیو اسٹار ہوٹل کو خیرباد کہا اور ایک فور اسٹار ہوٹل میں آ گیا۔ چند روز اس نے فور اسٹار ہوٹل میں گزارے لیکن فرق زیادہ نہیں تھا۔ بلکہ اس جگہ لانڈری کے دام اتنے فائیو اسٹار ہوٹل سے بھی زیادہ لگ رہے تھے اور ویسے بھی اس کی لانڈری کا خرچ بہت زیادہ تھا وہ ہر روز نئی دھلی ہوئی استری شدہ قمیص

بدلتا تھا اور پینٹ کی ڈرائی کلینگ اگر روز نہیں تو استری تقریباً روز کراتا تھا اور لانڈری اسے بہت مہنگی لگنے لگی تھی۔ اس نے جلد ہی فور اسٹار ہوٹل کو بھی چھوڑ دیا۔ تھری اسٹار میں آیا اور پھر ایک عام سے ہوٹل میں منتقل ہو گیا۔ بالکل اس طرح کے ہوٹل میں جو ریلوے سٹیشنوں کے قرب و جوار میں ہوتے ہیں یا پھر گلی کوچوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے مالی بحران کا شکار ہوتا جا رہا تھا اور کہاں تو شروع شروع میں ڈرائیور کے ساتھ کرایہ پر لی ہوئی رینٹ اے کار والوں کی قیمتی گاڑی اور پھر کہاں گیس سے چلنے والی کھٹارا قسم کی کالی ٹیکسیاں اور پھر منی بسوں کا تھکا دینے والا سفر۔ اب اسے ملازمت کی طرف سے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اس نے مختلف جگہوں پر انٹرویو دینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اب اس ملک میں چپڑاسی کی نوکری ملنا بھی مشکل ہے۔ کالی ٹیکسیوں میں گھومنے کے بعد سے ملک کی معیشت کا بھی خوب اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ ہر ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیور کی ذہنی سطح کے مطابق اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا اور پھر اسے بہت مایوسی ہوتی تھی۔ اسے ایک بھی ڈرائیور ایسا نہیں ملا تھا جو کہتا صاحب سب ٹھیک ہے یا ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے سارے ڈرائیور مایوسیوں کا ایک مجسمہ نظر آئے، اس نے جس سے بھی بات کی اس نے آگے سے ایک نوحہ سنا دیا۔

اب شمس کو چاروں طرف اندھیرا اور بند راستے نظر آنے لگے اس کا پیسہ ختم ہو گیا تھا۔ بس وہی رقم رہ گئی تھی جو اس نے بینک میں فکس کرا دی تھی اور جس کا اس کو مہینے کے بعد پندرہ ہزار کے قریب منافع مل سکتا تھا اور اس نے اندازہ لگایا کہ اس مہنگائی کے دور میں پندرہ بیس ہزار کے ساتھ وہ گزارا نہیں کر سکتا ہے۔ اسے بینک میں رکھی یہ فکس رقم بھی توڑنی پڑے گی لیکن پھر وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ اگر یہ رقم ٹوٹنے لگی تو پھر ٹوٹتی چلی جائے گی اور وہ اس پردیس میں کنگال ہو جائے گا۔

''ہاں پردیس۔'' اس نے سوچا کیونکہ پاکستان اب اسے پرایا دیس معلوم ہونے لگا تھا کہ جہاں نہ اس کا کوئی عزیز، نہ دوست، نہ واقف کار، نہ اس کے پاس گھر، نہ ملازمت اور وہ کسی اجنبی کی طرح ہوٹلوں میں رہتا اور بے مقصد آوارہ گردی کرتے کرتے تقریباً فٹ پاتھ پر آ گیا تھا۔ ملازمت بالکل عنقا ہو گئی تھی۔ اس کی ملازمت کا سابقہ ریکارڈ اور تجربہ بے معنی ہو گیا تھا۔ اس کے پے اسکیل کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ دو تین جگہ اسے ملازمت کا آسرا ملا بھی تو تنخواہ کسی نے پانچ ہزار سے اوپر نہیں لگائی اور پانچ ہزار تو وہ شروع شروع میں ہوٹل کا ایک دن کا خرچہ دے دیا کرتا تھا اور اب اگر اس کی تنخواہ دس بھی

ہو جائے تو وہ کیا کرے گا اسی دس ہزار میں اسے مکان لینا پڑے گا، مکان کا کرایہ بجلی، گیس کا بل، ٹرانسپورٹ، کپڑا لتا، لانڈری، دوا دارو اور دوسرے اخراجات۔

''اف میرے خدایا زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی۔'' سوچتے سوچتے اس کا دماغ مچھلی بازار بن گیا۔ اب اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں رہے تھے کہ وہ ادنیٰ سے ہوٹل کے کمرے میں بھی رہ سکتا۔ کیونکہ جس معمولی ہوٹل میں وہ ڈیڑھ سو روپے روزانہ پر تھا اس کے واجبات بھی کافی ہو گئے تھے کیونکہ پندرہ دن کا اس نے کرایہ نہیں دیا تھا اور کھانے پینے کے بل وغیرہ الگ تھے اور ہوٹل کے مالک نے اسے ایک ہفتے کا الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اس نے تمام بل نہ چکا دیئے تو سامان باہر پھینک دیا جائے گا اور معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

''آپ ایسا نہ کریں، مجھے پہلی تاریخ کو بینک سے پرافٹ ملے گا میں ایک ایک پائی چکا دوں گا۔'' اس نے انکساری کے ساتھ ہوٹل کے مالک سے التجا کی لیکن ہوٹل کے مالک کا رویہ سخت ہو گیا تھا وہ اکڑ کر بولا۔

''نہیں نہیں، مجھے اب آپ کی کسی بات کا یقین نہیں ہے۔ مجھے اس ہفتے پیسہ چاہئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے نیم رضامندی ظاہر کی اور ہوٹل سے چلا گیا۔ وہ بے ارادہ گھومتے گھومتے ایک چوک پر چلا گیا جو درحقیقت چوک نہیں تھا بلکہ اس جگہ سے کوئی چھ راستے مختلف سمتوں کو جاتے تھے اور جہاں آٹو میٹک سگنل بھی لگے ہوئے تھے اور ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک ٹریفک کا سپاہی بھی گاڑیوں کو راستے دکھانے میں اس طرح الجھا ہوا تھا جیسے کوئی چڑا الجھی ہوئی گھاس میں پھنسا ہوتا ہے اور شمس بہت دیر تک اس چھ رستے کے چوک پر کھڑا آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بھی گھاس میں الجھا ہوا چڑا ہو اور جیسے اس کی گاڑی بھی ان چھ راستوں کے بیچوں بیچ کھڑی ہو اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ اس کا راستہ کون سا ہے اور کدھر کو نکلتا ہے۔ اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کا ماضی حال مستقبل کچھ بھی نہ ہو۔ مستقبل میں اسے امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی، حال اس کا بے حال تھا اور ماضی......

وہ چوک پہ کھڑے کھڑے ماضی کے بارے میں سوچنے لگا کہ جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اور خاص طور پر زاہد کے ساتھ کئی بار یہاں آیا تھا، یہاں سے گزرا تھا لیکن اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت یہاں سے کتنے راستے گزرتے تھے کیونکہ اس

اُلٹ یہاں نہ تو گاڑیوں کا ایسا اژدہام تھا، نہ ٹریفک کنٹرول کرنے والے الیکٹریکل سگنلز
تھے۔ نہ ٹریفک کا سپاہی تھا۔ نہ لوگ الجھے ہوئے تھے، نہ گاڑیاں اتنی تھیں لہٰذا وہ اور زاہد
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یہاں سے اس طرح جھومتے جھامتے گزر جاتے تھے جیسے چوک نہ ہو
کوئی پارک ہو۔

''زاہد...... کہاں ہوگا زاہد۔'' اس نے کھڑے کھڑے سوچا۔ معلوم نہیں کیوں اس
پول پر کھڑے کھڑے اسے زاہد زیادہ ہی یاد آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں اکثر یہاں ہوا
خوری کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس وقت ہوا کے راستے میں ایسی فلک بوس عمارتیں
حائل نہیں ہوا کرتی تھیں اور ہوا سیدھی اس چوک کو چھوتی ہوئی نکل جاتی تھی اور زاہد اور
شمس اپنی باتوں میں مصروف رہتے۔ کبھی کبھار کسی کار کے اندر کوئی حسینہ گزر جاتی تو شمس
بہت زور سے زاہد کا بازو دبا دیتا۔

''قیامت قیامت......''

آج بھی اس نے چوراستے پہ کھڑے کھڑے کئی گاڑیوں کے اندر قیامت دیکھی اور
اسے زاہد بری طرح یاد آیا کہ اگر اس کے ساتھ ہوتا تو وہ زاہد کا ہاتھ دبا کر آہستہ سے کہتا۔
''قیامت قیامت۔'' اور جواب میں زاہد انتہائی معصومانہ اور شریفانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر
بکھیر دیتا۔ وہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں مدھم سی آواز گونجی۔
''شمس......!''

''یہ کس نے پکارا۔'' شمس چونکا۔ قریب سے گزرتی بھیڑ میں پلٹ کر دیکھا تو زاہد
جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''ارے زاہد...... اوہ گاڈ!'' دونوں ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ ایک دوسرے کی
طرف لپکے اور بغل گیر ہو گئے

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

زاہد نے بے اختیار خوشی سے شعر پڑھا اور کہنے لگا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ
تم ہو۔''

''کیا میں اتنا بدل گیا ہوں۔'' شمس نے خوشی سے بار بار زاہد کو لپٹاتے ہوئے کہا۔
''نہیں زیادہ تو نہیں بدلے لیکن یہ فرنچ کٹ داڑھی پہلے تو نہیں تھی۔'' زاہد نے
کہا۔

پاکیزہ ورلڈ پیج ڈاٹ کام

''ہاں یہی نئی چیز ہے۔'' شمس بولا۔ ''یہ بتاؤ تم ہو کہاں؟ میں نے تو تمہاری تلاش میں سارا شہر چھان مارا اور یقین کرنا کہ اس وقت بھی تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''تم نے سوچا اور میں آ گیا۔ یہ بتاؤ تم کہاں ہو اور کب آئے ہو؟''

''مجھے آئے ہوئے مہینے ہو گئے ہیں اور اس شہر میں آ کے خوار ہو گیا ہوں، اپنے ہی وطن میں اجنبی۔''

''اب میں مل گیا ہوں، اب تم اجنبی نہیں رہو گے۔ یہ بتاؤ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟'' زاہد نے پوچھا۔

ایک ہوٹل میں۔'' شمس نے کہا۔

''تنہا ہو، ہوٹل میں؟'' زاہد نے پوچھا۔

''تمہیں پتہ ہے میں تو ہمیشہ سے تنہا تھا، تنہا آیا ہوں، تنہا جاؤں گا۔''

''تمہارا لاابالی پن ویسا ہی ہے لیکن یہ بتاؤ کہاں اور کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو۔'' زاہد نے پوچھا۔

''چلو تمہیں بتاتا ہوں، ٹیکسی پکڑتے ہیں۔'' شمس ایک ٹیکسی کی طرف لپکا۔

''ٹیکسی کی ضرورت نہیں، میرے پاس موٹر سائیکل ہے۔'' زاہد نے پاس ہی پارک کئے ہوئے بائیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں یہاں کھڑے دیکھ کر تین چکر لگائے اور پھر رکا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تم ہو۔''

''اب تو یقین آ گیا ہے ناں۔'' شمس نے کہا اور دونوں کھل کے ہنسے۔

''آؤ بیٹھو پیچھے۔'' زاہد نے بائیک اسٹارٹ کی اور شمس پیچھے بیٹھ گیا۔ شمس کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق زاہد نے بائیک کو ہوٹل کی جانب موڑا۔ شمس اسے اپنے ہوٹل کا کمرہ دکھانا چاہتا تھا لیکن جب ہوٹل پہنچے تو دم بخود رہ گئے۔

ہوٹل کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

❀......□......❀

شمس جب زاہد کے ہمراہ ہوٹل کی پہلی منزل پر پہنچا جہاں اس کا کمرہ تھا تو کمرے کا بیرونی منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ کمرے کے دروازے پر قفل پڑا تھا اور شمس کا سارا سامان دروازے کے باہر برآمدے میں بکھرا ہوا تھا۔ ہر چند کہ بہت مختصر سامان تھا لیکن شمس کے نزدیک بہت قیمتی تھا۔ اس میں کچھ کتابیں، کچھ دستاویزات، سرٹیفکیٹس اور اسناد تھیں۔ ایک سوٹ کیس تھا جو بند حالت میں اٹھا کے باہر پھینک دیا گیا تھا۔ ایک پورٹ ایبل چھوٹا ٹی وی سیٹ تھا۔ ٹائم پیس، کچھ کپڑے جو اس نے وارڈ روب کے اندر ہینگرز میں لگا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اور چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ اگرچہ جن کی قیمت زیادہ نہ تھی لیکن سامان کا اٹھا کے باہر پھینکنے کی وجہ سے جو ذلت اور بے عزتی وہ محسوس کر رہا تھا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ پھر اس وجہ سے بھی بہت کوفت ہوئی کہ اپنے سب سے زیادہ عزیز دوست زاہد سے آج پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور وہ زاہد کے ساتھ کمرے میں بیٹھ کے چائے کے کپ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن سامان کے ساتھ ساتھ اس کی ساری عزت الٹی ہوئی تھی۔

وہ جب سے پاکستان آیا تھا اسے پہلی مرتبہ آج کوئی اپنا ملا تھا جس کے ساتھ وہ دکھ سکھ کی باتیں کر سکتا تھا۔ باتوں کا ایک بڑا ذخیرہ اور خزانہ اس کے اندر جمع تھا جس کی کم از کم ایک قسط وہ آج زاہد کے سامنے بیان کرنا چاہتا تھا اور پھر زاہد کے بارے میں بھی بہت کچھ جاننا چاہتا تھا، بہت کچھ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا لیکن ہوٹل کے باہر بکھرے سامان کو دیکھ کر سب باتیں ناگفتہ رہ گئیں نہ صرف زاہد کے سامنے سبکی محسوس ہوئی بلکہ اسے یوں لگا جیسے زاہد ایک لمحے میں اجنبی بن گیا ہو اور پہلی ہی ملاقات میں زاہد کے سامنے اس کے منہ پر ذلت اور خواری کی سیاہی مَل دی گئی ہو۔

''یہ کیا......؟'' زاہد نے انتہائی تاسف اور تجسس سے پوچھا۔ ''کیا یہ تمہارا ہی کمرہ ہے اور یہ سامان......''

''ہاں یہ میرا ہی کمرہ ہے اور سامان بھی میرا ہے۔'' شمس نے رندھی ہوئی آواز میں

جواب دیا۔ ''لیکن ہوٹل والوں کو ایسا کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔'' وہ
خود کلامی کے انداز میں احتجاجاً بولا اور پھر زاہد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''آؤ ذرا میں منیجر
کی خبر لیتا ہوں۔'' اس نے زاہد کا ہاتھ تھاما اور منیجر کے کمرے کا رخ کیا۔

جیسا پھٹیچر ہوٹل تھا، ایسا ہی پھٹیچر سا منیجر کا کمرہ تھا جس میں دھکا اسٹارٹ ایک
پیڈسٹل پنکھا تھا۔ خستہ سی لکڑی کی میز کرسی اور ویسا ہی موالی سا منیجر۔

''یہ سب کیا ہے۔'' زاہد کے ہمراہ اندر داخل ہوتے ہی شمس انتہائی برہم لہجے میں
منیجر سے مخاطب ہوا۔

''آپ کو معلوم ہونا چاہئے یہ کیا ہے۔'' منیجر نے بے نیازی سے کہا اور یہ خیال بھی
نہیں کیا کہ شمس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو اس کا عزیز یا دوست ہو سکتا ہے۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' شمس غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''میں صرف اتنا جانتا
ہوں کہ میری بے عزتی ہوئی ہے۔''

''عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر پیسے دے دیں۔'' منیجر ترنت بولا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ پہلی کو حساب چکا دوں گا۔'' شمس بولا۔ ''پھر سامان
باہر کیوں پھینکا۔''

''لیکن میں پہلی تک انتظار نہیں کر سکتا۔'' منیجر انتہائی بے رخی سے بولا اور پھر دراز
کھول کے گھٹیا درجے کے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور سلگا کے کش لینے کے بعد توہین آمیز
لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس طرح کے پینجر نہیں چاہئیں۔ گلی میں اور بھی تین چار ہوٹل ہیں
وہاں چلے جائیں لیکن......''

''کیا لیکن......؟'' شمس اپنی مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

''لیکن میرا قرضہ چکائے بغیر آپ یہاں سے سامان نہیں لے جا سکتے۔ بل چکا
دیں ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' اب کے زاہد علی نے شمس کو پیچھے کیا اور آگے بڑھ کر بہت تحمل سے
مدبرانہ آواز میں بولا۔ ''ورنہ کیا کر لیں گے آپ؟''

''آپ کون ہیں؟'' منیجر نے پہلی بار زاہد علی کے چہرے کو دیکھا اور جیسے مرعوب ہو
گیا۔ زاہد علی ایک صاف رنگت کے آدمی تھے۔ پروقار اور معصوم چہرہ، سر کے کھچڑی بال
اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ جس نے ان کی شخصیت کو مزید بارعب بنا دیا تھا۔ وہ دیکھنے میں
اگر کوئی بیوروکریٹ نہیں تو پڑھے لکھے آدمی ضرور معلوم ہوتے تھے۔

''یہ میرا کارڈ ہے، میں پروفیسر ہوں کالج میں۔'' زاہد علی نے اپنا کارڈ میز پر رکھتے ہوئے تعارف کرایا۔

''آپ بیٹھیں ناں سر۔'' مینجر متاثر ہو کر اٹھا اور اس نے کرسیاں سیدھی کر کے پہلی بار دونوں کو بیٹھنے کی دعوت دی اور دونوں بیٹھ گئے۔

''میں آپ کا سامان اندر رکھوا دیتا ہوں، آپ پہلی تک بل ادا کر دیجئے۔'' مینجر پروفیسر زاہد سے متاثر ضرور ہوا لیکن اپنے رویے پر کسی قسم کی معذرت کئے بغیر بولا۔

''نہیں مینجر صاحب! اس کی ضرورت نہیں، یہ میرے ساتھ گھر جائیں گے اور میرے پاس ہی رہیں گے۔'' زاہد نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا۔ ''سامان ادھر ہی پڑا رہنے دیں میں گھر سے پیسے لے کر آ رہا ہوں۔ آپ بل بنا کے رکھیں۔'' زاہد کو غالباً شمس کی بے عزتی سے بہت دکھ ہوا تھا۔

''آ جاؤ شمس!'' اس نے شمس کا ہاتھ تھپتھپایا اور دونوں اٹھ گئے۔ شمس حیرت زدہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ زاہد بدلا نہیں ہے۔ وہ ابھی تک پہلے کی طرح ایک سچا اور مخلص دوست ہے۔

''سنیئے۔'' مینجر اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں، سامان اگر آپ لے جانا چاہتے ہیں تو لے جائیے۔ پیسے کل بھی آ جائیں گے۔''

''آپ کو کل تک کا بھروسہ ہے؟'' زاہد نے پوچھا۔

''شرمندہ نہ کریں اب آپ۔'' مینجر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹیچرز کی بہت عزت کرتا ہوں سر...... کیا گاڑی ہے؟''

''گاڑی تو ہے لیکن بائیک ہے، اُس پر سامان نہیں جا سکتا۔'' زاہد نے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں، ہوٹل کی گاڑی لے جائیے، میں بندوبست کرتا ہوں۔'' مینجر کسی فلاحی ادارے کے رکن کی طرح دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا اور شمس نے بہت ممنونیت سے زاہد کو دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور احسان مندانہ لہجے میں بولا۔ یار زاہد میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کہوں اور کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

''کچھ مت کہو اور دیکھو شکریے کو درمیان میں مت لانا۔'' زاہد نے کہا۔ ''یہ مت بھولو کہ میں دوست ہوں تمہارا۔''

"شاید پہلے بھول جاتا لیکن اب کبھی نہیں بھولوں گا You are realy a true friend"۔

"صاحب! گاڑی آ گئی ہے اور سامان بھی اس میں رکھوا دیا ہے۔" اتنے میں مینجر نے اندر آ کر خبر سنائی۔

"تھینک یو ویری مچ۔" زاہد نے مینجر کا ہاتھ چھو کر شکریہ ادا کیا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں سر! آپ تو قوم کو راستہ دکھانے والوں میں سے ہیں۔" وہ متاثر ہو کر بولا۔

"لیکن پھر بھی قوم سیدھے راستے نہیں چلتی ہے۔" زاہد نے بے ساختہ کہا۔

"یہ آپ کا قصور تو نہیں ناں سر! ایک شخص اندھیرے میں لالٹین لئے کھڑا ہے لیکن گزرنے والے خود کھڈے میں جا گریں تو لالٹین والے کا کیا قصور؟" مینجر نے غیر متوقع طور پر فلسفیانہ انداز میں کہا اور تینوں ہنس پڑے۔

غروبِ آفتاب سے پہلے زاہد علی اپنے دوست شمس کو اُس کے سامان سمیت اپنے گھر لے آیا۔

"یہ میرے دو پیارے پیارے بچے ہیں..... علی اور عینی۔" جب کھانے کی میز پر بیٹھنے لگے تو زاہد نے پہلے سے میز پر بیٹھے ہوئے اپنے دونوں بچوں کا تعارف کرایا۔

"بچے دو ہی اچھے۔" شمس اپنے روایتی کھلنڈرے پن سے بولا اور دونوں بچوں سمیت چاروں کھلکھلا کر ہنسے۔ "السلام علیکم انکل!" علی نے سلام کیا۔

"جیتے رہو جیتے رہو۔" شمس نے باری باری دونوں بچوں سے ہاتھ ملایا پیار کیا اور کہنے لگا۔ "ماشاءاللہ بہت پیارے بچے ہیں۔"

"لیکن بہت شرارتی۔" زاہد علی نے جواب دیا۔

"وہ بچے ہی کیا جو شرارتی نہ ہوں۔" شمس فوراً بولا اور زاہد نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "سچ کہتے ہو۔ دیکھو ناں تم کتنے بڑے ہو گئے ہو لیکن ابھی تک بچے کے بچے ہو تمہاری شرارتیں نہیں گئیں۔"

باپ کی اس بات پر بچے ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسے۔ شائلہ سے ابھی تک شمس کا تعارف نہیں ہوا تھا کیونکہ گھر آنے کے بعد شمس اور زاہد ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے اور گھر میں چونکہ مہمان کی آمد تھی لہٰذا شائلہ کھانے پکانے میں مصروف رہی۔ اس نے جلدی جلدی

دو تین ڈشیں بنائیں، چپاتیاں تیار کیں، سلاد بنایا۔ یہ سب کچھ وہ میز پر قرینے سے رکھ کے کچن میں میٹھے کا ڈونگا اور ڈشیں لانے کے لئے گئی ہوئی تھی کہ بچے، زاہد اور شمس میز پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں شمائلہ میٹھے کی ڈش اٹھائے اور اپنے وجود کو سمیٹے ڈرائنگ روم میں وارد ہوئی۔ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے شمس کو سر کی جنبش اور مسکراہٹ کے ساتھ وش کیا۔ شمس نے بھی سر ہلا کر خندہ پیشانی سے جواب دیا اور ادب کے طور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بھئی یہ ہیں ہماری بیگم شمائلہ۔'' زاہد نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''سبحان اللہ!'' شمس بے ساختہ بولا اور شمائلہ جھینپ سی گئی۔

''کیا سبحان اللہ!'' زاہد نے شمس کی بے تکلفی پر چونک کر تجسس سے پوچھا۔

''بھئی سبحان اللہ تمہاری قسمت پر کہہ رہا ہوں۔ بہت لکی آدمی ہو جسے بھابھی جیسی بیوی نصیب ہوئی ہے۔''

''یہ بہت پرانا طریقہ ہے کہ شوہر کی تعریف کر کے بیوی کی تعریف کرنا۔'' زاہد نے کہا اور پھر اپنی بات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور تمہاری پرانی عادت'' اس پر سب ہنس پڑے اور بچوں نے کچھ سمجھے بغیر بڑوں کی ہنسی میں اپنی ہنسی شامل کر دی۔

''لیکن بھائی جان ایک نظر میں آپ نے میرے اندر کیا خوبی دیکھی کہ زاہد کو لکی کہہ دیا۔ میں تو ایک واجبی سی شکل وصورت کی عورت ہوں۔ کیوں زاہد!'' آخری بات شمائلہ زاہد کی طرف دیکھ کر بولی اور اس سے پہلے کے زاہد کچھ کہتا شمس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''حسن، شکل وصورت میں نہیں ہوتا بھابھی جان!'' شمس نے ایک معنی خیز بات کہی۔

''تو پھر حُسن کسے کہتے ہیں؟'' شمائلہ ترنت بولی۔

''حسن سلیقے میں ہوتا ہے۔ رویے اور سگھڑپن میں ہوتا ہے۔'' شمس نے جواب دیا۔ ''اب میرے اس دوست کو دیکھئے۔'' شمس نے زاہد علی کا بازو تھام کر کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی بے ترتیب زندگی میں ایسی ترتیب آ سکتی ہے۔ ظاہر ہے شادی کے بعد ہی یہ سدھرا ہے اور پھر اس میز کو دیکھیں......''

''کیا ہے میز میں؟'' زاہد نے پوچھا۔

''ارے بھئی، اتنی جلدی اتنے کم نوٹس پر اتنی ڈشیں کیا کوئی بیوی تیار کر سکتی ہے۔'' شمس نے بے ساختہ کہا اور پھر ایک بار سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

''اچھا بک بک بند کرو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' زاہد نے کھانے کے ڈونگے کی

طرف اشارہ کیا اور شمائلہ نے ڈونگا اٹھا کے شمس کی طرف بڑھایا۔

’’تھینک یو۔‘‘ اس نے شمائلہ کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ’’صحیح کہا اوّل طعام بعدہ کلام۔‘‘

پھر وہ جلدی جلدی کھانے میں مصروف ہو گیا جیسے دس دن کا بھوکا ہو۔

’’آپ بالکل ویسے ہی ہیں جیسا زاہد نے بتایا تھا۔‘‘ شمائلہ اچانک بولی۔

’’اچھا!‘‘ وہ چونکا۔ ’’یہ مجھے یاد کرتا تھا؟‘‘

’’ہر وقت، کوئی دن ایسا نہیں گیا جب آپ کا ذکر نہ آیا ہو۔‘‘ شمائلہ نے توثیق کی۔

’’ہاں یار!‘‘ زاہد سنجیدگی سے بولا۔ ’’میں نے تمہیں بہت یاد کیا ہے اور بہت مس بھی۔‘‘

’’مائی پلیزر!‘‘ اس نے کھانا کھاتے ہوئے از راہِ محبت بہت سنجیدگی سے زاہد کا ہاتھ دباتے ہوئے ممنونیت سے کہا۔

’’لیکن اب یاد نہیں کروں گا۔‘‘ زاہد نے لہجہ بدلا۔

’’کیوں؟‘‘ شمس چونکا اور زاہد اس کا تجسس دور کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ’’کیونکہ اب تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ گھر کے ایک فرد کی طرح۔‘‘

’’نہیں یار میں تم پر اور بھابھی پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔‘‘ شمس سنجیدہ ہو گیا اور معذرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ’’کوئی ہمیشہ تو کسی کے گھر میں نہیں رہ سکتا، چاہے وہ دوست ہی کیوں نہ ہو۔‘‘

’’دوست ہی کے گھر میں رہا جا سکتا ہے شمس! تم اس وقت کرائسس میں ہو اور آدمی ہمیشہ کرائسس میں نہیں رہتا۔ گزر جاتا ہے وقت، بات رہ جاتی ہے۔ کیوں شمی!‘‘ زاہد نے جملے کے آخری حصے میں بیوی کی طرف مڑ کر سوال کیا۔

’’ہاں بھابھی جان کی رائے لینا بہت ضروری ہے۔‘‘ اس سے پیشتر کہ شمائلہ جواب دیتی، شمس بول پڑا۔

’’میں ہمیشہ اپنے شوہر کی خوشی میں خوش رہتی ہوں بھائی جان!‘‘ شمائلہ انتہائی جانثار بیوی کی طرح بولی۔

’’لیکن میں کب تک یہاں رہ سکتا ہوں زاہد......!‘‘ شمس اچانک سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا۔ ’’یہ تمہاری محبت اور شرافت ہے کہ مجھے گھر لے آئے لیکن یہ مسئلے کا حل تو نہیں ہے اور نہ میرا ہمیشہ یہاں رہنا صحیح ہے۔‘‘

''ہمیشہ کس نے کہا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، تمہیں جاب ضرور مل جائے گی۔ تم کوشش کر رہے ہو، میں بھی اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے کوئی سبیل نکالوں گا، تم فکرمند نہ ہو۔'' زاہد علی نے اسے ایک نہایت ہمدرد دوست اور بھائی کی طرح تسلی دی۔

''ہاں بھائی جان!'' شائلہ بھی حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔ ''زاہد کے شاگرد بہت اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔''

''اب آ جاؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھاؤں، آرام کرو۔'' کھانا کھا چکے تو زاہد نے کہا اور پھر شمس زاہد کی رہنمائی میں اوپر عقبی سمت بنے ہوئے ایک الگ کمرے کی طرف چلا گیا۔

''یہاں بالکل پرائیویسی ہے۔ تمہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دینا۔ اب آرام کرو۔'' رات کافی ہو چکی تھی، زاہد شمس کو کمرے میں چھوڑ کر واپس پلٹنے لگا تو شمس نے بہت تپاک اور گرمجوشی سے زاہد کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے پکارا۔

''زاہد......'' زاہد اس کی طرف مڑا تو دیکھا شمس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تم رو رہے ہو؟'' زاہد نے اس کے آنسو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔'' شمس رقت بھری آواز میں بولا۔ ''وہ ممنونیت اور تشکر کا ایک مجسمہ بن گیا تھا۔ ایسا مجسمہ جس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

''پاگل نہ بنو۔'' زاہد نے اس کے آنسو پونچھے اور گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا عورتوں کی طرح رونے لگے۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب آرام کرو، صبح بات ہو گی۔'' زاہد اسے تھپتھپا کے چلا گیا اور شمس ذہنی طور پر واقعی بہت تھک گیا تھا، بستر پر گرتے ہی بے خبر سو گیا۔

شمس اگلے دن سے ہی زاہد علی کے ساتھ جاب ڈھونڈنے میں لگ گیا۔ زاہد نے اسے اپنے جاننے والوں کے ایک دو حوالے دیئے جہاں شمس وزٹ کر کے آیا لیکن نتیجہ کوئی خاطر خواہ نہیں نکلا۔ نہ تو کام کی نوعیت مناسب تھی، نہ معاوضہ باعزت تھا۔ زاہد نے بھی اسے منع کر دیا کہ عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کرے، ضرور کوئی باعزت ملازمت یا کام مل جائے گا لیکن کئی روز کی تگ و دو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ روزگار کے تمام مواقع اب اس ملک میں بند یا محدود ہو چکے ہیں۔ سوچنے لگا کہ اب زیادہ دن تک زاہد کے گھر میں بیٹھ کے مفت کی روٹیاں توڑنا مناسب نہیں۔ زاہد کی بیوی شائلہ بلاشبہ بہت اچھی خاتون ہے

اور اس نے ایک لمحے کے لئے اکتاہٹ یا بے زاری کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن پھر بھی اس پر ایک بوجھ ضرور ہے یقیناً کھانا پکانا پڑتا ہے۔ اس نے کام والی کوئی نہیں رکھی ہے۔ وہ خود سارے گھر کے کام کرتی ہے۔ اس کا کمرہ بھی خود صاف کرتی ہے اور کبھی منہ نہیں بناتی بلکہ خوشی خوشی کرتی ہے۔ کپڑے کسی دھوبی کو نہیں دیتی بلکہ واشنگ مشین میں جس طرح وہ زاہد کے کپڑے ڈالتی ہے اسی طرح شمس کے کپڑے بھی ڈالتی ہے اور کوئی فرق محسوس نہیں کرتی لہٰذا شمس ایک بے چینی اور کوفت محسوس کرنے لگا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اب یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے اور اگر گھر کے اندر وہ گھر کے فرد کی طرح رہتا ہے تو پھر اسے گھر والوں کا ہاتھ بٹانا چاہئے اور ذمے داریوں میں کچھ حصہ اس کا بھی ہونا چاہئے تاکہ زاہد کا بوجھ اگر وہ کم نہیں کر سکتا تو اس بوجھ میں اضافے کا باعث بھی نہ بنے۔

اس گھر کے اندر ایک معقول مقام اور گھر میں قیام کرنے کا ایک معقول جواز پیدا کرنے کے لئے اس نے ایک دن بینک جا کر ایک سرٹیفکیٹ کیش کروایا اور جیب نوٹوں سے بھر کر مارکیٹ گیا اور اس نے گھر اور گھر کے افراد کے استعمال کی بہت سی چیزیں خریدیں۔ اس نے پہلے تو ایک سپر اسٹور میں جا کر تمام راشن خریدا جس میں آٹا، چاول، تیل، گھی، چینی، نمک، مرچیں، دالیں، مصالحے بسکٹ اور خشک دودھ کے ڈبے، چائے کی پتی، مشروبات اور پتہ نہیں کتنی چیزیں خرید ڈالیں۔ پھر اس نے زاہد کے لئے پینٹ اور شرٹ کا پیس لیا۔ شمائلہ کے لئے ساڑھی خریدی اور بچوں کے لئے کپڑے اور کھلونے بھی لئے۔ یہ ساری چیزیں اکٹھی کر کے ٹیکسی روکی تو اس نے محسوس کیا کہ اب اس کا عزت کے ساتھ زاہد کے گھر میں رہنے کا جواز پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے آج کا دن اس لئے بھی بہت اچھا تھا کہ اس نے چند روز پہلے انشورنس کا کام شروع کیا تھا اور ایک پالیسی بھی بیچی تھی جس کے کمیشن کا چیک اس کی جیب میں تھا۔ اس لئے وہ خوشی خوشی گھر گیا۔

❁

''یہ دیکھئے......'' شام کو جب زاہد گھر آیا تو شمائلہ نے شمس کے لائے ہوئے سامان اور تحفے تحائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب آپ کے دوست شمس لائے ہیں۔''

زاہد اتنی ساری چیزیں دیکھ کر حیران ہو گیا۔ دن کے وقت جب شمس نے سامان ٹیکسی سے اتار کر اندر رکھا تو شمائلہ بھی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا

کہ یہ سب کیا ہے۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بھابھی جان۔ میں یہ سب لایا ہوں گھر اور بچوں کے لئے۔''

''لیکن......'' شمائلہ کی زبان بندی ہوگئی۔

اور جب شمس نے شمائلہ کو سمجھانے کی کوشش کی تو بھی شمائلہ مطمئن نہیں ہوئی۔

''دیکھئے بھائی جان میں ان میں سے کسی چیز کو چھوؤں گی بھی نہیں۔'' شمائلہ چیزوں کے قریب سے پیچھے ہٹ گئی۔

''کیوں؟'' شمس بہت اپنائیت سے بولا۔

''اس کیوں کا جواب آپ زاہد سے لیجئے گا۔ زاہد بہت خفا ہوں گے۔'' شمائلہ نے وضاحت کی۔

''آپ تو خفا نہ ہوں۔ زاہد سے میں بات کرلوں گا۔'' شمس نے کہا اور شمائلہ بہت بے چینی سے زاہد کی آمد کا انتظار کرنے لگی اور شام کو جب زاہد تھکا ہارا گھر پہنچا تو شمس اس وقت اپنے کمرے میں تھا اور شمائلہ نے زاہد کے آتے ہی اسے ڈرائنگ روم میں پڑے پیکٹس اور دوسرے سامان خورد ونوش دکھاتے ہوئے از راہ حیرت کہا۔

''یہ دیکھئے۔''

''کیا ہے یہ؟'' زاہد علی نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ سب آپ کے دوست شمس لائے ہیں۔'' شمائلہ نے کہا۔

''لیکن یہ ہے کیا؟'' زاہد علی کا تجسس اور بڑھ گیا تھا۔

''یہ راشن ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں ہیں اور کپڑے ہیں۔ تمہارے لئے، میرے لئے، بچوں کے لئے ...... گھر کے لئے یہ سارے تکلفات آج شمس صاحب نے کئے ہیں۔''

اتنے میں شمس بھی اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔ زاہد علی دم بخود اسے دیکھنے لگا، بالکل اس طرح حیرت و استعجاب سے جیسے شمس کوئی اجنبی اور کسی دوسرے سیارے سے آئی ہوئی کوئی مخلوق ہو۔

''اس طرح حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟'' شمس نے زاہد کی خاموشی کے اندر جیسے ارتعاش پیدا کرنا چاہا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' زاہد نے حیرت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں، تھوڑا سا سامان ہے گھر کے لئے، گھر کے لوگوں کے لئے۔'' شمس نے بات کو غیر اہم گردانتے ہوئے کہا۔

''کیا میں تمہیں اس گھر کے اندر پیئنگ گیسٹ کی حیثیت سے لایا تھا۔'' زاہد نے سوال کیا۔

''نہیں، ایک دوست کی حیثیت سے۔'' شمس نے فوراً جواب دیا۔

''ایک دوست کی حیثیت سے اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے۔'' زاہد علی نے مزید وضاحت کی۔

''بالکل صحیح۔'' شمس، زاہد کی بات کی توثیق کرتے ہوئے بولا۔

''تو پھر یہ تکلف تم نے کیوں کیا؟'' زاہد نے سوال کیا۔

''اگر میں گھر کا فرد ہوں تو کیا میرا یہ حق نہیں بنتا کہ میں گھر کے لئے کچھ سامان لے کر آؤں۔'' شمس نے سوال کیا تو زاہد نے کہا۔ ''تم اس وقت بے روزگار ہو۔ پیسہ کہاں ہے تمہارے پاس۔''

''اگر پیسہ نہ ہوتا تو میں یہ شاپنگ کیسے کرتا، بتاؤ۔'' شمس نے مزید سوال پوچھا۔

''تم نے یقیناً کوئی سرٹیفکیٹ کیش کرایا ہوگا؟'' زاہد نے اندازاً جواب دیا۔

''ہاں میں نے ایک سرٹیفکیٹ کیش کروایا ہے اور سرٹیفکیٹ کیش کروانے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔'' شمس نے جواب دیا اور پھر کہنے لگا۔ ''میں نے ابھی تمہیں ایک خوشخبری نہیں سنائی ہے۔ وہ بیچ میں ہی رہ گئی۔''

''کیا خوشخبری ہے؟'' زاہد پہلی بات کو بھول کر متجسس لہجے میں بولا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ میں نے انشورنس کا کام شروع کر دیا ہے۔'' شمس نے کہا۔

''تو......!'' زاہد نے پوچھا۔

''تو کیا آج ایک بڑی پالیسی میں نے بیچی جس کا سات ہزار روپیہ مجھے کمیشن بھی مل گیا ہے۔''

''واقعی......!'' زاہد علی چونکا۔

''اور کیا...... یہ رہا اس کمیشن کا چیک۔'' شمس نے جیب سے لفافے میں رکھا چیک نکال کے زاہد علی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ زاہد بہت خوش ہوا اور شمس کو گلے لگایا اور محبت بھرے لہجے میں شکایتاً بولا۔ ''کمینے ہمیں سودا سلف میں الجھا دیا اور اتنی بڑی خوشخبری ہمیں

دل سنا رہا ہے۔''

''کیا سناتا تم دونوں میاں بیوی نے ایسی چڑھائی مجھ پر کر دی کہ سنبھلنے بھی نہیں دیا۔'' شمس نے کہا اور پھر زاہد کو اپنے سینے کے ساتھ لپٹاتے ہوئے جذبات بھرے لہجے میں بولا۔ ''ارے یار! میں تو آج بہت خوش خوش گھر آیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ عملی طور پر اس گھر کا ایک حصہ، ایک فرد بھی بن جاؤں گا۔''

''تم اس گھر کے ایک فرد ہو......لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' شمس نے پیار سے ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا اور پھر مزید بولا۔ ''تم دونوں نے آج میرا موڈ بہت خراب کر دیا ہے۔''

''اب موڈ کو ٹھیک کر لو۔'' زاہد نے کہا۔

''ایسے نہیں۔'' شمس بولا۔ ''چلو آج کھانا کہیں باہر کھاتے ہیں، میں انشورنس کی اپنی پہلی آمدنی سیلی بریٹ کرنا چاہتا ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب میں نے نوکری کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ بیمہ پالیسیاں بیچوں گا۔''

''ویری گڈ آئیڈیا۔'' زاہد نے سراہتے ہوئے کہا۔

''سو کم آن گیٹ ان گو آؤٹ سائیڈ۔ کہاں ہیں بھابھی جان؟'' اس نے ایک ہاتھ زاہد کا اور دوسرا ہاتھ شمائلہ کا تھاما اور دونوں کو باہر کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ''بچوں کو بلاؤ۔'' شمائلہ نے سوالیہ نظروں سے زاہد علی کو دیکھا تو زاہد نے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔ ''بھئی ٹھیک ہے چلو آج اس کی نئی جاب سیلی بریٹ کرتے ہیں، بلاؤ بچوں کو۔'' اور پھر اس دن سب نے کھانا باہر ایک اچھے ریسٹورنٹ میں کھایا اور خوب لطف اٹھایا۔

انشورنس کا کام تو شمس نے محض وقت گزارنے کے لئے شروع کیا تھا تاکہ بے روزگاری کا احساس کم ہو اور کچھ نہ کچھ آمدنی کا ذریعہ بھی پیدا ہو لیکن کام ایسا چل پڑا کہ پہلے بعد دیگرے اس کی پالیسیاں فروخت ہوئیں اور نوکری کرنے کا خیال اس کے دل سے جاتا رہا کیونکہ ملازمت کے سلسلے میں اسے تنخواہ کی جو پیشکش دو تین جگہ سے ہوئی تھی اس سے زیادہ تو ایک پالیسی فروخت کرنے پر مل گیا تھا۔ لہٰذا شمس نے کچھ تو زاہد علی کے ذرائع استعمال کئے اور کچھ اپنے رابطے پیدا کئے اور اسے بہت جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کے اندر انشورنس ایجنٹ بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس طرح اس نے کسی تعارف اور حوالے کے بغیر بھی نصف درجن کے قریب پالیسیاں بیچ ڈالیں اور اس کاروبار سے

اسے اتنا کمیشن مل گیا کہ تھوڑے سے پیسے پاس سے ڈال کر بھاگ دوڑ کے لئے ایک
موٹر سائیکل خرید لی اور اب زاہد علی کے گھر کے باہر ایک کی بجائے دو موٹر سائیکلیں کھڑی
دکھائی دیتیں، وہ صبح زاہد کے ساتھ ساتھ گھر سے نکل جاتا۔ کبھی زاہد سے پہلے، کبھی کچھ بعد
میں۔ غرض دونوں موٹر سائیکلیں ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے گھر سے نکل جاتیں اور اب چونکہ
اس گھر کے اندر وہ واقعی گھر کے ایک فرد کی طرح رہنے لگا تھا لہٰذا زاہد اور شمائلہ نے شمس
اس کے مزاج کے ساتھ قبول کرلیا۔ وہ اکثر گھر کے لئے ضرورت کی کوئی چیز خرید لاتا، کبھی
کراکری کا کوئی سیٹ اچھا لگتا تو لے لیتا۔ کبھی کٹلری خرید لیتا۔ پھل اور خشک میوہ وغیرہ
لے کر آنا تو اس کا معمول بن گیا تھا اور زاہد اور شمائلہ اس کا دل توڑنے کی کوئی بات نہ
کرتے اور اسے احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ باہر کا فرد ہے اور ویسے بھی اب وہ مالی طور
پر گھر کے اوپر بوجھ نہیں تھا اور اس نے زاہد علی کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ گھر کی گاڑی کھینچنا
اس کا بھی فرض ہے کیونکہ ایک دن دونوں کے درمیان ٹھیک ٹھاک مدلل گفتگو ہوئی تھی۔

”دیکھو یہ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے کہ تم گھر کی چیزیں لانے کی ایک روٹین بنا لو۔“
ایک دن زاہد نے تکرار کرتے ہوئے کہا تو شمس فوراً بولا۔

”دیکھو زاہد! مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم ایک گدھے کی طرح گھر کی گاڑی کھینچو اور
میں اس کو کھینچنے میں تمہاری مدد کرنے کی بجائے خود بھی گاڑی میں سوار ہو کر تمہارے بوجھ
میں اضافہ کردوں۔“

”لیکن......“ زاہد نے کچھ کہنا چاہا تو شمس نے اس کو بات نہیں کرنے دی۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میری جان اگر مجھے اپنا دوست، اپنا بھائی سمجھے ہو تو مجھے ر
ٹوکو نہیں ورنہ پھر کہہ دو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

”نہیں یار! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ زاہد نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا ا
دونوں بہت جذباتی ہو گئے اور پھر گھر کے لئے شمس نے شاپنگ کی تو نہ زاہد نے منع کیا،
شمائلہ نے۔

بات بھی درست تھی کہ جب شمس اس گھر میں رہتا ہے اور انشورنس کے ذریعے ا
خوب کماتا کھاتا بھی ہے تو پھر اسے اپنا الگ گھر کر لینا چاہئے اور اگر زاہد کے ساتھ ر
ہے تو پیئنگ گیسٹ کی حیثیت سے نہ سہی گھر کے ایک فرد کی طرح مالی طور پر زاہد کا ہاتھ بٹ
چاہئے اور شمس نے ایسا ہی کیا وہ اپنی محنت، اپنے مزاج اور گھر کے معاملات میں گھر ک

فرد کی طرح دلچسپی لینے کی بدولت گھر کا ایک اٹوٹ انگ بن گیا۔ ساتھ بیٹھ کے کھانا پینا ساتھ اٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا بچوں کو اپنی بائیک پہ گھما کے لانا اور زاہد چونکہ اکثر مصروف رہتا تھا اور شام کو بہت لیٹ گھر لوٹتا تھا لہٰذا اگر شائلہ کو کبھی مارکیٹ تک جانا ہوتا تو شمس اپنی بائیک پر بٹھا کے پہنچا آتا حالانکہ شروع شروع میں اسے شمس کے ساتھ جاتے ہوئے بہت تامل محسوس ہوتا اور ہچکچاہٹ محسوس ہوتی لیکن شمس کے بے تکلفانہ رویے نے اس کی یہ ہچکچاہٹ بہت جلد ختم کر دی اور شائلہ کو کبھی خریداری کے لئے بہت ضروری مارکیٹ تک جانا ہوتا تو وہ زاہد کا انتظار کئے بغیر بے تکلفی سے شمس کو پکارتی۔ ''شمس بھائی پلیز مجھے ذرا مارکیٹ تک ڈراپ کر دیں۔'' اور شمس نہ صرف مارکیٹ تک ڈراپ کرتا بلکہ اگر اس کے پاس فرصت ہوتی تو واپس لانے کے لئے انتظار بھی کرتا۔ یہ ایک روٹین سی بن گئی تھی جس پر نہ تو شائلہ کو کوئی اعتراض تھا اور زاہد نے بھی کبھی ان معمولات کو شک و شبے کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن معلوم نہیں بچوں نے کیا بات محسوس کی کہ وہ شمس سے کھنچنے لگے تھے، انہیں شمس کا رویہ اچھا نہیں لگا۔

''مجھے یہ انکل اچھے نہیں لگتے۔'' ایک دن دونوں بہن بھائی جب تنہا بیٹھے تھے تو عینی نے علی سے کہا اور اس پر عینی نے فوراً جواب دیا۔ مجھے بھی اچھے نہیں لگتے۔''

''تمہیں کیوں اچھے نہیں لگتے؟'' علی نے معصومیت سے پوچھا۔

''پہلے تم بتاؤ تمہیں کیوں اچھے نہیں لگے۔'' عینی نے جواب دینے کی بجائے بہت معصومیت سے سوال کیا۔

علی کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر کندھوں کو جھٹکا دے کر گردن کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پتہ نہیں۔'' اور پھر عینی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''تم بتاؤ......'' اور عینی نے بھی کندھے ہلا کر بہت معصومیت سے کہا۔ ''پتہ نہیں۔'' اور پھر بچوں کی بات پتہ نہیں ...... پر ختم ہو گئی۔

''یہ گن کہاں سے آئی ہے؟''

''پتہ نہیں......'' اس دن شمس کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اچانک شائلہ کے ہاتھ شمس کے کباٹ میں رکھا ہوا ایک ریوالور ہتھے چڑھا اور ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ شائلہ نے گھر میں جھاڑو پونچھ کے لئے کوئی کام کرنے والی نہیں رکھی تھی۔ وہ گھر کے سارے کام خود ہی کرتی تھی۔ زاہد صبح صبح کالج کے لئے نکل جاتا، بچے اسکول چلے جاتے

اور شمس اپنی موٹر سائیکل دبا کے اپنے کاروبار کو نکل جاتا۔ پیچھے شمائلہ گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ جاتی۔

وہ شمس کے کمرے میں بھی جھاڑ پونچھ اور ڈسٹنگ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی۔ شمس نے کئی بار خفت بھی محسوس کی اور کوئی ماسی رکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن شمائلہ نہیں مانی کہ اسے گھر کے کام کاج کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ایک بجے سے پہلے پہلے وہ سارے گھر کے فرش، دیواریں اور فرنیچر وغیرہ شیشے کی طرح چمکا کے رکھ دیتی۔ ایک بجے سے پہلے فارغ ہو کر وہ جلدی جلدی کھانا تیار کرتی کیونکہ دو بجے تک بچے اسکول سے آ جاتے تھے اور بھوک سے بلبلا رہے ہوتے تھے۔ زاہد تو صرف رات کا کھانا ہی گھر میں کھاتا تھا اور شمس بھی باہر ہی رہتا، البتہ کبھی کبھار گھر کی طرف گزرتا تو لنچ گھر میں کر لیتا لیکن یہ اس کا معمول نہیں تھا۔ اس دن بھی جب معمول کے برعکس شمس دن میں کسی کام سے گھر لوٹا تو شمائلہ اس وقت شمس ہی کا کمرہ صاف کر رہی تھی اور جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے ایک ریوالور اچانک کباٹ میں رکھے کپڑوں کے بیچ میں سے نیچے گرا۔ شمائلہ نے پہلے کبھی کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا لہٰذا پہلے تو وہ گن کو دیکھ کر ڈر گئی پھر ڈرتے ڈرتے جھک کر اسے اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اور شمس اندر داخل ہوا۔

''ارے آپ......؟'' وہ چونکی۔

''ہاں میں......'' وہ آرام سے بولا۔

''یہ گن کہاں سے آئی ہے؟'' شمائلہ نے حیرت و استعجاب سے ریوالور کو الٹ پلٹ کر پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''کمال ہے آپ کے سامان میں رکھی ہے اور آپ کو پتہ نہیں۔'' شمائلہ نے ریوالور کی نال شمس کی طرف گھما کر پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ جب شہر کا میں نے مکمل جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ اس شہر میں ہر آدمی کو اپنے پاس ایک گن رکھنی چاہیے۔'' شمس نے وضاحت کی۔ ''سو میں نے ایک گن خرید لی۔''

''ہونہہ تو یہ بات ہے۔'' شمائلہ نے ریوالور کو مزید گھمایا اور شمس کی طرف نشانہ لگا کر لبلبی کے اوپر انگلی رکھ دی۔

''اوں ہوں احتیاط کریں، یہ چل بھی سکتا ہے۔'' شمس نے آگے بڑھ کر شمائلہ کے

ہاتھوں میں موجود ریوالور کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔
''کیسے چلے گی، مجھے تو چلانا نہیں آتی۔'' شمائلہ نے کہا اور شمس ہنس دیا۔
''اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔'' شمائلہ نے سادگی سے پوچھا اور شمس کہنے لگا۔
''ہنسنے کی بات یہ ہے کہ جس طرح آپ نے ٹریگر دبایا تھا یہ اب تک چل چکا ہوتا۔''
''تو پھر چلا کیوں نہیں۔''
''اس لئے کہ یہ لاک ہے، تالا لگا ہے اس پر۔ اس کو چلانے سے پہلے اَن لاک کرنا پڑتا ہے، یوں۔''
''اُف خدایا شکر ہے، چل نہیں گیا۔'' شمائلہ نے خوفزدہ ہو کر ایک جھرجھری لی۔
''لیکن پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں نے اس میں سے گولیاں نکال لی تھیں۔''
''لو بابا اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ ہمیں تو ڈر لگنے لگا۔'' شمائلہ نے گن لوٹاتے ہوئے کہا۔
''نہیں اسے اپنے پاس رکھو اور چلانا سیکھو۔'' شمس نے واپس ریوالور شمائلہ کے ہاتھوں میں دیا اور کہنے لگا۔ ''میں آپ کو سکھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ شمائلہ کی پشت کی طرف گیا اور اپنے دونوں بازو اس کے گرد حمائل کر کے ریوالور کو اس طرح اس کے ہاتھوں میں دبایا کہ ریوالور دو کی بجائے چار ہاتھوں میں آ گیا۔
''اس کو پکڑ کر رکھنا مضبوطی سے۔'' شمس نے رہنمائی کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بولنا شروع کیا۔ ''اب یہ دیکھو جب تک اس کا لاک نہیں کھلے گا، گولی چلے گی نہیں۔'' شمس گن کا لاک کھولتے ہوئے اسے ایک ٹیچر کی طرح سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''اب دیکھو وہ سامنے رکھا گلدان آپ کا نشانہ ہے۔ لبلبی دبائیں گی تو گولی چلے گی، دبائیں۔''
''نہیں ناں۔'' وہ شمس کے بازوؤں میں کسمسائی۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے۔''
شمائلہ نے ریوالور چھوڑ کر پیچھے ہٹنا چاہا لیکن وہ اس طرح اس کے بازوؤں میں محصور تھی جیسے کسی شکنجے میں کسی ہو۔
''ارے ڈریئے نہیں، میں نے کہا ناں خالی ہے۔'' شمس اسے مزید ڈھارس دیتے ہوئے بولا۔
''اگر خالی ہے تو میں نشانہ تبدیل کروں گی۔'' شمائلہ اچانک شمس کی طرف مڑ گئی۔

''کہاں ماروگی۔'' شمس نے پوچھا۔

''یہاں۔'' شمائلہ نے ریوالور کی نال شمس کی چھاتی پر رکھی اور از راہ مذاق کہا۔

''تو پھر چلاؤ گولی۔'' شمس سینہ تان کر بولا اور شمائلہ نے گولی چلا دی۔ شمائلہ نے گن خالی سمجھ کے گولی چلائی تھی لیکن ایک گولی شاید اس کے اندر رہ گئی تھی۔ گولی اتنے زور سے چلی کہ نہ صرف کمرہ بلکہ پورے مکان کے در و دیوار ہل گئے اور ایک چیخ گنبد کی آواز کی طرح فضا میں گونج گئی۔

......□......

پاکستانی وقار عظیم ڈاٹ کام

اور یہ چیخ شمائلہ کی تھی۔ کیونکہ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ریوالور کے اندر گولی بھی ہوگی اور شمس نے بھی یہی کہا تھا کہ ریوالور خالی ہے اور شمس کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ریوالور کے چیمبر میں ایک گولی رہ گئی ہے لیکن شمس کی زندگی باقی تھی اور شمائلہ کے بھی مقدر اچھے تھے کہ نجانے کیسے اس نے ریوالور کی نال اچانک شمس کے چہرے سے ہٹا کر ٹریگر دبایا اور جب گولی چل گئی تو وہ شمس کی ناک کے قریب سے گزر گئی۔

شمس کی حالت جو خراب ہوئی سو ہوئی، شمائلہ کی روح فنا ہوگئی۔

اس نے بے ساختہ ایک چیخ ماری جو کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا کر فضا میں تحلیل ہوگئی اور شمائلہ کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح زمین پر گرنے لگی تو شمس نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شمس کو دیکھ رہی تھی۔

''اِٹس او کے ...... اِٹس او کے......'' شمس نے اسے ڈھارس بندھائی اور سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا۔

''آپ......!'' اس نے شمس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہا۔

''ہاں ہاں میں ٹھیک ہوں بالکل۔ اللہ نے بہت کرم کیا۔'' شمس نے شمائلہ کی بات کو سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''لیکن......؟'' شمائلہ حواس باختہ تھی۔ وہ کوئی جملہ پورا ادا نہیں کر پا رہی تھی، شمس نے فوراً ہی شمائلہ کی بات کو سمجھ لیا اور کہنے لگا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں، یہ گولی کیسے اندر رہ گئی لیکن آپ پریشان نہ ہوں یہ میرا فالٹ ہے، آپ کا نہیں۔'' اس نے شمائلہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

شمائلہ نے پھر ایک نامکمل جملہ بولنے کی کوشش کی۔ ''خدانخواستہ اگر......''

''اگر گولی مجھے لگ جاتی تو کیا ہو جاتا، مر جاتا ناں ...... بس۔'' شمس بات کو غیر

سنجیدہ لیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے ہاتھ سے۔''

''خدا نہ کرے۔'' شمائلہ نے ہاتھ شمس کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا لیکن آدھے راستے میں روک لیا۔ اسے غالبًا احساس ہو گیا کہ وہ زاہد نہیں، شمس ہے اور اسے اپنے ہاتھ اور اعصاب قابو میں رکھنے چاہئیں۔

''لو پانی پی لو اور اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ کچھ ہوا تو نہیں ناں ......لو پانی۔'' شمس پانی کا گلاس لے کر آیا اور اپنے ہاتھ سے شمائلہ کو پلایا۔ ''اب ٹھیک ہو جاؤ آپ۔'' اس نے شمائلہ کو تسلی دی۔

پھر شام کو زاہد کے آنے تک وہ نارمل ہو گئی لیکن خوف و ہراس ابھی تک اس پر طاری تھا۔ زاہد علی نے جب اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی تو اسے بچوں نے باہر ہی بتا دیا کہ امی سے گولی چل گئی ہے۔

''اوہ گاڈ......'' زاہد نے پوری بات سنی نہ سمجھی، گھبرایا ہوا، تیزی سے اندر آیا جہاں شمس نے اسے پوری بات بتائی اور بار بار معافی مانگی کہ اس کی غفلت کی وجہ سے ایک بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

''اللہ کا شکر کرو حادثہ نہیں ہوا۔'' زاہد نے حادثے کے تصور سے ہی ایک جھرجھری لی اور شمائلہ کی طرف مڑ کر کہنے لگا۔

''شمی جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب صبح پہلا کام یہ کرو کہ جا کے کچھ اپنی جان کا صدقہ دے آؤ۔''

''ہاں میرے بھی ذہن میں تھا۔ صبح پہلا کام یہی کروں گا۔'' اس نے زاہد علی کا ہاتھ فرطِ جذبات سے تھام لیا۔ ویسے بھی زاہد علی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر پریشانی مزید نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ زاہد کے کندھے پر سر رکھ کے خوب روئے۔

''ٹیک اٹ ایزی۔'' زاہد نے اس کے دل کی کیفیت سمجھ کر ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ ''جو ہوا اسے بھول جاؤ اور جو نہیں ہوا اس کے لئے شکر ادا کرو اور آئندہ کے لئے محتاط رہو۔'' یہ بات زاہد نے معلوم نہیں کن معنوں میں کہی تھی، لگتا تھا جیسے وہ کوئی بات معنی خیز انداز میں کہہ گیا ہو اور پھر وہ ہوا جو ابھی تک نہیں ہوا تھا جس کا زاہد کو خیال بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک دن وہ بھی دیکھ لیا۔ اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ آسمان جیسے ٹوٹ پڑا ہے اور زمین جیسے پھٹنے لگی ہے۔

پاکستان ورچوئل لائبریری

چھٹیاں کرنے اور گھر بیٹھ کے آرام کرنے کی زاہد کو عادت نہیں تھی۔ کیسے بھی حالات ہو جائیں وہ کالج سے چھٹی نہیں کرتا تھا۔ اس دن بھی صبح جب وہ کالج کے لئے روانہ ہوا تو اس کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ اسے شدید چکر آ رہے تھے لیکن پھر بھی اس نے آرام نہیں کیا اور کالج کے لئے روانہ ہو گیا۔ جب اس کی موٹر سائیکل روڈ پر جا رہی تھی تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے موٹر سائیکل نہیں بلکہ سڑک دوڑ رہی ہے اور سڑک کے اطراف کھڑی بڑی بڑی عمارتیں دوڑ رہی ہیں۔ اسے ہر شے گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ کالج پہنچ کر اس نے بمشکل ایک پیریڈ لیا۔ دوسرا پیریڈ پڑھانے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ وہ کلاس چھوڑ کر کالج کے برابر میں ہی ایک پرائیویٹ ہسپتال کے واقف کار ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ ڈاکٹر نے جب زاہد کا بلڈ پریشر چیک کیا تو چونک گیا۔

''زاہد صاحب! حیرت ہے، اتنے بلڈ پریشر میں موٹر سائیکل چلا کے کالج تک کیسے پہنچے۔''

''کیا زیادہ ہے۔'' زاہد نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں بہت زیادہ۔'' ڈاکٹر نے تشویش کا اظہار کیا۔ ''اس بلڈ پریشر میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''پہلے تو مجھے کبھی نہیں ہوا بلڈ پریشر۔'' زاہد نے قدرے حیرت سے کہا۔

''پہلے کبھی آپ نے چیک ہی نہیں کرایا ہوگا اور اتنا زیادہ کبھی ہوا نہیں ہوگا کہ آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا لیکن آج تو بہت شوٹ کر گیا ہے۔'' ڈاکٹر نے پھر تشویش ظاہر کی۔

''تو......؟'' زاہد نے سوالیہ انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''تو کیا...... میرا مشورہ ہے کہ فوراً ایڈمٹ ہو جائیے۔'' ڈاکٹر نے رائے دی۔

''نہیں ڈاکٹر ایڈمٹ تو میں نہیں ہوں گا۔'' زاہد صاف انکار کرتے ہوئے بولا۔

''تو پھر میں دوا دے دیتا ہوں۔ ایک گولی ابھی کھا لیں اور گھر جا کے آرام کریں۔'' ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور اپنے پاس سے ایک ٹیبلٹ بلڈ پریشر کی دی اور جب زاہد جانے لگا تو ڈاکٹر نے جاتے جاتے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں اس کنڈیشن میں موٹر سائیکل نہیں چلائیں گے آپ۔''

''نہیں چلاؤں گا۔'' زاہد نے ڈاکٹر کی رائے مانتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی آج کالج میں ہی چھوڑ جاؤں گا۔''

اور پھر زاہد نے ایسا ہی کیا، وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی کیفیت آج ایسی نہیں ہے کہ وہ موٹر سائیکل چلا سکے اور اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اچانک اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ ڈاکٹر نے بھی اس سے پوچھا تھا۔ ''کوئی ٹینشن تو نہیں ہے؟''

''ٹینشن؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا تھا اور پھر اس نے کہا۔ ''نہیں ڈاکٹر ٹینشن تو نہیں ہے۔'' لیکن معاً اسے محسوس ہوا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہے، ضرور اس کے تحت الشعور میں کوئی نہ کوئی ٹینشن ہو گی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تاہم اس نے اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دیا اور موٹر سائیکل چوکیدار کے سپرد کر دی۔

کوچنگ سینٹر میں بھی فون کر دیا کہ وہ شام کو نہیں آ سکے گا اور پھر ایک ٹیکسی پکڑ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹیکسی اس نے گھر کے پاس روکی اور اُتر کے مکان کی طرف گیا۔ یہ اس کے بچوں کے اسکول میں ہونے کا وقت اور اس کی بیوی کے گھر میں موجود رہنے کا۔ اگر وہ اپنی موٹر سائیکل سے آیا ہوتا تو شائلہ موٹر سائیکل کی آواز پہچان کر فوراً گھر سے باہر نکل آتی بلکہ حیرت زدہ ہو جاتی۔ زاہد کبھی دن کے وقت گھر نہیں لوٹا تھا۔

زاہد گیٹ کی طرف گیا اور جونہی اس نے گھنٹی بجانے کے لئے ڈور بیل پر ہاتھ رکھا تو جیسے ہاتھ رکھنے سے پہلے اسے ایک کرنٹ سا لگا، اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اس کی نظر اچانک شمس کی موٹر سائیکل پر پڑی جو گیٹ سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔

''یہ کیا؟'' زاہد نے سوچا۔ ''یہ تو میرے ساتھ صبح نکلا تھا اور کہہ گیا تھا آج اس نے تین چار جگہ وزٹ کرنا ہے، واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ یہ تو صبح صبح ہی واپس آ گیا...... کیوں؟'' زاہد کے دماغ میں اچانک یہ کیوں، کسی سوئی کی طرح اٹک گیا اور ایک ساتھ کئی وسوسے اس کے دماغ میں سیٹیاں بجانے لگے۔ اس نے گھنٹی بجانے سے گریز کرتے ہوئے عقبی کمرے کی طرف دھیرے دھیرے قدم بڑھائے، یہ شمس کا کمرہ تھا۔ اس کے کمرے کی باہر کی طرف کھلنے والی دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ پیچھے کی طرف اندر گلی میں گیا جہاں تیسری کھڑکی تھی۔ یہ کھڑکی کھلی تھی لیکن اس کے پردے بہت دبیز تھے۔ زاہد کھڑکی کے پاس رُکا، اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر پردے کو بے آواز طریقے سے تھوڑا سا سرکا کے اندر جھانکا۔ اندر جھانکتے ہی اس کے دماغ میں دھائیں سے ایک بم پھٹ گیا۔ ایک دھماکے، ایک زلزلے نے اسے سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے پردہ ہٹایا تھا اور اس ایک لمحے میں اس نے ایک قیامت کا منظر دیکھ لیا۔ اب اس میں مزید دیکھنے کی سکت نہ تھی، اس نے فوراً پردہ گرا دیا۔

''اُف خدایا کیا شمائلہ ایسی بھی ہوسکتی ہے؟'' ایک پنچ جیسے اس کے سر میں لگا اور وہ کسی ناک آؤٹ ہونے والے باکسر کی طرح لڑکھڑا گیا۔

''اُف خدایا یہ ہے وہ دوست شمس جس کو میں فٹ پاتھ سے اٹھا کے لایا اور اپنے سر پہ بٹھا دیا تھا۔'' زاہد کو جیسے دوسرا پنچ لگا اور وہ مکمل طور پر ناک آؤٹ ہوگیا پھر کمرے کے منظر کو چاردیواری میں ہی آزاد چھوڑ دیا اور خود الٹے قدموں کمرے کی دیوار سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر مڑ کے واپس سڑک کی طرف جانے لگا لیکن اسے یوں لگا جیسے وہ سرکس کے اندر گھومنے والی تیز رفتار برقی گاڑی میں بیٹھا چکر کھا رہا ہو۔ اب اسے صحیح معنوں میں زمین آسمان، درخت، بلڈنگیں، سڑکیں، کاریں، ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے تو یہ مشورہ دیا تھا کہ موٹر سائیکل چلا کے نہیں لے جانا لیکن وہ تو اب زمین پر بھی سیدھے قدموں نہیں چل پا رہا تھا اور اسے چلتے ہوئے کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ آگے کی طرف جا رہا ہے یا پیچھے کی طرف چل رہا ہے۔ وہ چل رہا ہے یا زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہے۔ اس کا دماغ مکھیوں کا چھتا بن گیا تھا جہاں خیالات کی بھنبھناہٹ اس کے سر پر ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھی اور اس کی سوچ کے تمام راستے آپس میں گڈمڈ ہوگئے تھے۔

''یااللہ، ایسا کیوں ہوا ہے؟'' وہ سوچنے لگا۔ ''اگر میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھتا بلکہ یہ سب کوئی اور آکر بتاتا تو میں شمائلہ کی بے وفائی کا کبھی یقین نہ کرتا کیونکہ اس کی وفا پر میرا ایسا ہی یقین تھا جیسے کوئی سورج کی روشنی اور اس کے طلوع پر یقین رکھتا ہے۔ ہاں طلوع آفتاب ایک حقیقت ہے اور غروب آفتاب دوسری حقیقت اور آج اس کی شمی کی محبت، اس کی وفا، اس کے لفظوں کی سچائی، اس کے رویوں کا خلوص اور اس کی شخصیت کے حسن کا سورج غروب ہوگیا تھا۔'' اس کی سوچ کا دھارا رُکا، تھا اور پھر چل پڑا۔ ''لیکن کیوں ...... شمائلہ نے ایسا کیوں کیا ...... کیا میری محبت میں کسی قسم کی کمی رہ گئی تھی ...... کیا میں اس کا کوئی مطالبہ پورا نہیں کرسکا تھا ...... کیا میں اس کی خوشی اور اس کے اطمینان کے معیار سے کم تھا؟ میری زندگی میں تو کوئی دوسری عورت نہیں تھی۔ شمائلہ جانتی تھی کہ آسمان سے اُتری اپسرا بھی اس کے سامنے میرے نزدیک ہیچ تھی۔ میں نے تو اسے اس طرح ٹوٹ کے چاہا ہے کہ شاید ہی کسی نے کسی کو چاہا ہوگا۔ تو پھر کیوں ...... شمائلہ نے ایسا کیوں کیا؟ اور وہ احسان فراموش شمس ...... جو میرے لڑکپن کا دوست تھا، میں نے دوست بن کے جس کی دستگیری کی۔ زمین سے اٹھا کے چھاتی سے لگایا تو اس نے میری دوستی، میری

ہمدردی، میری نیکی کا یہ بدلہ دیا مجھے۔ ارے ڈائن بھی دس گھر چھوڑ دیتی ہے۔ ڈاکو بھی پڑوس میں ڈاکا نہیں ڈالتا اور یہ تو ایسا ڈاکو نکلا جس نے اپنے ہی گھر کے اندر ڈاکا ڈالا ...... کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں......؟'' یہ کیوں، کسی برچھے کی طرح اس کے دل و دماغ میں دھنس کے رہ گئی اور وہ الٹے سیدھے قدموں چلتا اس چوک پر پہنچ گیا جہاں سے وہ شمس نام کے ایک بچھو، ایک سانپ کو لے کر اپنے گھر آیا تھا اور جس نے سب سے پہلے اس کو ڈسا۔ اب وہ اس چوک پہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ لہٰذا وہ سوچ سوچ کے اس نتیجے پر پہنچا کہ اب اس کا جینا بیکار ہے۔ اسے مر جانا چاہئے لیکن مرنا بھی آسان نہیں ہے۔ کیا وہ زہر کھا کے مر جائے۔ معاً کہیں قریب یا دور سے ریل کی سیٹی کی آواز آئی اور وہ سوچنے لگا کہ ریل کی پٹری پر لیٹ جانے سے بھی موت آسانی سے آ جائے گی۔ وہ کسی ملٹی اسٹوری بلڈنگ کی چھت سے بھی کود سکتا ہے۔ چھلانگ لگا کے کسی گاڑی کے آگے بھی آ سکتا ہے۔ گلے میں پھندا لگا کے لوگ بہت آسانی سے خودکشی کر لیتے ہیں لیکن خودکشی پھر خودکشی ہے۔ اس کے بچوں کے لئے بدنامی کا بدنما داغ جو زندگی بھر ان کے ماتھے سے نہیں اترے گا اور زندگی بھر اس کے بچوں کو احساس ندامت رہے گا اور لوگ بھی احساس دلاتے رہیں گے کہ ان کے باپ نے خودکشی کر لی تھی۔

''نہیں نہیں نہیں۔'' ایک دم سے زاہد کے اندر ایک نئے جذبے نے جنم لیا۔ ''میں خودکشی کیوں کروں؟ گناہ میں نے اور میرے بچوں نے تو نہیں کیا کہ میں ...... یا میرے بچے بھگتیں۔ جنہوں نے گناہ کیا ہے سزا بھی انہی کو بھگتنی چاہئے۔'' زاہد تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور پھر سوچنے لگا ''سزا کیا ہو؟'' اس نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں کیا اور ایک پڑھے لکھے آدمی کی طرح شمائلہ اور شمس کے لئے سزا سوچ لی۔ اس نے برابر ہی میں ایک اسٹیشنری کی دکان سے لیٹر پیڈ خریدا۔ اسی دکان میں بیٹھ کے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور لفافے میں بند کیا۔ سڑک پہ آ کے ایک ٹیکسی انگیج کی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ پشاور کے لئے آخری گاڑی رات گیارہ بجے جا رہی تھی۔ زاہد نے ایک ہی ڈبے کے اندر دو سیٹیں مخصوص کرائیں اور ٹکٹ لے کر بہت اطمینان کے ساتھ واپس گھر کی طرف روانہ ہوا۔

گھر کی فضا بالکل مختلف تھی۔ بچے حسب معمول کھیل کود رہے تھے اور باپ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ شمائلہ کے دکان بھی ہر بائیک کی آواز پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ شمس بھی دوپہر گھر سے نکلنے کے بعد اب شام کو دوبارہ واپس آ گیا تھا اور سخت شش و پنج بلکہ

تشویش میں مبتلا تھا کیونکہ دن میں وہ شک و شبہ میں پڑ گیا تھا لیکن کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ کسی نے شاید کھڑکی کا پردہ سرکا کے اندر جھانکا تھا۔ شمائلہ نے بھی پردہ سرکنے کا نوٹس لیا تھا اور پردے کے ساتھ لگا ہوا کوئی ہاتھ بھی دونوں کو دکھائی دیا تھا لیکن شمس نے اٹھنے پلٹنے سنبھلنے اور کھڑکی تک جانے میں کچھ وقت لگا دیا تھا اور پھر اس نے پردے کو اچھی طرح سے ہٹا کر جب باہر دیکھنے کی کوشش کی تو اسے کسی کی پشت نظر آئی جیسے کوئی جھانک کر واپس جا رہا ہو اور یہ پشت اسے زاہد کی معلوم ہوئی تھی لیکن فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور وہ کچھ نہ دیکھ سکا کہ کون تھا لہٰذا کوئی حتمی نتیجہ بھی نہ نکل سکا۔

''یقیناً کوئی راہگیر یا پاس پڑوس کا آدمی تھا۔'' شمس نے خود کو اور شمائلہ کو بھی تسلی دی لیکن تشویش بہرحال موجود تھی اگر کوئی راہگیر یا پڑوسی تھا تو بھی ایک تشویشناک بات ہو سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی۔ دونوں باتیں تھیں اور اب گھر کی چار دیواری کو زاہد کی آمد کا انتظار تھا اور گھر کے حالات کا انحصار زاہد کی آمد پر تھا۔

معاً گھر کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ اندر کے چور نے شمائلہ کو متزلزل کر دیا تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کی طرف گئی۔ گیٹ کھولنے پر پہلی حیران کن اور خلاف معمول بات جو شمائلہ نے دیکھی وہ زاہد کا چہرہ تھا۔ پھر زاہد کی بائیک نہیں تھی اور ٹیکسی دروازے پر ابھی تک کھڑی تھی۔

''جان! بائیک کہاں ہے آج؟'' شمائلہ نے زاہد سے آنکھیں ملائے بغیر دروازے کے باہر کھڑی ٹیکسی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بائیک نہیں ہے آج۔'' وہ بھی شمائلہ کی طرف دیکھے بغیر جذبات اور مفہوم سے عاری لہجے میں بولا اور شمائلہ سے اپنے وجود کو بچا کے اندر گیا کہ جیسے وہ کوئی غیر عورت ہو۔ شمائلہ اس کے تیور دیکھ کر لرز سی گئی۔ شمس اندر کمرے میں موجود تھا۔ زاہد نے شمس کے چہرے کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ زاہد کا چہرہ بالکل اجنبی جیسا تھا۔

''ارے ...... کیا بات ہے بھئی کہاں سے آ رہے ہو؟'' شمس نے نارمل طریقے سے اس طرح بات شروع کی جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہو لیکن زاہد نے اس کی بات اَن سنی کر کے بہت نفرت اور حقارت کے ساتھ جملے کو بیچ میں کاٹا۔

''ہش ش ش ...... زیادہ بات نہیں۔ اندر کمرے سے جا کے اپنا سامان لے آؤ۔'' یہ حکم تھا۔

''زاہد......!'' معاً شمس کے ہونٹ اور زبان لڑکھڑا گئی اور زاہد نے انگشت شہادت

بلند کر کے کہا۔

''بس جتنا کہا ہے اتنا کرو۔ اپنا سامان لے آؤ۔'' اور پھر وہ شمائلہ کی طرف گھوما اور آنکھ ملائے بغیر تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوا۔

''تم بھی ...... تم بھی اپنا سامان باندھو۔'' یہ کہہ کر وہ خود ہی شمائلہ کے کپڑوں کا سوٹ کیس اٹھا لایا۔ کچھ کپڑے اس میں پڑے تھے۔ کچھ چیزیں زاہد نے اس کے اندر پھینکیں اور کسی روبوٹ کی طرح بولا۔ ''تم دونوں فوراً یہ گھر چھوڑ دو اور اس شہر سے چلے جاؤ۔''

''زاہد لیٹ می ایکسپلین۔'' شمس ہڑبڑا کر کچھ بولنے لگا۔ ''آخر کچھ بتاؤ تو......''

''شپ اپ۔'' زاہد کا غصہ اور جلال دیکھ کر دونوں سہم گئے۔ دونوں بچے بات کو کچھ کچھ سمجھ کے ایک کونے میں سہم گئے تھے۔ زاہد کسی ڈکٹیٹر کی طرح مزید آرڈر دیتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''اب نکلو یہاں سے، باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ یہ ٹکٹ ہیں دو، ریل کے۔ سیٹیں ریزرو ہیں پشاور تک۔ اپنی مرضی کے سٹیشن پر اتر سکتے ہو۔ اب بقیہ زندگی چین سے بسر کرو۔ کھلے عام، چوری چھپے نہیں۔'' زاہد رک رک کر ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا اور شمائلہ کے وجود پر کپکپی طاری ہوگئی اور جیسے زبان بند ہوگئی۔ شمس کے چہرے پر خوف اور وحشت طاری تھی۔ دنوں کے اندر اب زاہد کے ساتھ کوئی بات کرنے کی سکت نہیں تھی اور زاہد کا رویہ بھی ایسا ہو گیا تھا کہ اس نے کسی کے لئے بولنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔

''اور یہ دو لفافے ہیں۔ چاہے پرس میں رکھو چاہے سوٹ کیس میں۔'' زاہد نے لفافے شمائلہ کی طرف بڑھائے ابھی تک اس نے ایک نگاہ بھی شمائلہ کے چہرے پر نہیں ڈالی تھی لیکن جو کچھ وہ بول رہا تھا اور کرتا جا رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک پختہ پروگرام اور مصمم ارادے کے ساتھ گھر لوٹا ہے۔

''اس ایک لفافے میں پندرہ ہزار روپے کا چیک تمہارے نام کا ہے۔ تم اس کے ساتھ پرسنل اکاؤنٹ کھول سکتی ہو کیونکہ عین ممکن ہے کل یہ شخص تمہیں بھی دھوکا دے جائے۔'' زاہد نے دو لفافوں میں سے ایک لفافہ الگ کر کے کہا۔

''سنو زاہد!'' شمس نے ڈرتے ڈرتے کچھ کہنا چاہا۔

''ہش، ڈونٹ انٹرپٹ۔'' زاہد نے پھر انگلی بلند کر کے شمس کو بولنے سے روکا اور اس کے روکنے کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا ہو اور شمس

سہم کر چپ ہو گیا۔
''پکڑو لفافہ...... اسے سنبھال کے رکھو۔'' وہ بیوی سے مخاطب ہوا لیکن اس کے چہرے کی طرف اب بھی نہیں دیکھا ''اور یہ لو دوسرا لفافہ۔'' زاہد نے پھر دوسرا لفافہ اس کی طرف بڑھایا شمائلہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دوسرا لفافہ بھی کپکپاتی انگلیوں سے تھاما اور پھر زاہد نے پہلی مرتبہ شمائلہ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے دکھ، کرب اور ملال سے رقت بھرے لہجے اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''اس لفافے میں طلاق نامہ ہے۔ میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔''

''نہیں......'' شمائلہ چلائی۔'' یہ نہیں ہو سکتا۔

''ہاں شمائلہ یہ ہو گیا ہے۔'' زاہد بھی دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔ ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق۔''

''مجھ پر رحم کھاؤ۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کھاؤ۔'' وہ دھڑام سے زاہد کے قدموں میں گر گئی اور آنسو زاہد کے پاؤں پر تیزی سے گرنے لگے۔'' ایسا نہ کرو جان! اتنا بڑا فیصلہ مت کرو۔'' وہ گڑگڑائی۔

''فیصلہ تو ہو گیا۔'' زاہد کی آواز بن بولے بیٹھ گئی تھی۔ ''تیر کمان سے نکل کر واپس تو نہیں آ سکتا۔ طلاق کا فیصلہ بھی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہوتا ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ تم دونوں شادی کر لو۔''

''ایسا نہ کرو پلیز زاہد......! ایسا نہ کرو۔ رحم کرو زاہد! میری خطا......'' وہ دیوانی ہو کر زاہد کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

''میں نے کہا نا خطا معاف کرنے سے بھی وقت اب پیچھے نہیں جا سکتا۔ تم اٹھو ٹرین کا وقت ہو چلا ہے۔'' پھر وہ شمس کی طرف مڑا اور پہلی دفعہ اس نے شمس کے چہرے کو دیکھا جہاں اسے پھٹکار برستی نظر آ رہی تھی۔

''آؤٹ۔'' زاہد نے گردن کو گھما کے شمس کو دروازے کا راستہ دکھایا اور پھر دونوں کو سامان سمیت آگے کر کے خود ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور دروازہ چھوڑنے سے پہلے شمائلہ سے بولا۔'' اور ہاں گھر کے باہر داد فریاد نہیں کرنا۔ محلے والوں کو بھی پتہ چلے گا اور یہ بچوں کے لئے اچھا نہیں ہو گا۔''

''بچے......؟'' شمائلہ نے بچوں کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں کہا۔ بچے ابھی تک کونے میں سہمے ہوئے تھے۔

''بچوں کے لئے میں ہوں نا۔ ان کی فکر نہ کرو تم۔ چلو ٹیکسی میں بیٹھو دونوں۔'' وا
دونوں کو ہانکنے کے انداز میں بولا اور پھر دونوں کو ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بٹھایا۔ خود آگے
بیٹھا اور ٹیکسی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔

وہ ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر اس نے شمس اور شمائلہ کو بٹھا رکھ
تھا لیکن دونوں بہت فاصلے پر بیٹھے تھے۔ شمس ٹیکسی کے ایک طرف کے دروازے سے لگ
ہوا تھا اور شمائلہ دوسری طرف کھڑکی سے سر لگائے بیٹھی تھی اور بیچ میں ساری سیٹ خالی پڑی
تھی اور بیٹھنے کا یہ انداز زاہد کا نہیں بلکہ شمس اور شمائلہ نے خود ہی اختیار کیا تھا۔ وہ سکڑ سمٹ
کر ٹیکسی کے کونوں میں دبک گئے تھے۔ شمس بھی ڈرا سہما تھا اور شمائلہ خوفزدہ ہونے کے
ساتھ بہت غمزدہ تھی۔

خوش حال زندگی گزارنے والی عورت کے طلاق کے پہلے دن سے زیادہ غمزدہ دن
کیا ہوسکتا۔ شمائلہ اس وقت اپنا سب کچھ چھوڑ کے جا رہی تھی۔ اپنا سہاگ، اپنے دو کم سن
بچے، اپنا گھر جس کو اس نے کتنی محنت اور قرینے سے سجایا تھا اور پھر اپنا بے پناہ پیار کرنے
والا شوہر۔ اس کی محبت، اس کے دکھ سکھ، سب کچھ اچانک چھوٹ گیا تھا۔ کل تک وہ تصور
بھی نہیں کرسکتی تھی کہ آسمان اس پر اس طرح ٹوٹ پڑے گا۔ صرف ایک دن، ایک رات
کے وقفے میں ایسا ناگہانی ہو جائے گی۔

''یہ سب کچھ کیوں ہوگیا میرے مولا ...... میں کس شیطان کے بہکاوے میں
گئی۔'' شمائلہ ٹیکسی کے کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی اندر ہی اندر آنسو بہاتے ہوئے سوچتی
رہی۔

''غلطی بہت بڑی تھی میرے مولا ...... لیکن زاہد نے یہ مجھے غلطی کی سزا نہیں دی۔
یہ سزا تو اس نے مجھے اعتماد اور اعتبار کو توڑنے کی دی ہے۔ اس کا مجھ پر مکمل یقین او
بھروسہ تھا۔ میں نے اس کے بھروسے کے آبگینے کو چور چور کر دیا ہے۔ اس نے یہ آبگینہ
توڑنے کی کی سزا دی ہے۔ ورنہ وہ تو بڑی سے بڑی غلطی معاف کرنے والا آدمی ہے۔
اس کا سینہ تو سمندر کی وسعتوں سے بڑا اور گہرا ہے۔ تو پھر......'' سوچتے سوچتے اس کی
سوچ کا دھارا جیسے الٹا بہنے لگا۔ ایک نفرت اور حقارت کی لہر شمائلہ کے دل میں زاہد کے
لئے پیدا ہوئی۔ ''جھوٹا اور کمینہ ہے زاہد۔ اتنی بڑی اور انتہائی سزا؟ وہ اس سزا میں کمی بھی
تو کرسکتا تھا۔ وہ شمس کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتا اور شمائلہ کو کمرہ بند کر کے جی بھ

کے پیٹتا۔ اتنا پیٹتا کہ وہ لہولہان ہو جاتی۔ وہ چند روز کے لئے اس سے الگ ہو جاتا۔ اس کے لئے حقیر زبان استعمال کرتا۔ اسے کہیں کسی رشتہ دار کے گھر بھجوا دیتا۔ وہ سخت سزا دے سکتا تھا لیکن طلاق کا اتنا بڑا فیصلہ؟ اس سے تو اچھا تھا گلہ گھونٹ کے مار دیتا۔''

اچانک ٹیکسی رک گئی۔ شمائلہ کو کچھ پتا نہیں لگا کہ ٹیکسی کون سے راستے سے آئی نہ وہ باہر کی طرف کچھ دیکھ سکی۔ اس کے حواس بالکل قابو میں نہیں تھے۔ اس نے ٹیکسی رکنے پر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے باہر دیکھا تو عمارت پر ریلوے سٹیشن لکھا ہوا تھا اور زاہد باہر سے شمائلہ کے لئے ٹیکسی کا دروازہ کھول رہا تھا جبکہ شمس دوسری طرف سے خود ہی نیچے اتر گیا تھا اور دونوں کی کیفیت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے زاہد گن پوائنٹ پر دونوں کو ریلوے سٹیشن لایا ہے اور صورت حال تھی بھی گن پوائنٹ والی۔ شمس کو شبہ ہی نہیں یقین ہو چلا تھا کہ زاہد کے پاس ضرور کوئی خفیہ ہتھیار موجود ہے اور اس پر ایک دہشت اور وحشت بھی سوار ہے اور اگر اس وقت اس کی بات نہ مانی گئی تو پھر غصے میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ورنہ شمس اگر چاہتا تو بھاگ بھی سکتا تھا لیکن اس نے بھی مصلحت اسی میں جانی کہ چپ چاپ زاہد کا حکم مانتا رہے۔ بعد میں کیا ہوگا یہ بعد میں دیکھا جائے گا اور شمائلہ کو تو ہوش ہی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اور اب وہ ایک بے زبان چوپائے کی طرح تھی۔ لہٰذا ٹیکسی کا دروازہ کھلنے پر وہ ہونقوں کی طرح چپ چاپ منہ اِدھر اُدھر گھماتی نیچے اتری۔ سامان کے بارے میں اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ زاہد نے سامان قلی سے اٹھوایا اور دونوں کو قلی سمیت آگے کیا خود اپنے لئے پلیٹ فارم خریدا اور تینوں گیٹ سے اندر چلے گئے۔

''یہ تم دونوں کی سیٹیں ہیں۔'' جب قلی نے سامان برتھ پر رکھا تو زاہد سیٹوں کی نشاندہی کرتے ہوئے دونوں سے مخاطب ہوا۔ ''ٹکٹیں سنبھال کے رکھنا۔ پشاور تک کی ہیں لیکن منزل کا تعین تم خود کرو گے کہ کہاں اترنا ہے۔ تاہم کراچی کی حدود میں نہیں رہنا۔'' زاہد نے نظریں نیچے کئے ہوئے دھیمے لہجے میں ہدایت دی لیکن انداز سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ دونوں میں سے کس سے مخاطب ہے۔

''زاہد......'' شمس نے سامان تھام کر بہت آہستگی کے ساتھ زاہد کے کان میں کچھ کہنے کے لئے پکارا۔

''ہش ش ش۔'' زاہد نے اسے چپ کرا دیا اور کہنے لگا۔ ''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آج تم بولنا کچھ نہیں۔ سننا اور اس طرح کرنا ہے جس طرح کرنے کو کہا جائے ورنہ

پبلک کے سامنے کوئی سین کری ایٹ ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا اور پھر دونوں سے
مشترکہ طور پر مخاطب ہوا۔ ''میں نیچے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں اور اس وقت تک کھڑا رہوں
گا جب تک گاڑی روانہ نہ ہو جائے۔'' وہ حکم دے کر تھوڑا سا اور پیچھے ہوا اور پھر شمس کی
طرف دیکھ کر تحکماً کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

شمس چپ چاپ دبک کے بیٹھ گیا۔

''تم بھی......'' وہ شمائلہ کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا اور شمائلہ جو اب تک اپنے
جذبات کو قابو کیے ہوئے تھی، اپنی ہچکیوں اور سسکیوں کو کنٹرول نہ کر سکی۔

''میں تمہارے...... ساتھ...... تھوڑی...... دیر کے لئے نیچے آؤں۔'' شمائلہ نے
ہچکیوں اور سسکیوں کے اندر ڈوبی ہوئی آواز میں لکنت سے کہا۔

''نہیں۔'' زاہد نے ایک نیا فرمان جاری کیا۔ ''یہاں نیچے اترنا منع ہے۔ جب
گاڑی چل پڑے گی تو جہاں جی چاہے اتر جانا اور جب تک گاڑی چلتی نہیں ہے اپنی سیٹ
سے اٹھو گی نہیں اور نہ ہی کھڑکی کی طرف آؤ گی۔ اب بیٹھ جاؤ۔'' زاہد کے آخری حکم پر
شمائلہ فوراً بیٹھ گئی۔ شمس بھی بیٹھ چکا تھا۔ اس کا منہ ریل کے ایک سرے کی طرف شمائلہ نے
منہ دوسرے سرے کی طرف کیا، دونوں منہ موڑ کے اور پیٹھیں جوڑ کے بیٹھ گئے۔

زاہد نیچے اتر آیا اور پلیٹ فارم پر اس طرح چپ چاپ بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا
جیسے پٹڑی کے ساتھ ساتھ گڑے ہوئے بہت سے کھمبوں میں سے وہ بھی ایک کھمبا ہو۔

زاہد تقریباً بیس منٹ تک پلیٹ فارم پر ساکت کھڑا رہا۔ اس وقت اس کے دماغ
میں کوئی ایک سوچ نہیں تھی۔ سوچوں کا ایک اتھاہ سمندر تھا۔ سوچیں لہروں کی طرح آ رہی
تھیں اور بکھر کر فنا ہو کے واپس جا رہی تھیں۔ وہ کسی بت کی طرح کھڑا رہا۔ لوگ ریل پر
چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے۔ پھر سیٹی بجی، ریل کی چھک چھک کی ہلکی سی آواز گونجی۔ عزیز
و اقارب کو الوداع کہنے والے فوراً تیز تیز قدموں سے نیچے اترے۔ ریل میں جنبش پیدا
ہوئی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے الوداع کہنے والوں کے ہاتھ ہلے اور اندر بیٹھے ہوئے مسافر
کھڑکیوں کے قریب آ کر اپنے عزیزوں کو ہاتھوں کی جنبش سے وش کرنے لگے لیکن شمائلہ
اور شمس میں سے کوئی بھی کھڑکی کے پاس نہیں آیا۔ وہ آتے بھی کیسے زاہد بہت سخت حکم
صادر کر کے آیا تھا کہ کھڑکی کے پاس کوئی نہ آئے۔ پھر ریل کے چلتے ہی جیسے ایک دم زاہد
کے قدم زمین سے اکھڑنے لگے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' زاہد کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے دیدے پھاڑ پھاڑ کے ریل

کی کھڑکی کی طرف دیکھا کہ شاید شمائلہ سامنے آ جائے لیکن شمائلہ سامنے نہیں تھی۔ ''اسے کھڑکی پر آ جانا چاہئے تھا۔ میں نے منع کیا تھا تو کیا ہوا۔ میری مرضی کے خلاف اتنا کچھ کر سکتی ہے تو کیا کھڑکی کے پاس نہیں آ سکتی۔'' ایک موہوم سا خیال اس کے اندر ابھرا اور قدم خود ہی حرکت کرتی ریل کے ساتھ اٹھنے لگے۔ وہ قدم قدم آگے بڑھا اور پھر اسے کھڑکی پر اچانک ایک چہرہ نظر آیا۔ شمائلہ کا اداس، سوگوار، مغموم لیکن حسین چہرہ اور اس چہرے پر ستاروں کی طرح چمکتی آنکھیں۔ آنکھوں سے گرتی ہوئی شبنمی پھوار جس نے چہرے کے سوگوار حسن پر ایک تمازت ایک چمک پیدا کر دی تھی۔ گاڑی کی رفتار بتدریج بڑھی۔ شمائلہ نے اپنی مرمریں کلائی باہر نکالی، ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک آہ بھر کر زاہد کو دل کی گہرائیوں سے پکارا۔ ''زاہد......!''

''شمی......!'' زاہد بھی دل کی گہرائیوں سے چیخا لیکن اس کے لب نہیں ہلے۔ یہ صرف دل کی آواز تھی اس کا ہاتھ بھی آگے شمی کے ہاتھ کی طرف نہیں بڑھا۔ وہ سوچتا رہ گیا کہ ہاتھ بڑھائے یا نہیں لیکن جب اس نے ہاتھ بڑھانے اور شمی کے ہاتھ کو چھونے کا فیصلہ کر کے ہاتھ کو جنبش دی تو اس وقت گاڑی کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی اور ہاتھوں کے درمیان فاصلہ بہت طویل ہو گیا تھا۔ تاہم شمائلہ کھڑکی میں منہ رکھے زار و قطار رو رہی تھی اور ہاتھ فضا میں لہرائے جا رہی تھی اور ریل تیز بہت تیز ہوتی دور چلی گئی تھی۔

زاہد پھر پتھر کا بن گیا تھا۔ شمائلہ کا چہرہ اس کی آنکھ سے اوجھل ہو گیا تھا اور پھر ریل گاڑی بھی اوجھل ہو گئی اور مسافروں کو چھوڑنے کے لئے آنے والے لوگ بھی پلیٹ فارم چھوڑ کر باہر جا چکے تھے۔ دیکھتے دیکھتے میلے ٹھیلے کے سماں والا پلیٹ فارم سنسان ہو گیا تھا۔ بس اکا دکا قلی اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے تھے اور زاہد بجلی کا کھمبا بنا پلیٹ فارم پر بلا وجہ کھڑا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر معلوم نہیں کتنی دیر تک پلیٹ فارم پر یونہی کھڑا رہا۔

''اف خدایا!'' جب پلیٹ فارم انسانوں سے مکمل طور پر خالی ہو گیا، ریل کی پٹریاں سنسان ہو گئیں تو زاہد کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔ ''یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیا کر دیا میں نے۔ کیا یہ ریل واپس نہیں آ سکتی۔''

وہ حواس باختہ انداز میں سوچنے لگا اور پھر خیال آیا کہ تیر تو اس نے خود ہی کمان سے پھینکا تھا۔ اب واپس کیسے آ سکتا ہے۔ وہ ایک دم سے پھر پتھر کا بن گیا اور اس کے چاروں طرف سناٹا اور خاموشی چھا گئی۔ وہ بجلی کے کھمبے کی طرح مسلسل کھڑا رہا اور سوچنے لگا کہ ابھی یہاں ایک میلا جھمیلا سا لگا تھا وہ کہاں چلا گیا۔ وہ لوگوں کی بھنبھناہٹ، ریل

گاڑی کی سیٹیاں، انجن کی آوازیں شائلہ کے شبنمی آنسو وہ سب ریل لے گئی کیا۔'' وہ سوچ رہا تھا۔ سوچتا رہا کہ اس نے اچانک ایک عجیب وغریب بات محسوس کی کہ لوگ تو اس کے آس پاس کھڑے تھے اور قلی بھی ایک دوسرے کو کہنی مار کر آگے پٹری کی طرف جھک رہے تھے۔

''یہ کیا......'' وہ پھر چونکا۔ ''یہ تو وہی گاڑی ہے جو ابھی شائلہ کو لے کر گئی تھی۔ یہ واپس کیوں آ گئی۔'' اس نے ایک گاڑی کو اندر پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ ''کیا یہ عشق ہے جو کچے دھاگے سے کھینچ کر لے آتا ہے۔'' وہ کسی مجذوب کی طرح سوچنے لگا اور پھر اس نے آس پاس کھڑے لوگوں میں سے ایک شخص سے پوچھا۔ ''بھائی جان! کیا یہ وہی گاڑی ہے جو ابھی ابھی پشاور کے لئے روانہ ہوئی تھی؟'' اس پر وہ اجنبی ہنسا اور کہنے لگا۔ ''ارے باؤلے ہو گئے ہو بھائی! دیکھنے میں تو اچھے بھلے پڑھے لکھے لگتے ہو۔ کبھی گاڑی اس طرح واپس آتی ہے۔ وہ پشاور کو گئی تھی یہ پشاور سے آئی ہے۔ وہ جدا کرنے والی گاڑی تھی یہ ملانے والی ہے۔'' یہ کہہ کر اجنبی آگے بڑھ گیا کیوں کہ گاڑی پلیٹ فارم کے اندر آ گئی تھی۔

''ہاں وہ جدا کرنے والی گاڑی تھی۔'' زاہد مخبوط الحواس انداز میں بڑبڑایا۔ اور پھر اسے عوام کے دھکے کبھی اِدھر لڑھکا رہے تھے کبھی اُدھر...... کیونکہ گاڑی رک گئی تھی، مسافروں نے اترنا شروع کر دیا تھا اور دھکم پیل میں زاہد سنبھل نہیں پا رہا تھا۔ لوگوں کا ایک اژدہام اس کے چاروں طرف تھا اور اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی بھیڑ میں سناٹا محسوس کیا تھا۔ وہ اب طرح اس بھیڑ میں گم ہو گیا تھا جیسے قطرہ دریا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

❀......□......❀

گاڑی جب سٹیشن کی حدود سے باہر نکل گئی اور زاہد کا چہرہ آنکھ او جھل ہو گیا تو شائلہ پھر اسی گئی۔ اس کی آنکھیں اچانک اس طرح دھندلا گئیں جیسے بینائی چلی گئی یا جا رہی ہو۔

''بینائی چلی ہی تو گئی۔'' شائلہ نے سوچا۔ اس کے پیارے پیارے دو معصوم بچے جو اس کی آنکھوں کا نور تھے اور اُس کا لاکھوں میں ایک شوہر، اس کو ٹوٹ کے چاہنے والا زاہد جس نے کبھی اسے غمزدہ نہیں ہونے دیا، اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو جس نے کبھی غائب نہیں ہونے دیا۔ اس کی مسرتیں، قابل رشک حال اور مستقبل کے حسین خواب سب کچھ بکھر گیا۔ اس کے خوش حال گھرانے کے خرمن میں ایک چھوٹی سی چنگاری نے آگ لگا دی اور سب کچھ جل کے بھسم ہو گیا۔

''ہاں یہ آنکھوں کی بینائی ہی تو تھی جو چلی گئی۔'' شائلہ سوچتے سوچتے ریل کی کھڑکی سے پیچھے ہٹی اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اپنی نشست پر جا بیٹھی، جہاں شمس بیٹھا دزدیدہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس نہیں آیا تھا کیونکہ زاہد نے دونوں کو سختی سے وارننگ دی تھی کہ جب گاڑی پلیٹ فارم سے نکل رہی ہو تو کھڑکی پر نہیں آنا اور شمس نے اس طرح زاہد کے حکم کی پابندی کی جیسے گن پوائنٹ کے زور پر اس نے یہ سب کہا ہو۔ شمس کو سچ مچ ڈر بھی تھا کہ اگر اس نے اپنا چہرہ آگے کھڑکی کی طرف کیا تو زاہد کا دماغ اس وقت غیر متوازن ہے، وہ دور سے گولی مار کے مزید ناخوشگوار کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا شمس اپنی نشست پر چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جبکہ شائلہ کو گولی لگنے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ گولی تو اسے لگ چکی تھی اور گولی کیا لگے گی۔

اس کا زاہد، اس کے بچے، اس کی زندگی کا ہرا بھرا مہکتا آنگن سبھی کچھ تو بارود کے ایک خوفناک دھماکے سے اڑ کر فضا میں بکھر گیا تھا۔ اب مزید گولی کیا لگے گی۔

اس نے زاہد کی وارننگ کے باوجود، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سر کو باہر نکالا تھا اور اب جب سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔

وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اور ریل کی رفتار جوں جوں تیز ہوتی جا رہی تھی

شمائلہ پر بدحواسی اور ڈپریشن کا عمل تیز تر ہوتا جا رہا تھا اور شمس شمائلہ کی ساری کیفیت کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ شمس کے چہرے سے کوئی خاص پریشانی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بہت متوازن اور نارمل لگ رہا تھا۔

شمائلہ جب کھڑکی سے ہٹ کر واپس اپنی سیٹ پر بیٹھی تو شمس نے تھوڑا سا سرک کر شمائلہ کے لئے جگہ چھوڑی۔

''حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شمس نے اُکھڑی بکھری شمائلہ کے کان میں ڈھارس دینے کے انداز میں کہا لیکن شمائلہ نے اس کے اس بے معنی فقرے پر کوئی توجہ نہیں دی کہ اس کا دل اور دماغ تو پلیٹ فارم پر زاہد کے آس پاس کہیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بکھر گیا تھا۔

''نئی نئی بات ہے ناں۔ تھوڑا سا وقت بیتے گا تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' شمس نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی اور شمائلہ جو تھوڑی دیر کے لئے پتھر بن گئی تھی۔ پھر سے جذبات کا ایک دھارا بن گئی اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے رکے ہوئے آنسوؤں کو جیسے کوئی راستہ مل گیا اور وہ بے اختیار روتے ہوئے شمس سے کہنے لگی۔

''خدا کے لئے یہ تسلیاں دینا چھوڑو۔ تمہاری ان تسلیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''ہوگا...... بہت کچھ ہوگا تم دیکھنا ہم دونوں مل کے اب بہت کچھ کریں گے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''خاک......!'' وہ ہچکیوں سے درمیان بولی اور شمس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

''اس طرح تو اب زندگی نہیں گزرے گی۔'' شمس نے آہستہ سے کہا اور تھوڑا سا جو فاصلہ شمائلہ اور اس کے درمیان تھا اسے پُر کر کے شمائلہ کے قریب ہو گیا۔

''مت رو......لوگ دیکھ رہے ہیں کیا سوچیں گے۔''

''بھاڑ میں گئے لوگ۔'' شمائلہ جسم کو ایک جھٹکا دے کر آگے سرک گئی اور کہنے لگی۔

''جو مرضی آئے سوچیں لوگ میری بلا سے۔''

بوگی میں اس وقت لوگ تو نہیں تھے صرف سامنے کی نشست پر دو ہمسفر میاں بیوی بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ شام کے وقت تک تھوڑے فاصلے کا سفر کرنے کے لئے اترے چڑھے تھے۔ رات کے آغاز میں فالتو مسافروں نے بوگی خالی کر دی تھی اور اب صرف وہی مسافر رہ گئے تھے جن کے بیٹھنے اور سونے کی نشستیں محفوظ تھیں۔

اس لئے کمپارٹمنٹ کے دوسرے حصے میں بھی لوگ رات کے کھانے اور سونے کی

تیاری کر رہے تھے اور جہاں شمس اور شمائلہ تھے اس حصے میں صرف دو میاں بیوی مزید تھے جو انکھیوں سے شمس اور شمائلہ کا جائزہ لے رہے تھے کیونکہ شمس جتنی زیادہ سرگوشی کر رہا تھا شمائلہ اتنا ہی زیادہ اشتعال میں آ کر شمس کو جھٹک دیتی تھی۔

''لگتا ہے میاں بیوی میں سخت جھگڑا چل رہا ہے۔'' سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے اپنے مرد کے کان میں آہستہ سے کہا۔

''وہ میاں بیوی ہی کیا جن میں جھگڑا نہ ہو لیکن......'' مرد نے بھی سرگوشی کے انداز میں کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن کیا......؟'' عورت نے پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' مرد نے عورت کا ہاتھ دبا دیا اور پھر سرگوشی میں بولا۔ ''اس طرف زیادہ نہیں دیکھو۔''

اور پھر وہ عورت اور مرد دونوں نے منہ پھیر لیے اور چور نظروں سے شمس اور شمائلہ کا جائزہ لینے لگے۔

شمس مسلسل شمائلہ کے کان میں بڑبڑا رہا تھا اور شمائلہ کوئی جواب دیئے بغیر آنسو بہائے جا رہی تھی۔

ریل گاڑی زناٹے بھرتی اپنی منزل کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ دور فاصلے پر بیٹھے کچھ مسافر تو سو گئے تھے اور کچھ سونے کی تیاری کر رہے تھے جبکہ شمس سرگوشی میں مصروف تھا اور شمائلہ اس کی باتوں سے بیزار ہو گئی تھی۔

''خدا کے واسطے پرے ہٹ جاؤ، مجھے اس وقت اکیلا چھوڑ دو۔'' اس نے شمس کو ہلکا سا دھکا دے کر پرے کرتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ''تمہاری وجہ سے آج یہ دن مجھے دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ میں ہاتھ جوڑتی تھی تم سے، منتیں کرتی تھی میرا پیچھا نہ کرو لیکن تم باز نہیں آئے۔ میری خوشیوں کے آنگن میں آگ لگا کے ہی دم لیا۔ اب ہٹ جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ، نہیں تو میں زور زور سے بولنے لگوں گی۔''

شمائلہ سمٹ کے اس سے دور ہو گئی تو شمس کی نگاہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت اور مرد پر پڑی جو شمس کی طرف بہت توجہ کے ساتھ ڈھکی چھپی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''تم اس خاتون کے پاس چلی جاؤ، ذرا دلجوئی کرو پریشان ہے بہت۔'' مرد نے اپنی عورت سے کہا۔ ''میں اس بندے کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔''

''ناراض تو نہیں ہوں گے ناں وہ لوگ۔'' عورت نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے

کہا۔

''نہیں نہیں وہ کیا ناراض ہوں گے۔ اس وقت انہیں کسی ہمدرد کی ضرورت ہے۔ تم جاؤ۔'' اس نے رازداری کے ساتھ عورت سے کہا اور عورت جھجکتی ہوئی شمائلہ کے پاس چلی گئی اور مرد نے شمس کو اشارہ کرتے ہوئے اپنے پاس بلایا۔ شمس اٹھ کر مرد کے پاس گیا اور مرد نے اپنے پاس جگہ بناتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں شمس سے کہا۔ ''بیٹھئے۔''

شمس بیٹھ گیا اور مرد نے اسی طرح بیچ میں سے بات شروع کی کہ جیسے دونوں کی داستان سے واقف ہو۔

''کوئی بات نہیں جناب!'' مرد دھیمے ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ''ایسا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان ہمیشہ اچھے تعلقات نہیں رہتے، جھگڑا بھی ہوتا ہے اور جب عورت ناراض ہو جائے ناں تو اسے منانے کا طریقہ ایک ہی ہے۔''

''وہ کیا؟'' شمس نے تجسس سے پوچھا۔

''بتاتا ہوں......'' مرد بولا۔ ''پہلے چائے پی لیں کہ آپ کے سر کا درد کچھ کم ہو۔''

یہ کہہ کر مرد نے اپنا تھرماس کھولا، دو کپ چائے کے نکالے، ایک شمس کو پیش کیا اور ایک اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

ریل گاڑی پٹڑی کے تاریک اور سنسان راستے میں روشنی پھیلاتی اور خاموشی کو سیٹیوں سے توڑتی چھکا چھک دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

❁

زاہد بکھر گیا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کے وجود، اس کے دل و دماغ کے ہزار ٹکڑے ہو کر ذرّوں میں بکھر گئے ہیں اور کچھ ٹکڑے شمائلہ کی گرد اڑاتی ریل اپنے ساتھ لے گئی۔ کچھ شہر کے دھوئیں میں تحلیل ہو گئے۔

اس کے ذہن کی یکسوئی مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کہاں اور کس طرف جائے۔ اس کی منزل گم ہو گئی تھی اور وہ گھر کا راستہ بھی جیسے بھول بیٹھا تھا اور اگر وہ بچوں کو گھر پر چھوڑ نہ آیا ہوتا تو شاید وہ گھر کی طرف لوٹتا ہی نہیں۔

''بچے......!'' بچوں کے خیال سے وہ ایک دم چونکا، وہ خفقان کے عالم میں جب شمائلہ اور شمس کو ریلوے سٹیشن کی طرف ہانکنے کے انداز میں لایا تھا تو اس وقت اس نے بچوں سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بس گھر سے نکلتے وقت باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ بس اسے اتنا یاد تھا کہ بچے سہمے ہوئے تھے اور وہ ان کو سراسیمگی کے عالم میں چھوڑ کر گھر سے

اُمل آیا تھا۔

بچوں کا خیال آتے ہی وہ سخت پریشان ہو گیا۔ پریشان تو وہ پہلے ہی تھا لیکن اب اس کی پریشانی ایک ہوش و حواس والے آدمی کی پریشانی تھی اور اسے خیال آ رہا تھا کہ بچوں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔

اور اب ان کی ماں تو ہے نہیں جو سونخروں سے ان کو نوالے بنا بنا کے کھلائے گی، اب وہی ان کی ماں بھی اور باپ بھی ہے۔ لہٰذا بچوں کے خیال نے جیسے عارضی طور پر اس کے ہوش بحال کیے۔ وہ فوراً ایک فاسٹ فوڈ کی دکان پر گیا۔ کچھ برگر، چپس اور کولڈ ڈرنک کی بوتلیں خریدیں اور ایک رکشا پکڑ کر گھر پہنچ گیا۔

بچے اسی طرح ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ زاہد نے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لپٹایا، پیار کیا اپنے آنسوؤں کو پونچھا، رونا ضبط کیا اور بچوں کو اس طرح بازوؤں میں لیا جیسے مرغی چوزوں کو کسی بیرونی حملے سے بچانے کے لئے پروں میں چھپاتی ہے۔

''کھاؤ میرے بچو......'' اس نے کھانا پیکٹوں سے نکال کر ایک ٹرے میں رکھا اور بچوں کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''بابا! امی نہیں آئیں گی کیا؟'' علی نے کچھ سمجھتے ہوئے، کچھ نہ سمجھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں بیٹے امی ابھی نہیں آئیں گی لیکن آئیں گی ضرور۔'' زاہد نے گول مول سا جواب دیا۔

''امی کہاں گئی ہیں بابا؟'' عینی نے بہت دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بس وہ گئی ہیں بیٹے! تم کھانا کھاؤ۔'' زاہد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عینی کو کیا بتائے اور علی کو کیا سمجھائے۔

''بابا! امی اچھی نہیں تھیں ناں؟'' عینی نے نہایت معصومیت کے ساتھ دوسرا سوال کیا۔

''ایسا نہ کہو بیٹی!'' زاہد نے بیٹی کو اور قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کس نے کہا تم سے؟''

''بھائی کہہ رہا تھا بابا! بھائی بولتا تھا امی اچھی نہیں ہیں......'' عینی نے علی کی طرف دیکھ کر تجسس سے کہا۔

''ایسی باتیں بہن سے نہیں کیا کرو علی!'' زاہد نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور

اسے قریب کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں بابا! وہ اچھی نہیں تھیں......'' علی اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

''بیٹے وہ اچھی تھیں......'' زاہد کا گلا اچانک رندھ گیا اور وہ آبدیدہ ہو گیا۔

''تو پھر آپ نے انہیں نکالا کیوں؟'' علی نے معصومیت سے پوچھا۔

''بس ...... کیا بتاؤں بیٹے! تم بہت چھوٹے ہو۔'' زاہد کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ''لیکن اپنی ماں کو برا نہ کہو وہ بہت اچھی تھی۔'' زاہد کے لہجے میں دکھ، پریشانی او پچھتاوا تھا۔

''وہ انکل برے تھا ناں......'' علی نے تجسس سے پوچھا۔

''ہاں بیٹے انکل برے تھے۔ وہ بہت ہی برے تھے......'' زاہد نے علی سے اتفاق کیا۔

''میں ماروں گی انکل کو......'' عینی نے غصے میں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

''ہاں مارنا اسے، میں بھی ماروں گا۔ اب تم لوگ کھانا کھاؤ۔'' زاہد نے دونوں بچوں کو تھپتھپایا اور برگر ان کے منہ کے قریب کیا۔ بچے بادل نخواستہ کھانے لگے۔

معاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ زاہد چونکا اور فون کی طرف دیکھنے لگا۔

''بابا! فون......'' عینی نے کان کھڑے کیئے۔ ''بابا میں سنوں......؟'' علی نے لپک چاہا۔

''نہیں بیٹے تم لوگ کھانا کھاؤ، میں خود سنتا ہوں۔'' زاہد نے کہا اور بچوں سے الگ ہو کر فون کی طرف بڑھا۔ فون کی گھنٹیوں نے بچوں کی توجہ بھی ماں کے خیال کی طرف سے ہٹا دی تھی۔ اب وہ دونوں کھانا کھانے میں لگ گئے تھے۔

''ہیلو......'' کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد زاہد فون کے پاس پہنچا اور ریسیور اٹھایا۔ زاہد کے بڑے بھائی عابد علی کا فون تھا۔ عابد علی ایک اعلیٰ افسر تھے۔ سوسائٹی میں اعلیٰ مقا اور بڑا نام تھا۔ لوگ باگ ان کے نام سے فائدہ اٹھاتے اور ان سے کئی رعایتیں حاصل کرتے تھے لیکن زاہد نے کبھی بھائی کے نام اور مقام سے سہولت حاصل نہیں کی۔

دونوں بھائی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میل ملاپ بھی کم تھا لیکن زا ہمیشہ بڑے بھائی کا بہت احترام کرتا تھا۔ عید، بقرعید پر سب سے پہلے بھائی کو سلام کرنے جاتا۔ کوئی تہوار ہوتا تو دونوں بھابھیاں بھی محبت سے ملتیں اور میل ملاپ زیادہ نہ ہونے کے باوجود ایک رکھ رکھاؤ تھا، پیار تھا، محبت تھی۔

ٹیلیفون بھی دونوں بھائی کسی وجہ سے کرتے، کسی کو کوئی کام ہو، کوئی تہوار آ جائے یا کسی کی طبیعت خراب ہو تو خیر خیریت دریافت کرنے کے لئے فون آ جاتا، ورنہ دونوں میں سے کوئی بھائی بلاوجہ فون کر کے ایک دوسرے کا وقت برباد نہیں کرتا تھا اور اب جو عابد بھائی کا فون آیا تو زاہد کے لئے یہ اچانک فون تھا۔

اسے بھائی کی آواز ہی سن کر ایک دھڑکا لگا کہ شاید بھائی کو اس واقعہ یا سانحہ کا علم ہو گیا ہے۔ حالانکہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا۔ صرف شائلہ جانتی تھی یا زاہد خود جانتا تھا اور وہ سخت پریشانی میں تھا کہ بھائی کو کیسے بتائے گا اور دوسرے لوگوں کے علم میں کیسے لائے گا یا کسی کے علم میں جب بات آئے گی تو وہ ایک ندامت کے دلدل میں ڈوب جانے کے سوا کیا وضاحت کر سکے گا۔

تاہم اب یہ عابد علی کا فون بالکل اچانک آیا تھا اور زاہد وسوسے میں پڑ گیا تھا کہ معلوم نہیں بھائی جان نے کیوں فون کیا ہے۔

اس نے سی ایل آئی پر ہی بھائی کے فون کا نمبر دیکھ لیا تھا اور پھر بہت ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور متزلزل لہجے میں آواز نکالی۔

''ہیلو......'' زاہد نے کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد فون اٹھایا۔

''ہیلو زاہد! کیسے ہو بیٹے؟'' دوسری طرف بڑے بھائی عابد علی کی مشفقانہ آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ہوں بھائی جان!'' وہ گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیسے ہیں؟''

''شکر ہے مولا کا......'' عابد بھائی نے روایتی انداز میں جواب دیا اور پھر پوچھنے لگے۔ ''کیا گھر میں آج کوئی نہیں تھا؟''

''نہیں نہیں ...... ہاں، نہیں۔ کیا بات ہے بھائی جان! ادھر ہی تو تھے۔'' زاہد بوکھلاہٹ میں بولا۔

''یار! وہ تمہاری بھابھی دن بھر ٹرائی کرتی رہی۔ کہنے لگی پتہ نہیں کیا بات ہے کوئی فون اٹھا نہیں رہا۔ میں بھی کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔ اب لائن ملی ہے۔'' عابد بھائی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''وہ بھائی جان شاید کچھ لائن میں خرابی تھی۔'' زاہد نے اپنے حواس قابو میں کئے۔

''اچھا ذرا شائلہ کی بات کرا دو اپنی بھابھی سے۔'' عابد بھائی حرف مدعا پر آتے ہوئے بولے۔ ''بلکہ مجھ سے بھی بات کرا دو۔ کافی دنوں سے بات نہیں ہوئی۔''

''اوہ گاڈ......'' زاہد بے اختیار چونکا۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ شمائلہ کو اب کہاں سے لائے۔

زاہد کے من میں کئی باتیں تھیں اور ایک تشویش تو یہی تھی کہ بھائی جان کے علم میں یہ واردات بہرحال آ کر رہے گی لیکن اس نے سوچا تھا کہ جب دو چار دس دن گزر جائیں گے تو کسی دن بھائی کے پاس چلا جائے گا یا بھائی کو بلا لے گا اور سارا دکھڑا ان کے سامنے بیان کرے گا اور پھر ان کے گلے لگ کے خوب روئے گا کیونکہ اب زاہد کو کندھے کی ضرورت تھی، کسی ہمدرد کے کندھے کی جس پر وہ سر رکھ کے خوب روئے اور اس کے لئے صرف بھائی کا کندھا ہی تھا جو بڑے بھی ہمدرد بھی اور جن کی باتوں میں باپ کی شفقت کی سی خوشبو تھی۔ وہ یہ کہانی بیان کرنے کے لئے کچھ مہلت چاہتا تھا لیکن بھائی جان کا فون اچانک اور غیر متوقع طور پر آ گیا۔

''ہاں زاہد! تم لائن پر ہو کہ نہیں ...... ہیلو۔'' زاہد نے جب خاموشی اختیار کی تو دوسری طرف سے عابد علی بولے۔

''ہاں ہاں، بھائی جان بتایا ناں یہ لائن میں گڑبڑ ہے کچھ۔'' وہ ہڑبڑا کر خاموشی توڑتے ہوئے بولا۔

''میں نے کہا تھا ذرا شمائلہ کو بلاؤ۔'' عابد بھائی بولے۔

''وہ بھائی جان......'' وہ گھبرا کے بولا۔

''بھائی جان شمائلہ ذرا برابر میں پڑوس میں گئی ہوئی ہے۔'' اچانک اسے ایک بہانہ سوجھ گیا۔

''اچھا آئے ناں تو فون کروا دینا۔ اپنی بھابھی سے بات کر لے۔'' عابد بھائی نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی جان!'' زاہد نے بے ساختہ کہا اور یوں وقتی طور پر بات بن تو جاتی لیکن بھائی جان کا حکم بہرحال برقرار رہتا اور وہ شمائلہ کے فون کا انتظار کرتے لہٰذا اس نے فون بند کرنے سے پہلے پوچھ لیا۔

''بھائی جان! کب تک سو جاتے ہیں آپ؟''

''کیا بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔'' عابد بھائی نے جواب دیا۔ ''تمہیں ہمارے سونے جاگنے کا وقت معلوم نہیں کیا؟ بس شمائلہ آئے تو فون کروا دینا۔''

''شمائلہ آج بہت دیر سے آئے گی بھائی جان!'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' عابد علی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

''بھائی جان پڑوس میں اس کی سہیلی کے گھر میں کوئی شدید قسم کا گھریلو جھگڑا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ سہیلی اس کو بلا کر لے گئی ہے اور شائلہ نے کہلوا بھیجا ہے کہ اسے لوٹنے میں بہت دیر ہو جائے گی۔''

''یار یہ کیا دوسروں کے بکھیڑے اپنے سر لے لیتے ہو تم لوگ؟ اسے منع کرو کہ دوسروں کے گھریلو معاملات میں نہ پڑا کرے۔ بہر حال وہ تمہاری بھابی نے کچھ میلاد وغیرہ کے لئے کہنا تھا۔ صبح بات کر لے گی۔'' عابد بھائی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''افوہ......'' زاہد نے ایک لمبی آہ بھری اور بچوں کو کھانا کھاتے ہوئے چھوڑ کر ایک صوفے پہ ٹیک لگا کے دراز ہو گیا۔

''ابو آپ رو رہے ہیں؟'' تقریباً نصف رات ہو گی جب اچانک عینی کی آواز اس کے کان میں گونجی، اس نے کپکپا کر دیکھا علی اور عینی دونوں اس کے بائیں دائیں پہلو سے لگے بیٹھے تھے۔

''ہم نے آپ کو بہت جگایا۔ آپ سو گئے تھے۔'' علی نے باپ کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''میں قربان ہو جاؤں۔'' زاہد نے اپنے بازو پھیلائے اور دونوں کو لپٹا لیا۔ ''میں بھی کیسا ظالم باپ ہوں تم کو سلائے بغیر خود سو گیا۔''

حالانکہ زاہد کو معلوم تھا کہ وہ سویا نہیں تھا بلکہ دن بھر کی تکان اور ٹینشن کی وجہ سے اس کا سارا وجود چور ہو گیا تھا اور دماغ پر جو نقاہت طاری ہوئی تھی اس کی وجہ سے وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔

''آ جاؤ میرے بچو! یہاں پلنگ پر آئندہ ہم تینوں یہاں سوئیں گے۔'' وہ دونوں بچوں کو پلنگ پر لے گیا اور تینوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے۔

❁

''اوہ میرے خدا...... یہ کیا ہو گیا۔'' زاہد کے بڑے بھائی عابد علی نے جب زاہد کی دردناک داستان سنی تو ایک ٹھنڈی آہ بھر کے صوفے سے ٹیک لگا لی اور اپنے ہاتھ کی انگلیاں پاس بیٹھے زاہد کے سر کے بالوں میں اس طرح پھیرنے لگا جیسے وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہو۔

اور زاہد اس وقت واقعی ایک چھوٹا سا بچہ بن گیا تھا۔ وہ بھائی کے کندھے پر سر رکھ

کے چپکے چپکے آنسو بہاتا رہا اور کمرے میں کچھ دیر تک مکمل خاموشی طاری رہی اور ا
خاموشی کے دوران زاہد کی ایک سسکی وقفے وقفے کے بعد ایک چھوٹا سا ارتعاش پیدا کر رہ
تھی۔

''دیکھو زاہد جو ہو گیا سو ہو گیا ...... اب وقت واپس پیچھے تو نہیں جا سکتا۔'' عابد
نے طویل خاموشی کے بعد کمرے کا سکوت توڑتے ہوئے اور زاہد کی گردن کو نہای
شفقت کے ساتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور جو کچھ ہوا بہت برا ہوا، ہمارے خاندان م
سات پشتوں تک اس طرح کی کوئی بات کبھی سامنے نہیں آئی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں
اس طرح کی کوئی بات کبھی ہوئی نہیں ہو گی۔'' عابد علی بہت معنی خیز انداز میں بولے۔

''کیا مطلب ......؟'' زاہد نے بھائی کے کندھے سے سر اٹھایا اور بھائی کی طرف
رخ کر کے ٹیڑھا سا ہو کے صوفے پر بیٹھا اور بھائی کی بات کو بہت توجہ سے سمجھنے کی کوشش
کرتے ہوئے بولا۔

''مطلب یہ ہے کہ پرانوں کے بقول اپنے پیٹ سے قمیض اٹھاؤ تو اپنا پیٹ ننگا ہو
ہے۔'' عابد علی نے کہا۔

''لیکن اب تو پردہ ہٹ ہی گیا ناں۔'' زاہد شکست خوردگی کے عالم میں بولا۔

''تم نے ہٹایا ناں۔۔۔'' عابد ترت بولا اور کہا۔ ''یہ تمہاری غلطی ہے۔''

''جی ......'' زاہد، بھائی کی بات پر چونکا اور عابد علی وضاحت کرتے ہوئے کہ
لگا۔ ''ہاں زاہد!''

زاہد چوکس ہو کے بیٹھ گیا اور عابد نہایت فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہ
لگا۔ ''میں نے جو اپنے خاندان کی سات پشتوں کا نام لیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کبھ
ایسا ہوا نہیں ہو گا لیکن سمجھدار لوگ کیچڑ میں پتھر پھینک کر اپنے منہ پر گند نہیں اچھالتے۔''

''بھائی جان!'' زاہد چونکا۔

''ہاں زاہد جو ہو گیا تھا سو ہو گیا۔ تم اس کتے کے بچے کا منہ کالا کر کے گھر سے کک
آؤٹ کر دیتے اور بیوی کے ساتھ جو جی چاہتا سلوک کرتے لیکن گھر کی چار دیواری ۔
اندر لیکن افسوس تم نے غصے اور انتقام میں آ کر اپنی بے وقوفی سے اپنا ہی گھر تباہ کر دیا او
اب جو بدنامی ہو گی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تم اپنے اندر توانائی نہیں پاؤ گے
افسوس ......'' عابد علی انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ بولے۔

''بھائی جان! کیا آپ چاہتے تھے کہ میری غیرت ......''

''ہش ش ش۔'' زاہد نے کچھ کہنا چاہا تو عابد اس کی بات کاٹ کر بولے۔ ''نہیں میں نہیں چاہتا کہ آدمی اپنی غیرت کو بیچ دے، غیرت کے بغیر زندگی ادھوری ہے لیکن غیرت کے ساتھ ایک لفظ ہے مصلحت۔ کوئی ایسا بڑا اور نازک فیصلہ جس کے دوررس نتائج ہوں ایسا فیصلہ کرتے وقت آدمی اپنی قوت فیصلہ کے ایک پلڑے میں غیرت اور ایک میں مصلحت ڈالتا ہے۔ یہ کرنا پڑتا ہے انسان کو۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ جو چاروں طرف بڑی بڑی کوٹھیاں، بنگلے اور مکان ہیں ان دیواروں کے اندر کیا بڑی بڑی ہولناک داستانیں نہیں پنہاں ہیں۔ کیا ان کواڑوں کے پیچھے غیرت کے قبرستان آباد نہیں ہیں جن کی قبروں پر مصلحت کے کتبے لگا کے بدنامیوں کے گلے گھونٹ دیئے گئے ہیں۔'' عابد علی ایک ہی سانس میں بول گئے اور زاہد کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے اور یہ پریشانی اور پچھتاوے کے قطرے تھے۔ وہ چپ رہا اور عابد صاحب مزید بولتے گئے۔ ''جو لوگ تمہارے پاس پڑھتے ہیں یا تمہیں جانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ تمہارے جیسے اچھے ٹیچر بہت کم ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک تم صبر و استقامت کا ایک پہاڑ ہو۔ ہو گے کوئی شبہ نہیں لیکن تم نے اپنی ذات کے معاملے میں صبر و استقامت نہیں دکھائی۔''

''اس سے زیادہ صبر کیا ہو سکتا ہے بھائی جان! دوسرا آدمی ہوتا تو گولی مار دیتا لیکن میں نے اس عورت کو ہاتھ نہیں لگایا۔'' زاہد جیسے پھٹ پڑا۔ وہ کہنے لگا۔ ''پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ میں نے صبر کا مظاہرہ نہیں کیا۔''

''نہیں کیا......'' عابد علی پھر اپنی بات پر زور دے کر بولے۔ ''اگر صبر اور برداشت سے کام لیتے تو یقیناً تم دکھ میں ہوتے لیکن تم اکیلے دکھ جھیلتے۔ اب سارے خاندان اور بچوں کو اذیت میں ڈال دیا۔ اب تمہارے پاس وہ حوصلہ نہیں جو بچوں کو دے سکو، خود کو دے سکو۔ وہ حوصلہ نہیں جو حوصلہ تمہیں گھر سے باہر نکلنے اور لوگوں کا سامنا کرنے میں مدد دے۔ تم نے کانٹوں کی سیج پر چلنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔''

''اب آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں جلدی سے کہہ دیں بھائی جان! بچوں کو گھر اکیلا چھوڑ کے آیا ہوں۔'' وہ بھائی کی باتوں سے زچ ہو کر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور بھائی نے کلائی کھینچ کر دوبارہ صوفے پر بٹھایا اور تحکماً کہا۔ ''بیٹھو......''

زاہد پھر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

''دیکھو بیٹے! جیسا میں نے کہا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ پچھتاوے سے فائدہ کچھ نہیں۔ بچوں کو یہاں چھوڑ دو میرے بچوں کے ساتھ وہ خوش رہیں گے۔ تمہاری بھابھی

اپنے بچوں کی طرح ان کی دیکھ بھال کرے گی۔ تم نئے سرے سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاؤ اور نئی زندگی شروع کرو۔'' عابد علی نے نہایت ہمدردی اور شفقت سے کہا۔

''ہاں زاہد بچوں کو یہاں چھوڑ دو۔'' اتنے میں زاہد کی بھابھی بھی اندر آ گئی تھی اور وہ بھی گفتگو میں شامل ہو گئی تھی۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔

''تھینک یو بھابھی تھینک یو۔'' زاہد اٹھا اور ممنونیت سے اپنی بھابھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''مجھے حوصلہ ہوا ہے کہ کل اگر میرے بچوں پر کوئی آڑا وقت آیا تو آپ لوگ ان کے ماں باپ کی جگہ ان کے سر پر موجود ہوں گے لیکن فی الحال میں نے کالج سے طویل چھٹیاں لے رکھی ہیں۔ بچوں کے پاس رہوں گا۔''

''ٹیک کیئر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' زاہد جب جانے لگا تو عابد نے ایک بار پھر اسے دلاسا دیا۔

اس رات ریل مسلسل زناٹے بھرتی جا رہی تھی اور شمائلہ ہمسفر خاتون کے برابر بیٹھی مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ آنسو پونچھ رہی تھی اور لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی خاتون کے کان میں بولے جا رہی تھی۔ اس نے اپنا سارا دکھڑا بیان کر دیا تھا۔ اس نے یہی بتایا تھا کہ زاہد سے وہ بے پناہ محبت کرتی ہے اور کبھی اس کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ زاہد جیسے پیارے چاہنے والے اور سونے جیسے آدمی کی نظروں سے گر جائے گی اور وہ یہی کہے جا رہی تھی کہ اس کے خوش حال گھرانے کو کسی کی نظر لگ گئی اور یہ نظر صرف اور صرف اس شیطان صفت شمس کی لگی تھی جو معلوم نہیں کب کیسے ان کی زندگی میں داخل ہوا اور ان کے چہکتے مہکتے بسیرے کو آگ لگا دی۔

وہ خاتون سے کہہ رہی تھی کہ ایسے ایسے ہزار شمس بھی ہوں تو وہ زاہد کے پاؤں کی خاک پر قربان کر دے لیکن معلوم نہیں پھر یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہو گیا اور اب وہ اسی شیطان صفت آدمی کے رحم و کرم پر ایک گاڑی میں بٹھا دی گئی ہے اور منزل کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے۔

شمائلہ کو یہ بھی نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی کا رخ کس طرف ہے اور کون سے ریلوے سٹیشن سے گاڑی نکل رہی ہے۔ شمس خاتون کے مرد کے ساتھ سامنے والی سیٹ پر بیٹھا بہت مزے لے لے کر بول رہا تھا اور اس نے بھی کم و بیش ہمسفر مرد کو ساری داستان سنا دی تھی۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا؟''ہمسفر نے شمس کی داستان سننے کے بعد قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھے برے کی کیا تعریف ہے آپ کے پاس۔کیا آپ نے کبھی اپنی بیوی کے دا.....''

''ہش ش......''ہمسفر نے شمس کو بولتے بولتے ٹوکا اور کہنے لگا۔''یہ نہ کہیے۔نہ میں نے یہ کہا ہے میں مردوں کا نیک پروین ہوں۔سب کی زندگی میں عورتیں آتی ہیں۔میری زندگی میں بھی آئی ہیں لیکن اچھے برے کی تعریف یہ ہے کہ جو کسی کا گھر اُجاڑتا ہے وہ اچھا نہیں کرتا۔''

''ارے چھوڑو یار! کیا اخلاقی قدروں کا لیکچر لے کر بیٹھ گئے۔اس کا شوہر بھی پلمبر رہا ہے، لمبے لمبے اخلاقی لیکچر دیتا تھا لیکن بیوی کو سنبھال نہیں سکا۔اس کے شوہر کو دیکھو گے تو......''

''میں جانتا ہوں......''ہمسفر شمس کی بات کاٹ کر اچانک بولا۔

''کیا......؟''شمس چونکا۔

''میں جانتا ہوں آپ نے جب زاہد علی صاحب کا حوالہ دیا تو میں پہچان گیا۔بہت پڑھا لکھا اور شریف آدمی ہے۔''

''لیکن بے وقوف ہے اگر بے وقوف نہ ہوتا تو اس طرح اپنا اور بیوی بچوں کا تماشا نہ بناتا۔معاملے پر مٹی ڈال دیتا۔یا مجھے مروا دیتا......مگر......''

''شریف آدمی تھا نا۔''ہمسفر نے پھر لقمہ دیا اور اتنے میں اچانک گاڑی میں بریکیں لگنی شروع ہوئیں، دونوں باتیں کرتے کرتے چپ ہوئے۔گاڑی چند لمحوں بعد کسی سٹیشن کے اندر داخل ہو کر رک گئی۔

''آجاؤ باقی باتیں پھر ہوں گی۔نیچے چائے پی لیتے ہیں۔''شمس نے ہمسفر سے کہا اور دونوں نیچے اتر گئے۔''

شمائلہ بہت تھکن محسوس کر رہی تھی اس کی آنکھیں بوجھل ہو کر ڈوب رہی تھی، وہ سو جانا چاہتی تھی لیکن گاڑی کے رکنے کی وجہ سے وہ بھی چوکس ہو کر بیٹھی اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگی۔

''درد ہو رہا ہے۔''خاتون نے از راہِ ہمدردی پوچھا۔

''بہت سخت۔''شمائلہ نے کہا۔''میرے پاس سر درد کی گولی ہے، میں دیتی ہوں۔''

خاتون نے کہا اور پھر اپنے پرس سے ایک پتا نکال کر ایک ٹیبلٹ نکالی۔ تھرماس سے پا نکال کر بھرا اور شمائلہ کو پیش کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ کھالو۔ ابھی میرے شوہر آجائیں اندر ان ۔ ہوں کی چائے کا کپ اسٹیشن سے لا دیں۔ تھرماس میں ختم ہوگئی ہے۔''

''آپ کی بہت بہت مہربانی۔ کتنا خیال رکھتی ہیں آپ میرا۔'' شمائلہ نے از ر تشکر کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ کیا خیال رکھا ہے میں نے؟ سر درد کی ایک گولی ہی دی ہے۔'' خاتون کسرِ نفسی سے بولی۔

''یہ بہت بڑی بات ہے بہن! کچھ لوگ درد دیتے ہیں، کچھ لوگ درد کا علا کرتے ہیں۔ کتنا فرق ہے دونوں میں۔'' شمائلہ دکھ بھرے لہجے میں لیکن فلسفیانہ انداز می بولی۔

''آپ فکر نہ کریں آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے اور پھر برا وقت کسی پر بھی آ س ہے اور پھر برا وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔ اچھا نہیں رہتا تو برا بھی نہیں رہے گا۔'' خاتون ۔ شمائلہ کو ڈھارس دی۔

اتنے میں گاڑی کو ایک دو جھٹکے لگے اور پھر گاڑی حرکت میں آ کر ریلوے اسٹیش سے باہر نکلنے لگی۔ باہر پلیٹ فارم پر گھپ اندھیرا تھا اور اکا دکا لوگوں کے سایے دکھا دے رہے تھے۔ کسی سٹال پر مدھم سی روشنیاں بھی تھیں لیکن اسٹیشن کی نشاندہی نہیں ہو ر تھی کہ کون سا اسٹیشن ہے۔

گاڑی نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑ لی تو خاتون کے شوہر نے گاڑی کے ساتھ سا دوڑتے ہوئے دروازے کی راڈ پکڑی اور ڈبے میں سوار ہوگیا۔

''کہاں رہ گئے تھے، آپ اس بے چاری کے لئے چائے منگوائی تھی۔'' خاتو نے شوہر سے شکایت کے لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں بہن! چائے کی طلب بھی نہیں ہے۔'' شمائلہ نے کہا اور پھر ایک بات شمائلہ اور خاتون نے ایک ساتھ محسوس کی لیکن ان کے بولنے سے پہلے خاتون ۔ شوہر نے ازراہ افسوس شمائلہ سے کہا۔

''بہن ایک بری خبر ہے۔'' اور جواب میں شمائلہ چونک گئی اور ٹکر ٹکر ہمسفر کے منہ طرف دیکھنے لگی لیکن چپ رہی۔ بولی کچھ نہیں جبکہ خاتون نے تجسس سے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''آپ نے دیکھا نہیں ہم دو اترے تھے نیچے اور یہ ایک واپس آیا ہے۔'' ہمسفر نے پہیلی بجھانے کے انداز میں کہا۔

شمائلہ پھر بھی محو حیرت اور چپ رہی اور خاتون نے شوہر سے کہا۔

''کیا پہیلیاں بجھاتے ہیں، بتاتے کیوں نہیں کیا ہوا؟''

''یہ صاحب جن کا نام شمس تھا، یہ واپس گاڑی میں نہیں چڑھے وہ اسٹیشن سے باہر نکل گئے۔'' ہمسفر نے جیسے ایک دھماکہ خیز خبر سنائی اور شمائلہ دم بخود رہ گئی۔

ریل نے سیٹی بجائی جو باہر کم اور شمائلہ کے کانوں میں زیادہ بجنے لگی۔

❁

اس دن زاہد ایک طویل غیر حاضری کے بعد اس ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا جہاں وہ اچھے دنوں کے دوران اکثر شام کو تھکا ہارا بیٹھتا اور چائے کافی کا ایک کپ پی کر تازہ دم ہو جاتا تھا اور اس ریسٹورنٹ میں پابندی کے ساتھ آنے کی بدولت ریسٹورنٹ میں آنے والے دوسرے ریگولر وزیٹرز کے ساتھ بھی اس کی ہیلو ہائے ہوگئی تھی لیکن اس نے یہاں بیٹھنے والوں کے ساتھ بھی کوئی گروپ نہیں بنایا تھا۔ بس اکیلا کسی جگہ بیٹھ جاتا اور چائے کی ایک پیالی پی کر تھکن دور کرتا۔

کبھی کبھار یہ چائے کا اچھا کپ اچھے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے پینا بھی اسے عیاشی معلوم ہوتا کیونکہ یہ خرچ وہ شمائلہ اور اپنے بچوں کے بغیر خالص اپنی ذات کے اوپر کرتا تھا۔ تاہم یہ کپ وہ چائے نہیں بلکہ دوا سمجھ کے پیتا تھا کیونکہ ایک پیالی سے اس کی ساری تکان دور ہو جاتی تھی اور آج بہت دنوں کے بعد اس طرف آیا تھا۔ کیونکہ آج اس کی ذہنی اور قلبی کیفیت اس کی اعصابی گرفت سے باہر ہو رہی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق آج بھی دن گزارا تھا۔ صبح بچوں کو اٹھانا، ان کا ناشتہ تیار کرنا، اسکول کی وین تک پہنچانا۔

پھر دن کے کھانے کا بندوبست کر کے بچوں کی آمد کا انتظار کرنا۔ کیونکہ شمائلہ کے جانے کے بعد اس نے اپنے کالج اور کوچنگ سینٹر سے طویل رخصت لے رکھی تھی اور اب ہمہ وقت بچوں ہی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ آج بھی بچے جب واپس آئے تو اس نے ان کا لباس بدلنے میں مدد کی۔ کھانا کھلایا لیکن خود اس نے کچھ نہیں کھایا کیونکہ اس کے دل پر آج بہت بوجھ محسوس ہو رہا تھا لیکن اس نے بچوں سے اس کا اظہار نہیں کیا۔

شام کو گھبراہٹ بڑھی تو اپنی بائیک پر جانے کی بجائے رکشا سے ریسٹورنٹ کی طرف چلا آیا کہ چائے کی ایک پیالی پینے اور ماحول بدلنے سے شاید اس کی طبیعت سنبھل

جائے لیکن طبیعت بگڑتی چلی گئی۔
ریسٹورنٹ میں چونکہ وہ کافی دنوں کے بعد آیا تھا اس لئے یہاں باقاعدگی سے آنے والے کچھ لوگوں نے محسوس کیا کہ زاہد آج کچھ مختلف دکھائی دے رہا ہے۔
کچھ لوگوں نے آپس میں رائے زنی بھی کی لیکن زاہد کے ساتھ کسی کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی اس کی طبیعت اچانک بہت زیادہ بگڑ گئی تو اس نے بل کی رقم میز پر رکھی اور چائے کا کپ ادھورا چھوڑ کے ریسٹورنٹ سے باہر نکلا۔ ٹیکسی روکی اور بڑی مشکل سے ڈگمگاتا لڑکھڑاتا ہوا ٹیکسی تک پہنچا۔
''خیریت ہے صاحب!'' ٹیکسی والے نے زاہد کی کیفیت دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔
''میرے بھائی مجھے کسی طرح گھر پہنچا دو۔'' زاہد سینے پر ہاتھ رکھ کے کراہتے ہوئے بولا۔
''حوصلہ رکھیں۔'' ٹیکسی والے نے جلدی سے نیچے اتر کر زاہد کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور سہارا دے کر گاڑی میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔
''صاحب ہسپتال لے چلوں۔''
''نہیں ...... گھر۔'' زاہد بمشکل بولا۔ وہ بچوں کو دیکھے بغیر ہسپتال نہیں جانا چاہتا تھا۔
بہت ہی خستہ اور شکستہ حالت میں وہ گھر پہنچا۔ بچوں کو گلے لگایا۔ سینے میں درد شدت اختیار کر گیا تو اس کی پیشانی پسینے سے شرابور ہوگئی۔
''ابو ابو......'' دونوں بچے تڑپ کر باپ سے لپٹ گئے۔
''صبر میرے بچو صبر......'' اس نے اکھڑتی ہوئی سانس سے کہا اور بہت مشکل سے ٹیلیفون تک پہنچ کے اپنے بھائی عابد علی کو فون کیا۔
''ہیلو ...... بھائی جان ...... جلدی پہنچیں۔'' وہ ٹوٹتی ہوئی سانس میں بولا اور فون رکھ دیا۔
عابد علی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی نکالی اور ہوا کی طرح زاہد کے گھر کی طرف بھگانے لگا۔

......□......

''بھائی جان اگر میرا آخری وقت آ گیا ہے تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔'' زاہد نے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا تو تڑپ کر اپنے بازو کسی ننھے بچے کی طرح بھائی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بھائی نے لپک کر زاہد کو سینے سے لگا لیا۔

عابد علی کو جب زاہد کا ٹیلیفون ملا تھا تو اس نے فون پر زاہد کی آواز سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہت زیادہ تکلیف میں ہے لہٰذا عابد بغیر کوئی وقت ضائع کئے سرعت کے ساتھ گاڑی لے کر نکلے اور گھر پہنچ کر گاڑی زاہد کے مکان کے گیٹ پر چھوڑ لپک کر اندر پہنچے اس وقت زاہد بہت تکلیف میں تھا اور مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

''کام ڈاؤن، کام ڈاؤن۔'' وہ زاہد کو دیکھ کر دور سے ہی پکارے اور زاہد کسی معصوم بچے کی طرح ہاتھ بڑھا کر بولا۔

''بھائی جان اگر میرا آخری وقت آ گیا ہے تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔''

عابد علی نے وفور جذبات سے بے قابو ہو کر زاہد کو سینے سے لگا لیا اور آبدیدہ ہو کر بولے۔ ''اونو، نو، ناٹ ایٹ آل تمہارا آخری وقت ابھی کیسے آ سکتا ہے تم تو مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ تم سے پہلے تو میرا آخری وقت آئے گا۔''

''خدا آپ کو سلامت رکھے۔'' زاہد، بھائی سے لپٹ کر رو پڑا۔ ''اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا، آپ کے بچوں کا کون ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوگا تم بھی سلامت رہو گے اور بچے بھی۔'' عابد نے زاہد کو ڈھارس دی۔ معاً باہر ایمبولینس کے سائرن کی آواز آئی تو زاہد چونکا اپنے درد پر قابو پانے کی کوشش کی اور کان سائرن کی آواز کی طرف لگا کر ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ ایمبولینس؟''

''میں نے بلوائی ہے ایمبولینس۔'' عابد نے وضاحت کی۔ ''میں نے گھر سے نکلتے وقت ایمبولینس کے لئے فون کر دیا تھا۔ اٹھو تیار ہو جاؤ۔''

''نہیں بھائی جان! رہنے دیں، نہیں جاؤں گا۔ ہوسپٹل اب جو کچھ ہونا ہے گھر پر

ہی ہو لینے دیں۔''

''کچھ بھی نہیں ہونا ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ٹریٹمنٹ ضروری ہے دیر نہ کرو۔' عابد نے زاہد کو سہارا دیا اور کسی حد تک زبردستی اسے بیڈ سے اٹھا دیا۔

''بھائی جان بچوں کا کیا ہو گا۔'' زاہد نے پاس کھڑے سہمے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تمہاری بھابھی پیچھے پیچھے آ رہی ہیں، بچوں کو ساتھ لے جائیں گی۔'' عابد نے ڈھارس دی اور پھر وقت ضائع کئے بغیر انہوں نے زاہد کو ایمبولینس میں لٹایا اور ایمبولینس ٹریفک سے بچتی بچاتی، ضرورتاً سگنل توڑتی اور سائرن بجاتی ہوئی ہسپتال کی جانب روانہ ہو گئی۔

ریل کا ڈبہ لاہور کے قریب پہنچنے تک تقریباً خالی ہو چکا تھا۔صرف شمائلہ اور اس کے ہمسفر میاں بیوی بوگی میں رہ گئے تھے یا پھر اِکا دُکا لوگ دور دور بیٹھے اپنی نشستوں پر چوکس ہو گئے تھے کیونکہ نصف گھنٹے بعد لاہور سٹیشن آنے والا تھا اور شمائلہ کے ہمسفر میاں بیوی جنہیں لاہور اترنا تھا اپنا سامان سمیٹنے اور باندھنے میں مصروف تھے جبکہ شمائلہ کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔وہ شمس کے راستے میں کسی سٹیشن پر اتر کر فرار ہو جانے سے بہت مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ وہ زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسے شخص کے ہمراہ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی جس کی وجہ سے اس کی زندگی تباہ ہو گئی تھی۔اب جبکہ اس کے ہم سفر اگلے سٹیشن پر اسے تنہا چھوڑ کے اترنے والے تھے تو شمائلہ پر ایک خوف طاری ہو گیا تھا کیونکہ اس کے پاس ٹکٹ تو پشاور تک کا تھا لیکن منزل کوئی نہیں تھی، نہ پشاور، نہ پشاور سے آگے نہ پہلے۔

''تم نے کیا سوچا ہے کہاں جاؤ گی؟'' جب گاڑی لاہور کی حدود میں داخل ہوئی اور بیوی نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر تمام سامان بحفاظت پیک کر لیا تو شمائلہ سے ازراہِ ہمدردی پوچھا۔

شمائلہ کی ہمسفر خاتون کا نام زارا تھا اور میاں فریدالدین تھے۔فرید کا لاہور میں شپنگ اور لوڈنگ اَن لوڈنگ کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔لاہور میں زیادہ تر کام ڈرائی پورٹ پر تھا لیکن کبھی کبھی جب شپمنٹ آ جاتی تو پھر کراچی بھی تواتر کے ساتھ اس کا آنا جانا رہتا۔ اب بھی وہ ایک کام کے سلسلے میں کراچی گیا تھا جہاں تقریباً اس کے بیس دن لگ گئے تھے۔

اس کی بیوی بھی کبھی کبھی ساتھ کراچی چلی جایا کرتی تھی بلکہ فرید بہت اصرار کر کے بیوی کو ساتھ لے جاتا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور فرید ٹوٹ کے چاہنے والا ایک شوہر تھا۔ اولاد کوئی نہیں تھی اور زارا اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتی تھی لیکن فرید نے کبھی اولاد کی خواہش محسوس نہیں کی تھی اور اگر دل کے نہاں خانے میں کہیں کوئی ایسی چنگاری تھی بھی تو وہ منوں مٹی کے نیچے دب گئی تھی۔

فرید اپنی آرزو کا ایک لفظ بھی لب پر نہیں لایا تھا اور کبھی ایک لمحے کے لئے زارا کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اولاد کا خواہشمند ہے۔ رہ گئے خدشات تو وہ ہر اس عورت کے من میں پرورش پاتے ہیں جس کی گود ہری نہ ہو رہی ہو تاہم فرید دل کا صاف اور چاہنے والا شوہر تھا جس کے تصور میں بھی کسی دوسری عورت کی کوئی جھلک نہیں تھی اور اب جو شمائلہ نے ان کے ہمراہ سفر کیا تو دونوں میاں بیوی کو شمائلہ کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا تھا اور جب لاہور سٹیشن قریب آنے لگا تو شمائلہ کو دھڑکا لگا اور گاڑی کی رفتار کے ساتھ جہاں گرد اڑ رہی تھی وہاں شمائلہ کے چہرے کا رنگ بھی فق ہوتا گیا اور زارا از راہِ ہمدردی شمائلہ سے پوچھنے لگی۔ ''تم نے کیا سوچا ہے، کہاں جاؤ گی؟''

''میں......'' شمائلہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میری کوئی منزل نہیں ہے۔'' جہاں گاڑی آگے نہیں جائے گی، وہاں میں اُتر جاؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھ سے بے اختیار آنسو برسنے لگے پھر وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اور کچھ نہ ہوا تو گاڑی کے آگے پٹڑی پر ہی لیٹ جاؤں گی۔''

''نہیں......'' فریدالدین بے ساختہ بول اٹھا۔ ''ایسا نہ کہیں آپ لاہور اتریں اور کل کے ہمارے ساتھ رہیں۔'' وہ کہہ تو بیٹھے لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اس کی طرف مشکوک اور مخدوش نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اسے سفر کے دوران ہی کھٹکا سا لگا تھا کہ فرید شمائلہ کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے اور شمائلہ کے معاملات سے زیادہ اسے یہ دلچسپی خود شمائلہ کے وجود میں لگ رہی تھی۔ زارا نے پہلی بار ایک عورت کی نگاہ سے بڑے بھرپور انداز میں شمائلہ کو دیکھا تو اسے وہ ایک بہت حسین عورت لگی اور پھر اس نے اپنی نگاہ کا زاویہ بدل کر ایک گھمبیر نگاہ شمائلہ کے حسین چہرے سے ہٹا کر اس کے جسم پر ڈالی تو اس کا وجود بہت پر کشش نظر آیا اور اس نے محسوس کیا کہ یہ وہ پُرکشش سراپا ہے جس نے شمس کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوگا اور اب اس کے میاں نے اس سے رائے لئے بغیر شمائلہ کو اپنے گھر میں رہنے کی اچانک پیشکش کی تو زارا کو ایک دھچکا لگا کہ یہ پیشکش

غیر متوقع غیر عملی اور غیر فطری بھی تھی لہٰذا زارا نے ایک بھرپور اور کسی حد تک اجنبی نگاہ سے اپنے میاں کو دیکھا اور شمائلہ نے بھی زارا کے چہرے کے تاثرات سے اس کے من کے خدشے اور تشویش کو محسوس کیا۔ خود شمائلہ بھی اس طرح کی پیشکش قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وقت کا پہیہ پھر پیچھے کی طرف مڑ گیا ہو اور پھر وہی صورت حال پیدا ہونے لگی ہو جب شمس زاہد کے ساتھ اس کے گھر میں رہنے آیا تھا اور اس وقت سب کچھ کتنا پُر خلوص طریقے سے ہوا تھا اور شمائلہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ شمس کا اس کے گھر میں قدم رکھنا اس کو کتنا مہنگا پڑے گا۔ اس وقت ایک مرد ایک غیر گھر میں آیا تھا، اب ایک عورت ایک غیر گھر میں جائے گی تو پھر کوئی چنگاری شعلہ نہ بن جائے۔

''نہیں بھائی جان نہیں ...... میں آپ کے گھر نہیں جاؤں گی۔'' شمائلہ نے پُر یقین انداز میں کہا تو شمائلہ کی اس بات سے زارا کی تشویش کم ہوگئی۔ اسے شمائلہ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جائے گی۔ زارا کچھ نہ بولی لیکن فرید بول پڑا۔ ''دیکھو بہن......!'' وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ شمائلہ سے مخاطب ہوا۔ ''میں رشتے جوڑنے کا قائل نہیں ہوں کیونکہ رشتہ جوڑنا آسان لیکن نبھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں رشتے اس لئے کم جوڑتا ہوں کہ نبھاتا ہوں لیکن تم نے جب مجھے بھائی کہہ کر پکارا ہے تو قبر میں جانے تک تم اب میری بہن ہی رہو گی۔ لہٰذا میں اپنی ایک خوبصورت، جوان بہن کو بے سہارا انسانوں کے ایسے جنگل میں نہیں چھوڑ سکتا جہاں چاروں طرف بھوکے بھیڑیے منہ کھولے کھڑے ہوں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گی۔'' وہ بہت جذباتی انداز میں ایک ہی سانس میں کہہ گیا اور پھر اپنی بات کی تائید کے لئے بیوی کی طرف مڑ کر پوچھا۔ ''کیوں زارا ٹھیک ہے ناں؟''

زارا کا دل جیسے ایک دم شیشے کی طرح صاف ہوگیا۔ اس نے غور سے اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے ہمیشہ کی طرح اپنے شوہر کا چہرہ بہت معصوم لگا جس میں کسی قسم کے مکر و فریب، جھوٹ، بدنیتی یا ریاکاری کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اسے خود سے ندامت ہوئی کہ اس نے پیار کرنے والے اور فرشتہ صفت شوہر کی نیت پر شبہ کیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' زارا نے بلاتامل فرید کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن......''

ہاں کرنے کے بعد پھر زارا کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہونے لگا تو فرید نے فوراً زارا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''زارا جی! اگر بھروسہ ہے مجھ پر اس لڑکی پر اور اپنے آپ پر تو اتار لو اسے سٹیشن پر

ار گھر لے چلو اور لیکن ...... اگر، مگر، چونکہ، چنانچہ کے چکر میں نہ پڑو اور اگر بھروسہ نہیں ہے تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، اسے جانے دو۔ آگے جہاں اسے اس کی قسمت لے جائے۔''

''بھائی جان میں کچھ کہوں؟'' اس سے پیشتر کہ زارا کچھ کہتی شمائلہ نے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور سنجیدگی سے کہا۔

''بولو کیا بات ہے؟'' فرید نے تجسس سے پوچھا۔

''میں نہیں اتروں گی یہاں مجھے آگے جانے دیں۔'' شمائلہ نے یقین سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

آگے کہاں جاؤ گی؟'' فرید نے پوچھا۔

''جہاں قسمت لے جائے۔'' وہ ترت بولی اور پھر زارا کا ہاتھ فرطِ محبت سے دباتے ہوئے رقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی بہن اور بھائی پر بوجھ نہیں بنوں گی۔''

''جب بہن بھی کہتی ہو اور بھائی بھی تو پھر بوجھ کیسا؟'' زارا پسیج گئی اور بے اختیار شمائلہ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بہت اپنائیت سے بولی۔ ''اٹھو اپنا سامان سمیٹو، تم ہمارے ساتھ رہو گی۔''

پھر زارا نے شمائلہ کا مختصر سا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے میں اس کی مدد کی۔ اتنے میں لاہور سٹیشن آ گیا اور تینوں اتر کر مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔

''ایک ضعیف بیمار خاتون جو بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہے، کی دیکھ بھال کے لئے ایک خاتون نرس کی ضرورت ہے۔ ایسی نرس کی جو بیمار کو دوا دارو دے سکے۔ کھانا کھلا سکے اور دیگر دوسری خدمات بخوبی انجام دے سکے۔ ڈیوٹی کے اوقات بارہ گھنٹے ہیں۔ ڈیوٹی کے دوران نرس کو کھانے پینے کی سہولت کے علاوہ گھر سے گھر تک پک اپ اور ڈراپ ہو گا۔ معاوضہ بہت معقول ملے گا جس کا تعین کام دیکھنے کے بعد کیا جائے گا۔ آج ہی نیچے دیئے ہوئے نمبر پر رابطہ کریں۔''

اخبار میں چھپا ہوا یہ ایک اشتہار تھا جسے شمائلہ بہت دیر سے، بہت غور اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھ رہی تھی۔

شمائلہ کئی دنوں سے جاب کرنے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن اس نے جب بھی یہ ارادہ ظاہر کیا تو فرید نے ہمیشہ مخالفت کی اور فرید سے زیادہ فرید کی بیوی زارا نے اختلاف کیا۔

دونوں میاں بیوی اسے اپنی سگی بہن کی طرح چاہنے لگے تھے، فرید نے صرف زبان سے ہی نہیں کہا تھا بلکہ ثابت کر کے بھی دکھایا کہ وہ اس کا بھائی ہے۔

شمائلہ گھر کے اندر ایک خوشبو کی طرح رچ بس گئی تھی۔ اس نے اپنے اخلاق، اپنی محبت اور رویّے سے دونوں میاں بیوی کو جیسے خرید لیا تھا۔ جب اس کے حالات بگڑے نہیں تھے تو اپنے بچوں کو اسکول اور شوہر کو کالج کے لئے تیار کرانے کے لئے صبح سویرے فجر سے پہلے اٹھ جاتی تھی، نہا دھو کے نماز پڑھتی پھر بچوں کا اور زاہد کا ناشتہ تیار کرنا، انہیں خوشی خوشی فارغ کر کے پھر وہ خود ناشتہ کرتی اور دوپہر سے پہلے پہلے گھر کے تمام کام ختم کر کے کھانا بھی پکا لیتی تھی۔ اس نے اپنی اس عادت کو یہاں بھی معمول بنا لیا۔ وہ زارا اور فرید کے بیدار ہونے سے پہلے نماز پڑھ لیتی۔ فرید کے کپڑے اگر استری کرنے والے ہوتے تو انہیں استری کر دیتی اور پھر پانی گرم کر دیتی کہ اگر کسی نے نہانا ہو تو نہا لے۔ دونوں میاں بیوی جب تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آتے تو ناشتہ پہلے سے لگا ہوتا اور پھر ایک دن جذبات سے مغلوب ہو کر فرید نے کہا تھا۔ ''شمائلہ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے ایسی محبت والی بہن مل جائے گی۔'' تو جواب میں شمائلہ ترت بولی تھی۔ ''بھائی جان! میں نے کب سوچا تھا کہ میرا گمشدہ بھائی یوں اچانک مجھے مل جائے گا کہ میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔''

پھر زارا کیسے چپ رہ سکتی تھی اس نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ''بھئی تم دونوں تو مکالمے بازی کر رہے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے میری کھوئی ہوئی بہن ہی نہیں بلکہ ایک سہیلی بھی مل گئی ہے۔

''لیکن تم تو اس سے ماسیوں والا کام لیتی ہو، صبح سے شام تک مشین کی طرح لگی کام کرتی رہتی ہے اور تھکتی نہیں۔''

''میں کب کہتی ہوں اسے کام کرنے کے لئے، خود ہی تو مشین کی طرح شروع ہو جاتی ہے۔'' زارا نے جواب دیا۔ فرید کچھ کہنے لگا تو شمائلہ فرید اور زارا دونوں کی بات کاٹتے ہوئے بولی تھی۔ ''نہیں بھائی جان اور زارا تم بھی سن لو، میرے کام کا ذکر مت کرو، میں خود کو ماسی سمجھ کے نہیں اس گھر کی بہن سمجھ کے کام کرتی ہوں اور مجھے ویسے بھی فارغ بیٹھنے کی عادت نہیں ہے، یہ میرا ماضی ہے جو میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مجھے میرے بچے اور میرا شوہر اور زیادہ یاد آئیں گے اگر میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہوں گی۔ اس طرح میں بھولی رہتی ہوں۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی گھر میں ہوں۔''

''تم اپنے ہی گھر میں ہو۔'' فرید نے بے ساختہ شمائلہ کی بات کی درستگی کی۔
''اس میں کیا شک ہے۔'' شمائلہ نے سر جھکا لیا تھا۔
اور واقعی اس بات میں شک بھی نہیں تھا شمائلہ واقعی اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنے کی عادت ڈال رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ وہ کام کر کے اس گھر کی روٹی کھائے اور جب سے وہ یہاں آئی تھی اس نے اس گھر کو شیشے کی طرح چمکا کے رکھ دیا تھا اور زارا کی کسی ملازمہ کی طرح خدمت کرتی تھی اور زارا کو بہت آرام مل گیا تھا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ گھر کے سارے کام کاج کیسے ہو جاتے ہیں۔ وہ زارا کی بہن اور سہیلی کے علاوہ ہمراز بھی بن گئی تھی۔ اس نے شمائلہ کو کئی باتیں ایسی بتائی تھیں جو کوئی عورت بہت مشکل سے کسی کو بتاتی ہے۔

ہر چند کہ فرید زارا سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن بے اولاد ہونے کے سبب زارا کو ہمیشہ ایک خدشہ رہتا تھا کہ فرید کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لے جو زارا کے مفاد کے خلاف ہو لیکن شمائلہ نے فرید کا گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد زارا کو یہ تسلی کروا دی تھی کہ فرید ان مردوں میں سے نہیں ہے جو اولاد کو بہانہ بنا کر دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ پھر بھی شمائلہ نے اپنے تجربے کی بنیاد پر زارا کو کئی ایسے نسخے اور گر بتائے تھے جو ایک بانجھ عورت کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں اور اس طرح اس کے آنگن میں بہار کے پھول کھل سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اخبارات کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کے بعد زارا کو ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے پاس لے کر گئی تھی اور اس نے ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر کو تلاش کیا تھا کہ جس نے گارنٹی دی تھی کہ زارا اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو جائے گی اور زارا یہ سب باتیں اپنے شوہر فرید کو بتاتی رہتی تھی اور فرید بہت خوش تھا کہ شمائلہ کا قدم ان کے گھر کے اندر بہت بابرکت ثابت ہو رہا ہے لیکن زارا اور فرید کی تمام محبت کے باوجود شمائلہ پر کبھی کبھار کسی وقت اچانک ایک دورہ سا پڑ جاتا اسے اپنے بچے بے پناہ یاد آتے۔ زاہد کی یاد کا تیر سینے میں کھب کے رہ جاتا اور شمس کی یاد جیسے تیزاب میں رچی ہوئی ہوا کی طرح اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ بے تحاشا سڑکوں پر دوڑتی ہوئی جائے اور دریا میں چھلانگ لگا کر اس جھلسے ہوئے بدن کو سرد کر دے۔

لیکن پھر وہ اندر ہی اندر اپنی قوت مدافعت کو یکجا کرتی، اپنے جذبات کو قابو میں لاتی، اپنے اعصاب کو بروئے کار لاتی اور اپنے ارادوں کو سمیٹ کر زندگی کی جہت قائم کر لیتی اور تہیہ کر لیتی کہ مجھے جینا ہے اپنے بچوں کے لئے جو اس سے کھو گئے ہیں اور اپنے

شوہر کے لئے جو اس کا نہیں ہے لیکن اسے دوبارہ پانا ہے۔

شمائلہ یہ بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ زارا اور فرید کی اس کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے باوجود اس کا وجود اس گھر میں زائد اور بے معنی ہے اور چاہے وہ گھر میں کتنی ہی مصروف رہے اور دو ماسیوں سے زیادہ کام کیوں نہ کر کے دے اور زارا اور فرید چاہے کچھ نہ کہیں لیکن پھر بھی اس کی وجہ سے ایک فرد کا زائد راشن گھر میں آتا ہے۔ وہ صبح کا ناشتہ کرتی ہے۔ دوپہر اور شام کا کھانا اس کا بندھا ہوا ہے۔ چائے کا موڈ بنتا ہے تو چائے بھی بنا کے پی لیتی ہے۔ زارا گاہے بہ گاہے جب شاپنگ کے لئے جاتی ہے اور اپنے لئے کچھ خریدتی ہے تو شمائلہ کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور لے آتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو کافی اس گھر میں زیر بار سمجھنے لگی تھی اسی لئے اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ کہیں کسی دفتر میں جاب کر لے گی لیکن اس نے جب بھی ارادہ ظاہر کیا تو زارا اور فرید دونوں نے دبے لہجے میں مخالفت کی۔ فرید دراصل چاہتا نہیں تھا کہ شمائلہ دفتروں میں مردوں کے درمیان کام کرے اور پھر کوئی اور سکینڈل بن جائے۔ ویسے بھی شمائلہ کے کام نہ کرنے کی وجہ سے دونوں میاں بیوی کو فائدہ ہی تھا کہ گھر کے کام کاج، صفائی، کھانے پکانے کا سارا بوجھ شمائلہ نے اٹھا لیا تھا جس کی بدولت زارا کو بہت آرام میسر آ گیا تھا اور اس کا دل بھی بہلا رہتا تھا لیکن شمائلہ اپنے اس طرز زندگی سے اچانک اکتا گئی تھی اور تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی تبدیلی جس سے اس کا یہ احساس جاتا رہے کہ وہ گھر میں مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہے۔ لہٰذا اخبار میں جب اس نے بیمار خاتون کے لئے کسی تیماردار کا اشتہار پڑھا تو وہ اور بھی مچل گئی۔

”بھائی جان میں یہ جاب کرنا چاہتی ہوں۔“

اس نے اشتہار کو بہت غور سے پڑھنے کے بعد فرید کو اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔

”کیوں......؟“ فرید نے حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ”کیا تمہیں کوئی پریشانی ہے، کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟“

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آپ تو ایک زبردست انسان ہیں بھائی جان!“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”میرا کوئی بھائی نہیں ہے اس لئے میں بھائی کی کمی محسوس کرتی تھی لیکن مجھے یقین ہے اگر میرا بھائی ہوتا تو اس سے زیادہ اچھا نہیں ہوسکتا تھا جتنے آپ ہیں۔“ وہ جذباتی ہوگئی اور مزید بولی۔ ”آپ کے ملنے کے بعد تو میرا دنیا کے بارے میں نظریہ ہی بدل گیا اور میں قائل ہوگئی کہ دنیا نیکی اور بدی سے مل کر بنی ہے اس دنیا میں جہاں شمس جیسے بد اور بدکردار لوگ ہیں وہاں قدرت نے توازن قائم رکھنے کے لئے آپ جیسے نیک

اور نیک کردار لوگ بھی پیدا کیے ہیں۔"

"اتنی زیادہ میری تعریف نہ کرو، میری بہن! میں ایک بہت ہی حقیر اور گناہگار سا بندہ ہوں۔ معلوم نہیں کیوں تمہارے لئے میرے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا ہو گیا جس کو میں بھائی کے پیار کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتا۔ میں اس جذبے کی زیادہ وضاحت نہیں کرنا چاہتا لیکن صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اچانک نوکری کرنے کا خیال اتنی شدت سے کیوں آ گیا، کیا زارا نے کچھ......"

فرید بولے چلا جا رہا تھا کہ شمائلہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر فرید کو روکتے ہوئے کہا۔ "نہیں بھائی جان! نہیں۔" وہ ایک دم زارا کے قریب ہو کر اس کے کندھے سے کندھا لگا کر بولی۔ "زارا تو میری جان ہے اگر یہ مجھ سے جان بھی مانگے تو میں انکار نہیں کروں گی۔ تم دونوں ایک مثالی جوڑا ہو ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے آپ دونوں کو صرف اس لئے بنایا تھا کہ مجھے تحفظ دے سکو۔"

"تو پھر کیوں تم نوکری کے لئے اتنی بے قرار ہو گئی ہو، کس چیز کی تمہیں تکلیف ہے یہاں؟" زارا نے پوچھا۔

"یہی تکلیف ہے میری بہن کہ کوئی تکلیف نہیں......" شمائلہ بولی۔ "جہاں آپ دونوں نے مجھے اتنا پیار دیا ہے وہاں مجھے یہ جاب کرنے کی اجازت بھی دے دیں۔ میرے اطمینان کے لئے۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولی۔

"اسے مت روکو فرید! کرنے دو یہ جاب۔" زارا نے رضامندی ظاہر کی۔

"ٹھیک ہے جا کے دیکھ لو، کون لوگ ہیں، کیا ہیں؟ تمہیں جاب ملتی بھی ہے کہ نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" فرید بھی رضامند ہو گیا۔

اور شمائلہ نے اُسی وقت ٹیلیفون کیا، اپائنٹمنٹ لیا اور شام کو ملاقات کے لئے چلی گئی۔

گلبرگ کے علاقے میں ایک بہت شاندار کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے گیٹ سے اندر جاتے ہی ڈرائیو وے اور گیراج بنا ہوا تھا جس میں آگے پیچھے دو گاڑیاں تھیں۔ ڈرائیو وے کی بائیں جانب ایک خوبصورت گارڈن تھا جس میں رنگ برنگے پھولوں اور پودوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے لیکن پستہ قد پھلدار درخت مہک رہے تھے۔ گارڈن ہی سے ایک گلی پیچھے کی طرف عقبی گارڈن میں چلی جاتی تھی جس میں عدم توجہی کا شکار کیاریوں اور چند گملوں

کے علاوہ رسیاں تاریں اور الگنیاں لگی ہوئی تھیں جہاں کپڑے وغیرہ سکھائے جاتے تھے اور یہ لان بالکل اندر تھا اور صرف گھریلو استعمال میں آتا تھا۔ گھر کے اندر کمروں کی بناوٹ اور ساخت بھی مکان کی بیرونی وضع قطع کی طرح جدید ڈیزائن کا نمونہ تھی۔ برآمد موتیے اور رات کی رانی کی بیلوں سے مہکتا ہوا تھا۔ اندر جانے کے لئے مغلیہ انداز کے محراب دار دروازے سے گزر کر پھر بیضوی راہداری سے گزرنا پڑتا۔ پہلا کمرہ ڈرائنگ روم تھا لیکن ڈرائنگ روم کے بازو سے پھر ایک چھوٹی راہداری اندر کے بیڈ رومز کی طرف جاتی تھی۔ پورا گھر صاف ستھرے لیکن بہت کم اور سلیقے کے فرنیچر سے مزین تھا اور کم فرنیچر ہونے کی وجہ سے کمرے بہت کشادہ اور روشن معلوم ہو رہے تھے۔

اندر والے برآمدے سے ایک خوبصورت گھومتا ہوا گول زینہ ٹاؤن ہاؤس یا صاحب کے اسٹڈی روم کی طرف جاتا تھا۔ گھر میں تین ملازم تھے ایک چوکیدار، ایک ڈرائیور اور ایک کھانا پکانے اور کھانا سرو کرنے والا خانساماں۔ اس کے علاوہ دو جز وقتی ملازم تھے ایک مالی تھا جو گارڈن اور پودوں کی دیکھ بھال کر کے واپس چلا جاتا اور ایک عمر رسیدہ ماسی تھی جو صبح سویرے آکر صفائی ستھرائی کرتی اور برتن وغیرہ دھو کر شام تک واپس چلی جاتی۔ کپڑے لانڈری میں دھلتے تھے اور استری بھی ڈرائیور لانڈری سے کرا کے لاتا تھا۔ گھر کے مکینوں میں صرف تین افراد تھے۔ رجب احمد جو شہر کا قابل عزت اور متمول بزنس مین تھا۔ رجب احمد کی بیوی کلثوم رجب جو بہت بارعب عورت تھی اور شہر کے اندر ایک این جی او چلاتی تھی جس کے سبب ہمہ وقت مصروف رہتی تھی۔

دونوں میاں بیوی درمیانی عمر کے تھے۔ دونوں میں اچھی ہم آہنگی تھی۔ بیوی طبعاً شوہر پر کچھ حاوی تھی تاہم پیار محبت سے رہتے تھے۔ دونوں اپنی اپنی فیلڈ میں اتنے مصروف تھے کہ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود دونوں میں چوبیس گھنٹوں کے اندر بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔

ایک بیٹا تھا جو اس گھر کا مکین نہیں تھا کیونکہ وہ برسوں سے امریکہ کی ریاست ٹیکساس میں سی اے وغیرہ کا کورس کر رہا تھا اور اب شاید اس کا مستقل طور پر واپس آنے کا ارادہ بھی نہیں تھا لہٰذا گھر کا تیسرا فرد رجب احمد کی ماں اور کلثوم رجب کی ساس تھی جو بیمار اور ضعیف تھی۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر مفلوج تو نہیں تھی لیکن کمر اور ٹانگوں میں تکلیف رہتی تھی اور ٹانگوں کو زیادہ تر گرم رکھنا پڑتا تھا۔ وہ بغیر سہارے کے نہ کھا پی سکتی تھی، نہ بغیر سہارے کے دوا لے سکتی تھی۔ رجب احمد نے ماں کی

یکھ بھال کی خاطر چوبیس گھنٹوں کے لئے دو نرسیں رکھ چھوڑی تھیں رات کی نرس چھوڑ کر
سی وجہ سے چلی گئی تھی اور دن کی نرس کو دونوں وقت ماں کو سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ دن کی نرس
لو ایک معمر اور تھوڑی بہت بیمار عورت تھی اور اسے رات کو اپنے بچوں کی دیکھ بھال بھی
رنی ہوتی تھی اور وہ رات کا کام مستقل طور پر نہیں سنبھال سکتی تھی، اس لئے رجب احمد
نے رات کی ڈیوٹی کے لئے نرس کی ضرورت کا اشتہار اخبار میں دے دیا تھا، اچھا ردعمل ہوا
اشتہار کا۔ کئی پیشہ ور اور غیر پیشہ ور نرسیں آئیں لیکن عجیب اتفاق ہوا کہ جس طرح شائلہ یہ
طے کر کے گئی تھی یہاں جاب کرنی ہے اسی طرح مسٹر رجب کی نگاہِ انتخاب شائلہ پر پڑی
اور انہوں نے دو چار باتیں کرنے کے بعد شائلہ کو موزوں سمجھتے ہوئے جیسے کوئی فیصلہ کر
لیا۔

''یہ ہیں ہماری ماں.....'' مسٹر رجب نے شائلہ کو مکان کے آخر میں، الگ تھلگ
بیڈ روم کے اندر لے جاتے ہوئے تعارف کرایا۔ جیسا کہ رجب احمد نے تعارف کرانے
سے پہلے ماں کے بارے میں تفصیل بتا دی تھی وہ ویسی ہی تھی۔ وہ بیڈ پر چت لیٹی ہوئی تھی،
بہت سی ضرورت کی چیزیں اس کے بیڈ پر آس پاس ہی رکھی ہوئی تھیں اور لگتا تھا جیسے خود
کروٹ لینا بھی اس کے لئے محال ہو۔

''السلام علیکم ماں جی!'' رجب کے تعارف کرانے پر شائلہ نے مؤدب طریقے سے
سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، جیتی رہو۔'' ماں نے بہت انکساری سے سلام کا جواب دعا کے
ساتھ دیا اور شائلہ کے سر پہ ہاتھ پھیرنے کے لئے اپنے ہاتھ کو تھوڑا سا اونچا کیا۔ شائلہ جھکی
اور ماں کا سرسری سا جائزہ لیا۔

وہ ایک عمر رسیدہ لیکن گریس فل عورت تھی۔ کھلی ہوئی صاف روشن رنگت چاندی کی
طرح سفید لیکن گھنے بال ...... جو الجھے ہوئے تھے اور بالوں کے الجھے ہوئے گچھے بتا رہے
تھے کہ ماں کو کسی نرس کے ساتھ ساتھ ایک بیٹی کی ضرورت بھی ہے۔ بڑھاپے کے کھنڈرات
بتا رہے تھے کہ جوانی کی عمارت بہت حسین اور پرکشش رہی ہوگی اور چہرے کی پژمردگی
سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاتون کے اندر شکایتوں کا ایک انبار ہوگا اور جذبات کی یہ آگ
ملمت کی راکھ کے نیچے دبی ہوگی۔

''میں نے ماں کے بارے میں ساری کیفیت آپ کو بتا دی ہے کہ کیا کچھ کرنا ہو
۔ اگر یہ سب کچھ آپ کر سکیں تو میری بیوی کے آ جانے پر آپ حامی بھر لیں ورنہ سوچ

لیں۔ خدمت بہت کرنی ہوگی۔'' مسٹر رجب نے کہا۔
''ہونہہ......'' شمائلہ ایک لمحہ خاموش ہوئی، ماں کے التجا کرتے ہوئے چہرے
دیکھا اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں جیسے شمائلہ سے التجا کر رہی ہوں کہ چھوڑ کے نہ
حامی بھر لو۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ دو تین امیدوار نرسیں کام کی نوعیت جان
واپس جا چکی تھیں اور جو نرس کام کر رہی تھی وہ بھی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔
''بولو......'' جیسے ماں کی آنکھوں سے آواز آئی۔
''بولو......'' شمائلہ کے کان میں آواز گونجی لیکن یہ آواز ماں کی آنکھوں سے نہ
مسٹر رجب کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔
''ٹھیک ہے سر! میں خدمت سے نہیں گھبراتی۔'' شمائلہ نے پُرعزم انداز میں جوا
دیا۔ ''یہ میری ماں کی طرح ہیں۔ مجھے اپنی ماں کی خدمت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں
سمجھ کے ان کی خدمت کروں گی کہ ماں کی خدمت کر رہی ہوں۔''
''گڈ......'' رجب احمد شمائلہ کی بات کو سراہتے ہوئے بولا۔ ''یہی اسپرٹ ہو
چاہئے۔''
معاً رجب احمد کی بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے داخل ہونے سے پہلے
پرفیوم کا جھونکا اس طرح اندر داخل ہوا جیسے کسی نے جھونکے کو دھکیل دیا ہو یا جیسے ابھی ا
پرفیوم کے تالاب سے غوطہ لگا کے وہ باہر نکلی ہو۔
''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے گالوں
پفنگ ٹشو پیپر سے درست کی اور بہت طنطنے سے بولی۔
''آؤ آؤ بیگم!'' مسٹر رجب نے خوشامدانہ اور استقبالیہ انداز اختیار کرتے ہو۔
کہا۔ ''یہ خاتون آئی ہیں شمائلہ بیگم، ماں کی نرسنگ کے لئے، میں نے انٹرویو کیا ہے۔'' ا
پھر وہ شمائلہ کی طرف مڑ کر اپنی بیوی کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''مسز کلثوم رجب،
میری بیوی ہیں۔''
''السلام علیکم!'' شمائلہ نے مسز رجب کی طرف مڑ کر مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔
''ہونہہ......'' جواب میں کلثوم نے بہت رعونت کے ساتھ ہلکا سا سر ہلایا اور پھر
اپنے شوہر کی طرف مڑ کے بولی۔ ''آر یو سیٹسفائیڈ؟''
''یس شی از او کے۔'' مسٹر رجب ترت بولے اور پھر معاملے کی تصدیق کے
بیگم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے تا کہ وہاں سے کوئی جواب آنے پر وہ حتمی فیصلہ

سکیں۔ بیگم نے بھرپور نظروں سے شمائلہ کا جائزہ لیا اس کے چہرے اور اس کے سراپے کی طرف دیکھا، اس کے لباس پر نظریں ڈالیں جو بہت پُرکشش تھا اور شمائلہ نے خود جدید تراش خراش کا بنایا تھا اور بہت سلیقے سے پہنا تھا۔ اس نے اس سرسری سے جائزہ کے بعد پھر اپنے شوہر کو دیکھا۔ ''آسک ہر...... اِف شی ہز گاٹ اینی گارنٹی۔'' اس نے شمائلہ کی طرف سے منہ موڑ کے اس طرح شوہر سے کہا کہ اگر اس نے خود شمائلہ سے بات کر لی تو شاید اس کی توہین ہو جائے گی لیکن اس سے پہلے کہ مسٹر رجب کوئی جواب دیتے شمائلہ نے بہت پُراعتماد طریقے سے بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''نو میڈم! آئی ڈونٹ ہیو اینی گارنٹی۔ دس از مائی ایڈریس اینڈ دس از مائی آئی ڈی کارڈ، اِف یو ٹرسٹ می دین آئی ایم ریڈی ٹو ایکسپٹ دی اسائن منٹ...... یو تھنک اِٹ اوور، میک اپ یور مائنڈ اینڈ گو می اے رنگ...... اَدروائز نو پرابلم...... تھینکس اے لاٹ......'' شمائلہ نے ایڈریس والی چٹ اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی بیگم کے قریب ایک میز پر رکھی اور اباؤٹ ٹرن ہونے کے انداز میں واپس جانے کے لئے دروازے کی طرف مڑی۔

اس وقت ماں جو ساری باتیں سن رہی تھی کچھ مرتعش ہوئی اسے ایک جھٹکا سا لگا اس نے آنکھیں گھما کر بیٹے اور بہو کی طرف دیکھا جیسے فریاد کرنے کے لہجے میں کہہ رہی ہو۔ ''اسے روک لو......''

بیگم کلثوم بھی شمائلہ کے لہجے اور اعتماد سے متاثر ہوئی اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ عورت اس کی ساس کو اچھے طریقے سے سنبھال سکتی ہے اور اچھے طریقے سے سنبھالنے والی عورت ہی کی بیگم کو ضرورت تھی کیونکہ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اپنی ساس کو پانی کا ایک گلاس بھی پلا دے، اس کے لئے تو اپنا میک اپ سنبھالنا ہی مشکل تھا وہ اپنے آئرن کئے ہوئے کپڑوں میں ایک معمولی سلوٹ نہیں برداشت کر سکتی تھیں معلوم ہوتا تھا کپڑے بیگم نے نہیں پہنے ہیں بلکہ وہ خود کپڑوں کے اندر گئی ہے۔ جہاں وہ اس طرح رہتی تھی جیسے ڈرائی کلینرز کے شوکیس کے اندر ہینگر میں ٹنگی ہو۔ بیگم مسکراتی بھی کنجوسی سے تھی کہ کہیں چہرے کے غازے میں دراڑ نہ پڑ جائے۔ ایسے میں بغیر تیماردار کے اپنی ساس کو وہ ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی لہٰذا اب جو شمائلہ خود اعتمادی کے ساتھ واپس پلٹی تو بیگم کو لگا کہ اچھی تیماردار واپس جا رہی ہے اسے روک ہی لینا چاہیئے۔

''ویٹ......'' شمائلہ جب دروازے کے پاس پہنچی تو بیگم کی کھنکتی ہوئی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔ شمائلہ آواز سن کر پلٹے بغیر اپنی جگہ پر اس طرح رک گئی جیسے آواز نہیں

بریک ہو۔

بیگم نے اپنے شوہر مسٹر رجب کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں منظوری دیتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ رجب آگے بڑھا اور شمائلہ کے قریب جا کر شائستگی سے بولا۔ ''ہم نے آپ کو سلیکٹ کر لیا ہے۔''

''تھینک یو......'' شمائلہ پلٹی اور اظہارِ تشکر کیا۔

''آپ کب سے کام شروع کرنا چاہتی ہیں؟'' رجب نے پوچھا۔

''جب سے آپ کہیں'' شمائلہ ترت بولی۔

''ہم تو چاہیں گے کہ آج ہی سے شروع کر دو۔'' اب کے بیگم نے رائے ظاہر کی اس اندیشے کے ساتھ کہ کہیں شمائلہ کل پر بات ٹال نہ دے۔

''میں تیار ہوں۔'' شمائلہ نے رضامندی ظاہر کی۔

''تو پھر چلی جاؤ اماں کے پاس۔'' بیگم شائستہ نے کہا۔ ''شی از آل یورس۔''

''مائی پلیزر۔'' شمائلہ نے بھی اپنی انگریزی دانی دکھائی۔ وہ آگے بڑھی اور بستر پر پڑی ہوئی لاچار ماں کا ہاتھ خندہ پیشانی سے تھام لیا۔

بیگم نے رجب کو اشارہ کیا اور دونوں میاں بیوی کمرے سے باہر نکل گئے اور شمائلہ کی داستان یہاں سے ایک نئی سمت اختیار کر گئی۔

❀......□......❀

''ماں جی چشم بددور، ماشاء اللہ اس عمر میں بھی آپ کا جسم کتنا خوبصورت ہے۔''
شمائلہ نے مساج کرتے ہوئے خوشگوار حیرت سے کہا۔

شمائلہ نے خود ہی ماں جی سے مساج کے لئے کہا تھا کیونکہ شمائلہ کو ان سے بہت ہمدردی ہو گئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ جب تک وہ ماں جی کی خدمت پر مامور ہے اسے زیادہ سے زیادہ آرام اور سکھ پہنچانے کی کوشش کرے۔

''پتہ ہے مجھے رجب کے باپ نے ایک مقابلے میں جیتا تھا۔'' ماں جی نے شمائلہ سے کہا اور یہ بات معلوم نہیں ماں جی نے کیسے بتا دی کیونکہ یہ بات شاید رجب احمد کی بیوی کو بھی معلوم نہیں تھی اور اسے معلوم بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ ساس بہو کے درمیان ایسا کوئی ربط نہیں تھا۔ بیگم کلثوم کا زیادہ تر وقت تو اپنی این جی او کے کاموں میں، میٹنگز میں، سیمیناروں میں شرکت کرنے میں گزرتا تھا یا پھر بیوٹی پارلر میں چہرے اور جلد کی کھنڈرات نما جھریوں کو چھپانے اور لیپا پوتی میں صرف ہوتا تھا۔ وہ صبح صبح میک اپ کے بغیر جب پارلر جاتی تو اگر دادی نہیں تو عمر رسیدہ ماں ضرور لگتی تھی اور جب خاصا وقت صرف کر کے پارلر سے باہر نکلتی تو اس پر کسی نئی نویلی دلہن کا گمان ہوتا اور پھر وہ پوری کوشش کرتی کہ میک اپ بگڑنے نہ پائے اور غازے اور سرخی کی مصنوعی تہیں باقی رہیں۔ وہ ساس کے کمرے میں بھی برائے نام ہی آتی اور آتی بھی تو دور ہی سے دیکھتی اور ہیلو ہائے کر کے واپس چلی جاتی۔ لہٰذا ایسے میں ساس بہو کے درمیان کسی گہرے ربط کا امکان ممکن نہیں تھا لیکن ماں جی اور شمائلہ کے درمیان اتنی گہری وابستگی ہو گئی تھی جو اس سے پہلے کسی نرس کے ساتھ نہیں ہو سکی تھی اور اس سے پہلے کسی نرس یا کسی بھی خدمت گار عورت نے ماں جی کی ایسی خدمت بھی نہیں کی تھی۔ شمائلہ نے ماں جی کی خدمت میں اپنی جان لڑا دی تھی۔ وقت پر دوا دارو اور خوراک دینے کے علاوہ انہیں ضرورتاً نہلانا دھلانا، ہر روز نئے کپڑے بدلنا اور کپڑوں کو پاکیزہ رکھنا، بیڈ شیٹ اور تکیے کے غلافوں پر کوئی داغ دھبہ نہ پڑنے دینا۔ ماں جی کے الجھے ہوئے بالوں میں ہر روز کنگھی کر کے سنوارنا، ماں جی کے بدن کی اسفنجنگ اور طہارت

کا خیال رکھنا اور یوں دو تین مہینے کی شبانہ روز خدمت سے شمائلہ نے ماں جی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور ماں جی نے جیسے اپنا پورا وجود، پوری شخصیت شمائلہ کے سپرد کر دی تھی اور دونوں میں اتنی زیادہ قربت ہو گئی تھی جیسے وہ برسہا برس سے ایک دوسرے کے دُکھ سکھ کی ساتھی ہوں اور اپنے دل کی جو باتیں ماں جی نے شمائلہ سے کی تھیں وہ کسی اور سے نہیں کیں اور شمائلہ نے بھی ماں جی کو اعتماد میں لے کر اپنے دل کا حال بتا دیا تھا۔

اس دن ماں جی صبح ہی سے اپنے جسم میں ہلکے ہلکے درد کو محسوس کر رہی تھیں لیکن شکایت کسی سے نہیں کی تھی۔ وہ شمائلہ کا انتظار کر رہی تھیں۔ شمائلہ نے شام کو کچھ درد کش گولیاں دیں لیکن ماں جی نے جب کچھ زیادہ آرام محسوس نہیں کیا تو شمائلہ نے ماں جی کا موڈ خوشگوار بنانے کے لئے کہا۔ ''آیئے ماں جی میں آج آپ کا مساج کرتی ہوں۔''

''ہاں......!!'' ماں جی تجسس سے بولیں، جیسے پوچھ رہی ہوں کہ کیا تمہیں مساج آتا ہے۔

''ہاں......'' شمائلہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں نے سیکھا ہوا ہے یہ کام۔''

اور پھر بہت آرام سے ماں جی کے جسم کو کپڑوں کی قید سے آزاد کیا اور داد دیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ماں جی چشم بددور ...... ماشاء اللہ اس عمر میں بھی آپ کا جسم کتنا خوبصورت ہے!''

''ہونہہ...... واقعی!'' ماں جی خوش ہو کر بولی۔

''ہاں ماں جی! اللہ نظر بد سے بچائے۔'' شمائلہ نے تصدیق کی۔

''اب کیا نظر بد سے بچوں گی۔'' ماں جی ایک سرد آہ بھر کر بولیں۔ پھر توقف کر کے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''نظر تو لگ ہی گئی ہے بیٹی!''

''آپ مایوس نہ ہوں ان شاء اللہ......'' شمائلہ اسے ڈھارس دینا چاہتی تھی لیکن جب ماں جی نے گردن گھما کر معنی خیز نظروں سے شمائلہ کو دیکھا اور نفی میں سر کو جنبش دی تو شمائلہ نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا اور پھر کچھ دیر دونوں خاموش رہیں اور شمائلہ خاموشی کے دوران ماں جی کے چہرے کو دیکھتی رہی اور ہاتھ مساج کے لئے خود بخود متحرک ہوتے گئے، ماں پر ایک مسحور کن کیفیت طاری ہونے لگی اور ساتھ ساتھ وہ سوچ کی گہری اور خوشگوار وادیوں میں کھونے لگی۔

''پتہ ہے میں ایک گھنٹہ ایکسرسائز روزانہ کرتی تھی۔'' ماں جی ماضی کے دریچے میں جھانکتے ہوئے بولیں۔

''ہاں......!'' شائلہ نے تجسس سے کہا اور ماں جی اس کی 'ہاں' کو نظرانداز کرتے ہوئے مزید بولیں۔

''اور ایک گھنٹہ جوگنگ کرتی تھی میں، اس کے علاوہ یوگا......''

''سچ......'' شائلہ نے حیرت سے کہا اور ماں جی پھر شائلہ کے 'سچ' کو نظرانداز کرتے ہوئے بولیں۔ ''اور جس طرح بنیا، پائی، دھیلے کوڑی کا حساب رکھتا ہے ناں...... اسی طرح میں رتی ماشا اور تولے کی طرح ناپ تول کے خوراک کھاتی تھی۔''

''واقعی؟'' شائلہ نے مزید دلچسپی سے کہا۔

''اور کیا......؟'' ماں جی بولی اور کہنے لگی۔

''جسم ایسے ہی تھوڑی بنتا ہے۔ اس کے لئے ریاض کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح ایک گانے والا یا گانے والی برسوں ریاض کرتی ہے تب جا کے اس کے گلے میں لوچ، سر اور پختگی پیدا ہوتی ہے لیکن......''

ماں جی ایک فلسفیانہ بات کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔

''لیکن کیا ماں جی؟'' شائلہ نے تجسس سے پوچھا۔

''بات یہ ہے بیٹی کہ یہ ایکسرسائز، ڈائٹنگ، جوگنگ، یوگا...... وغیرہ کچھ نہیں خوبصورت جسم وہ ہے جو قدرت نے عطا کیا ہو۔'' ماں جی مزید کہنے لگیں۔ ''رنگ گورا ہو یا کالا...... دونوں رنگ اللہ کی نعمت ہیں، انسان کے اندر کا رنگ اچھا ہونا چاہیے۔ ٹانگیں وہ اچھی جو چلتی ہوں، پاؤں وہ خوبصورت ہوتے ہیں جن پہ انسان کھڑا ہو، آنکھیں وہ خوبصورت ہوتی ہیں جن میں بینائی ہو، ناک میں قوت شامہ ہو، کان سن سکتے ہوں، زبان میں گویائی ہو تو میٹھی بھی ہوگی اور کڑوی بھی لیکن ہم لوگوں نے خوبصورتی کے معیار ہی کچھ اور بنا لئے ہیں۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہوئیں تو شائلہ نے ایک دم ہاتھوں کو روکا اور ماں کی طرف مڑ کر پکارا۔ ''ماں جی......!'' شائلہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں سکی شاید وہ ماں جی کی باتوں سے متاثر ہو کر پکار اٹھی تھی۔

''ہاں بولو۔'' ماں جی نے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' شائلہ نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے ہاتھوں کو پھر متحرک کیا۔

''تم نے ٹھیک کہا، میں جوانی میں بہت خوبصورت تھی۔'' ماں جی تھوڑی دیر کے بعد خاموشی کو توڑتے ہوئے بولیں اور پھر نظریں شائلہ کے چہرے کی طرف گھما کر مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بالکل تمہاری طرح......''

''میری طرح؟'' شمائلہ ماں جی کی بات کی نفی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں کہاں خوبصورت ہوں ماں جی!''

''تمہیں نہیں معلوم ناں ...... خوبصورتی کو کہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے۔ رائے تو دوسرے قائم کرتے ہیں۔'' ماں جی نے کہا اور پھر دوبارہ معنی خیز انداز میں کہنے لگیں۔ ''اور وہ بندہ تمہیں دیکھ کر جو گمراہ ہوا اس نے بھی تو کچھ دیکھا ہی ہوگا۔''

ماں جی کا اشارہ شمس کی طرف تھا۔ ماں جی نے جس طرح شمائلہ کو اعتماد میں لے کر اپنے ماضی کی بہت ساری باتیں بتا دی تھیں اور مسلسل بتا رہی تھیں اسی طرح شمائلہ نے بھی اپنی داستانِ حیات کا ایک حصہ ماں جی کے سامنے بیان کر دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے شوہر زاہد سے کس قدر پیار کرتی ہے اور زاہد بھی ٹوٹ کر اسے چاہتا تھا لیکن شمس نامی ایک شیطان فطرت دوست نے کس طرح دوستی کی اقدار کو جوتوں کے نیچے کچلنے کی کوشش کی اور اس کی زندگی کی خوشیوں کا آنگن چند لمحوں میں جلا کے بھسم کر دیا اور اب اسے شمس نام سے ہی اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ اس لفظ کا ہم معنی سورج بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

''نہیں ماں جی، اس خبیث کی بات اشاروں میں بھی نہ کریں۔'' شمائلہ تڑپ کر بولی۔ ''وہ ان مردوں میں سے ہے جن کے لئے خوبصورتی کوئی معنی نہیں رکھتی، ان کے لئے صرف عورت معنی رکھتی ہے اور عورت کو حاصل کرنے کے لئے ایسے لوگ اپنی ساری دوستیاں اور رشتے قربان کر دیتے ہیں۔ یہ بھیڑیے ہیں۔'' شمائلہ بولتے بولتے غصے میں آ گئی۔

''آئی ایم سوری!'' ماں جی نے شمائلہ سے معذرت کی۔ ''مجھے یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہئے تھا۔'' اور پھر مزید افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ ''معلوم نہیں کیوں میں باتوں باتوں میں خوبصورتی سے بدصورتی پر آ گئی۔ آئی ایم اگین سوری۔''

''اٹس او کے ماں جی!'' شمائلہ نے جھک کر ماں جی کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر تعریف کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''جوانی تو ہوتی ہی خوبصورت ہے ماں جی لیکن آپ اب بھی کئی جوانوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔''

''تھینک یو۔'' ماں جی نے تشکر کے طور پر اپنی پلکیں بند کیں اور کھولیں اور پھر قدرے توقف سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''پتہ ہے مجھے رجب کے باپ امیر نے ایک مقابلے میں جیتا تھا۔''

''کیا......؟'' شمائلہ چونکی۔

''ہاں، میں جیم خانے جایا کرتی تھی اور تقریباً سارا جیم خانہ مجھ پر فریفتہ تھا۔ اکثر لوگوں کو میرے ساتھ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور کچھ بات کرتے ہوئے نروس ہو جاتے تھے۔''

''آپ چیز ہی ایسی تھیں ناں ماں جی!'' شمائلہ نے بیچ میں لقمہ دیا۔

''سنو تو شیطان......'' ماں جی نے پیار سے اسے ڈانٹ پلائی اور پھر مزید گویا ہوئی۔

''میری دوستی کے قرعے میں دونو جوانوں کا نام نکلا۔ امیر حسین اور عبید...... دونوں کو میرے عشق کا بخار تھا اور دونوں نے مجھے شادی کا پروپوزل دیا۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ مجھے دوسرے سے زیادہ چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ میں امتحان لوں گی تو پتہ ہے کیا ہوا؟''

ماں جی نے ہنسنا شروع کر دیا۔

''آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟'' شمائلہ نے تجسس سے کہا۔ ''آگے بتائیں ناں کیا ہوا؟''

''آگے یہ ہوا کہ دونوں آزمائش کے لئے تیار ہو گئے۔'' ماں جی نے انکشاف کیا اور پھر مقابلے کی نوعیت بتاتے ہوئے بولیں۔ ''ایک دن کلب ہی کے اندر ایک کمرے میں میرا برتھ ڈے منایا گیا۔ کیک کاٹنے سے پہلے بتیاں ساری گل کر دیں صرف دو بڑی موم بتیاں روشن رکھیں۔ میں نے اعلان کیا کہ دونوں میں سے جو اپنی ہتھیلی موم بتی کی لو پر ایک منٹ تک رکھے گا اور اُف نہیں کرے گا میں اس سے شادی کروں گی۔ پتہ ہے کیا ہوا......''

ماں جی کہتے کہتے رکیں اور شمائلہ ہمہ تن گوش بنی ہوئی تھی۔ پھر ماں جی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''ایک تیسرے دوست کو ریفری بنایا گیا جس نے مقابلہ شروع کرنے کی سیٹی بجائی اور امیر اور عبید دونوں نے بیک وقت اپنی اپنی موم بتیوں پر ہتھیلی رکھ دی لیکن عبید نے زور کی سسکی لی اور ایک سیکنڈ میں ہاتھ جھٹکے سے کھینچ لیا جبکہ امیر نے گھڑی کے مطابق پورے ایک منٹ تک ہتھیلی موم بتی پر رکھی۔ اس کی کھال جلنے لگی لیکن شیر کے بچے نے اُف تک نہیں کی اور ہاتھ ایک منٹ سے پہلے نہیں ہٹایا۔''

''اُف توبہ...... مجھے تو سن کر ہی کپکپی آ گئی ہے۔ کیسا چاہنے والا تھا۔'' شمائلہ سچ مچ کانپ کر بولی۔

''اندازہ لگاؤ۔'' ماں جی نے واقعہ یاد کر کے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ہتھیلی

لی ساری کھال جھلس گئی تھی۔''

''پھر آپ نے شادی کر لی اس سے۔'' شمائلہ نے پوچھا۔

''ظاہر ہے ایسے مظاہرے کے بعد بھی اس کے ساتھ شادی نہ کرنا ظلم تھا اس پر...... رجب اسی امیر کا ہی تو بیٹا ہے۔''

''امیر صاحب محض نام کے امیر تھے یا واقعی امیر تھے۔'' شمائلہ نے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔

''اسم با مسمّٰی......'' ماں جی بہت اعتماد کے ساتھ بولیں۔ پھر کہنے لگیں۔''نام بھی امیر تھا اور تھا بھی بہت امیر آدمی۔ یہ جو تم رجب کے ٹھاٹ باٹ، کاروبار، جائداد، روپیہ پیسہ، شان و شوکت دیکھتی ہو ناں یہ سب امیر کا ہے اور اتھارٹی میرے پاس ہے۔ میں نے خود اپنے پاس رکھی ہے۔ معذور ہونے کے باوجود میں چیک خود سائن کر کے ان لوگوں کو دیتی ہوں...... پتہ ہے کیوں؟'' ماں جی نے سوال کیا۔

''کیوں؟'' شمائلہ نے آہستہ سے پوچھا۔

''اگر یہ سب کچھ میں نے ان کے نام کر دیا ہوتا تو ان لوگوں نے مجھے کبھی کا گھر سے نکال کے کسی محتاج خانے میں ڈال دیا ہوتا اور میری یہ بہو جو دور سے مجھے ہیلو ہائے کر کے جاتی ہے ناں، یہ میری صورت بھی نہ دیکھتی۔'' ماں جی رازداری سے بولیں۔''دنیا بہت مطلب کی ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، آل اولاد سب رشتے کاغذی ہیں۔'' پھر ماں جی بولتے بولتے چپ ہو گئیں۔ کچھ لمحے ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔ شمائلہ خاموشی سے مساج کرتی رہی اور ماں جی کے جسم کو سکھ ملتا رہا۔ انہوں نے آنکھیں موند لیں اور پھر آنکھیں بند کر کے بڑبڑاتے ہوئے بولیں۔''مجھے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہ میں محتاج خانے میں نہیں اپنے گھر کے اندر مرنا چاہتی ہوں۔''

''آپ کا بیٹا......'' شمائلہ نے کچھ کہنا چاہا تو ماں جی بات کاٹ کر بولیں۔''میرا بیٹا جو ہے ناں وہ زن مرید ہیں وہ بیوی کی مرضی کے بغیر اسے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا ہوگا اور میرا خیال ہے دیکھنے کے لئے بھی وہ اسے ایک تحریری درخواست دیتا ہوگا، آگے بیوی کی مرضی کہ وہ درخواست منظور کرے یا مسترد......'' ماں جی کی اس بات پر شمائلہ نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا اور مساج کو آخری ٹچ دینے کے لئے اس نے انگلیوں کو بہت فنکارانہ طریقے سے کیکڑے کی طرح ماں جی کے جسم پر چلایا۔ ماں جی اب پرسکون ہو گئی

تھیں اور شمائلہ کے ہاتھ کو قریب کر کے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر اپنے بے جان ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلی جاؤ گی ناں؟'' شمائلہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور ماں جی نے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ ایک لمحے میں پُرسکون ہو کر سو گئیں۔

''تم یہاں بیٹھو جھاڑیوں کی اوٹ میں ...... سامنے نہیں آنا۔'' فرید نے شمائلہ سے ایک جگہ بیٹھنے کو کہا۔ ''بس پگڈنڈی کی طرف دیکھتی رہو میں جا کے بچوں کو بھیجتا ہوں۔'' یہ کہہ کر فرید اچانک غائب ہو گیا تھا۔ شمائلہ کو خوف سا آنے لگا۔

عجیب سا ماحول تھا آس پاس گھنے درخت اور جھنڈ تھے۔ درختوں اور جھاریوں پر پرندے دکھائی تو نہیں دے رہے تھے لیکن پرندوں کی عجیب سی پراسرار آوازیں آ رہی تھیں جیسے وہ جھاڑیوں کے اندر چھپ کر بیٹھے ہوں اور ان آوازوں کے بیچ اُلو اور چمگادڑ کی آوازیں بہت نمایاں تھیں اور یہی آوازیں شمائلہ کو پریشان کرنے لگی تھیں۔ وہ بچپن ہی سے اُلو اور چمگادڑ اور ان کی آوازوں سے بہت خوفزدہ رہتی تھی۔

وہ جب چھوٹی سی تھی تو اس کے ایک عزیز کے چہرے پر رات کے وقت ایک چمگادڑ چمٹ گئی تھی۔ اس کا عزیز بہت چیخا چلایا تھا۔ اس نے چہرے سے چمگادڑ کو ہٹانے کی کوشش کی تھی لیکن چمگادڑ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ پھر وہ جب خود اڑی تو کھال بھی ادھیڑ کے ساتھ لے گئی تھی اور اس کا یہ عزیز ساری عمر زخمی اور داغدار چہرے کے ساتھ زندہ رہا۔ شمائلہ نے چمگادڑ کا یہ واقعہ اپنے بچوں علی اور عینی کو بھی سنایا تھا تو واقعہ سن کر وہ خوفزدہ ہو گئے تھے اور ان پر چمگادڑ کی ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ اسی طرح کسی نے اسے اُلو سے بھی ڈرا رکھا تھا کہ یہ رات کا پرندہ ہے اور انسان کی آنکھوں پر حملہ کرتا ہے اور اب درختوں کے جھنڈ میں یہی دو آوازیں زیادہ نمایاں تھیں اور اسے ایک چھوٹا سا پرندہ وقفے وقفے سے اپنے آس پاس اڑتا ہوا دکھائی دیتا تھا جو یقیناً چمگادڑ ہی تھا لیکن ابھی تو شام کا دھندلکا پھیلا تھا۔ ابھی چمگادڑ یا اُلو کی اڑان کا وقت نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگی معلوم نہیں یہ دونوں پرندے شام کی روشنی میں کیسے نمودار ہو گئے۔ اسے اپنے بچوں کی فکر لگ گئی کہ بڑی مشکل سے آج فرید بھائی نے بچوں سے ملاقات کی سبیل نکالی تھی۔ انہوں نے معلوم نہیں زاہد سے کس طرح بچے حاصل کیے ہوں گے۔ اس میں زارا کی کوششوں کو بھی بہت دخل تھا لیکن کچھ عجیب سی فضا بن گئی تھی کہ فرید اسے ایک جھاڑی کے پیچھے بٹھا کے نہ جانے خود کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اسے نہیں

معلوم تھا کہ بچے کہاں ہیں کس کے پاس ہیں، کیسے آئیں گے، کیا زاہد علی بھی ساتھ آئے گا؟ اس نے خود سے سوال کیا اور خود ہی اس کے اندر جواب پیدا ہوا......نہیں...... زاہد کہاں آئے گا۔ اس کی یہی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے فرید بھائی کی لاج رکھ لی اور بچوں سے اس کو ملاقات کی اجازت دے دی۔ ''لیکن بچے کہاں ہیں......'' اس نے انتہائی پریشانی کے عالم میں سوچا اور پھر معاً اس کے کان میں بچوں کی دور سے آتی ہوئی باریک اور متلاشی آواز آئی۔

''امی...... امی جان......!'' یہ علی اور عینی کی آوازیں تھیں۔ وہ اچھل کر جھاڑیوں کی اوٹ سے سامنے آ گئی۔ حد نظر تک شام کے دھندلکوں میں طویل لمبی پگڈنڈی کی طرف دیکھا جو دو رویہ درختوں اور جھاڑیوں کی قطاروں کے اندر دور تک جا رہی تھی اور اس کے دونوں بچے دو ننھی گڑیاؤں کی طرح اچھلتے کودتے لپکتے دوڑتے ہوئے بازو پھیلائے اس کی طرف آ رہے تھے۔

''عینی...... علی......!'' شمائلہ نے بہت زور سے آواز لگائی لیکن آواز جیسے نکلی نہیں شمائلہ نے دوڑنا چاہا لیکن پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ فرید بھائی کہہ گئے تھے یہاں سے ہلنا نہیں لیکن بچے اچانک سامنے آ گئے تھے۔ انہوں نے بازو پھیلائے اور پکارا۔

''امی......''

''میرے بچو......!'' شمائلہ نے بھی بازو پھیلائے اور انہیں اپنے بازوؤں میں لینے کے لئے لپکی معاً ایک توپ کا گولہ کسی نے اس پر پھینک دیا اور اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔

''اوں ہوں، ایسے نہیں ...... تم کیا سمجھتی ہو اتنی آسانی کے ساتھ تمہاری ملاقات بچوں سے ہو جائے گی۔'' شمائلہ نے اچانک شمس کو جھاڑیوں کے اندر سے نکلتے اور بچوں پر جھپٹتے دیکھا۔ بچے چیخے۔

''امی...... امی امی......''

شمائلہ نے بھی شور مچا دیا۔ ''بچاؤ بچاؤ ...... کوئی میرے بچوں کو بچاؤ۔'' وہ چیختی رہی پھر جیسے پیچھے کی طرف سے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور کچھ سنگھانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی چیخ و پکار تیز کر دی۔ ساتھ ہی اس کے کان میں کچھ آوازیں آنے لگیں۔

''شمائلہ......شمائلہ......شمائلہ......''

کوئی اسے قریب سے اور زور زور سے پکار رہا تھا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ

آوازیں تو فرید بھائی اور زارا بہن کی ہیں اور پھر جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑا اور وہ ہڑ بڑا کر کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہو گئی۔ وہ پسینے میں شرابور تھی اور اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر چلاتی رہی۔ ''میرے بچوں کو بچاؤ...... میرے بچوں کو بچاؤ''

''ہوش میں آؤ شمائلہ......!'' زارا نے اسے زور زور سے جھنجھوڑا تو شمائلہ ہوش میں آئی۔ اس نے اپنے حواس قابو میں کئے اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

تقریباً نصف رات کا وقت تھا آج شمائلہ کی طبیعت صبح ہی سے کچھ خراب تھی۔ وہ ماں جی کے پاس نہیں گئی تھی اور ماں جی کی صبح والی خدمت گار سے درخواست کی تھی کہ وہ رات کو بھی ان کو سنبھال لے۔ شمائلہ اور صبح والی نرس کا اکثر آپس میں ایڈجسمنٹ ہو جایا کرتا تھا کہ کبھی صبح والی کو کچھ کام پڑ گیا تو شمائلہ دن کا کام بھی سنبھال لیتی تھی اور شمائلہ اگر کسی وجہ سے رات کو ڈیوٹی نہ جا سکے تو دن والی اس کی جگہ ڈبل ڈیوٹی دے دیا کرتی۔ آج بھی شمائلہ کی طبیعت صبح ہی سے ناساز تھی اور وہ خود کو ڈیوٹی کرنے کے قابل نہیں محسوس کر رہی تھی لہٰذا اس نے چھٹی کر لی تھی وہ اکثر کوشش کرتی تھی کہ زاہد اور بچے اسے یاد نہ آئیں، وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتی لیکن کبھی کبھی اس پر اس طرح بچوں کی یاد کا دورہ پڑتا جیسے مائیگرین کے درد میں مبتلا کسی کے سر میں اچانک درد اٹھ جاتا ہے۔ ایسا درد جو کسی ٹیبلٹ، دوا دارو، تعویذ، ٹوٹکے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک دورانیہ ہوتا ہے اور جو مریض کو خوب تڑپا کے اپنے مخصوص وقت پر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ شمائلہ پر بھی بچوں کی یاد کا ایک ایسا ہی ناقابل برداشت دورہ پڑ جایا کرتا تھا اور شاید اس دورے کے درد کی شدت ہی تھی جس نے اسے صبح سے بے چین اور مضطرب کر رکھا تھا اور شاید اسی لئے وہ ڈیوٹی دینے بھی نہیں گئی تھی اور بچوں کی یاد کے درد سے تڑپ تڑپ کر سو گئی تھی۔ بچے اسے خواب میں دکھائی دیئے۔

بڑی مشکل سے اس نے چیخ و پکار بند کی اور پھٹی پھٹی نظروں سے زارا اور فرید کو دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا میری بہن...... بولو شمائلہ کیا ہوا؟'' فرید نے جھک کر ایک ہمدرد بھائی کی طرح محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا کوئی خواب دیکھ لیا ہے۔''

''ہاں بھائی جان! میرے بچے...... میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے بچے......''

''بس......'' فرید نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے کچھ کہنے سے روکا اور بولا۔

''خواب تو خواب ہوتا ہے۔''

''میں اپنے بچوں سے ملنا چاہتی ہوں بھائی جان! میرے بچے میرے لئے تڑپ رہے ہوں گے۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟'' اس نے پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا اور دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ''ایئرپورٹ فون کر کے معلوم کریں شاید کوئی نائٹ کوچ جانے والی ہو۔'' وہ تڑپی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے شائلہ ہوش میں آؤ۔'' زارا نے بہت پیار سے ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا۔

''کیا اپنے بچوں سے ملنا پاگل پن ہے زارا بہن!'' شائلہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''اپنے بچوں سے ملنا تمہارا حق ہے۔'' فرید نے کہا۔ ''لیکن حق استعمال کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ایسے تو نہیں کہ آدھی رات کو اٹھ کے جہاز پکڑو اور بچوں کو پکارتی ہوئی کراچی پہنچو۔''

''پھر کیا کروں بھائی جان! بچوں کے لئے میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے، زاہد تو یہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں شمس کے ساتھ عیش کی زندگی گزار رہی ہوں۔''

''وہ یقیناً یہی سمجھ رہا ہو گا لیکن میں جاؤں گا کراچی اور پھر سب باتیں صاف ہو جائیں گی۔ میں بچوں سے تمہاری ملاقات کا بندوبست بھی کر کے آؤں گا۔'' فرید نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کب جائیں گے آپ؟'' شائلہ نے بے قراری سے پوچھا۔

''مجھے اگلے ہفتے جانا ہے۔ میں خاص طور سے عابد بھائی اور زاہد سے مل کر بچوں سے بھی ملوں گا اس وقت تم ریلیکس کرو۔'' فرید نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا اور پھر زارا سے مخاطب ہوا۔ ''زارا! تم پلیز آج اسی کمرے میں شائلہ کے پاس سو جاؤ۔'' فرید نے کسی بچی کی طرح شائلہ کو ٹریٹ کیا۔

''سو جاؤ......'' زارا نے بھی پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر دونوں سو گئیں۔

''آپ؟'' وہ چونکی اور سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

اس رات ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے شائلہ کو پھر ایک بار آزمائش کے دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ وہ ماں جی کو ہیلو ہائے کر کے حسبِ معمول ڈریس تبدیل کرنے کے لئے برابر کے ڈریسنگ روم میں گئی۔ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ ماں جی کو اٹینڈ کرنے سے

کام کے کپڑے پہنتی تھی کیونکہ ایک تو ماں جی کی صفائی ستھرائی کرنا ہوتی پھر جب ذرا ستانے لگتی تو لباس چرمرا بھی جاتا تھا اس لئے جوڑا تبدیل کر لیتی تھی۔ اس رات بھی نے معمول کا راستہ اختیار کیا اور جب وہ اندر پہنچی تو آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز ی اور رجب صاحب نہایت دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ شمائلہ چونکی۔ آپ......!!'' وہ لرز گئی اور کسمسا کر جلدی سے اپنا لباس درست کیا اور انتہائی برہمی کے میں رجب سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ کیوں میرے کمرے میں آئے ہیں؟ چلے جایئے ......''

''دیکھو میری بات سنو......'' رجب نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا۔

''میں کوئی بات سننے کو تیار نہیں، آپ ڈریسنگ روم سے نکل جایئے نہیں تو م......''

''ہش ...... بیگم کی فکر نہ کرو۔ وہ سیمینار میں شرکت کرنے اسلام آباد گئی ہیں، ہفتے آئیں گی۔'' رجب نے اس طرح رازداری کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا جیسے شمائلہ م کے جانے پر خوش ہو۔ رجب نے نہایت غیر ذمے داری کے ساتھ اس کی طرف ھنے کی کوشش کی۔ شمائلہ چراغ پا ہو گئی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تاڑ سے ایک تھپڑ رجب گال پر مار دیا۔

''تم نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔'' رجب گال سہلاتے ہوئے غرانے کے انداز میں ا۔

''اگر باز نہ آئے تو جوتا بھی ماروں گی۔'' شمائلہ ترت بولی اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتا شمائلہ غصے میں بے قابو ہو کر بولی۔ ''آپ نے کیا سمجھا ہے کہ مجھے مرد کی تلاش کیا؟ شرم آنی چاہئے آپ کو کہ میں آپ کی ماں کی خدمت کر رہی ہوں ایسی خدمت کہ ہی کسی نرس نے کسی مریضہ کی کی ہو۔ شاید ہی کسی بہو نے ساس کی ہو، شاید ہی کسی بیٹی ماں کی ایسی خدمت کی ہو۔ اللہ آپ کو توفیق دے تو کبھی ماں جی کے پاس گھڑی دو ڑی بیٹھ کے میرے بارے میں پوچھنا کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔'' بولتی چلی گئی۔

''میری بات سنو میں......''

''کچھ نہیں......'' شمائلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''کچھ نہیں کہنا سننا مجھے۔ گیٹ ٹ...... نہیں تو میں شور مچا کے ساری کالونی کو جمع کر دوں گی۔'' شمائلہ ایک دم شیرنی بن

گئی تھی۔ رجب کافی گھبرا گیا اور گھبرائے ہوئے نروس لہجے میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔
کے آئی ایم سوری ...... ویری ویری سوری، مجھ سے غلطی ہو گئی، میں معافی چاہتا ہوں۔
نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ وہ نہایت معذرت بھرے انداز میں بولا۔

''اب اگر صحیح سمجھ لیا ہے تو نکل جاؤ یہاں سے، مجھے چینج کرنا ہے۔'' شمائلہ تحکم
انداز میں بولی۔ ''آؤٹ......'' اور آؤٹ کہہ کر اس نے انگشت شہادت دروازے
طرف گھمائی۔

''میں نکل جاتا ہوں لیکن کچھ کہنے کے لئے مجھے ایک منٹ دے دو۔'' اس
ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''بولو۔'' شمائلہ نے اسے ایک منٹ کی مہلت دیتے ہوئے کہا۔

''شادی کرو گی۔'' رجب فوراً حرف مدعا پر آ گیا اور شمائلہ کو یوں لگا جیسے رجب
نے ایک دھماکہ کیا ہو۔ شمائلہ کو فوری طور پر کوئی جواب نہیں بن پایا۔ اس نے زبان بند ر
لیکن دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں جیسے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''دیکھو شمائلہ میں تہہ دل سے یہ پروپوزل دے رہا ہوں اور یہ کوئی غلط بات
نہیں ہے۔'' رجب بہت ہی نرم اور دھیما لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تمہارے
حالات کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت معلوم ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس شاد
کا جواز موجود ہے اور اگر میں تمہیں آفر دے رہا ہوں تو یہ بھی کوئی غیر اخلاقی بات نہیں
میرے پاس بھی جواز موجود ہے۔'' وہ بولتا چلا گیا۔ ''میرے پاس دولت ہے، صحت ہے
تم اگر اس بنگلے میں نہ رہنا چاہو تو میں تمہیں الگ بنگلہ لے کر دے سکتا ہوں، تمہارے نا
بنگلہ کر سکتا ہوں اور......''

''اور بس تمہارا ایک منٹ پورا ہو گیا ہے۔'' شمائلہ نے ہاتھ بلند کر کے اسے رو
لیکن وہ مزید وقت لیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''دیکھو میری اور کلثوم کی ریلیشن شپ......''

''میں نے کہا بس کافی ہو گیا ہے۔'' شمائلہ نے اب اسے سختی سے روک دیا۔ ''میر
تمہاری اور کلثوم بیگم کی ریلیشن شپ پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی لیکن اپنے بارے میں
صرف اتنا بتا دوں کہ میں یہاں شادی کرنے نہیں تمہاری ماں کی خدمت کرنے آئی تھی او
اب شاید ان کی خدمت بھی نہ کر سکوں کیونکہ اب میرا یہاں اس گھر میں رہنے کا کوئی جوا
نہیں رہا۔''

''پلیز......'' رجب نے ہاتھ جوڑے اور نئی درخواست کرتے ہوئے بولا۔ ''پلیز

ہرے پروپوزل کو بھی بھول جاؤ۔ میری غلطی کو بھی معاف کر دو لیکن ایک درخواست کو مت ٹھکراؤ۔ میری ماں کو نہیں چھوڑنا پلیز......'' وہ بھیک مانگنے کے انداز میں ہاتھ جوڑتا ہوا الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا اور شمائلہ سر پکڑ کے رہ گئی۔

''کیا ہوا......؟'' ماں جی نے نہایت تپاک سے شمائلہ کا ہاتھ تھاما اور اس کے ہرے کی طرف دیکھنے کے لئے سر کو گھمانے کی کوشش کی لیکن گھما نہیں سکی۔ ''میں نے پوچھا کیا ہوا؟'' ماں جی نے دوبارہ پوچھا تو شمائلہ چونکی۔

وہ کافی دیر سے چپ چاپ خیالوں میں گم پریشان حال ماں جی کے پاس بیٹھی تھی۔ ماں جی کی آواز سن کر چونکیں لیکن بولی کچھ نہیں، تاہم ماں جی کے سر پر آہستہ سے ہاتھ لما، سر کو سہلایا، ماں جی کا تکیہ درست کیا لیکن بولی پھر بھی کچھ نہیں۔ اس کے چہرے پر یشانی کی لکیریں گنجلک ہوتی گئیں اور آنسوؤں کے شبنمی قطرے وقفے وقفے سے ٹپکتے ہے۔ وہ آنسو بہاتی اور انگلیوں کی پوروں سے پونچھتی رہی۔

''تم آج بولو گی کچھ نہیں۔'' ماں جی نے اپنی بے جان انگلیوں سے شمائلہ کا ہاتھ بانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن شمائلہ نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا اور اپنی سسکیوں ور ہچکیوں کو اندر سینے میں اتارنے اور چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ تب ماں جی نے خود ی اس کے سینے میں چھپے خاموش دریا میں ایک کنکر مار کے ارتعاش پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''نہ بتاؤ لیکن مجھے معلوم ہے۔''

''کیا......؟'' وہ ایک دم چونکی اور ماں جی کی طرف مڑ کر بولی۔ ''کیا معلوم ہے؟''

''رجب......؟'' ماں جی نے آہستہ سے رجب کا نام معنی خیز انداز میں لیا اور نکھیں شمائلہ کی طرف گھما کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے رقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ ر کے لوگ ہیں بیٹی! ان کی سوچ پتھر کی، دل و دماغ پتھر کے ہیں اور یہ رہتے بھی پتھر ے دور میں ہیں اور یہ ہوس پرست لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ہر عورت مرد کی تلاش میں ہے۔ ن کے اپنے دل جذبات سے خالی ہیں اور یہ کسی دوسرے کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے ...... بے حس لوگ ہیں......'' اچانک بولتے بولتے غصے سے ماں جی کی سانس اس طرح پھول ی جیسے پہاڑی راستے کی کوئی لمبی چڑھائی چڑھ کر آئی ہو۔ ''میں ان لوگوں کو......'' ماں ی کی سانس بے قابو ہو گئی اور وہ غصے سے ہانپنے لگیں۔

''آپ نہ بولیں ماں جی!'' شمائلہ نے ماں جی کو بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا

ان کی پیشانی کو پیار بھرے انداز میں آہستہ سے چھوا اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ د
غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ میری وجہ سے دل میلا نہ کریں
جی!''

''تمہارے ساتھ زیادتی تو نہیں ہوئی ہے ناں؟'' ماں جی نے تنفس کو قا
کرتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں ماں جی!'' شمائلہ ترت بولی۔ ''میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں۔''

''تھینک گاڈ!'' ماں جی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے فکر لگی ہو
کیونکہ میں نے رجب کو تمہارے کمرے کے اندر جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔''

''اس نے بے قابو ہونے کی کوشش کی تھی ماں جی! لیکن خدا کا شکر ہے میر
حفاظت خود کرسکتی ہوں۔'' شمائلہ نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

''خدا تمہیں مزید ہمت دے اور اپنی امان میں رکھے۔'' ماں جی نے تہہ دل
شمائلہ کو دعا دی لیکن اس کے لفظ اچانک ٹوٹ پھوٹ گئے۔ شمائلہ نے پھر ماں جی کو ڈھ
دیتے ہوئے کہا۔ ''ماں جی میری وجہ سے آپ کوئی بات دل پر نہ لیں ...... لیکن ایک
آپ کو کرنا ہوگا۔''

ماں جی جواب میں کچھ نہیں بولیں اور سوالیہ نظروں سے شمائلہ کو دیکھنے لگیں تو
نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ رات کی خدمت گار کا بندوبست کرلیں
اب یہاں نہیں رہ سکوں گی۔''

''کیا...... کیا کہا تم نے؟'' ماں چونکی۔ ''کیا مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی تم؟''

''ہاں ماں جی! میرا اب یہاں رہنا درست نہیں ہے۔'' شمائلہ نے کھل کر کہا
ساتھ ہی ماں جی کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا، وہ بہت جذباتی ہوگئی تھ
ماں جی غمزدہ ہوگئیں۔

''تم تو بیٹی بنی تھیں میری؟'' ماں جی نے صدمے سے کہا۔ ان کی آواز میں
پیدا ہوگئی تھی۔

''بیٹی تو میں ہوں آپ کی ماں جی!'' شمائلہ بولی۔

''تو پھر چھوڑ کر کیوں جارہی ہو؟'' ماں جی بولیں۔ ''میں نے سنا تھا بیٹے ماں
کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن بیٹی کبھی نہیں چھوڑتی، تم کیسی بیٹی ہو؟ کہو چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔''

''ماں جی! مجھے جانا ہوگا اب دل اٹھ گیا ہے۔'' وہ دل برداشتہ ہوکر بیزاری

بولی۔
''مجھ سے پہلے دل اٹھ گیا ہے تمہارا......'' ماں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
''تھوڑی دیر پہلے کا دھچکا کافی نہیں کہ دوسرا صدمہ دے رہی ہو۔'' اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ''مت چھوڑو مجھے بیٹی!''
''نہیں ماں جی! اب آپ مجھے نہیں روک سکیں گی، مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے اس گھر میں کوئی راکشش موجود ہے جو کسی وقت بھی مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔'' شمائلہ نے بہت دکھ اور خوف سے کہا اور ماں نے سر اور جسم کو قدرے تیزی سے حرکت دی جو ماں جی کے مردہ جسم کے لحاظ سے خلاف معمول اور خلاف توقع تھی۔ شمائلہ نے محسوس کیا کہ ماں کے مردہ بدن میں جیسے ایک انوکھا کرنٹ آ رہا ہو۔ ماں جی کے جسم میں ایک نامعلوم سی لرزش ہوئی اور شمائلہ حیرت زدہ ہو گئی اور اس نے سوچا کہ شاید اس دکھ کی گھڑی میں ماں کو ایک ایسا شدید جھٹکا لگا ہے کہ قدرت نے ایک خوشگوار معجزہ دکھا دیا ہے جس کی رو سے ماں کے جسم میں جیسے خون گردش کرنے لگا ہے اور وہ اللہ کے کرم سے فوراً اپنے پاؤں پر اٹھ کھڑی ہوں گی۔
''ایسا ...... کرو'' ماں جی کے ہونٹ دھیرے دھیرے کپکپائے اور آنکھوں کے اشارے سے انہوں نے شمائلہ کو کارنس پر رکھی ہوئی کوئی چیز اٹھانے کو کہا۔
''چیک بک......؟'' کارنس پر ایک چیک بک رکھی تھی جو شمائلہ نے اٹھا کے تجسس سے پوچھا۔
''ہاں ...... یہ رکھ لو۔'' ماں جی نے کہا۔
''ماں جی کیا ہے یہ؟'' شمائلہ نے تجسس سے پوچھا۔
''اس کے اندر ...... میں نے چیکس سائن کر کے رکھے ہیں تمہارے لئے۔ جب اور جتنا جی چاہے پیسہ نکال لینا......'' وہ بمشکل بولی۔
''نہیں ماں جی! نہیں......'' شمائلہ نے چیک بک واپس کارنس پر رکھتے ہوئے گھبراہٹ میں کہا۔
''ہاں شمو رکھ لو...... تم بیٹی ہو میری ...... کیا بیٹی کا حق ......'' وہ جملہ مکمل نہیں کر پائیں اور ان کے سینے میں ہلکا ہلکا زیر و بم پیدا ہوا۔ سانس جو کچھ تیز چل رہی تھی آہستہ ہوئی اور آہستہ ہوتے ہوئے تھم گئی اور آنکھیں ٹیڑھی سی ہو کر شمائلہ کی طرف مڑ گئیں۔
''ماں جی!'' شمائلہ دہل گئی۔ ''ماں جی......'' شمائلہ کی ایک رندھی ہوئی چیخ نکلی اور

شمائلہ کے ہاتھوں میں ماں جی کا نازک ہاتھ سوکھے پتے کی طرح سخت ٹھنڈا اور بے جان ہو گیا اور ماں جی کا جسم جو تھوڑی دیر پہلے لرزہ تھا اس شمع کی طرح نکلا جو گل ہونے سے پہلے بھڑکتی ہے۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں ابھی تک شمائلہ کی جانب تھیں۔

''ماں جی! اب تو میں چھوڑ سکتی ہوں ناں آپ کو؟ آپ تو پہلے ہی مجھے چھوڑ گئی ہیں۔'' شمائلہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی اور اس کی ہچکیاں آسیب زدہ بنگلے کے در و دیوار میں گم ہو کے رہ گئیں۔

''اگر اتنا ہی مختصر عرصے کے لئے ملنا تھا تو پھر اتنی محبت کیوں دی تھی ماں جی..... اس لئے کہ تمہاری قبر پر پیچھے کوئی پانی اور پھول ڈالنے والا ہو۔'' شمائلہ ماں جی کی قبر پر بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی اور دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ آج ماں جی کی تدفین کو تیسرا دن تھا، رسم کے مطابق لوگ تیسرے دن سوم کرتے ہیں۔ مرنے والے یا مرنے والی کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کرتے ہیں۔ پھر دیگیں پکتی ہیں، پلاؤ بریانی کھا کر فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں ان سب چیزوں کا مردے کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں لیکن مرحوم یا مرحومہ کے گھر میں کچھ افراد ضرور جمع ہو جاتے ہیں۔ سیاست کی بات ہوتی ہے حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا ہے۔ کسی کی تعریف کسی کی برائی ہوتی ہے۔ مرنے والے یا مرنے والی کو بھی کوئی یاد کرتا ہے اور یوں احساس ہوتا ہے کہ مرنے والے کو لوگ بھولے نہیں ہیں اور قبر پر بیٹھی شمائلہ سوچ رہی تھی کہ معلوم نہیں ماں جی کے گھر میں کوئی فاتحہ خوانی کوئی رسم قل ہوتی ہے کہ نہیں۔ کیونکہ شمائلہ ماں جی کی موت کے دن جنازہ اٹھنے تک گھر میں موجود تھی اور خوب روئی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ماں سے بہت زیادہ پیار کرنے والی بیٹی روتی ہے اور جنازہ جب گلی سے نکلا تو دوسری گلی سے شمائلہ نکل گئی تھی اور اس کے بعد لوٹ کر نہیں گئی۔ اس نے بیگم کلثوم کو دیکھا تھا جس نے خلاف معمول آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا لیا تھا شاید آنکھیں چھپانا چاہتی تھی کیونکہ دل روتا ہے تو آنکھیں روتی ہیں اور سیاہ شیشوں کے پیچھے کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ آنکھیں رو رہی ہیں یا نہیں۔

شمائلہ نے محسوس کیا تھا کہ ماں جی کے پیچھے رونے والی کوئی نہیں تھی اور شاید اسی لئے اس نے شمائلہ کو اتنی محبت دی تھی کہ کوئی پیچھے یاد کرنے والی اور رونے والی چھوڑ جائے اور شمائلہ نے محسوس کیا تھا کہ ماں جی دھن دولت جائیداد تو بہت چھوڑ گئی ہے لیکن رونے والی ایک شمائلہ ہی ہے اور پھر وہ لوٹ کر کوٹھی میں نہیں گئی تھی اور آج جب وہ تیسرے دن

قبر پر آئی تو اس نے محسوس کیا کہ قبر خشک تھی اور قبر پر باسی پھول پڑے تھے جو غالباً پہلے دن ڈالے گئے تھے۔ شمائلہ نے گورکن سے کہہ کر پانی قبر پر ڈلوایا، پھول کی پتیاں بکھیریں اور پھر خوب روئی اور روتے ہوئے قبر کے ساتھ جی بھر کے باتیں کیں۔ پھر جب وہ قبرستان سے باہر نکلنے لگی تو قبرستان کے گیٹ کے پاس پہنچ کر ایک دم نہ صرف چونکی بلکہ خوفزدہ بھی ہوگئی۔

رجب گیٹ پر کھڑا دیدے پھاڑ پھاڑ کے اس کو دیکھ رہا تھا، شمائلہ تھوڑی سی ٹھٹکی لیکن رکی نہیں۔ وہ تیز تیز ڈگ بھرتی رجب کی طرف دیکھے بغیر اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ رجب شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی اور وہ یہ اندازہ نہیں کرسکی کہ رجب اپنی ماں کی قبر پر آیا ہے یا شمائلہ کی ٹوہ لیتا ہوا اس کے تعاقب میں آیا ہے۔ تاہم شمائلہ کی ٹیکسی قبرستان کے باہر کھڑی تھی۔ وہ جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھی اور پھر اس نے پلٹ کے قبرستان کی طرف نہیں دیکھا۔

پاکستانی ورچوئل لائبریری
ڈاٹ کام

''یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟'' زارا نے ایک دن شمائلہ کے قریب بیٹھ کر او نہایت محبت سے اس کے کندھے چھو کر کہا۔ فرید بھی از راہ ہمدری پاس بیٹھا تھا۔ شمائلہ۔ زارا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ چپ چاپ خلا میں گھورتی رہی۔

شمائلہ ماں جی کی موت کے بعد بہت بجھ گئی تھی اور اس طرح چپ رہنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ گھر کے سارے کاموں میں زارا کا ہاتھ بٹاتی تھی اور اس کی یہ پریشانی او خاموشی فرید اور زارا کے لئے تشویشناک ہوتی جا رہی تھی۔ کئی بار فرید نے بھی اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی بات کرنے کی کوشش کی لیکن شمائلہ کھلی نہیں اور نہ ہی اس کی پژمردگی دو ہوئی۔ پھر فرید نے زارا سے کہا کہ وہ شمائلہ سے بات کرے کہ کسی طرح اس کی خاموشی ٹوٹے۔

''کوئی بات کرو شمائلہ! آخر کب تک، اس طرح چپ رہ کر سوچتی اور کڑھتی رہو گی اپنی صحت کا خیال رکھو۔'' زارا نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے وہ اچھی عورت تھی تمہاری ماں کی طرح تھی لیکن ماں تو نہیں تھی اور ماں بھی ہوتی تو بھی مرنے والے کے ساتھ کوئی مر تو نہیں جاتا۔ اپنی صحت کے بارے میں سوچو۔''

''ہاں شمائلہ سنبھالو اپنے آپ کو، ہم تمہاری طرف سے بہت فکرمند ہو رہے ہیں۔'' فرید بھائی بولے۔

''کیوں بھائی جان! کیوں فکرمند ہیں آپ میرے لئے؟'' شمائلہ نے آخرکار طویل خاموشی کے بعد جیسے چپ کا روزہ توڑا۔ ''کیوں فکرمند ہیں آپ، مجھ سے کیا فائدہ ہے آپ کو؟''

''بات فائدے یا نقصان کی نہیں، بات درد کی ہے۔ فکرمند اس لئے ہیں کہ ہم تم سے پیار کرتے ہیں۔'' فرید نے بے ساختہ کہا۔

''کیوں...... کیوں مجھ سے پیار کرتے ہیں؟'' وہ بحث کرنے لگی۔

''اس لئے کہ تم بہن ہو ہماری۔'' فرید نے ترت کہا۔

''یہ کوئی جواز نہیں ہے محبت کرنے کا۔ سگے بہن بھائی آج کل پیار نہیں کرتے ایک دوسرے سے، میں تو آپ کی منہ بولی بہن ہوں۔'' شمائلہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''سگے بہن بھائی تو خون کے پیاسے بھی ہوتے ہیں۔ پیار تو منہ بولے رشتے ہی کرتے ہیں۔'' فرید بھی جیسے بحث کے ذریعے شمائلہ کو قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ''اگر ہم تم سے پیار کرتے ہیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے پہلی بار خلا سے نظریں ہٹائیں اور گردن گھما کر فرید اور زارا کو دیکھنے لگی۔

''کس بات سے ڈر لگتا ہے بیٹی!'' فرید بھائی نے پوچھا۔

''محبت سے۔'' وہ کھوئی ہوئی سی بولی۔

''محبت سے؟ ہم کچھ سمجھے نہیں۔'' فرید نے زارا کی طرف غور سے دیکھا اور پھر پُرتجسس انداز میں شمائلہ سے پوچھا۔ شمائلہ جو ابھی تک مخبوط الحواس سی تھی بولی۔ ''بھائی جان! بات یہ ہے کہ......'' وہ آہستہ آہستہ بولتے ہوئے اپنی الجھی ہوئی بات کی گرہ کھولنے لگی۔ ''اگر کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے تو اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے محبت سے۔ کیونکہ مجھے محبت راس نہیں آتی اور مجھ سے محبت کرنے والے میرا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔'' وہ خوف کے عالم میں مزید کہنے لگی۔ ''زاہد نے مجھ سے جو محبت کی ہے وہ کتابی تھی بلکہ کتابوں میں بھی ایسی محبت کی مثال نہیں ملتی اور ایک ذرا سی بات پر محبت کی تمام زنجیریں اس نے توڑ دیں بلکہ بات تو تھی ہی نہیں اور اگر بات تھی بھی تو وہی بات تھی کہ

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

شمائلہ شعر پڑھ کر زہر خند طریقے سے ہنسی اور پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''زاہد خود بھی ایک شعر بہت شوق سے پڑھتا تھا جب کبھی کسی بات پر مجھ سے ناچاقی ہو جاتی تو صلح میں پہل کرتے ہوئے ایک سے زیادہ مرتبہ اس نے یہ شعر پڑھا تھا کہ

بہت نازک مگر جب توڑیئے تو ٹوٹنا مشکل
یہ زنجیرِ محبت بھی عجب زنجیر ہوتی ہے

پھر یہ زنجیر اس نے خود توڑی ایسے جیسے کچا دھاگا ہو۔'' شمائلہ پھر ذرا سی تلخی کے ساتھ ہنسی اور جذباتی ہو کر کہنے لگی۔ ''پھر گئی تھی میں خدمت کرنے ایک بیمار عورت کے پاس تو چند روز میں ہی اس نے ماں کی محبت سے زیادہ محبت دی اور چھوڑ کر چلی گئی۔ اب

آپ لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ بھائی جان! زارا بہن! میں خوفزدہ ہوگئی ہوں کہ کہیں آپ مجھے چھوڑ نہ دیں۔'' وہ نہایت مخبوط الحواس طریقے سے بولی۔

''اوکم آف یو بے وقوف لڑکی۔'' فرید نے اسے پیار سے ڈانٹا جیسے چھوٹی بہن کو ڈانٹتے ہیں۔ ''یہ کیا وہم تم دل میں لے کر بیٹھ گئی ہو، بھلا ہم تمہیں چھوڑیں گے۔ نکال دو یہ خوف دل سے۔''

''ڈر مجھے اپنی وجہ سے نہیں ہے بھائی جان! ڈر مجھے یہ ہے کہ خدا نہ کرے خدا نہ کرے میری وجہ سے آپ لوگوں پر کوئی افتاد نہ آ پڑے۔ میرا منحوس سایہ......''

''نان سنس۔'' زارا نے پیار سے ڈانٹ پلانے کے انداز میں شمائلہ کی بات کاٹی۔ ''کیا ہوگیا تمہیں ...... کیوں اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو۔''

''مجھے میرے بچے بری طرح یاد آ رہے ہیں۔ وہ روز میرے خواب میں آتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ تکلیف میں ہوں۔''

''یہ بات تو ماننے والی ہے کہ تمہیں بچے یاد آتے ہیں لیکن پریشانی اس کا حل نہیں۔'' فرید نے کہا۔

''اس کا حل یہ ہے کہ مجھے جانے دیں کراچی، بھائی جان!'' شمائلہ نے حل بتایا۔

''کراچی تم زاہد کے پاس جاؤ گی؟'' فرید نے پوچھا۔

''تو کیا......؟'' وہ ادھوری بات بول کر رکی۔ کہنے لگی۔ ''کیا میں زاہد کے پاس نہیں جا سکتی؟''

''لیکن کس حیثیت سے جاؤ گی اس کے پاس۔'' فرید نے کہا۔

''کیا زاہد کے پاس جو لوگ جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے جاتے ہیں۔'' شمائلہ نے سوال کیا۔

''تم لوگ نہیں ہو شمائلہ! تم اس کی مطلقہ بیوی ہو۔'' فرید نے جیسے ایک رکاوٹ کھڑی کی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیوں مجھے طعنہ دیتے ہیں مطلقہ ہونے کا؟''

''یہ بات نہیں ہے۔'' فرید نے کچھ کہنا چاہا تو زارا نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

''اچھا یوں کرتے ہیں مجھے کراچی سے آ لینے دو۔'' فرید نے موضوع بدلا۔ ''میں

سارا حال احوال معلوم کر کے آؤں گا اور پھر تم چلی جانا۔ بھلا میں تمہیں جانے سے کیوں روکوں گا۔ تمہارے بچے ہیں، تمہارے جگر کے ٹکڑے۔ اپنے جگر کے ٹکڑوں سے کوئی کیسے جدا رہ سکتا ہے۔"

"لیکن آپ کب جائیں گے کراچی؟" وہ مضطرب ہو کر بولی اور فرید نے بہت آسان سے جواب دیا۔ "میں شاید ہفتہ تک جاتا لیکن میں اب کل ہی چلا جاؤں گا۔"

"سچ ...... کل۔" شمائلہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں کل بائی ایئر۔" فرید نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا اور اگلے دن ہی وہ ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی روانہ ہو گیا۔

چند روز تو شمائلہ نے بہت بے چینی سے فرید کا انتظار کیا کہ کب وہ واپس آئے بچوں کی خیر خبر لائے اور وہ بچوں سے ملنے کراچی چلی جائے اور اسی بہانے چاہے دور سے ہی سہی اپنے زاہد کو ایک نظر دیکھ لے گی اور اسی بہانے کئی مہینوں سے اپنی پیاسی اور اپنے محبوب کے درشن کو ترسی ہوئی آنکھوں کی پیاس بجھا لے گی اور اس طرح اپنے زاہد کو ایک نظر دیکھ کر، دل کی آگ کے الاؤ پر صبر کی مٹی ڈال کے ٹھنڈا کر لے گی لیکن یہ کیفیت اس پر چند روز رہی۔ اس نے فرید کی آمد کا بے چینی سے انتظار کیا لیکن معلوم نہیں اچانک اس کے من مندر میں کیا آگ لگی کہ ساری امیدیں اور جذبے جیسے سرد پڑ گئے اور زاہد کے لئے اس کے دل میں جو محبت کی جوت روشن تھی وہ اچانک نفرت کے انگاروں میں بدل گئی۔ اس نے گھر سے نکلتے وقت زاہد کی نظروں سے بچا کر اپنی اور زاہد کی شادی کی چھوٹی تصویر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی تھی اور جب بھی جی بھر کے رونے کو جی چاہتا تو تنہائی میں اس تصویر کو سینے سے لگاتی اور خوب روتی، پھر اچانک اس کے اندر ایسا مد و جزر آیا کہ زاہد علی کے لئے محبت کے کھلے ہوئے پھول نفرت کے انگاروں میں بدل گئے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، غصے میں بھری اٹھی۔ سوٹ کیس سے زاہد کی تصویر نکالی اور فریم شدہ تصویر دیوار پر دے ماری۔ زارا اتنے میں اندر آ گئی۔ اس نے دیکھا فریم کے شیشے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور شمائلہ غصے میں پھنکارے مار رہی ہے۔

"یہ کیا ہے؟" زارا نے تصویر اٹھائی، بال پڑے شیشے کو غور سے دیکھا اور شمائلہ سے مخاطب ہوئی۔ "یہ کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں۔ تصویر کیوں پھینکی؟"

"یہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ جب میرے دل میں اس کی کوئی جگہ نہیں تو میں اس

کی تصویر کیوں اپنے پاس رکھوں۔ میں نفرت کرتی ہوں اس سے نفرت ...... نفرت ....
نفرت۔'' شمائلہ غصے سے دانت پیستے ہوئے لفظ نفرت پر زور دے کر بولی۔

''دل سے کہتی ہو کہ تم نفرت کرتی ہو اس سے؟'' زارا نے دھیمے لہجے میں معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں یہ میرے دل کی آواز ہے۔'' وہ پھٹ پڑنے کے انداز میں بولی اور مزید کہنے لگی۔ ''ایسا کیا ہوا تھا مجھ سے کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ کرلیا۔ وہ اپنے آپ کو عالم فاضل سمجھتا ہے۔ لوگوں کو نیکی، صلح، بھائی چارے اور ضبط و تحمل کا درس دیتا ہے اور خود اس نے کسی سے کوئی درس نہیں سیکھا، لوگ جن کے دل بڑے ہوتے ہیں سات خون بھی معاف کر دیتے ہیں لیکن وہ اتنے چھوٹے دل کا اتنے کم ظرف کا آدمی نکلا کہ اس نے بلاوجہ مجھے کچرے کی طرح اٹھا کے گھر سے باہر پھینک دیا۔ وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ میں آج بھی اگر چاہوں تو اچھے سے اچھا زاہد مجھے مل سکتا ہے۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتے بولتے ہانپنے لگی۔

''بیٹھ جاؤ آرام سے شمائلہ!'' زارا نے شمائلہ کا ہاتھ تھام کر اسے پلنگ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''فرید کا فون آیا تھا، وہ ایک دو دن میں لوٹ آئے گا پھر تم چلی جانا کراچی زاہد کے پاس۔''

''میری جوتی جائے گی اس کے پاس۔'' اس کی نفرت کی آگ کسی طرح ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی۔

''بچوں سے تو ملو گی نا؟'' زارا نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔

''بھاڑ میں گئے بچے بھی، مجھے نہیں چاہئیں بچے۔'' وہ تنک کر بولی، پھر اس نے خود ہی آہستہ آہستہ اپنا غصہ کم کیا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر کہنے لگی۔ ''زارا جی میں کوئی کچرا نہیں، انسان ہوں۔ میری بھی عزت ہے اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب کبھی زاہد سے ملنے واپس نہیں جاؤں گی۔ فرید بھائی جان آ جائیں تو میں ان کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔''

❁

فرید تقریباً پندرہ دن کے بعد کراچی سے واپس آیا۔ اس دوران فرید کا زارا سے ٹیلیفون پر ضرور رابطہ رہا لیکن فرید اور شمائلہ کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوا اور نہ ہی زارا نے شمائلہ سے فرید کے کسی ٹیلیفون کا ذکر کیا۔ وہ بظاہر یہی تشویش ظاہر کرتی رہی کہ فرید نے

کراچی سے کوئی ٹیلیفون کیوں نہیں کیا اور ظاہر ہے شمائلہ فرید کی آمد کی منتظر تھی اور اسے بھی تشویش رہی ہو گی کہ فرید نے ٹیلیفون تک نہیں کیا لیکن اس نے ایسی کسی تشویش یا بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس نے کراچی جانا ہے اور نہ ہی بچوں اور بچوں کے باپ سے ملنا ہے۔

''تم کراچی کی خیر خیریت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھو گی۔'' فرید کراچی سے لوٹا تو اس نے شام تک کراچی کا کوئی حال احوال نہیں بتایا بلکہ اس انتظار میں رہا کہ شمائلہ اپنے اضطراب اور بے چینی کا مظاہر کرے گی لیکن شمائلہ نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی جیسے کراچی میں اس کا کوئی ہو ہی نہیں تو پھر فرید نے زبان کھولی اور پوچھا۔ ''تم کراچی کی خیر خیریت کے بارمیں کچھ نہیں پوچھو گی کیا؟''

''کیوں کراچی میں کوئی بم پھٹا ہے کیا؟'' شمائلہ نے ترت ایک جلا بھنا سا جواب دیا اور فرید شمائلہ کا یہ جواب سن کر حیران رہ گیا کیونکہ جب وہ کراچی گیا تھا تو اس وقت شمائلہ کراچی جانے کے لئے رسیاں تڑا رہی تھی اور بچوں کی جدائی اور زاہد کی محبت میں کسی بلی کی طرح تڑپ رہی تھی لیکن اب اچانک جیسے اس کے سارے جذبات سرد ہو گئے تھے اور وہ اتنی لاتعلق ہو کے بولی تھی جیسے کراچی میں اس کا کوئی بھی نہ ہو۔

''بہت جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی تمہارے لہجے میں شمائلہ۔'' فرید فکرمندی سے بولا۔ ''میرا تو یہی خیال تھا کہ تم کراچی کے حالات کے بارے میں بہت پریشان ہو گی، تمہیں رات دن بچوں کی یاد ستا رہی تھی۔ تم زاہد صاحب کے بارے میں بھی ایک ان کہا دکھ رکھتی ہیں لیکن......''

''لیکن یہ سب ختم ہو گیا بھائی جان!'' وہ فرید کی بات کاٹ کر بولی۔ ''میں آپ سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا؟'' فرید نے تجسس سے پوچھا۔

''یہی کہ میں نے بچے بھی چھوڑ دیئے اور زاہد کی شکل بھی اب کبھی نہیں دیکھوں گی۔'' وہ تنک کر بولی۔

''یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے کیا؟''

''ہاں حتمی اور آخری۔'' شمائلہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''تو پھر ٹھیک ہے کراچی کے بارے میں کچھ تمہیں بتانا بیکار ہے۔ کیونکہ میں تو بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔'' فرید نے شمائلہ کی ٹوہ لینے کے لئے کہا۔

''کیا؟'' شمائلہ نے کان کھڑے کیے، بظاہر عدم دلچسپی ظاہر کی۔

''چھوڑو ہٹاؤ جب تمہیں کوئی دلچسپی ہی نہیں تو پھر کیا بتاؤں؟''

شمائلہ بولی کچھ نہیں لیکن اس کے من میں جیسے ایک کھلبلی سی مچ گئی، اس نے متلاشی نظروں سے فرید کو، پھر زارا کو دیکھا اور قدرے تشویش سے کہنے لگی۔

''کیا بات ہے...... کیا ہوا کراچی میں؟''

''بتا دو فرید!'' زارا نے فرید سے کہا۔

''کیا ہوا بھائی جان بولیں نا؟'' وہ ایک دم تڑپ گئی اور اس کی تمام نفرت غم اور غصہ گہری تشویش میں بدل گیا۔

''کراچی سے کچھ زیادہ اچھی خبر کے ساتھ نہیں آیا ہوں۔'' فرید نے دھیرے سے کہا اور شمائلہ کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔ ''کیا ہوا کیا میرے بچے؟'' وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔

''بچے تمہارے خیریت سے ہیں۔'' فرید نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا زاہد؟'' شمائلہ نے دوسری تشویش ظاہر کی۔

''زاہد کی بھی خیریت ہے۔'' فرید نے کہا۔

''تو......!'' شمائلہ تشویش کے ساتھ الجھن میں بھی مبتلا ہو گئی۔

''دراصل تمہارے آنے کے بعد زاہد کو ایک شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔'' فرید نے انکشاف کیا۔

''اوہ گاڈ!'' شمائلہ دہل گئی۔ ''مجھے معلوم تھا وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ اب کیا حال ہے اس کا؟'' شمائلہ نے استفسار کیا۔

''وہ ٹھیک ہو گیا تھا پندرہ بیس دن ہسپتال میں رہا پھر ڈسچارج ہو کر گھر چلا گیا تھا لیکن......''

''لیکن کیا؟'' شمائلہ نے سخت اضطراب میں پوچھا۔

''لیکن کچھ دن پہلے اسے پھر اٹیک ہوا۔'' فرید نے کہا۔

''اوہ خدایا!'' شمائلہ تڑپ کر بولی۔ ''اب کہاں ہے زاہد؟''

''ہسپتال میں ہی ہے لیکن...... ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اب ایک اور اٹیک اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' فرید نے بتایا اور شمائلہ سخت پریشان ہو گئی۔ ''اے میرے خدا! میری زندگی بھی اسے دے دے۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دعا کی اور پوچھنے لگی۔ ''بھائی جان زاہد ہسپتال میں ہے تو میرے بچے

کہاں ہیں؟''
''بچوں کو ان کا انکل ساتھ لے گیا ہے، عابد بھائی کے پاس ہیں۔'' فرید نے بتایا۔
''مجھے فوراً کراچی پہنچنا ہے بھائی جان!'' کچھ دیر پہلے جو مصنوعی نفرت اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی وہ پھر سے محبت کا اُبلتا ہوا چشمہ بن گئی۔
''اب میں خود بھی تمہیں نہیں روکوں گا۔ تمہارا کراچی پہنچنا ضروری ہے۔ کب جانا چاہتی ہو؟'' فرید نے کہا۔
''آج ...... ابھی ...... اسی وقت......'' وہ پا بہ رکاب ہو کر بولی۔ ''جہاز کا پتہ کریں۔''
''ٹھیک ہے میں معلوم کرتا ہوں کون سا جہاز جا رہا ہے۔'' فرید نے بہت ہمدردی سے کہا اور ٹیلیفون اٹھا کے کراچی کی فلائٹ کا پتہ کیا اور شائلہ پہلی ممکنہ فلائٹ سے کراچی چلی گئی۔

''تو یہ ہے میرا شہزادہ۔'' شائلہ نے ہسپتال کے کمرے میں پُرسکون اور خاموش سوئے ہوئے زاہد کو دیکھا اور سوچنے لگی۔ وہ مغرب سے پہلے کراچی ایئرپورٹ پر پہنچ چکی تھی، ایئرپورٹ پر پہنچ کر پہلے وہ سیدھی گھر گئی کہ شاید بچے گھر میں موجود ہوں اور ان کے ذریعے مزید حال احوال معلوم ہو سکے حالانکہ فرید بھائی نے اسے بتایا تھا کہ بچے گھر پر نہیں ہیں اور بچوں کو زاہد کے بھائی عابد صاحب لے گئے ہیں۔ فرید کی بھی بچوں سے براہ راست ملاقات نہیں ہوئی تھی، وہ تھوڑی دیر کے لئے عابد سے ان کے آفس میں ملا تھا اور عابد سے فرید کے کچھ زیادہ بے تکلفانہ مراسم بھی نہیں تھے۔ فرید ان کے آفس میں اپنے ذاتی کام سے جایا کرتا تھا اور اس طرح ملاقات کی ایک سبیل نکل آئی تھی لیکن ملاقات بھی فاصلے سے ہوتی تھی لیکن اس مرتبہ فرید نے ملاقات کے لئے ایک نیا موقع نکالا تھا اور انہیں شائلہ کا حال احوال بتایا تھا۔ تاہم شائلہ کے حوالے سے نہ ہی عابد اور نہ ہی فرید نے کوئی کھل کر بات کی تھی البتہ عابد نے یہ ضرور بتایا تھا کہ بچے خیریت سے ہیں اور انہیں وہ اپنے پاس لے آئے ہیں لیکن یہ جاننے کے باوجود شائلہ سیدھی گھر چلی گئی تھی کہ شاید کسی عنوان بچے گھر میں مل جائیں لیکن گھر پر تالا پڑا ہوا تھا اور عابد کے گھر وہ جانا نہیں چاہتی تھی لہٰذا اس نے ٹیکسی چھوڑی نہیں اور اسی ٹیکسی کے ذریعے سیدھی ہسپتال پہنچی۔ کمرے میں جانے سے پہلے اس نے ڈیوٹی نرس سے ملاقات کی۔ اپنا رشتہ بلاتکلف بتایا اور زاہد کے

بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد اس کے کمرے میں پہنچی۔ زاہد اس وقت اپنے بیڈ پر کوئی خواب آور دوا لینے کے بعد پرسکون انداز میں سویا ہوا تھا۔ شمائلہ اس کے قریب پہنچی اور ٹکر ٹکر زاہد کو دیکھنے لگی۔

''تو یہ ہے میرا شہزادہ۔'' اس نے زاہد کے پرسکون چہرے کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی۔ ''وہی دبدبہ، وہی وقار، وہی مردانہ وجاہت لیکن کتنا کمزور اور زرد رو ہو گیا ہے۔'' وہ کھڑی کھڑی ٹکٹکی باندھے زاہد کے چہرے کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہی تو وہ چہرہ ہے جس سے اس نے زندگی میں پہلی بار اور آخری بار پیار کیا لیکن دیکھتے دیکھتے یہ چہرہ کس طرح اجنبی ہو گیا۔ کبھی جدا نہ ہونے والے دو جسم کس طرح دولخت ہو گئے اور ایک دوسرے کے وجود میں مدغم روحیں کیسے الگ ہو گئیں۔ ''سب قسمت کا کھیل ہے۔'' اس نے سوچا اور پھر اس کی نگاہ زاہد کے پاؤں پر پڑی اور وہ ان پاؤں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتی تھی۔ ''زاہد لوگوں کا چہرہ بھی اتنا خوبصورت نہیں ہوتا جتنے تمہارے پاؤں ہیں۔'' اور زاہد یہ سن کر کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرمانے لگتا تھا۔ شمائلہ نے غور سے دیکھا۔ اس کے پاؤں آج بھی اتنے ہی خوبصورت تھے لیکن پیروں کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا اور وہ یہ زردی دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی اور خود کو قصوروار ٹھہرا رہی تھی کہ زاہد کی اس خستہ حالی کی وہ ذمے وار ہے۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور کھولیں تو آنسو ٹپک پڑے، اس نے جھک کر نم آنکھیں آہستہ سے زاہد کے پیروں سے اس طرح لگائیں جیسے پھول کی پنکھڑیاں چھو رہی ہو۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ زاہد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ معلوم نہیں زاہد نے اس کی خوشبو کو محسوس کیا یا کوئی اور بات تھی کہ زاہد نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے شمائلہ کا دھندلا سا عکس دیکھ کر چونکا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دل کے آئینے پر لگی شمائلہ کی تصویر اس کے تصور سے باہر نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی ہے، اس نے یقین کرنے کے لئے دو تین بار آنکھوں کو کھولا بند کیا۔ شمائلہ کی جیتی جاگتی تصویر اس کے سامنے تھی اور شمائلہ کی آنکھوں سے زارو قطار آنسو برس رہے تھے۔ زاہد کو ایک دم جھٹکا لگا تھا۔

''تم......'' زاہد کے ہونٹ دھیرے دھیرے جنبش میں آئے اور اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات میں کہا۔

''ہاں زاہد میں......'' شمائلہ نے اپنی پور سے آنسو پونچھے۔ زاہد کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری

''لیکن......؟'' زاہد نے کچھ کہنا چاہا تو شمائلہ نے آہستہ سے انگلی کی پور سے اسے بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''بس بولو نہیں۔''

زاہد نے پلکیں جھپکائیں تو آنسو اس کے اختیار سے باہر ہو گئے۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آ گئی ہوں نا اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شمائلہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے زاہد کے گالوں سے بہتی شبنم کو پونچھا اور زاہد نے شمائلہ کے دوپٹے کا کونہ پکڑ کے آنکھوں سے لگایا اور آنسوؤں کا بند جیسے ٹوٹ گیا اور زاہد بے اختیار ہچکیوں کے ساتھ رو پڑا۔

''میں نے کہا نا، اب میں آ گئی ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شمائلہ نے زاہد کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور اس سے پیشتر کہ کوئی دکھ سکھ کی بات ہوتی، کوئی گلہ شکوہ کوئی راز و نیاز ہوتا کہ ڈاکٹر اور نرسوں کی ایک ٹیم اندر داخل ہوئی۔ وہ زاہد کا ایک تازہ ای سی جی بھی کرنا چاہتے تھے اور کچھ نئی آئی ہوئی رپورٹوں کا معائنہ بھی۔

''آپ پلیز باہر جائیں۔'' ایک ڈاکٹر نے شمائلہ سے کہا اور شمائلہ باہر چلی گئی۔

''آپ اندر جا سکتی ہیں۔'' ایک نرس نے کچھ دیر بعد برآمدے میں سے گزرتے ہوئے سرسری طور پر شمائلہ سے کہا اور شمائلہ تیزی سے زاہد کے کمرے کی طرف گئی۔ زاہد اس وقت تکیہ اونچا کر کے بیٹھا سراپا انتظار تھا جو آنسو تھمے ہوئے تھے وہ پھر چشمے کی طرح ابلنے لگے لیکن دونوں نے پلکوں پر ضبط کے بند باندھ لئے۔ دونوں کے سینے میں باتوں کے انبار جمع تھے جو کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ کے باہر آنا چاہتے تھے لیکن دونوں نے لفظوں کے سیلاب کو روک رکھا تھا اور دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیا کی جائے اور کہاں سے شروع کی جائے۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ہر لمحے چہرے کے جذبات اور تاثرات میں تبدیلی نمایاں ہوتی رہی۔ ایک افسوس، ایک ندامت، ایک پچھتاوا، ایک شکوہ، ایک شکایت، دونوں طرف تھی اور وہ جیسے دونوں کسی کٹہرے میں خاموش کھڑے تھے۔ دونوں مجرم ہوں یا دونوں معصوم۔

''کیوں ...... تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟'' آخرکار زاہد کے ضبط کا پیمانہ جیسے چھلکا ...... بالآخر وہ بول پڑا۔

''تم یہ سوال اتنے عرصے کے بعد آج پوچھ رہے ہو۔ تم نے اس دن کیوں نہیں

پوچھا جس دن کچھ سوچے، کچھ پوچھے بغیر مجھے ایک اجنبی کے سپرد کر کے ریل میں بٹھا دیا تھا۔'' شمائلہ کا ایک ایک لفظ شکوے اور شکایت کے آنسوؤں میں لپٹا ہوا تھا۔ ''تم نے اس وقت کیوں نہیں سوچا زاہد!''

''اس وقت نہ سوچنے کی ہی تو سزا بھگت رہا ہوں۔'' زاہد دکھ سے بولا۔ ''لیکن......''

''سزا تو میں بھی بھگت رہی ہوں۔'' شمائلہ زاہد کی بات کاٹ کر بولی۔ ''میں اس جرم کی سزا بھگت رہی ہوں جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔'' شمائلہ نے کہا اور زاہد پھٹی پھٹی آنکھوں سے سوالیہ نظروں کے ساتھ شمائلہ کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ کچھ پوچھے بغیر شمائلہ سے جواب چاہتا ہو۔

''ہاں زاہد اس دن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔'' وہ کلیجہ تھام کر بولی۔ ''تم نے جو کچھ دیکھا وہ کچھ بھی نہیں تھا اور اگر کچھ تھا تو دھوکا تھا...... تمہاری نظر کا فریب تھا۔ اس سانپ کو جس کو دوست سمجھ کر تم گھر کے اندر لائے تھے، تمہیں پتہ ہے وہ سانپ جس دن سے گھر میں گھسا، اس دن سے وہ میری تاک میں تھا اور ہماری خوشیوں سے بھری معصوم سی دنیا میں زہر گھولنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے ڈس تو نہیں سکا لیکن ہماری پیار بھری دنیا میں زہر گھول گیا۔ اس دن کچھ بھی نہیں ہوا تھا زاہد!'' شمائلہ آخری فقرہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ ''سب کچھ یکطرفہ تھا۔ وہ تنہائی اور موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر حاوی ہونا چاہتا تھا اور میں نے اس کو دو تھپڑ رسید کئے تھے اور میں نے اس سے کہا تھا کہ اب میں تمہاری شکایت زاہد سے کر دوں گی لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ تم اسی وقت گھر آئے اور تم نے کوئی وضاحت نہیں مانگی اور ایک انتہائی فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے سے بہت اچھا تھا کہ تم اسی وقت مجھے گولی مار دیتے لیکن تم نے میرے ساتھ اس مچھلی کا سا سلوک کیا جس کو پانی سے نکال کے اس طرح خشکی میں چھوڑیں کہ مرنے بھی نہ پائے اور جینے بھی نہ پائے۔'' وہ بولتے بولتے ہچکیوں سے رونے لگی۔

''اف میرے خدایا! میں نے یہ کیا کر دیا۔'' زاہد سینہ مل کر بولا۔ ''مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی۔''

''غلطی تم سے ایک نہیں ہوئی...... غلطیاں تم سے کئی ہوئی ہیں زاہد!'' شمائلہ تنک کر بولی۔ ''پہلی غلطی تم نے اس دن کی جب تم ایک اجنبی کو بازار سے پکڑ کر لائے اور گھر میں بسا دیا، اسے کمرہ دیا، اسے کھانے کی میز دی۔ اسے گھر کا ایک فرد بنایا اور نہیں سوچا کہ

تمہاری ایک جوان بیوی ہے۔ تم نے خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شاپنگ کے لئے مجھے فورس کر کے بھیجا۔" وہ تڑپی اور زاہد شدید دکھ کے لہجے میں کہنے لگا۔"میری نیت صاف تھی۔ میں اسے دوست سمجھتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دوست کے روپ میں وہ ایک سانپ، ایک پاگل کتا ہے۔"

"تم نے اپنی سادگی، اپنی سچائی اور اپنے اندھے اعتماد کی بدولت اسے مواقع فراہم کیے۔ یہ میں تھی جس نے کبھی اسے موقع سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا۔"

"تم اتنے عرصے اسے برداشت کرتی رہیں۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" وہ از راہ تاسف بولا اور پھر کہنے لگا۔"اگر پہلے مجھے پتہ چل جاتا تو میں......"

"میں تمہیں کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح خود گھر سے چلا جائے اور میں نے کوشش کی تھی کہ وہ چلا جائے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کوئی دکھ پہنچے کوئی صدمہ ہو، اس لئے چپ رہی۔"

"آخر صدمہ تو پہنچا نا۔" وہ دکھ سے بولا۔

"بلاوجہ۔" وہ روہانسی ہو کر خود کلامی کے لہجے میں بولی۔"میں نے تو زندگی میں تمہارے بغیر کچھ سوچا ہی نہیں زاہد! اگر ایک طرف دنیا کا سونا رکھ دیا جاتا اور دوسری طرف تم ہوتے میں آنکھ اٹھا کے بھی سونے کو نہ دیکھتی لیکن افسوس کہ تم نے بھی نہ پہچانا مجھے۔ میں نے تو ہمیشہ یہی سوچا کہ میں تمہاری ایک امانت ہوں، امانت تھی اور امانت رہوں گی۔"

"لیکن میں نے خود اس امانت کو کھو دیا ہے۔" وہ کف افسوس ملتے ہوئے بولا اور پھر خود ہی اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے کہنے لگا۔"لعنت ہے مجھ پر ایسا بھی کیا غصہ۔ اسی لئے تو غصہ حرام کیا گیا ہے۔ اس غصے کا جنون صبح سے شام تک کتنی بار ہمارے سر پر چڑھتا ہے اور اس غصے میں ہم کیسی کیسی نادانیاں اور کتنے غلط فیصلے کر بیٹھتے ہیں اور پھر بعد میں پچھتاتے اور بھگتتے ہیں جس طرح میں بھگت رہا ہوں۔"

"اور جس طرح میں بھگت رہی ہوں۔" وہ بیچ میں لقمہ دیتے ہوئے از راہِ افسوس بولی اور پھر کہنے لگی۔"تم کیا سمجھ رہے تھے جس آدمی کے ساتھ تم نے مجھے ریل میں بٹھا دیا تھا میں اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ ارے وہ تو کچھ دور جا کے کسی سٹیشن پر اتر گیا تھا۔" شمائلہ نے بتایا۔"اس میں تو اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ ایک دن بھی حالات کا مقابلہ کر سکتا۔ وہ زندگی کیا گزارتا میرے ساتھ ...... گھٹیا کمینہ اور بزدل آدمی۔" شمائلہ نے

آخری تین لفظ نہایت حقارت سے کہے۔

''ہاں مجھے تمہارے اس منہ بولے فرشتہ صفت بھائی فرید کے ذریعے معلوم ہوا کہ شمس تمہیں راستے میں چھوڑ گیا تھا۔'' زاہد نے بتایا۔

''ہاں اگر فرید بھائی جیسے لوگ نہ ہوتے تو میرا سچائی اور نیکی سے اعتبار اٹھ جاتا۔ شمائلہ بولی۔

''وہ بھی میرے فیصلے پر بہت افسوس کر رہے تھے۔'' زاہد نے ایک بار پھر از ر افسوس کہا۔

''کاش فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار تم نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی ہوتی'' شمائلہ نے کہا۔

''لیکن اب کیا ہو سکتا ہے اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔'' زاہد ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

''ہاں اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔'' شمائلہ رو پڑی ''لیکن میں تمہارے جسم کا ایک حصہ ہوں زاہد میں الگ نہیں ہو سکتی۔ تم سے الگ ہو کر مر جاؤں گی میں۔ تیر کو واپس کمان میں لاؤ زاہد!''

''لیکن کیسے؟'' زاہد تڑپ کر بولا۔

''جیسے بھی ہو...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' شمائلہ کا جی چاہا وہ زاہد کو اپنے سینے میں چھپا لے۔

''اور کیا میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں۔'' زاہد اضطراب دبے چینی اور محرومی سے بولا۔ ''دیکھ لو میں کیا تھا اور کیا بن گیا ہوں۔ یہ سب تم سے بچھڑنے کے بعد ہوا ہے...... مجھے دل کی بیماری کہاں تھی شموں!''

''کبھی نہیں...... کبھی نہیں۔ میں جانتی ہوں تم دل کے بیمار کبھی نہیں تھے، تمہارا دل تو میرے پاس تھا۔''

''اب بھی تمہارے پاس ہے لیکن......'' وہ کہتے کہتے رکا تو شمائلہ بولی۔ ''لیکن کیا ہم اب پھر مل گئے ہیں...... ہم پھر ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ہمارے بچے درمیان میں ہیں، ابھی کچھ نہیں بگڑا ہمارا، ہم ہیں تو میاں بیوی نا!''

''نہیں چندا!'' وہ رقت بھری آواز میں بولا۔ ''یہ چاند سا چہرہ اب میرا نہیں رہا۔''

''لیکن کیوں؟'' شمائلہ تڑپ کر بولی۔

''اس لئے کہ اب ہمارے درمیان قانون کی، اخلاق کی، شرع کی ایک دیوار حائل ہوگئی ہے۔ اب ہم کتنے ہی قریب ہوں۔ میاں بیوی کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے، اب تم میری گمشدہ جنت ہو۔''

''اوہ خدایا یہ کیا ہوگیا۔'' شمائلہ تڑپی۔

''میری کوتاہی۔'' وہ اعترافاً بولا۔ ''میں پاگل ہوگیا تھا۔ میری عقل پر، میرا جنون حاوی آ گیا تھا لیکن خیر وقت اب بھی ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلا۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لانا ہوگا۔'' زاہد کہتے کہتے رکا، شمائلہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے تھاما اور بہت فکر انگیز اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''یہ تیر واپس کمان میں آ سکتا ہے شمو!'' یہ کہہ کر اس نے شمائلہ کی کلائی تھامی اور بولا۔ ''سمجھ رہی ہوناں؟''

''کیا؟'' شمائلہ چونکی۔ وہ بات کچھ سمجھی، کچھ نہیں سمجھی تھی۔ ''تم وضاحت سے بولو۔''

''کے...... سے...... کیسے؟'' شمائلہ الجھن سے باہر نکلنے کے باوجود الجھ گئی تھی۔+

''اس کے لئے ہم دونوں کو قربانی دینی پڑے گی۔'' زاہد نے انکشاف کیا۔

''کھل کر کہو۔'' شمائلہ کے دل کی دھڑکن مزید تیز ہوگئی تھی۔

''تمہیں حلالہ کرنا ہوگا۔'' زاہد نے جیسے ایک توپ کا گولہ پھینک کر شمائلہ کے وجود کو اڑا دیا۔

''کیا...... کیا کہا تم نے؟'' شمائلہ لرز گئی۔ ''یہ تو صرف میری قربانی ہے تمہاری قربانی نہ ہوئی۔''

''میں جو عذاب اس وقت بھگت رہا ہوں اس سے زیادہ قربانی کیا ہوگی؟'' وہ بدیدہ ہوکر بولا۔

''اور پھر اس کے بعد۔'' شمائلہ نے ایک زخمی پرندے کی طرح زاہد کو دیکھا اور مزید کہنے لگی۔ ''اور اس کے بعد جو ایک ایک لمحہ تم پر بیتے گا وہ کیسا ہوگا۔''

''وہ مزید عذاب ہوگا جو میں سہہ لوں گا۔ اب جو میں نے ایک غلطی کی ہے تو اس کی سزا تو بھگتنا چاہئے ناں مجھے۔''

''سزا تو میں بھگتوں گی نا...... روز جیوں گی روز مروں گی۔'' شمائلہ نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

''ہاں جانم میرے گناہوں کی سزا تمہیں بھی بھگتنا پڑے گی اور اگر ہم دونوں ۔ دوبارہ ملنا ہے، میاں بیوی کی حیثیت سے، بچوں کے ماں باپ کی حیثیت سے، اگر ہم ۔ دوبارہ خوشیوں کی جنت کی طرف جانا ہے تو پھر ہمیں اس پل صراط سے گزرنا ہو گا شمی!'' زاہد بہت سنجیدگی اور جذباتی انداز میں بولا۔'' شمائلہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی اور ا سے پیشتر کہ وہ کچھ بولتی معاً موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ شمائلہ فون کی آواز سن کر چونکی۔

''کیا تمہارے پاس موبائل فون ہے؟'' شمائلہ نے تکیے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں ...... میری بیماری کے بعد بھائی جان نے یہاں رکھ دیا تھا تاکہ میں ان کے رابطے میں رہوں۔ مجھے پکڑانا ذرا فون۔'' زاہد بولا اور شمائلہ نے فون اٹھا کے زاہد کو دیا۔ زاہد کے بھائی کا فون تھا۔

''ہیلو!'' زاہد گویا ہوا۔'' جی بھائی جان بہتر ہوں، آپ ابھی آ رہے ہیں؟''

''بچے۔'' شمائلہ نے زاہد کے کان میں سرگوشی کی۔ یہ اس نے بچوں کو لانے کا مطالبہ کیا تھا۔

''بھائی جان! بچوں کو ساتھ لیتے آیئے گا۔ ٹھیک ہے بھائی جان!'' زاہد نے فون بند کیا اور کسی قدر تشویش سے بولا۔'' بھائی جان آ رہے ہیں۔''

''تو......!'' شمائلہ نے تجسس سے پوچھا۔

''ایسا کرو یہ دراز کھولو اور اس میں سے چابی نکالو۔'' اس نے اپنے پلنگ کے ساتھ رکھے کیباٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ شمائلہ پوری بات نہ سمجھتے ہوئے اٹھی دراز کھولا اور چابیاں نکالیں۔

''یہ تو گھر کی چابیاں ہیں۔'' شمائلہ نے چابیاں پہچانتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم گھر چلی جاؤ، میں نہیں چاہتا اس وقت بھائی جان سے تمہارا آمنا سامنا ہو۔'' زاہد محتاط طریقے سے بولا۔'' معلوم نہیں بھائی جان کا تمہارے ساتھ کیا رویہ ہو کیونکہ بھابھی جان نے بھائی جان کے آگے بہت زہر اگلا ہے۔''

''میرے خلاف۔'' شمائلہ نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' زاہد بولا۔'' ویسے تو بھائی جان بہت ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ مجھے درگزر کرنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن بھابھی جان کی بات کو بہت مانتے ہیں۔ پھر ہو سکتا ہے بھابھی جان بھی اس وقت ان کے ساتھ آ رہی ہوں۔ کہیں کوئی ناخوشگوار بات نہ ہو جائے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم اس وقت گھر چلی جاؤ۔ میں بھائی جان کو

سب کچھ سمجھا دوں گا۔ پھر کل ان کے ساتھ آرام سے بات کریں گے۔“
”لیکن مجھے بچوں سے ملنا ہے۔“ شمائلہ بچوں کے لئے بے چین ہو کر بولی۔
”بچے آ رہے ہیں نا...... میرا ایک سٹوڈنٹ ادھر ہی ہسپتال میں ہے۔ بچے میں اس کے ذریعے گھر بھجوا دوں گا تمہارے پاس اور کوئی بات ہوئی تو میں فون کر دوں گا۔“ زاہد نے تفصیل بتائی۔
”رات تمہارے پاس کون ہوتا ہے؟“ شمائلہ نے پوچھا۔
”بھائی جان کا ایک ملازم ہوتا ہے۔ حالانکہ کسی کی ضرورت نہیں ہے، سٹاف کافی خیال رکھتا ہے۔ اب تم آ گئی تو مجھے اطمینان ہے۔ تم رہو گی میرے پاس...... مگر آج کی رات گھر جاؤ اور اپنا خیال رکھنا۔“
”مجھ سے زیادہ تمہیں اپنا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔“ وہ انتہائی وابستگی سے بولی۔ پھر دونوں ایک لمحے کے لئے بھول گئے کہ اب میاں بیوی نہیں رہے۔

گھر پہنچ کر دس برس کی ساری یادیں ایک ایک کر کے اس کے دماغ میں فلم کی طرح چل گئیں اس نے ایک ایک کمرے میں ایک ایک کونہ دیکھا۔ گرد و غبار، مٹی دھول، بے ترتیبی اور ایک ویرانہ پن گھر کے اندر سے چھلکتا تھا لیکن گھر کے ایک ایک کونے سے اس کی اور زاہد کی محبت کے پھولوں کی مہک آ رہی تھی۔ اس کا بیڈ روم ویسا ہی تھا لیکن لگتا تھا کہ کئی دنوں سے اس کی جھاڑ پونچھ نہیں ہوئی ہے۔
وہ بچوں کا نہایت بے چینی سے انتظار کرنے لگی اور اسی انتظار میں فارغ بیٹھنے کے بجائے اپنے بیڈ روم کی ڈسٹنگ کی۔ بیڈ کی چادر تبدیل کی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر چیزیں قرینے سے سجائیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر ان کی شادی کی جو تصویر تھی وہ شمائلہ جاتے جاتے اپنے ساتھ لے گئی تھی لیکن یہ دیکھ کر شمائلہ کے من میں عجیب کیفیت پیدا ہوئی کہ ڈریسنگ ٹیبل پر ان کی شادی کی ایک اور تصویر رکھی ہوئی تھی جو زاہد نے کہیں اندر البم سے نکال کے بہت اچھے فریم میں لگا کر رکھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے بیڈ کے سرہانے کتابوں کے ساتھ ایک ڈائری دیکھی جو شمائلہ نے یونہی اٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگی تو ڈائری کے صفحے دیکھ کر تڑپ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ زاہد اس کے ساتھ بے پناہ محبت کرتا ہے لیکن اسے زاہد کی محبت کی اس شدت کا اندازہ نہیں تھا جو شدت ڈائری کے صفحات پر اسے بکھری ہوئی نظر آئی۔ زاہد ڈائری کبھی لکھتا ہی نہیں تھا اور یہ ڈائری اس نے شمائلہ کی جدائی کے بعد لکھنا

شروع کی تھی اور اس نے شمائلہ کی کوئی بات نہیں لکھی تھی بس ہر روز کی کیفیت تاریخ وا
درج تھی کہ شمائلہ سے بچھڑنے کے بعد اس کے دن کیسے گزرے اور اس نے یہ کیفیت بیا
کرنے کے لئے کئی پرانے اساتذہ اور جدید شعراء کے اشعار کا سہارا لیا تھا۔ شمائلہ جانتی تھ
کہ زاہد خود شاعر نہیں ہے لیکن لگتا تھا اس نے کئی جگہ خود شاعری کر کے اور ہجر کی کیفیت
بیان کی ہوئی تھی۔

وہ پڑھتی رہی اور اس کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔

''بچے ابھی تک نہیں آئے۔'' اچانک اسے یاد آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عابد بھا
اس کی آمد کا سن کر بہت برہم ہو گئے ہوں اور بھابھی نے بھی حشر اٹھا دیا ہو پھر شاید بچوا
سے ملاقات نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

''لیکن نہیں ایسا نہیں ہے ...... عابد بھائی اتنے سخت دل کے نہیں ہیں۔ زاہد کا بھ
یہی خیال ہے کہ بھائی جان درگزر کرنے والے انسان ہیں اور بھابھی جان نے اگر مخالفت
بھی کی تو تھوڑی سی برہمی کے بعد اسے منا لیں گے۔ شمائلہ نے خود ہی سوال کیا اور پھر خو
ہی جواب دے کر خود کو تسلی دی اور شدت سے بچوں کا انتظار کرنے لگی۔

''کوئی آیا ہے شاید۔'' اچانک اس نے گھر کے باہر گاڑی رکنے کی آواز سنی اور اس
کے دل کی دھڑکن غیر متوازن ہو گئی۔

''معلوم نہیں بچے اس سے کس طرح ملیں گے۔'' ایک اندیشہ سا اس کے من میں
پیدا ہوا کہ زاہد سے اس نے بچوں کی کیفیت ہی نہیں پوچھی تھی کہ وہ اس کے بارے میں
کس طرح اور کس انداز سے سوچتے ہیں۔

''ابھی پتہ چل جائے گا۔'' اس نے خود ہی جواب دیا اور کھڑکی کا پٹ تھوڑا ا
کھول کے باہر کی طرف دیکھا۔

باہر شام کے دھندلکے چھا گئے تھے۔ سٹریٹ بلبوں کی روشنیاں سڑکوں پر بکھر
دکھائی دے رہی تھیں لیکن گھر کے باہر کسی ذی روح کے آثار نہیں تھے جو گاڑی رکی تھی و
کسی کو اتار کے آگے چلی گئی تھی اور وہ ایسی جگہ رکی تھی کہ شمائلہ اسے دیکھ نہیں سکی کہ ٹیکسی تھ
یا کار۔ اس سے پیشتر کہ وہ دروازہ کھول کر باہر جاتی اور بچوں کو دیکھتی کہ معاً دستک ہوئ
...... کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زاہد نے کہا تھا کہ وہ اپنے کسی شاگرد کے ساتھ
بچوں کو گھر بھجوا دے گا۔ یقیناً اسی نے دستک دی ہو گی۔

''ٹھک ٹھک۔'' ایک دھیمی سی دستک مزید ہوئی۔ بچوں کو دیکھنے کا شوق اور انتظار

پیمانہ لبریز ہو گیا، وہ تیزی سے دروازے کی طرف گئی اور دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

''تم؟'' وہ چونکی اور ایک چیخ مارنے کے لئے منہ کھولا لیکن چیخ نکلنے سے پہلے ہی ایک فولادی ہاتھ شمائلہ کے دہانے پر تھا اور چیخ اس کے اندر ہی کہیں گھٹ کے رہ گئی۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

یہ شمس کا ہاتھ تھا اور اس نے اس طرح شمائلہ کے منہ کو بند کر دیا تھا کہ جیسے کسی کھولتے ہوئے ککر کا منہ بند کر دیا جاتا ہے اور بھاپ رک جاتی ہے۔ شمائلہ کی سانس بھی اسی طرح بند ہو گئی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اگر چند لمحے اور اس کی سانس اسی طرح رکی رہی تو وہ مر جائے گی۔

''یا اللہ یہ شیطان پھر کہاں سے وارد ہو گیا۔'' اس نے اندر ہی اندر فریاد کی۔

''تم نے مجھے بہت تڑپایا ہے۔ آج میں تمہیں تڑپاؤں گا ...... اور تڑپا تڑپا کے ماروں گا۔'' شمس نے نہایت وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

شمائلہ کے لئے شمس کا یہ بالکل مختلف، نا قابل فہم اور نفرت انگیز روپ تھا۔ وہ زاہد کا ایک پرانا اور جگری دوست تھا جسے زاہد اپنے جگر کا ٹکڑا بنا کے گھر لایا اور پھر شمائلہ نے اس کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کی نیت خراب ہوئی مان لیا کہ خوبصورت جوان عورت کو دیکھ کر فتور پیدا ہو گیا لیکن اب جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ تو ایک انتہائی وحشیانہ اور مجنونانہ بات تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اور دماغ پر جنون سوار تھا اور اس صورت حال نے شمائلہ کو لرزا کے رکھ دیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کسی لمحے اس کی سانس رک جائے گی۔ وہ تڑپ بھی نہ سکی۔

''م م م......'' وہ شمس کے فولادی ہاتھ کی گرفت میں کسمسائی۔ شمس نے ایک ہاتھ سے دروازہ بند کیا اور شمائلہ کو دھکیلتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

''میں ہاتھ ہٹا رہا ہوں تمہارے منہ سے ...... تا کہ تمہاری سانس جاری رہے لیکن تم نے اگر ایک آواز بھی نکالی تو یہ تمہاری آخری آواز ہو گی۔ سوچ لو میں تمہیں موقع دے رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر شمس نے آہستہ آہستہ ہاتھ کی گرفت کو ڈھیلا کر کے ہتھیلی کو تھوڑا سا اس کے منہ سے ہٹایا اور شمائلہ کے لئے سانس لینے کا راستہ چھوڑا۔

''آہ......'' شمائلہ نے ایک گھٹی ہوئی سانس باہر نکالی اور غصے سے بولی۔ ''تم کمینے تو تھے ہی لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اتنے کمینے ہو۔''

"جتنا تمہیں معلوم ہوا اس سے میں کئی گنا زیادہ کمینہ ہوں۔" وہ بے غیرتی سے ہنس کر بولا اور شائلہ کے اتنے قریب ہوا کہ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔

"ہٹ جاؤ پلیز مجھے چھوڑ دو۔" اس نے شمس کو دھکیلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو زاہد نے تم پر بھروسہ کیا تھا۔" وہ سمٹتے ہوئے بولی۔

"یہ اس کی غلطی تھی۔" شمس نے فوراً جواب دیا۔ "آج کے زمانے میں کبھی کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔"

شائلہ تڑپی اور بے بس سی ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ ایک زور کی چیخ مارے تاکہ شاید کوئی پاس پڑوس سے اس کی مدد کو پہنچے لیکن اس سے پیشتر کہ شائلہ منہ کھولتی شمس نے جیسے شائلہ کے ارادے کو بھانپ لیا۔ وہ انگشت شہادت آہستہ سے شائلہ کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے چپ رہنے کی تلقین کرنے کے انداز میں بولا۔ "اوں ہوں، میں نے اس شرط پر تمہاری سانس کھولی ہے کہ تم چیخو چلاؤ گی نہیں اور جیسا کہ میں نے بولا تھا۔ اگر آواز نکالی تو تمہاری آخری آواز ہو گی۔"

پھر وہ شائلہ پر ہلکا سا دباؤ ڈال کے تھوڑا سا پیچھے ہٹا اور غور سے شائلہ کے چہرے کو دیکھا جیسے ہلکے اندھیرے میں کوئی کتاب کا صفحہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

"واہ سبحان اللہ......" اس نے شائلہ کے حسن کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "واہ ہیلن آف ٹرائے کا چہرہ ہے لیکن الو ہے زاہد۔"

"اسے گالی نہ دے کتے......" شائلہ نے دل میں شمس کی گالی کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ تب شمس ہنس کر اس طرح بولا جیسے اس نے شائلہ کی گالی سن لی ہو۔ "زاہد کو میرا گالی دینا تمہیں اچھا نہیں لگا ناں ......لیکن حقیقت ہے کہ وہ الو ہے، گدھا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

وہ تھوڑا سا اور پیچھے ہٹ کر بولا۔ تب شائلہ کو لگا کہ وہ دست درازی کرنے کی بجائے بات چیت کے موڈ میں آ گیا ہے۔ یہ جان کر شائلہ کو تھوڑی سی تسلی ہوئی کہ اسے کچھ سوچنے کا موقع مل گیا ہے اور ہسپتال سے بچے آنے والے تھے شاید اس دوران بچے آ جائیں اور شائلہ کی بچت ہو جائے کیونکہ چیخ و پکار سے کوئی فائدہ نہیں تھا کہ دروازے بند تھے۔ کوئی فریاد سننے والا نہیں تھا اور وہ مکمل طور پر ایک درندے کے قبضے میں تھی۔

"اگر وہ اُلو نہ ہوتا تو کبھی مجھے گھر میں نہ رکھتا۔ پھر اگر اس میں عقل ہوتی اور تمہارے حسن کی قدر ہوتی تو مجھے بھلے مار دیتا لیکن تمہیں طلاق دے کر میرے ساتھ روانہ

نہ کرتا ...... کیا غلط کہا میں نے۔'' وہ اس طرح شمائلہ سے مخاطب ہوا جیسے اس کا جواب چاہتا ہو۔

''یہ کمینہ بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' شمائلہ نے دل میں سوچا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں ......'' وہ اس طرح بولا جیسے شمائلہ سے گفتگو کر رہا
شمائلہ نے اب دل میں بھی کوئی بات سوچنا بند کر دی۔ اس خیال سے کہ اس کے مدمقا خبیث آدمی اس کے دل کی ہر بات کا جواب دے رہا تھا۔

''اب سنو میں ٹرین سے کیوں اتر گیا تھا وہ جو تمہارا بھائی بن گیا ہے فریدالدین، اس کے ساتھ جب میں ایک سٹیشن پر نیچے اترا تو اس نے مجھے دھمکی دے تھا کہ وہ تمہیں اپنے گھر رکھے گا بہن بنا کر ...... اور کوئی غلط کام کرنے پر اس نے خطرناک نتیجے کے لئے تیار رہنے کا الٹی میٹم دے دیا تھا اس لئے میں نے سوچا کہ بندے کے ہوتے ہوئے دال نہیں گلے گی میری۔'' شمس نے بتایا۔

''دال تو اب بھی نہیں گلے گی تیری شیطان آدمی۔'' شمائلہ نے کچھ سوچ کر دل کہا۔

''کیسے نہیں گلے گی؟'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''اب تو دال بھی میرے قبضے میں مرغی بھی اور مچھلی بھی۔ اصل میں تیرا کچھ حساب رہتا ہے جو میں اس گھر کے اندر آرام سے چکانا چاہتا تھا لیکن تم نے نہیں چکانے دیا، آج وہی چکانے آیا ہوں۔''

''نہیں نہیں تم میرے قریب نہیں آنا۔'' شمائلہ نے اسے پرے دھکیلنے کی کو کرتے ہوئے کہا اور شمس کے ارادے کو بھانپ کر تڑپ گئی جیسے مچھلی بن پانی کے تڑ ہے۔

''کہتے ہیں مچھلی دو طرح اچھی لگتی ہے۔'' شمس بولا۔ ''تیرتے ہوئے اور تڑ ہوئے لیکن لوگ بھول گئے کہ اصل ذائقہ اس کے کھانے میں ہے۔'' یہ کہہ کر شمس ایک جانور بن گیا اور اس طرح جھپٹ پڑا جیسے بھیڑیا بکری پر جھپٹتا ہے۔

شمائلہ کو بچپن کا وہ چمگادڑ یاد آ گیا جس نے اس کے ایک عزیز کے چہرے کی ا ادھیڑ دی تھی، اسے لگا کہ آج وہ بھی زخم زخم ہو کے مسخ ہو جائے گی، چیخنے چلانے کی گنجائش نہیں تھی۔

اس وقت شمائلہ نے اللہ سے مدد مانگی، اپنے اعصاب کو قابو میں کیا، اپنی بکھ ہوئی قوت کو سمیٹا، اپنے دماغ پر زور دے کر عقل سے جو کام لیا تو معلوم نہیں کہاں سے

طاقت اس کے اندر آئی اور اس نے پوری قوت سے ایک کک حملہ آور شمس کے جو لگائی تو شمس تکلیف سے دھاڑا اس کے دونوں ہاتھ جھٹکے سے کھل گئے اور وہ اس طرح تڑپا جیسے کتے کی دم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا ہو۔ وہ ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایک بلا شائلہ کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گھما کے بلا شمس کے سر پر دے مارا۔ فوراً ہی دوسرا بلا پڑا۔ شمس متزلزل ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ گرتا پڑتا پلٹ کر شائلہ پر جھپٹتا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی جس میں زاہد نے اپنے شاگرد کے ساتھ بچوں کو گھر بھیجا تھا۔ بچے باہر ہی سے پکارنے لگے۔ ''امی ...... امی ...... امی۔'' شمس کو چونکہ گھر کے تمام راستے معلوم تھے اس لئے وہ عقبی دروازے سے فرار ہو گیا اور حواس باختہ شائلہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور بچوں کے لئے دروازہ کھول دیا۔

''پھر آؤں گا۔'' شمس بھاگتے دھمکی دے گیا۔

❁

دروازہ کھلتے ہی عینی اور علی، ماں کو دیکھ کر بے اختیار ماں کی طرف لپکے۔ شائلہ بھی تیزی سے بچوں کی طرف بڑھی۔ زاہد کا جو شاگرد بچوں کو لے کر آیا تھا، وہ ماں بچوں کا ملاپ دیکھ کر دروازے سے ہی لوٹ گیا۔ اس وقت شائلہ کی حالت بہت خستہ تھی۔ بالکل بکھرے اور کپڑے چرمرائے ہوئے تھے اور گالوں پر نیل کے نشان تھے جیسے کسی کتے نے کاٹ لیا ہو۔ شائلہ کے نزدیک شمس پاگل کتا ہی تو تھا لیکن اس وقت اس نے کتے کے بارے میں مزید کچھ نہیں سوچا۔ بس بے اختیار دونوں بچوں کو ایک ساتھ بازوؤں میں لے کر زور زور سے بھینچنے لگی۔ بچے بھی ماں سے چمٹ کر ماں کو چومنے لگے۔ شائلہ نے بچوں کو کچھ نہیں بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک شیطان آیا تھا بس حفظ ماتقدم کے طور پر دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی۔ عقبی دروازوں کو بھی چیک کیا اور بچوں کو لپٹاتے ہوئے پلنگ پر لے گئی اور دونوں کو سینے سے لگا کے خوب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور دونوں بچے بھی ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے۔

''امی! آپ کیوں چلی گئی تھیں؟'' علی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''امی! آپ کہاں چلی گئی تھیں؟'' یہی سوال عینی نے بہ انداز دگر روتے ہوئے پوچھا۔

''میں کہیں نہیں گئی تھی بچو ...... میرا دل تم لوگوں کے ساتھ تھا۔'' شائلہ کی بھی ہچکیاں بے قابو ہو گئیں۔ اس نے دونوں کو زور زور سے بھینچا اور بار بار ان کی شکلیں اس طرح

دیکھنے لگی جیسے کوئی کسی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔"

"میں صدقے جاؤں، میں قربان جاؤں۔ کتنے کمزور ہو گئے ہو تم دونوں۔ چھوٹا سا منہ نکل آیا ہے۔" وہ بچوں کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے نا، میری وجہ سے تم پر مصیبت آئی ہے۔ لعنت ہے مجھ پر ہزار بار لعنت۔ میں کتنی بری ہوں۔ ہوں نا بری۔ ہیں علی، عینی بولو تمہاری ماں بہت بری ہے نا...... کیوں علی۔"

"نہیں امی...... آپ بہت اچھی ہیں۔" علی نے کہا اور شمائلہ نے انگلی کی پور سے اس کے آنسو پوچھتے ہوئے پوچھا۔ "سچ......"

"ہاں......" علی نے آہستہ سے کہا۔

"تم کیا کہتی ہو عینی تم بھی مجھے اچھا سمجھتی ہو کیا؟" اس نے عینی کو قریب کیا اور سینے سے لگا کے پوچھا۔

"ہاں امی آپ بہت اچھی ہیں۔" عینی نہایت معصومیت سے بولی اور شمائلہ نے ایک آہ بھری اور عینی کو زور سے لپٹاتے ہوئے بولی۔ "میں صدقے جاؤں، اب بھی مجھے اچھا سمجھتے ہو تم لوگ لیکن تمہارے ابو تو مجھے بہت برا سمجھتے ہوں گے...... ہے نا؟" اس نے دونوں بچوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "بولو ناں ابو کیا کہتے ہیں، میں بہت بری ہوں؟" دونوں کچھ دیر چپ رہے اور پھر عینی ننھی سی آواز میں بولی۔ "ابو کہتے ہیں آپ بہت اچھی ہیں۔"

"کیا......؟" شمائلہ چونکی اور پھر پوچھنے لگی۔ "کیا واقعی ابو کہتے ہیں میں بہت اچھی ہوں...... نہ، نہ نہ اب وہ کبھی ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

"ہاں امی! ابو کہتے ہیں آپ بہت اچھی ہیں۔" علی نے کہا۔ "وہ آپ کو بہت یاد کرتے تھے اور یاد کر کر کے روتے تھے...... اسی لئے بیمار ہو گئے۔"

"اوہ خدایا!" وہ علی کی بات سن کر دہل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا کلیجہ پھٹ کر باہر آ جائے گا۔ "کتنے اچھے ہیں ابو تمہارے، بیٹے کتنے اچھے ہیں۔" وہ جذبات پر قابو نہ پا سکی۔

"دشمس انکل گندے ہیں امی!" معاً عینی اپنی توتلی زبان میں بولی۔

"اس کا نام نہ لو بیٹی......!" شمائلہ نے تڑپ کر عینی کو گلے لگایا اور کہنے لگی۔ "اپنی پاک اور معصوم زبان پر اس ذلیل کا نام نہ لاؤ بیٹی!"

''میں اسے ماروں گا۔'' علی نے مٹھیاں بھینچ کر غصے میں کہا۔

''ماروں گی تو میں اسے بیٹے۔'' شمائلہ ایک دم لاوا بن کر دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''میں اسے ایسی جگہ ماروں گی جہاں وہ پانی نہیں مانگے گا...... نہیں چھوڑوں گی۔''

''امی......!'' عینی نے ماں کی مختلف شکل دیکھی تو پکار اٹھی۔

''امی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' اب کے علی بھی ماں کی کیفیت دیکھ کر چونکا۔ ''آپ نفرت کرتی ہیں نا اس سے؟''

''ہاں بیٹے!'' شمائلہ اپنے حواسوں میں آتے ہوئے بولی۔ ''شدید نفرت ...... میں نے زندگی میں صرف ایک بار محبت کی ہے بچو اور وہ تمہارے باپ سے اور میں نے زندگی میں ایک بار نفرت کی ہے اور وہ اس خبیث آدمی سے جس نے ہمارا ہنستا بستا گھر برباد کر دیا۔'' اس نے دوبارہ اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور مجسمہ انتقام بن کر بولی۔ میں نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا لیکن زندگی میں اب پہلی مرتبہ کسی سے انتقام لوں گی اور یہ میرا عہد ہے۔''

بچے حیرت و استعجاب کا نمونہ بن کر ماں کو ٹکر ٹکر تکنے لگے۔ ماں خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ معاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ہسپتال سے زاہد علی کا ٹیلیفون تھا۔

❁

رات بھر بچے اپنے گھر میں ہی ماں کے ساتھ رہے۔ شمائلہ نے بچوں کو کلیجے سے لگا کے خوب دل کی حسرتیں نکالیں۔ بچوں نے بھی رات جاگ کے ماں سے باتیں کرتے ہوئے گزاری۔ شمائلہ کو اس بات کا بہت صدمہ ہوا کہ بچوں کی پڑھائی میں تسلسل نہیں رہا تھا۔ وہ بچے جو ایک دن بھی اسکول کا ناغہ نہیں کرتے تھے، اب تایا کے گھر جا کے ایک دم اسکول سے دور ہو گئے تھے اور شمائلہ کے لئے یہ بات انتہائی تکلیف کا باعث تھی کہ جن بچوں کا باپ لوگوں کی جہالت دور کرنے کی کوشش میں ان کی تاریک راہوں میں علم اور روشنی کے چراغ جلا رہا تھا اس کے اپنے بچے تعلیم سے محروم ہو رہے تھے اور اس کے لئے شمائلہ خود کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اپنے آپ کو کوسنے دے رہی تھی۔ تاہم وہ بچوں کی تعلیم کا تسلسل قائم کرنے کے بارے میں پکا منصوبہ بنا کے پھر گھر چھوڑنا چاہتی تھی۔ ہر چند کہ گھر چھوڑنے کے تصور سے اس کی روح کانپ جاتی تھی۔ اس کا اپنا بنایا ہوا، اپنا سجایا ہوا گھر اب اس کا اپنا نہیں تھا۔ آج وہ اپنے ہی بنائے ہوئے اور اپنے ہاتھوں سے سجائے ہوئے گھر میں کسی اجنبی کی طرح آئی تھی۔

شمائلہ نے اس گھر میں ایک رات بچوں کے ساتھ گزاری اور زاہد نے ہسپتال سے فون کر کے اسے بتایا کہ وہ کچھ دن بچوں کے پاس ہی رہے۔ زندگی میں آگے جو قدم اٹھا‌ ہے وہ اس کے ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اٹھایا جائے گا۔

شمائلہ نے زاہد کا فون آنے پر اسے شمس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس نے کس طرح شمائلہ پر حملہ کیا تھا۔ وہ یہ بات اسے بتانا بھی نہیں چاہتی تھی کہ زاہد پہلے ہی بہت ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ رنگت زرد پڑ گئی تھی اور جسم آدھا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ شمائلہ سے ملاقات کے وقت بار بار وہ اس اندیشے کا اظہار کر رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ ہسپتال سے زندہ واپس گھر جائے گا کہ نہیں کیونکہ اس کا دل بہت مجروح اور مخدوش ہو چکا تھا اور اس کے جو قلبی ٹیسٹس ہوئے تھے ان کی رو سے دل مرمت اور رفوگری کے قابل بھی نہیں رہا تھا اور وہ عیادت کو آنے والے پڑھے لکھے لوگوں کو دل کی کیفیت بتاتے ہوئے اکثر مصحفی کا یہ شعر پڑھ دیتا تھا

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

اور جب شمائلہ نے اس کی کیفیت پوچھی تو شمائلہ کو بھی زاہد نے یہی شعر سنایا تھا اور شمائلہ کا کلیجہ جیسے منہ کو آ گیا تھا اور اب جبکہ شمائلہ زاہد کے دل کی کیفیات اور خدشات سے واقف تھی تو وہ شمس کے حوالے سے کوئی بات کر کے اسے مزید دکھ اور صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ شمائلہ نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب آنے والے وقتوں کے تمام حوادث کا تنہا ہی مقابلہ کرے گی۔ تاہم اس کی غمزدہ زندگی میں یہ دو دن بہت عارضی خوشی کے آئے تھے کہ اس کے بچھڑے ہوئے بچے اس سے آن ملے تھے اور اس نے گلا دن اور اگلی رات بھی بچوں کے ساتھ گزاری تھی۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کے بچوں کو کھلایا تھا اور زاہد کے لئے بھی پرہیزی کھانا بنا کے اس کے شاگرد کے ہاتھ ہسپتال بھجوایا تھا لیکن خود ہسپتال نہیں گئی تھی کہ زاہد نے ٹیلیفون کر کے منع کر دیا تھا کیونکہ بڑے بھائی اور ان کی بیگم بھابھی الماس نے شمائلہ کی آمد کی وجہ سے ہسپتال ہی میں اس کے سامنے بہت ہنگامہ کر دیا تھا اور انہیں شمائلہ کی ایک مطلقہ کی حیثیت سے واپسی قطعاً ناپسند تھی اور اب وہ نہیں چاہتے تھے کہ بچے کسی طرح بھی شمائلہ کی تحویل میں رہیں۔ تاہم شمائلہ دو دن سے گھر میں ایک عارضی جنت میں خود کو محسوس کر رہی تھی کہ اس کا اپنا بنایا ہوا گھر تھا جس گھر کی ایک ایک اینٹ پر محبت کے پھولوں کی خوشبو بکھری ہوئی تھی اور اس کے اپنے بچے اس کے پاس تھے جن کو بار بار چوم

کر اور گلے لگا کر اپنی حسرت نکال رہی تھی لیکن یہ عارضی خوشی کب تک اس کے نصیب میں ہے، اسے معلوم نہیں تھا۔ ایک خدشہ ہر وقت اسے لگا رہتا اور وہ ہر آہٹ پر گھبرا جاتی کہ شاید بھائی جان اور بھابھی آئے ہیں جو کسی بھی لمحے اسے کان سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کریں گیا ور یہ خدشہ اس کا بے بنیاد بھی نہیں تھا۔

معلوم نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ ابھی شمائلہ کو بچوں کے ساتھ وقت گزارے ہوئے دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اچانک شام کو بھائی جان اور بھابھی آ گئے۔ عابد نے تو ایک خاموش غصے اور نفرت کا مظاہرہ کیا لیکن بھابھی الماس نے نفرت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے پہلے تو دوہتڑ مار کے دروازہ توڑنے کے انداز میں کھلوایا اور پھر جھکڑ کی طرح اندر داخل ہوئیں اور داخل ہوتے ہی شمائلہ پر برس پڑیں۔

''کیوں ری آوارہ عورت اب کیا لینے آئی ہے، کہاں گیا ہے وہ لگا سگا؟ شرم کرو بے غیرت شرم کرو۔ کوئی دوسری ہوتی تو منہ نہ دکھاتی دوبارہ لیکن جس نے اپنے اوپر سے شرم وحیا کی چادر ہی اٹھا دی ہو وہ کیا شرمائے گی۔ لعنت ہے تجھ پر.......تھو......'' اور بھابھی نے تھو کہہ کر سچ مچ شمائلہ کے منہ پر تھوک دیا۔

''بھابھی جان......!'' شمائلہ اپنے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے چلا کر بولی۔ ''تمیز کے دائرے میں رہیے۔''

''واہ واہ...... واہ واہ...... دیکھ لی اس کی جرأت یہ اب ہمیں تمیز بھی سکھائے گی۔ اس کو کہتے ہیں کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے اس کی تو میں......'' یہ کہہ کر بھابھی الماس شمائلہ پر جھپٹی اور گھما کے ایک ہاتھ اس کے مارا لیکن شمائلہ نے بھابھی کی کلائی پکڑ کر ہاتھ راستے میں روک دیا اور تنبیہہ کرتے ہوئے بولی۔ ''خبردار بھابھی نہ میں چور ہوں نہ آپ کوتوال۔ منہ سے آپ نے بہت کچھ کہہ دیا ہے اب ہاتھ چلانے کی کوشش نہ کریں۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔'' شمائلہ نے دھیرے سے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کی اور بھابھی کی کلائی چھوڑ دی۔

''دیکھا......'' غصے سے بھابھی کا خون کھول گیا اور وہ عابد کی طرف مڑ کر بولیں۔ 'دیکھا یہ سب آپ لوگوں کی شہ دینے کا نتیجہ ہے۔ اگر زاہد میں غیرت ہوتی تو یہ بے شرم منہ نہیں دکھا سکتی تھی لیکن دیکھو کس ڈھٹائی سے واپس گھر میں براجمان ہو گئی ہے۔ چلو زاہد سے پوچھیں کہ جو عورت اب اس کی بیوی نہیں ہے تو اسے کس حیثیت سے گھر میں رکھا ہوا ہے، کیا داشتہ ہے اس کی؟''

''اُف خدایا......'' شمائلہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی لیکن اس نے ضبط کیا بولی نہیں۔

''میں پوچھتی ہوں ایک ہی باپ کی اولاد ہو، یہ کیسا خون ہے آپ کے اس بھ کی رگوں میں۔'' بھابھی عابد سے مخاطب ہو کر زاہد کو کوسنے دینے لگیں۔

''اچھا اب زاہد سے اور کچھ نہیں کہنا پہلے ہی تم نے بہت کچھ اس سے کہہ دیا۔ اس کی طبیعت بگڑ گئی اور اسے کچو کے نہ لگانا جا کے۔'' عابد نے بیوی کو ٹھنڈا رہنے کی تلقی کرتے ہوئے کہا۔

''اف اللہ......'' شمائلہ اندر ہی اندر تڑپی اور سوچنے لگی۔ ''معلوم نہیں یہ عورت زا کو کتنا پریشان کر کے آئی ہے کہ اس کی طبیعت بگڑ گئی۔

''میں کہہ رہی ہوں، سوچ کیا رہے ہو اس کو نکالئے دھکے دے کر باہر......'' بھا نے شوہر کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کہا اور پھر خود ہی شمائلہ کی طرف رخ کر کے بولی۔ ''نکا بدکردار یہاں سے باہر نہیں تو دھکے دوں گی۔'' وہ شمائلہ کی طرف بڑھی مگر شمائلہ نے دونو ہاتھوں سے اسے روک دیا۔ بھابھی ایک جھٹکا کھا کر رہ گئی۔

''دیکھا کیسے دھکا مارا ہے اور آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔'' وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔

''دیکھو بیگم ہم یہاں ہاتھا پائی کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ جس کام سے آئی ہ وہ کام کرو چلو اٹھاؤ بچوں کو۔'' عابد نے بیگم کو سمجھایا۔ ''اس کو گھر میں رکھنے یا نکالنے کا کا زاہد پر چھوڑ دو......البتہ بچے ہمارا خون ہیں ان کو سنبھالو۔''

''بچوں پر تو میں اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔'' بھابھی ترت بولی اور بچو کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''آ جاؤ بچو......'' اور بچے جو پہلے ہی سے سہمے کھڑے تھے مزید خوفزد ہو گئے حالانکہ وہ کئی مہینوں سے عابد اور بھابھی ہی کے پاس تھے لیکن اس وقت ماں سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔

''بچوں کو میں خود لے جاؤں گی، آپ چھوڑ دیں انہیں......'' شمائلہ بھابھی او بچوں کے درمیان حائل ہو گئی۔

''خبردار......'' اس مرتبہ عابد بھائی نے اپنا موڈ بدلا اور سخت غصے میں شمائلہ ک وارننگ دیتے ہوئے مخاطب ہوئے۔ ''میں نے بہت برداشت کیا ہے تمہیں۔ تم نے جو کچھ کیا وہ ہماری سات پشتوں میں کسی نے نہیں کیا تھا۔ میں نے برداشت کیا۔ تم نے ہمارے

خاندان کی ناک کٹوادی، میں نے برداشت کیا۔"
"لیکن میں برداشت نہیں کروں گی۔ میں ناک کے بدلے اس کی ناک آج کاٹ کے رہوں گی۔" معا بھابھی کو شوہر کی وجہ سے جوش آ گیا۔ ایک چھری ہاتھ لگ گئی اور اس نے لپک کر شمائلہ کی ناک پکڑنے کی کوشش کی لیکن شمائلہ نے دھکا دیا تو وہ پرے جا گریں۔
"خبردار......" شمائلہ نے بھابھی کو پرے دھکیلتے ہوئے غصے میں کہا۔
"پاگل مت بنو بیگم! بچوں کو سنبھالو۔" عابد نے بیگم کو جھنجھوڑا اور پھر دونوں نے مل کر بچوں کو دبوچ لیا۔
"تائے ابو چھوڑ دو۔" علی رویا۔
"مجھے بھی چھوڑ دو تائے ابو۔" عینی نے فریاد کی اور بھابھی نے زور سے شمائلہ کو دھکا دے کر پلنگ پر گرا دیا۔
"امی ...... امی......" علی اور عینی دونوں چلائے اور بازو ماں کی طرف بڑھا دیئے۔
"تم ہمارے پاس رہو گے بیٹے ابو کے گھر آنے تک۔" عابد نے دونوں بچوں کو پکارا۔
"ہاں علی تمہاری ماں ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے تمہارے باپ کو چھوڑ کر دوسرے آدمی سے شادی کر لی۔"
"یہ جھوٹ ہے بچو......" پلنگ پر گری ہوئی شمائلہ اٹھی اور چلاتی ہوئی بچوں کی طرف لپکی لیکن دونوں میاں بیوی نے مل کر شمائلہ کو اندر دھکیلا، بچے چھین لئے اور باہر سے کنڈی لگا کر چلے گئے۔ بچے تھوڑی دیر پریشان ہوئے، روئے بھی، چلائے بھی لیکن گاڑی میں بیٹھے تو ٹھیک ہو گئے۔ ویسے بھی وہ کئی دنوں سے تایا تائی کے پاس تھے اور وہاں تائی کے اپنے ہم عصر بچوں کے ساتھ بہلے ہوئے تھے۔

عابد اور بھابھی جب بچوں کو شمائلہ سے چھین کر لے گئے تو شمائلہ کے حواس اڑ گئے لیکن وہ صبر اور اپنے اوپر جبر کر کے بیٹھ گئی۔ وہ قانونی اور اخلاقی طور پر اتنی کمزور پوزیشن میں تھی کہ شور شرابا کر کے پاس پڑوس والوں کو مدد کے لئے بھی نہیں پکار سکتی تھی کہ مدد کو آنے والا آئے گا بھی تو اس کی مدد کرنے کے بجائے شمائلہ کو ہی لعنت ملامت کرے گا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اپنی تمام تر بے گناہی کے باوجود اب محلے والوں اور عزیز و اقارب

اور سب جاننے والوں میں ایک بدکردار عورت کے حوالے سے پہچانی جاتی ہو گی جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ زاہد کو اس نے سمجھا دیا تھا اور زاہد اپنے کئے پر نادم اور نالاں بھی تو لیکن باقی سب لوگوں کو تو نہیں سمجھا سکتی تھی۔ شمائلہ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو ایک ایسے موڑ پر کھڑا محسوس کیا جہاں اگلا راستہ اسے صرف موت کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا ایک بار پھر جی چاہا کہ وہ دروازہ توڑ کر باہر چلی جائے اور کسی تیز رفتار گاڑی کے آگے آ جائے یا بجلی کی تاروں سے لٹک جائے یا کسی بلند بلڈنگ کی چھت سے چھلانگ لگا دے۔ وہ سوچنے لگی کہ مرنے کے لئے انسان کے پاس کتنے راستے ہیں لیکن جب انسان خود مرنا چاہے تو ہر راستہ دشوار معلوم ہوتا ہے اور ہر راستے کے آگے ایک ایسی مصلحت موجود ہوتی ہے جو اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر کمزور کر دیتی ہے۔ موت وہی آسان ہے جو اچانک اور قدرت کی طرف سے آ جائے لہٰذا اسے اب زندگی گزارنے کا راستہ مشکل اور ذلت آمیز نظر آ رہا تھا اور وہ دعا کرتی تھی کہ کسی طرح اسے اچانک موت آ جائے۔

''تم فوراً ہاسپٹل آ جاؤ۔'' شمائلہ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ اچانک فون آیا۔ زاہد کا فون تھا وہ اسے ہسپتال بلا رہا تھا۔ شمائلہ زاہد کا فون سن کر اپنی تمام پریشانی بھول گئی۔

''کیا بات ہے زاہد تم ٹھیک تو ہو نا؟'' شمائلہ نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں میں بہت بہتر ہوں۔'' زاہد بہت دھیمی، نرم اور کمزور آواز میں بولا۔

''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بھائی جان اور بھابھی نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور بچوں کو بھی لے گئے ہیں۔''

''کس نے بتایا؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''بھائی جان نے خود راستے میں جاتے ہوئے فون کیا تھا۔ بچے ان کے ساتھ تھے۔ بچوں سے بھی بات ہوئی ہے۔''

شمائلہ نے ضبط کیا لیکن پھر بھی ہچکیوں کو کنٹرول نہیں کر سکی۔

''تم رو نہیں ہسپتال آ جاؤ۔'' زاہد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''وہاں سے کوئی مجھے دھکے دے کر تو نہیں نکالے گا؟'' شمائلہ نے کسی مجبور اور بے بس عورت کی طرح کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں آج ہسپتال میں کوئی ہے نہیں میرے پاس۔ آج بہت ضروری باتیں ہوں گی تمہارے ساتھ۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' وہ بے اختیار بولی۔ اندر سے دروازے کو دستک دی۔ کسی نے باہر سے کنڈی کھولی۔ اس نے پھر تالے لگا کے اِدھر اُدھر دیکھا کہ اب کوئی نئی مصیبت نہ وارد ہو جائے اور جلدی سے رکشا پکڑ کے ہسپتال پہنچ گئی۔ ہسپتال میں رات شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسیں جنرل وارڈز اور پرائیویٹ کمروں میں مریضوں کی دیکھ بھال اور معائنہ کر کے واپس جا چکے تھے اور کچھ مریض سو رہے تھے یا سونے کی تیاری کر رہے تھے اور جن کو نیند نہیں آتی تھی انہیں نیند کی گولیاں یا انجکشن دے کر سلا دیا گیا تھا جبکہ اکا دکا مریض ایسے تھے جو اپنے اپنے بیڈز اور کمروں میں کسی نہ کسی سبب جاگ رہے تھے اور ان جاگنے والے مریضوں میں ایک زاہد علی بھی تھا جو اپنے کمرے میں بیڈ پہ چت لیٹا دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے شائلہ کے انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا اسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی اپنے انتظار کی کیفیت پر کہ اتنے برس شائلہ اور اس نے ایک دسرے کا ساتھ دیا، لوٹ کر چاہا، ایک دوسرے کا انتظار بھی کیا لیکن آج اس کے انتظار کی کیفیت ہی بالکل جدا تھی۔ ایسی بے چینی تو اُسے ہنی مون کے زمانے میں بھی نہیں تھی حالانکہ دو دن پہلے ہی شائلہ اچانک ہی ہسپتال آ گئی تھی اور یہ تھوڑا سا وقت ان کو شکوے شکایت اور رونے دھونے میں گزر گیا تھا اور پھر اس وقت زاہد کو انتظار بھی نہیں تھا کیونکہ شائلہ کی آمد غیر متوقع تھی اور شائلہ نے ایک سرپرائز دیا تھا لیکن زاہد نے اسے بہت جلد گھر بھجوا دیا اور پیچھے پیچھے بچے بھی بھجوا دیئے تھے کیونکہ ہسپتال میں بھائی جان اور بھابھی کا آنا جانا تھا اور زاہد جانتا تھا کہ بھابھی، شائلہ کی بہت بے عزتی کرے گی اور بھائی جان بھی عزت کے ساتھ پیش نہیں آئیں گے۔ اس لئے وہ شائلہ کو بے عزتی سے بچانا چاہتا تھا اور اب جو زاہد کو شائلہ کا شدت سے انتظار تھا تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ شاید شائلہ سے یہ اس کی آخری ملاقات ہو کیونکہ بھائی جان اور بھابھی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب اگر شائلہ گھر یا ہسپتال میں دیکھی گئی تو پھر بھائی یا بھابھی زاہد کے سامنے نہیں آئیں گے لہٰذا یہ ان کی الوداعی ملاقات ہو گی اور اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس بار بچھڑنے کے بعد وہ سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح کتابوں میں بھی ملے گا یا نہیں، اس لئے اس نے شائلہ کو فون کر کے فوراً ہسپتال آنے کو کہا تھا اور اب وہ شائلہ کا انتظار ایسی بے چینی سے کر رہا تھا کہ شاید رومیو نے جولیٹ کا بھی نہیں کیا ہو گا۔

اس کی نگاہیں دروازے پر اس طرح لگی ہوئی تھیں کہ وہ پلک نہیں جھپکا رہا تھا اور راستہ دیکھتے دیکھتے جیسے اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ دروازہ بھی تھک گیا تھا۔ پھر معاً

دروازے کی تھکن بھی دور ہوئی اور زاہد کی آنکھ سے لے کر دروازے تک انتظار کی ڈور بھی ٹوٹی۔

ہلکی سی دستک ہوئی اور دستک کے ساتھ ہی شمائلہ اندر داخل ہوئی۔ زاہد نے پلنگ پر لیٹے لیٹے اس طرح بے اختیار بازو پھیلائے جیسے ایک ننھا منا بچہ چاند کو دیکھ کر شدت شوق سے اس کی طرف لپکتا ہے لیکن چاند دور ہوتا ہے جبکہ شمائلہ دور نہیں تھی۔ اس وقت ہسپتال رات کی خواب آور گولیوں کے خمار میں ڈوب چکا تھا۔ ڈیوٹی روم میں ڈیوٹی دینے والا ایک ڈاکٹر اور نرس مریضوں کے وجود سے بے خبر تھی اور زاہد اور شمائلہ اپنے پرائیویٹ روم میں ڈاکٹرز اور نرسوں کی موجودگی سے بے نیاز تھے اور ہسپتال سے نکلنے کے صرف دو راستے ہوتے ہیں ایک موت کے ویرانے کی طرف جاتا ہے اور دوسرا زندگی کی پُرفریب بہار کی جانب۔ زاہد انہیں دوراستوں کے سنگم پر کھڑا تھا۔

''موت کی منزل کی طرف جانے والا راستہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔ وہاں تو آدمی کی مرضی کے بغیر موت کا فرشتہ خود اڑا کے لے جاتا ہے لیکن زندگی کا راستہ ہمارے اختیار میں ہے۔ آؤ آج ایک بار پھر زندگی کے راستے پر گامزن ہونے کا عہد کریں پھر بے شک موت آجائے۔'' زاہد نے جذبۂ شوق کی شدت سے بے قابو ہو کر کہا۔

''نہیں نہیں نہیں ایسا نہ کہو میری جان! موت کی بات نہ کرو میں زندگی کے ہر راستے پر تمہارا ساتھ دوں گی چاہے وہ راستہ کتنا ہی کٹھن ہو۔'' شمائلہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''ان ہونٹوں سے اب موت کا لفظ نہیں نکالنا۔''

''تم بھی پھر آج کوئی شکایت نہیں کرنا، نہ بھائی جان کی، نہ بھابھی کی، نہ اس شیطان اور آستین کے سانپ کی۔'' زاہد نے کہا۔

''نہیں کروں گی۔'' شمائلہ بے ساختہ بولی۔ ''لیکن تم آرام کرو، سو جاؤ۔''

یہ ہماری الوداعی ملاقات ہے۔ صبح تم نے جانا ہے۔'' وہ دکھ سے بولا۔

''ہاں جانتی ہوں۔'' شمائلہ رقت بھرے لہجے میں بولی۔ ''جانتی ہوں یہ الوداعی ملاقات اور الوداعی رات ہے۔''

''تو پھر اس رات کو سو کر کیوں گزاریں۔'' زاہد نے حسرت سے کہا۔

''تمہاری صحت اور عقل کا یہی تقاضا ہے۔'' شمائلہ بے ساختہ بولی اور زاہد نے بھی فوراً جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''عقل کے تو بہت سارے تقاضے ہوتے ہیں اور ہم ہمیشہ عقل ہی کی بات سنتے آئے ہیں لیکن

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

''آؤ اس شعر کی تشریح بن جائیں۔'' زاہد نے وفور جذبات سے کہا اور پھر وہ اس شعر کی تشریح بن گئے۔

صبح بہت خوبصورت تھی۔ طلوع آفتاب ابھی کچھ دور تھی لیکن کرنوں کی بکھری ہوئی ہلکی ہلکی ملگجی روشنی نے ستاروں کی جھالر کو غائب کر دیا تھا۔ چڑیاں اپنے گھونسلوں سے نکل کر ٹہنیوں پر چہچہا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے فضا کو معطر کر دیا تھا۔ نمازی فجر کی نماز کے لئے تیز تیز ڈگ بھرتے مسجد کی طرف جا رہے تھے اور ڈیوٹی روم میں اونگھتی نرس گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور خراماں خراماں آنکھیں ملتی ہوئی زاہد کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ زاہد اور شمائلہ نے تقریباً پوری رات جاگ کر باتیں کرتے ہوئے گزاری تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے شب عروسی دولہا اور دلہن جاگ کے گزارتے ہیں۔ بہت سی باتیں کیں دونوں نے لیکن پھر بھی باتوں کا اسٹاک ختم نہیں ہوا۔ تاہم ایک تھکن کے احساس کے بعد اس وقت ان کی آنکھ لگی جب پو پھٹنے والی تھی لیکن ابھی تھوڑی سی میٹھی نیند لی ہوگی کہ ہلکی سی دستک ہوئی۔

شمائلہ چونکی، زاہد کی بھی آنکھ کھل گئی۔

''چندا......'' زاہد آہستہ سے پکارا۔ ''شاید نرس ٹمپریچر نوٹ کرنے آئی ہے۔''

''میں دروازہ کھولتی اور دھیرے سے دروازہ کھولا۔ نرس اندر داخل ہوئی شمائلہ ہی کی عمر کی نوجوان نرس تھی۔ شام کو شمائلہ اور نرس کے درمیان ایک بہت مانوس ملاقات بھی ہوئی تھی اور اگر شمائلہ ہسپتال میں رہ جاتی تو دو چار ملاقاتوں میں ٹھیک ٹھاک دوستی ہو جاتی کیونکہ رات کی ملاقات میں نرس نے بہت کچھ کرید کرید کے شمائلہ سے پوچھا اور اپنی بہت ساری باتیں اگل دی تھیں لہٰذا دروازہ کھلنے پر دونوں نے ایک دوسرے کو وش کیا اور چند لمحے نرس نے رک کر شمائلہ کے چہرے کی طرف بہت معنی خیز انداز میں دیکھا۔ دونوں کے درمیان آنکھوں کی زبان میں بات ہوئی مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا اور پھر نرس نے بڑھ کر زاہد کی کلائی نبض کے لئے تھامی۔ تھرمامیٹر منہ میں لگایا اور ٹمپریچر نوٹ کر کے چلی گئی۔

''اب کیا حکم ہے میرے آقا! میرے لئے؟'' نرس کے جانے کے بعد شمائلہ نے ہلکے پھلکے خوشگوار موڈ میں کہا کیونکہ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹروں کی ٹیم نے معائنہ کرنے کے

لئے آ جانا تھا اور عابد اور بھابھی کا ٹیلیفون بھی آیا ہوا تھا کہ وہ صبح اس وقت ہسپتال آ ئیں گے جب شمائلہ وہاں سے چلی جائے گی۔

''اب ہمیں بچھڑنا ہے جانم ......'' زاہد دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہمیشہ کے لئے؟'' شمائلہ بھی دکھ سے بولی۔

''نہیں ...... دوبارہ ملنے کے لئے ......'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''تمہیں لاہور جا کے شادی کرنا ہوگی۔'' زاہد نے بہت تکلیف کے لہجے میں یہ بات کہی۔

''نہیں زاہد نہیں ...... یہ نہیں ہوسکتا۔'' شمائلہ تڑپ گئی۔ ''بھلا سوچو تو سہی تم نے اپنے گھر میں ایک اجنبی کے ساتھ میری ایک جھلک دیکھی اور صرف شبے کی بنیاد پر سارا گھر تباہ کر دیا اور اب ......''

''بار بار مجھے اس کوتاہی کا احساس نہ دلاؤ۔ میں نے یہ سب کچھ غصے میں اس لئے کیا کہ میں کبھی تمہیں کسی دوسرے کی ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔'' زاہد شمائلہ کی بات کاٹ کر بولا۔

''اور اب کیسے دیکھ سکو گے کہ میں باقاعدہ کسی کی منکوحہ بن کر اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاروں ...... نہیں زاہد ...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''یہ تمہیں کرنا پڑے گا۔ شی! ضد نہ کرو، جاؤ لاہور، وہاں تمہیں اللہ نے فرید کی شکل میں ایک بہت اچھا بھائی اور ایک بہن دی ہے۔ اُن کی مدد سے تم شادی کرو۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ ہمارے پاس دوبارہ ایک ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' زاہد تقریباً رو پڑا اور ہچکیاں روکتے ہوئے بولا۔ ''یہ قیمت ادا کرنی پڑے گی تمہیں بھی اور مجھے بھی۔ قدرت نے مجھے اسی لئے آزمائش میں ڈالا ہے کہ میں نے غصہ کیا اور غصے میں ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ یہ سزا ہے اس غصے کی جو سزا صرف مجھے ملنی چاہئے تھی لیکن تم بھی بھگت رہی ہو۔ اس لئے ...... اس لئے ......'' کہتے کہتے اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور بمشکل وہ بات پوری کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''اس لئے کہ ہم دو جسم اور ایک جان ہیں، ہم نے زندگی کی لذتیں اگر ایک ساتھ محسوس کی ہیں تو دکھ بھی اکٹھے جھیلیں گے۔ میں تو بھگت ہی رہا ہوں لیکن میری غلطی کا خمیازہ تمہیں بھی بھگتنا ہوگا۔ میرے لئے، اپنے لئے، ہمارے لئے، ہمارے بچوں کے لئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم خوار ہوں گے ہی ہمارے بچے بھی رل جائیں گے۔ اوہ میرے خدا ...... اوہ میرے مولا۔'' اس کے ضبط کے سارے بند کھل گئے اور وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔

''حوصلہ رکھو جان!'' شمائلہ اس کو تسلی دے کر کہنے لگی۔ ''حوصلہ رکھو جان ...... ہمت نہ ہارو۔''

''کیسے......'' زاہد حسرت سے بولا۔ ''اگر تم مجھے دوبارہ نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا۔''

''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔'' شمائلہ نے بڑے یقین سے کہا۔ ''تم زندہ رہو گے۔ اپنے لئے، میرے لئے، ہمارے لئے، ہمارے بچوں کے لئے، وہ نہیں رکیں گے۔ میں جا رہی ہوں لاہور، میں شادی کرلوں گی اور پھر طلاق لے لوں گی۔ شادی، طلاق، شادی، طلاق ...... جب یہی میرا مقدر ہے تو اس مقدر کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں لاہور جاؤں گی واپس آنے کے لئے، دوبارہ ملاپ ہوگا ہمارا۔ پھر کوئی ہمیں ملنے سے روک نہیں سکے گا۔ اگر یہ سماجی زنجیریں جو محض دو لفظوں کے سبب ہمارے پاؤں میں پڑی ہیں تو انہی دو لفظوں سے میں انہیں توڑ بھی دوں گی۔ بس مجھے دعا دو۔'' وہ ایک عزم کے ساتھ لیکن شکستہ لہجے میں بولی اور زاہد نے سر اٹھایا شمائلہ کا ہاتھ تھاما اور پلنگ پر بیٹھ کر نہایت ہمت افزا لہجے میں بولا۔ ''کریج مائی ڈیئر بی لویڈ ...... آئی ایم پراؤڈ آف یو ...... مجھے ہمیشہ تم پر ناز رہا اور ہمیشہ رہے گا۔ جاؤ میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

زاہد نے یہ بات اس طرح کہی جیسے کوئی کبوتری کو ڈربے سے نکال کر ہوا میں اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ جاؤ اپنے کھوئے ہوئے کبوتر کو ڈھونڈ کے واپس لاؤ۔ شمائلہ نے دوسری شادی کا عزم کر کے اسی دن طلوع آفتاب سے پہلے لاہور جانے کے ارادے سے ہسپتال چھوڑ دیا۔

❀......□......❀

زاہد چونک گیا۔

معلوم نہیں رات کا کون سا پہر تھا کہ زاہد کو دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ و
وقت گہری نیند میں تھا اور اپنی ذہنی اور جسمانی کیفیت کے حساب سے اس نے صبح تک
تھا کیونکہ پورا دن اس نے بہت بینک اور بے چینی میں گزارا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی با
میں اس کی نبض دیکھی تھی بلڈ پریشر چیک کیا تھا۔ کچھ دوا دارو بھی دی تھی لیکن زاہد کی
چینی دور نہیں ہوئی تھی لہٰذا ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق رات کے آغاز پر نرس نے
سکون کے لئے کوئی خاص قسم کا انجکشن لگا دیا تھا اور پھر نرس نے اسے تسلی دیتے ہو۔
تھا اب آپ سکون سے صبح تک سوتے رہیں گے۔ نیند کی دوا لینے کے باوجود ایک آہ
اس کا بیدار ہو جانا ایک غیر فطری عمل تھا کیونکہ اسے صبح تک سلا دینے کے لئے انجکشن
گیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ اب بے خبر سو جائے گا اور اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ۔
سو رہا ہے کہ اس نے ایک ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ کسی کی چاپ سنی اور یہ چاپ ڈا
نرس کی نہیں تھی اور کسی تیماردار کی بھی نہیں ہو سکتی کہ آج رات اس کے پاس کوئی تیما
بھی نہیں تھا۔ تاہم اس نے کمرے کے اندر کسی فرد کی موجودگی کو محسوس کیا۔ اس
آنکھیں دو تین دفعہ کھول کے بند کیں۔ نیند اتنی غالب تھی کہ آنکھ پلک کا بوجھ اٹھانے
بھی قاصر نظر آ رہی تھی۔

کمرے میں اسے گھپ اندھیرا دکھائی دیا۔

اسے خیال آیا کہ رات کو اندر سے اس نے کنڈی بھی نہیں لگائی تھی اور نرس نے
اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ وہ دروازہ بند کرنے کی تلقین کر کے جاتی۔ دروازہ
اندر سے رات کو کھلا رہ جاتا تھا اور زاہد نے کبھی اس بات کو اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ
تھا کہ یہ ہسپتال کے کمرے ہیں بند رہیں یا کھلے رہیں یہاں ڈاکوؤں کی دراندازی
امکان نہیں تھا کہ مریض کے پاس مرض کے سوا کیا ہوتا ہے جو ڈاکو لے جائیں۔ چور
سب کچھ لے جا سکتا ہے لیکن کسی کی بیماری یا معذوری لاچاری کی اسے ضرورت

الی۔ اسی لئے ہسپتال ایک ایسی واحد جگہ ہے کہ جہاں مریض یا امراض چوری نہیں
لے۔ سو جب رات کو نرس چلی گئی تو زاہد نے بھی دروازے کو مقفل کرنا ضروری نہیں
ا۔ ویسے بھی انجکشن لگتے ہی اس پر نیند کا ایسا غلبہ ہو گیا تھا کہ اسے اگلے لمحے کی خبر ہی
اں رہی اور اب جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ چونک گیا۔ اندھیرے کے باوجود روشن دان
باہر کے بلب کی ہلکی سی روشنی اندر چھت کے ایک حصے پر پڑ رہی تھی جس سے کمرے کی
ھری فضا میں کسی جگہ ایک سرمئی سی لکیر تھی اور جب دروازے میں چرچراہٹ ہوئی تو
نے ایک نامعلوم سا سایہ اندر داخل ہوتے دیکھا جو دروازے کی اور میں غائب ہو
ا۔ زاہد چونک گیا۔

''کون؟'' اس نے بہت آہستہ سے پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

''نرس......!'' زاہد نے ہلکی سی آواز دی کوئی جواب نہیں آیا۔

''ڈاکٹر!'' اس نے پھر پکارا لیکن کوئی بولا نہیں اور اس نے محسوس کیا کہ ہلکی سی
کے ساتھ کوئی اس کے پلنگ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔

''کون ہو بھئی؟'' اب کے زاہد نے کسی قدر پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''پہچانا؟'' کسی نے اس کے قریب آ کر مکروہ سی آواز میں پوچھا۔ پوچھنے والے کا
ابھی نمایاں نہیں ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ ٹارچ کی روشنی اس نے زاہد کے
ے پر ماری اور پھر اپنے چہرے پر۔ پھر بہت کمینی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''اب پہچانو۔'' یہ
کا چہرہ اور شمس کی آواز تھی۔

''تم۔'' زاہد غصے نفرت انتقام اور جھنجلاہٹ کے ملے جلے انداز میں بولا۔

''ہاں میں۔'' شمس نہایت گھٹیا لہجے میں بولا اور کہنے لگا۔ ''ہاں میں تیرا یار۔''

''اف میرے خدایا۔'' زاہد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے کوئی چیز اٹھا
اس کے سر پہ دے مارنا چاہی لیکن ہاتھ اٹھ نہیں سکا۔ نقاہت نے اسے دبوچ رکھا تھا۔

''ارے بھئی اگر یاری کے حوالے سے نہیں شناخت کر رہے ہو تو اور بھی کوئی چیز
ے میرے درمیان مشترک ہے۔ تمہاری بیوی...... اگر یار نہیں رقیب تو ہوں نا تیرا۔''

وہ انتہائی ڈھٹائی سے بولا اور کہنے لگا۔

''ارے بھئی مجھے تم گنوار سمجھتے رہے ہمیشہ...... لیکن تم تو پڑھے لکھے آدمی اور فیض کی
'رقیب سے'' پہلی دفعہ تم نے ہی مجھے سنائی تھی۔ واہ سبحان اللہ دو تین بند اس کے کیا
حال تھے۔'' یہاں تک بول کے وہ زاہد کے غصے پریشانی اور مضطرب کیفیت کو

نظر انداز کر کے نظم کے بند لہک لہک کے پڑھنے لگا۔

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے
ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز تیرے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
تجھ سے ....

"بند کرو یہ بکواس۔" وہ ابھی نظم پڑھ رہا تھا کہ زاہد کی قوت برداشت جواب د
گئی۔ اپنی تمام تر بیماری، لاچاری اور نقاہت کے باوجود وہ اس طرح دھاڑا جیسے مردہ کف
پھاڑ کے بولے۔

"اوں ہوں ہوں غصہ نہیں، غصے میں ایسی خوبصورت شاعری کو بکواس کہہ گئے ہ
یہ وہ ہے جو تم نے لہک لہک کر سنائی تھی مجھے۔ آج یہ ہم دونوں کے درمیان بھ
بامعنی......"

"میں تم سے کہہ رہا ہوں بکواس بند کرو۔" زاہد پھر نفرت آمیز انداز میں بولا
"آستین کے سانپ گھٹیا کمینے تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی۔ میں تمہیں......" زا
غصے میں کانپنے لگا اور اپنے سرہانے پڑا ہوا شیشے کا گلاس اسے دے مارنا چاہا لیکن زاہد
ہاتھ گلاس تک پہنچ نہیں پایا۔

"او......غصہ نہ کرو۔ اس کنڈیشن میں غصہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔ بلڈ پریش
بڑھ گیا تو برین ہیمبرج کا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔" شمس بہت دھیمے لیکن شیطانی لہجے م
بولا اور کہنے لگا۔ "میں صرف تمہیں تھوڑی سی انفارمیشن دینے کے لئے آیا ہوں اور وہ ذ
غور سے اور تحمل سے سنو۔" شمس نے دونوں ہاتھ اٹھا کے اسے ٹھنڈا رہنے کی تلقین کر
ہوئے کہا اور زاہد جیسے واقعی اپنے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے اس کی بات سننے کے لئ
راضی ہوا تو شمس بولا۔ "تم یہ نہ سمجھنا کہ شمائلہ لاہور چلی گئی ہے۔ شمائلہ ادھر ہی ہے میر
پاس۔ ہم دونوں نے شادی کر لی ہے اور ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ چاہتی ت

ے، پیار کرتی ہے مجھ سے۔"

"بکواس......" زاہد نے جھپٹنے کے لئے مٹھیاں بھینچیں۔

"سن لو میری بکواس پھر بولنا۔" شمس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ارے نادان تم کبھی ؤرت کو نہیں سمجھ سکے۔ وہ تمہاری بیوی تھی اور تم اسے نہیں سمجھ سکے۔ میں نے اسے اچھی رح سمجھ لیا ہے اور اب وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی اور کبھی تمہارے پاس نہیں آئے گی۔"

"غلط کہہ رہے ہو تم۔" زاہد اکھڑی اکھڑی سانس کے درمیان رقت آمیز لہجے میں ولا۔ "وہ واپس میرے پاس آئے گی راستہ چاہے طویل سہی لیکن اس کی منزل میں وں۔"

"جب تم ہو گے ہی نہیں تو اس کی منزل کیسے بنو گے...... ہونہہ اور ڈر مجھے بھی یہی ہ کہ اسے کسی دن واپس تمہارے پاس آنے کا خیال نہ آ جائے۔ اس لئے میں آج یہ ڈر ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے آیا ہوں۔ ہاں......" شمس نے کسی درندے کی رح آواز نکالی اور آدم خور کی طرح منہ کھول کے نوکیلے دانت نکالے اور بھیڑیے جیسے زاہد کی گردن میں گاڑ دیئے اور خونخوار آواز میں بولا۔ "آج میں تمہارا خاتمہ کر دوں گا ہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"بچاؤ بچاؤ۔" زاہد پہلے ہی بیمار اور نحیف و نزار تھا۔ شمس نے ڈریکولا بن کر اسے ادبوچا کہ اس کی جان ہی نکل گئی اور نرخرے سے سانس کی آوازیں آنے لگیں۔ اس مس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اپنی گردن کو آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن شمس ایک شش کی طرح مضبوط اور طاقتور تھا اور زاہد کے پاس چیخنے چلانے کے لئے نحیف اور بس آواز ہی تھی وہ گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخا۔

"کوئی بچاؤ...... بچاؤ بچاؤ...... ڈاکٹر ڈاکٹر...... سسٹر کوئی ہے۔" معاً اس کے کان آوازیں آنے لگیں۔

"زاہد صاحب...... زاہد صاحب! آنکھیں کھولیں زاہد صاحب!۔" پھر کسی نے کے چہرے کو آہستہ سے ہلایا اور پانی کا چھینٹا سا اسے اپنے چہرے پر محسوس ہوا۔

"اوہ......" زاہد نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو دیکھا ڈیوٹی ڈاکٹر، نرسیں اور وارڈ ے اس کے بیڈ کے اطراف جمع تھے۔ حواس باختہ زاہد نے اپنے ہوش قابو میں کئے اور ت مٹانے کے لئے چہرہ ہاتھ سے چھپانے لگا۔

"کیا بات ہے زاہد صاحب! ہم ڈیوٹی روم سے آپ کا شور سن کر آئے ہیں؟"

ڈاکٹر نے از راہ ہمدردی پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ منہ چھپا کے بولا۔

''کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟'' نرس نے پوچھا۔

''ہاں...... ڈراؤنا خواب۔'' زاہد شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

''کام ڈاؤن۔'' ڈاکٹر نے زاہد کو چھو کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی رپورٹس بہت سیٹسفیکٹر ہیں۔ آپ ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''تھینک یو ڈاکٹر!'' زاہد نے اپنے حواس مکمل طور پر قائم کرتے ہوئے از راہِ تشکر کہا۔

''اب آپ سو جائیں۔ صبح بات ہوگی۔''

ڈاکٹر نے مزید تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''شیور۔'' زاہد کروٹ لے کر لیٹ گیا اور نرس نے کمبل سے اس کا جسم ڈھانپ دیا اور پھر وہ تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ سو گیا۔

❁

گھر کے گارڈن میں عابد صاحب کے دو بچے نومی اور نینا جھولا جھول رہے تھے اور عینی اور علی جھولوں سے کچھ فاصلے پر چپ چاپ اداس بیٹھے اپنے تایا زاد بھائی بہن کو خوش وخرم انداز میں جھولا جھولتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ نومی اور نینا دونوں عینی اور علی کے ہم عمر کزنز تھے۔ بہت قریبی اور خون کا رشتہ تھا لیکن گھر کے کرائسس سے پہلے بچوں کی آپس میں زیادہ قربت یا میل جول نہیں تھا۔ اب جب شمائلہ منظر سے ہٹ گئی اور زاہد ہسپتال میں داخل ہو گیا تو عینی اور علی کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہا اور عابد صاحب اپنے گہرے خونی رشتے کے سبب دونوں بچوں کو گھر لے آئے۔ اس احتیاط کی وجہ سے بھی کہ کہیں شمائلہ انہیں اپنے ساتھ نہ لے جائے کیونکہ یہ عابد صاحب کے خون کا اور ناک کا بھی مسئلہ تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بھائی کا خون شمائلہ کے ساتھ لوگوں کے دروازوں پر رلتا پھرے۔ اس لئے وہ بچوں کو شمائلہ سے چھین کر گھر لے آئے تھے۔ ہر چند کہ بیگم عابد کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ زاہد کے بچے ان کے گھر میں پلیں۔ وہ اپنے گھر میں باہر کی کوئی مداخلت پسند نہیں کرتی تھیں لیکن یہ ان کے شوہر کی عزت کا معاملہ تھا۔ جس میں بادل نخواستہ ہی سہی بیگم نے بھرپور ساتھ دیا اور بچوں کو اپنے گھر لانے میں بہت تعاون کیا۔

اب یہ دونوں بچے اپنے تایا کے گھر میں تھے لیکن ابھی تک اسے اپنا گھر نہیں سمجھ رہے تھے اور نہ ہی اپنے تایا زاد بہن بھائیوں کے ہمراہ گھل مل سکے تھے۔ لہٰذا نومی اور نینا بہت خوشگوار موڈ میں الگ الگ جھولوں پر بیٹھے جھول رہے تھے اور علی اور عینی کچھ فاصلے پر گارڈن کی کیاری کے پتھر پر بیٹھے آگے پیچھے ہوتی ہوئی جھولے کی رسیوں کو اس طرح محرومی کے ساتھ دیکھ رہے تھے جیسے وہ ایسے یتیم بچے ہوں جن کے باپ اور ماں کا سایہ ابھی ابھی سر سے اٹھ گیا ہو۔ پینگیں اوپر ہی اوپر جا رہی تھیں اور علی اور عینی کی نگاہیں رسیوں کے ساتھ ساتھ جھول رہی تھیں۔

''توبہ...... چکر آ گئے مجھے۔'' نینا نے اپنے تیز رفتار جھولے کو یکدم روکا اور گارڈن کی بینچ پر سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

''مجھے بھی چکر آ گئے ہیں۔'' نومی نے بھی اپنا جھولا چھوڑ دیا اور نینا کے پاس بیٹھ گیا اور پھر اچانک علی اور عینی کی طرف دیکھ کر بولا۔''ارے تم دونوں کیا یتیموں کی طرح ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہو۔ جھولا جھولو۔''

علی اور عینی کچھ نہیں بولے خاموش رہ کر دیکھنے لگے۔

''او علی میں تم سے کہہ رہا ہوں جھولو جھولا۔'' نومی نے پھر آواز لگائی۔

''نہیں نومی مجھے جھولنا نہیں آتا ہے۔'' علی نے بہت مسکین سے لہجے میں معذرت چاہی۔

''تم جھولو۔'' نینا نے عینی کے پاس جا کر کہا۔

''نہیں۔'' عینی نے بھی بھائی کی تقلید کی۔

''بھائی ان کو جھولنا سکھا دو۔'' نینا نے شرارت آمیز انداز میں اپنے بھائی نومی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں۔'' نومی کو بھی شرارت سوجھی اور علی کے قریب آ کر بولا۔

''اٹھو جھولا جھولو۔''

''نہیں بھائی مجھے نہیں آتا ہے۔'' علی نے کہا۔

''ارے کوئی جہاز چلانا ہے کہ نہیں آتا۔ میں سکھا دوں گا۔'' نومی نے علی کی کلائی پکڑ کر اٹھایا۔

''چلو اٹھو تم بھی۔'' نینا نے عینی کا بازو پکڑا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری
عظیم وار ورڈ پریس

''نہیں میں نہیں بیٹھوں گی مجھے ڈر لگتا ہے۔'' عینی نے انکار کیا۔

''زبردستی بٹھاؤ اسے۔'' نومی علی کا ہاتھ چھوڑ کر عینی کے پاس آ گیا اور دونوں بہن بھائیوں نے مل کر عینی کو جھولے پر بٹھایا اور نومی نے جھولے کو دھکے دے کر جھولا ہلانا شروع کیا عینی ڈری سہمی اور پکاری ''نہیں بھائی نہیں۔ نومی بھائی روکو جھولا۔'' لیکن روکنے کی بجائے نومی نے زور زور سے جھولے کو ہلایا اور پینگ دونوں جانب عمودی نکتے کو چھونے لگی۔ عینی اس طرح جھولنے کا تجربہ نہیں رکھتی تھی اور نومی کی شرارت کی رگ تیزی سے پھڑک گئی تھی۔ اس کا ہاتھ رکنے کی بجائے تیزی سے جھولے پر متحرک ہو گیا عینی زور سے چلائی۔ ''روکو روکو بھائی! نومی بھائی میں گر جاؤں گی روکو۔ علی علی علی۔'' جب نومی نے جھولا نہیں روکا تو اس نے اپنے بھائی کو پکارا اور نینا اس تمام صورت حال سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ علی سے بہن کا چیخنا چلانا برداشت نہ ہو سکا۔ وہ اٹھ کر نومی کے پاس آیا اور نومی سے کہنے لگا۔ ''نومی جھولا روکو۔''

''تم بیٹھ جاؤ ادھر جا کے۔'' نومی، علی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ عینی زور زور سے چلانے اور پکارنے لگی۔

''میں کہتا ہوں روکو جھولا۔'' اب کے علی غصے سے بولا اور نومی کے ہاتھ سے رسی چھین کر جھولا روک دیا۔

''تو میرا ہاتھ پکڑتا ہے۔'' یہ کہہ کر نومی غصے سے علی کی طرف پلٹا اور اسے تابڑ توڑ گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔

''چھوڑ دو اسے۔ میرے بھائی کو نہیں مارو۔'' عینی بھائی کو پٹتا دیکھ کر چلائی اور نومی کا ہاتھ روکا۔

''ہٹ پرے تیرے بھائی کو نہیں چھوڑوں گا میں۔'' نومی نے عینی کو دھکا دے کر پرے کیا تو علی سے رہا نہ گیا۔ اس نے نومی کا ہاتھ روکا اور ایک مکا اس کے پیٹ میں مارتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''اس کو دھکا کیوں دیا؟'' مکا نومی کے پیٹ میں زور سے لگا اور پھر وہ علی پر جھپٹ پڑا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لان میں شور شرابا ہوا تو بیگم عابد دوڑتی ہوئی باہر آئیں اور دور سے ہی چلا کر بولیں۔ ''نومی یہ کیا ہو رہا ہے۔''

''ممی! اس نے میرے پیٹ میں مکا مارا ہے۔'' نومی نے شکایت کرتے ہوئے کہا اور شکایت کے دوران ہی ایک دو ہاتھ اور علی کے منہ پر جڑ دیئے۔

''اچھا اس کی یہ مجال کہ مکے بھی مارنے لگا ہے۔'' بیگم عابد غصے میں علی کی طرف

پکیں اور اس کے کان کی لو دو انگلیوں میں مروڑتے ہوئے بولی۔ ''کیوں رے کتے کے پلّے، تجھے اس لئے یہاں لائے ہیں کہ تو میرے بچوں کو مارے۔''
علی کان کی تکلیف سے تڑپا اور درد سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''تائی ماں پہل اس نے کی۔''

''ہاں تائی ماں پہلے اس نے مارا ہے۔'' اب کے عینی اپنے بھائی کی حمایت میں بولی۔

''چپ......'' بیگم صاحبہ نے ایک ہاتھ عینی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''آ گئی بڑی حمایتی بن کے۔''

اتنے میں عابد صاحب بھی ہنگامہ سن کر باہر آ گئے۔
''کیا ہو رہا ہے یہ؟'' انہوں نے آتے ہی پوچھا۔
''بھئی یہ کتے کے پلے شیر ہو رہے ہیں۔ مارا ہے اس نے نومی کو۔'' وہ مزید ایک ہاتھ علی کو جڑتے ہوئے بولیں۔ علی اور عینی منہ بسور کر رہ گئے۔
''ہٹاؤ بھی بچے ہیں۔'' عباد صاحب نے معاملے کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے بھی کچھ کیا ہوگا۔''
''اپنے بچوں کی طرفداری کبھی نہ کرنا آپ۔'' بیگم نے شوہر پر طنز کیا۔ ''یہ بچے یہاں رہنے کے نہیں ہیں۔'' انہوں نے نفرت سے ایک نظر عینی اور علی پر ڈالی۔
''زاہد آ جائے گھر تو ان کو چلتا کر دیں گے۔'' عابد صاحب نے بات کو رفع دفع کرتے ہوئے کہا اور بیگم کا بازو تھام کر بولے۔ ''اب چلو اندر...... اپنے بچوں کو بھی لے چلو۔'' اور پھر خود ہی نومی اور نینا کو پکار کر بولے۔ ''چلو نومی اندر، نینا تم بھی۔'' اور نومی اور نینا ان کے ساتھ اندر چلے گئے۔
''تم بھی کمرے میں جاؤ۔'' جاتے جاتے عابد صاحب نے علی اور عینی کو پکار کے کہا لیکن اندر کمرے میں جانے کی بجائے وہ دونوں گارڈن میں ہی ایک کیاری کے پاس بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کے گلے لگ کے چپکے چپکے رونے لگے۔

❁

اب شمائلہ واپس فرید بھائی اور زارا کے گھر میں آ گئی تھی۔ یہ گھر پوری دنیا میں واحد جگہ تھی جہاں اسے اب بھی غیر مشروط طور پر محبت مل رہی تھی لیکن یہ گھر اس کی منزل نہیں تھا بلکہ یہ گھر اس کے لئے ایک پلیٹ فارم کی طرح تھا جہاں ستا کر اس نے گاڑی

پکڑنی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہونا تھا۔ وہ کراچی سے واپس آ چکی تھی اور اب واپس کراچی جانے کے راستے اس کے لئے بند ہو چکے تھے تاوقتیکہ وہ ایک بار پھر شادی نہ کر لے اور شادی کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر وقت کی چکی کے درمیان گیلے دانوں کی طرح پسنا ہے۔ فرید بھائی سے اس نے یہ بات تو نہیں کہی تھی اور کہہ بھی نہیں سکتی تھی لیکن زارا کو سارا حال سنایا تھا اور وہ ہر صورت میں زاہد کو پانا چاہتی تھی اور زاہد کو دوبارہ پانیکی خواہش اور امنگ نے ہی زندہ رکھا ہوا تھا اور اسی خواہش کی تکمیل کے بعد ہی اپنے بچوں کو دوبارہ اپنا سکتی ہے لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لئے اسے ایک اور پل صراط سے گزرنا تھا اور یہ کوئی آسان راستہ نہیں تھا۔ اس راستے سے گزرتے ہوئے وہ کسی ایسے جہنم میں بھی گر سکتی تھی جہاں وہ مرے گی بھی نہیں اور جل جل کر زندہ رہے گی۔ ایک انتہائی مشکل راستہ اور انتہائی مشکل فیصلہ اس کے سامنے تھا۔

''بتاؤ میری بہن میں کیا کروں؟'' وہ زارا کے گلے لگ کر رونے لگی۔ ''کوئی راستہ بتاؤ۔''

''صبر کرو شائلہ صبر ...... اور مجھے کچھ سوچنے دو۔ رب جو کرے گا بہتر کرے گا۔'' زارا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر اپنے ان عزیزوں رشتے داروں کے چہرے اور نام اس کے ذہن میں آنے لگے جو کنوارے یا رنڈوے تھے اور شادی کے لئے امیدوار ہو سکتے تھے۔

''ہرگز نہیں زارا جی ...... میں کسی ایسے آدمی کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو بعد میں مجھے آزاد نہ کرے۔ کیونکہ مجھے شادی کا شوق نہیں زاہد کو پانے کی تمنا ہے اور بچوں کو اپنانے کی آرزو ہے۔'' زارا نے اپنے محلے کے ایک آدمی کا جب ذکر کیا جو فرید کا دوست بھی تھا اور رنڈوا بھی لیکن چھ بچوں کا باپ تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد ارادہ ترک کر دیا۔ پھر چھ بچوں کا معاملہ بھی تھا جو پالنے پڑتے اور ایسا شخص کبھی چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔ پھر شائلہ کے ذہن میں ایک دن ایک اور تجویز آئی کہ وہ ایک گول مول سا اشتہار اخبار میں دے دے لیکن پھر یہ تجویز بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔

اس کی سمجھ میں شادی کے لئے کوئی حل نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ جو بھی شخص شادی پر آمادہ ہوگا وہ کچھ پانا چاہے گا۔ کھونے کے لئے شادی نہیں کرے گا اور شائلہ کچھ پانے کے لئے کھونا چاہتی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والا نیا مرد جدائی کے لئے نہیں وصال کے لئے آئے گا۔ آنے والے کو شائلہ کے مسئلے سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ وہ اپنا

گھر بسانا چاہے گا۔ لہٰذا جس طرح کا بندہ شمائلہ کے ذہن میں تھا اس طرح کا بندہ سوسائٹی میں آسانی سے نہیں مل سکتا تھا اور یہ ساری تلاش سوچ بچار کی حد تک محدود تھی۔ کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔ صرف زارا اور شمائلہ بیٹھیں اپنی سوچ اور خیالات کے گھوڑے دوڑاتی رہیں۔ فرید کو اس مسئلے کے حل میں مدد کے لئے شامل نہیں کیا گیا کیونکہ شمائلہ فریدالدین کو اپنے سگے بھائی سے بھی زیادہ سمجھتی تھی اور اس نازک اور عزیز رشتے کی بدولت وہ بھائی کے سامنے اس طرح کی خواہش ظاہر نہیں کرسکتی تھی کہ اسے ایک عدد شوہر کی تلاش ہے۔ حیا راہ میں حائل تھی لہٰذا وہ اکیلی اس اُدھیڑ بن میں مصروف رہی اور ذہنی اکھاڑ پچھاڑ کے دوران اسے اچانک شادی دفتر کا خیال آیا کہ جہاں ہر امیدوار بلاتکلف اپنی ضرورت اپنی خواہش اور اپنی ڈیمانڈ کے ساتھ پیش کرسکتا ہے لہٰذا اس نے فرید بھائی کو کچھ نہیں بتایا لیکن زارا کے ساتھ شادی دفتر کے حوالے سے مشورہ کیا اور زارا ہی کی رضامندی اور مشورے سے ایک دن وہ ایک شادی دفتر پہنچی جس کی کرتا دھرتا ایک معزز خاتون تھی اور اس شادی دفتر کی بہت اچھی ساکھ تھی اور مشہور تھا کہ خاتون نہ تو غلط مشورے دیتی ہے اور نہ دانستہ طور پر غلط شادیاں کراتی ہے۔ شمائلہ خاتون کے بارے میں بہت چھان بین کر کے اس کے دفتر میں آئی تھی اور اس نے اپنی تمام داستان مختصراً سنا دی تھی اور بتا دیا تھا کہ شادی کسی خوشی کے لئے نہیں بلکہ اپنے کھوئے ہوئے شوہر کو دوبارہ پانے کی غرض سے کر رہی ہے۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی اور سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ اگر سچ بتائے بغیر آپ شادی کر لیتیں اور پھر اپنے مقاصد کے لئے شوہر سے طلاق مانگتیں تو بہت دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں اور آپ کی زندگی ایک بار پھر جہنم بن سکتی تھی۔'' شادی دفتر کی خاتون نے شمائلہ کا دکھڑا سننے کے بعد کہا۔

''جی میں نے اسی لئے سب کچھ بتا دیا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ کوئی ایسا آدمی ہو کہ جو......''

''کہاں؟'' خاتون نے شمائلہ کی بات کاٹ کر کہا۔ ''محترمہ آپ خود سوچیں ایسا آدمی کہاں ملے گا جو محض آپ کو چھوڑنے اور آپ کے کھوئے ہوئے سابقہ شوہر سے آپ کو ملوانے کے لئے آپ سے شادی کرے۔'' خاتون نے کہا۔ ''آپ تو ایسا بندہ تلاش کر رہی ہیں جو محض آپ کے عیش کی خاطر آپ سے شادی کرے۔''

''نہیں میڈم نہیں۔'' شمائلہ تڑپ کر بولی۔ ''خدا کے لئے ایسا نہ کہیں۔ میں عیش

کے لئے نہیں اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے شادی کر رہی ہوں۔ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو پانے کے لئے شادی کر رہی ہوں۔'' شمائلہ بات کرتے ہوئے روہانسی ہو گئی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' خاتون نے شمائلہ کو پریشان اور آزردہ دیکھ کر کہا۔
''میں آپ کی پریشانی اور دکھ کو سمجھتی ہوں۔ آپ اپنے کوائف دے جائیں۔ میں آپ کی ڈیمانڈ کے مطابق کوئی رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔'' خاتون نے کہا۔

''شکریہ۔'' شمائلہ بہہ جانے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی اور جب اٹھ کے جانے لگی تو خاتون نے شمائلہ کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش میں از راہ مذاق کہا۔ ''بلکہ کوشش کروں گی کہ کوئی ایسا بڈھا کھوسٹ مل جائے جو جلدی لڑھکنے والا ہو۔''

''آپ بہت جولی ہیں۔'' شمائلہ ہنس پڑی اور پھر اچھے موڈ میں شادی کے دفتر سے باہر نکلی لیکن ایک لفظ بڈھا کھوسٹ اس کے ذہن میں رہ گیا۔

❁

شمائلہ نے گھر آ کر زارا کو ساری روداد سنائی اور لڑھکنے والے بندے کی بات پر دونوں نے خوب انجوائے کیا اور پھر شمائلہ شادی دفتر والی خاتون کے ٹیلیفون کا انتظار کرنے لگی اور اس انتظار میں کئی دن اور ہفتے گزر گئے شادی دفتر سے کوئی ٹیلیفون نہیں آیا اور شمائلہ کی بے چینی حد سے بڑھ گئی۔

''پلیز زارا جی مجھے ہر حال میں زاہد کے پاس جانا ہے۔'' اس دن جب دونوں تنہا بیٹھی تھیں تو شمائلہ نے بے چینی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں زاہد سے پیار کرتی ہوں۔ ٹھیک ہے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن پھر بھی اس کے بغیر اتنے عرصے سے رہ رہی ہوں لیکن زاہد میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے بغیر اس نے جو وقت گزارا ہے، جدائی کے اس زہر نے اسے تباہ کر دیا ہے۔ وہ مزید میری دوری برداشت نہیں کر سکے گا۔ اگر اس کا یہی حال رہا تو وہ مکمل تباہ ہو جائے گا۔ جتنی ضرورت اسے آج میری ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہوئی تو زارا نے لقمہ دیا۔

''تو......'' زارا نے پوچھا۔

''تو کیا شادی دفتر والی خاموش ہے، مجھے کوئی راستہ بتاؤ۔ کوئی شارٹ کٹ......'' اس نے اضطرابی کیفیت میں پوچھا۔

''ایک بات کہوں؟'' زارا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بولو۔'' شمائلہ سراپا گوش ہو کر بولی۔

''یہ جو رجب ہے ماں جی کا بیٹا۔'' زارا نے اتنا ہی کہا تو شمائلہ چونکی۔ ''کیا مطلب وہ تو انتہائی خبیث اور کمینہ آدمی ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے لیکن اس نے خود تمہیں شادی کا پروپوزل دیا تھا۔'' زارا ٹھنڈے دماغ سے بولی۔ ''اور اگر گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے تو یہ اور بھی اچھی بات ہے کیونکہ تم نے کون سی زندگی اس کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس سے چھٹکارا ہی تو لینا ہے۔''

''تو......'' شمائلہ نے تجسس سے کہا کیونکہ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

''تو کیا وہ تو تیار ہی بیٹھا ہوگا۔ تم جا کے ملو اس سے۔'' زارا نے رائے دی۔

''لیکن میں اس کی بیوی کے سامنے نہیں الگ ملنا چاہتی ہوں۔'' شمائلہ نے کہا۔

''الگ ملو، ٹیلیفون کر لو، اسے پہلے ...... وہ بھی الگ ملنا چاہے گا۔'' زارا نے رازداری کی بات کی جو شمائلہ کی سمجھ میں آ گئی اور پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے دھڑکتے دل کے ساتھ ایم رجب کو ٹیلیفون کر دیا اور رجب کو جب شمائلہ کا ٹیلیفون ملا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ فون پر شمائلہ کی آواز سن کر اس نے بے اختیار مصرع پڑھا

ـ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

شمائلہ کو اس کے غالب کا مصرع پڑھنے پر حیرت ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رجب ایک انتہائی ڈفر اور کوڑ مغز آدمی ہے لیکن پھر شمائلہ نے سوچا کہ یقیناً اسے کسی فلم سے یہ مصرع یاد آیا ہوگا جو اس نے اچانک اور بے ساختہ پڑھ دیا ہے۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' شمائلہ نے بہت احتیاط اور دبے دبے لہجے میں کہا۔

''اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہاں ہو میں تمہیں پک کر لیتا ہوں۔'' رجب نے بہت خوشدلی سے کہا۔

''نہیں سر! اس کی ضرورت نہیں، آپ مجھے وقت بتائیں، میں خود آ جاؤں گی۔ سواری کا بندوبست ہے۔'' شمائلہ نے جواب دیا اور پاس بیٹھی زارا نے شمائلہ کے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی میں ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''تم پاگل ہو آنے دیتیں پک کر کے لے جاتا تو اور بھی اچھا تھا۔''

''کیا معلوم کہاں لے جاتا۔'' شمائلہ نے بے ساختہ کہا اور زارا کی ہنسی رک نہ سکی وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

''کون ہے پاس؟'' رجب نے کچھ محسوس کر کے اچانک پوچھا۔ ''باتوں کی آواز آ رہی ہے۔''

''کوئی نہیں ٹی وی لگا ہوا ہے۔'' شمائلہ نے فوراً بات بنالی اور پھر پوچھنے لگی۔ ''مجھے بتائیں کہاں آؤں میں؟''

''آج رات آٹھ بجے گھر آ جاؤ۔'' رجب نے اس طرح کہا جیسے کوئی بہت ہلکا رازداری کی بات ہو۔

''لیکن میں الگ ملنا چاہتی ہوں کوئی اور نہ ہو جہاں۔'' شمائلہ نے کہا اور شمائلہ کے منہ سے یہ بات رجب کے لئے ایک مژدۂ جانفزا تھی اور بے ساختہ بولا۔ ''تو میں کون سے مجمع میں ملنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن گھر میں۔'' شمائلہ نے کچھ کہنا چاہا تو رجب شمائلہ کا مطلب سمجھ کر بات کاٹ کر بولا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ بوڑھی گھوڑی لال لگام کسی میٹنگ وغیرہ میں گئی ہوئی ہے، تم بے کھٹکے آ جاؤ۔''

''کتنے بجے؟'' شمائلہ نے آہستہ سے پوچھا اور رجب شمائلہ کے لہجے کو رازداری کا لہجہ سمجھتے ہوئے اسی انداز میں دھیرے سے بولا۔ ''میں آٹھ بجے گھر پر تمہارا منتظر ہوں گا۔''

''میں آٹھ بجے آ جاؤں گی۔'' شمائلہ نے کہا اور پھر ٹھیک آٹھ بجے رجب کی کوٹھی کے اندر ڈرائنگ روم میں رجب کے ہمراہ موجود تھی۔ کوٹھی میں آ کر شمائلہ کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی ہر چند کہ ماں جی الگ تھلگ اپنے کمرے میں بے جان پڑی رہتی تھیں لیکن گھر میں رونق لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں جی گھر کے ہر کمرے اور ہر مقام پر موجود ہیں۔ ان کے پیار محبت اور خلوص کی خوشبو ساری فضا میں بکھری رہتی تھی اور اب یہ گھر ایک ویرانہ اور ایک قبرستان کی طرح لگتا تھا۔

''ماں جی سے گھر کے اندر کتنی رونق تھی۔'' جب کچھ دیر کمرے میں خاموش رہی تو شمائلہ نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ تو تھی۔'' وہ یونہی بے خیالی میں ماں کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بولا۔ کیونکہ اس کا سارا دھیان شمائلہ کی طرف لگا ہوا تھا جو اس کے بالکل مدمقابل صوفے پر اندر سے بہت گھبرائی ہوئی لیکن بظاہر بہت پراعتماد انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کے بیٹھنے کا اسٹائل رجب کے اندر ایک کھلبلی مچا رہا تھا۔

''مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔'' ذرا توقف کے بعد رجب نے پھر بات کا آغاز کیا۔

''کیسے معلوم تھا۔'' شائلہ نے پوچھا۔

''بس......'' وہ سر ہلا کے ہاتھ ملنے لگا۔

''میں دراصل کچھ کہنا چاہتی تھی۔'' بڑی مشکل سے دھڑکتے دل کو قابو میں کر کے شائلہ بولی۔ ''وہ......'' اس کے ہونٹ پھڑ پھڑائے لیکن قوت گویائی نے ساتھ نہیں دیا۔ اندر ہی اندر ایک خوف نے جیسے اسے دبوچ لیا۔ ''یا اللہ...... کیا وہ اس ہیبت ناک دیو کے ساتھ شادی کرے گی۔'' شائلہ نے سوچا اور ایک متوقع شوہر کی حیثیت سے سر سے پاؤں تک رجب کا جائزہ لیا۔ وہ ایک لمحہ تصور میں بھی، اسے اپنا شوہر قبول نہیں کر سکی لیکن پھر اس نے یہ سوچا کہ یہ سب اس کی نفرت ہے رجب کے لئے جو اس کے من میں ایک کراہت اور بھدی تصویر پیدا کر کے اندر سے بول رہی تھی۔ اپنا کام نکالنے کے لئے تو انسان برے سے برے لوگوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ یہ محض ایک سمجھوتہ ہو گا۔ زاہد اور اپنے بچوں کو پانے کے لئے۔ شائلہ نے رجب کا جائزہ لیتے ہوئے خود ہی سوال و جواب کئے اور خود کو تسلی دیتی رہی لیکن دل کی بات اور حرف مدعا زبان پر لانے میں اسے بہت مشکل پیش آئی۔

''ہاں ہاں بولو۔'' اس کی لمبی خاموشی دیکھ کر رجب نے بے چین نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بات یہ ہے کہ......'' شائلہ ہچکچائی۔

''گھبراؤ نہیں نا، کھل کر بات کرو۔ اس وقت تمہارے میرے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے جو کچھ کہنا ہے وہ کھلے دل سے کہو۔'' اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''دراصل اس دن آپ نے کچھ کہا تھا مجھ سے اور میں نے آپ سے بدتمیزی کی تھی۔ نہیں کرنی چاہئے تھی۔'' شائلہ کا اشارہ شادی کے اس پروپوزل کی طرف تھا جو رجب نے دیا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے آئی ایم سوری فار دیٹ۔''

''او نو ریگراڈ مائی ڈیئر سویٹ ہارٹ۔'' رجب اپنی سیٹ سے اٹھ کے شائلہ کے قریب آ بیٹھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ ''پچھتانا نہیں چاہئے کیونکہ زندگی میں کوئی کام ایک ہی وقت میں پورا نہیں ہوتا۔ کام ادھورے رہ جاتے ہیں جو کبھی نہ کبھی پورے ہو جاتے ہیں۔''

''میں کوئی ادھورا چھوڑا ہوا کام پورا کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی آپ سے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کیا؟'' رجب علی نے بے چینی اور تجسس سے پوچھا اور پھر قریب آنے کی کوشش کی۔

''اب نہیں کہوں گی۔'' شمائلہ اس کے وحشیانہ طرزِ عمل سے خوفزدہ ہوکر جلدی سے اٹھی اور تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئی۔

''ارے سنو...... سنو...... سنو۔'' رجب گیٹ تک اس کے تعاقب میں آیا لیکن شمائلہ اس طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی غائب ہوئی جیسے کوئی ہرنی بھیڑیے کے پنجوں سے بچ نکلتی ہے۔

''لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی بات تھی مجھے کیوں نہیں بتایا۔'' جب فرید بھائی کو شمائلہ کی پرابلم کا پتہ چلا تو انہوں نے شمائلہ کو پیار سے چپت لگا کر کہا اور پھر بیوی کو سخت سُست کہتے ہوئے بولے۔ ''زارا جی! مجھے آپ پر بھی غصہ آرہا ہے۔ آپ نے سب کچھ جانتے ہوئے مجھ سے چھپایا۔''

''شمائلہ نے کہا تھا بھائی جان سے ذکر نہ کرنا۔'' زارا نے بری الذمہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے سامنے شادی کا ذکر کرتے ہوئے شرما رہی تھی۔''

''نان سینس۔'' فرید بولا۔ ''بھلا شرع میں کیا شرم ہے۔'' اور پھر وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''یہ کوئی بری بات تو نہیں ہے اور پھر میری بہن کو شادی کا شوق تو نہیں ہے اسے اپنے شوہر کے پاس واپس جانے کے لئے باعزت راستہ چاہئے اور اس کے لئے یہ راستہ بنانا ہماری ذمہ داری ہی نہیں فرض بھی ہے۔ میں خود بھی انہیں خطوط پر سوچ رہا تھا اب جبکہ تمہاری خواہش کا علم ہوگیا ہے تو پھر اب مجھ پر چھوڑ دو۔ بس مجھے تین دن چاہئیں۔'' فرید نے بہت تیقن کے ساتھ تین انگلیاں کھڑی کر کے کہا جیسے مہلت مانگ رہا ہو اور پھر واقعی تین دن گزرنے کے بعد فرید ایک دن بہت مثبت نتیجے کے ساتھ شام کو گھر لوٹا اور شمائلہ سے کہنے لگا۔

''صبح تمہیں ایک جگہ لے جاؤں گا تیار رہنا۔''

شمائلہ بہت سوچ بچار میں پڑ گئی اور پھر تجسس سے پوچھا۔ ''کہاں چلنا ہے بھائی جان!''

''صبح معلوم ہو جائے گا۔'' فرید نے تجسس برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں شادی کر کے پچھتاؤ گی نہیں۔ شادی تمہاری مرضی سے ہو گی اور طلاق بھی تمہاری مرضی سے۔ تم ان شاء اللہ دوبارہ جا کر اپنا گھر آباد کرو گی زاہد تمہیں ملے گا۔ بچے تمہارے ہوں گے اور تم زندگی کا سفر از سر نو وہاں سے شروع کرو گی جہاں سے سفر کی یہ ڈور ٹوٹی تھی۔ تمہیں اللہ خوشیاں دے گا۔''

''آمین۔'' زارا جو چپ چاپ پاس کھڑی تھی بے ساختہ آمین کہہ اٹھی اور پھر فرید کی ہدایت کے مطابق شائلہ نے ایک بار پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا مختصر سامان باندھا کپڑے لتے سمیٹے اور صبح سویرے ناشتہ کر کے بذریعہ کار لاہور سے کسی قصبے کی طرف روانہ ہو گئی۔ زارا کو فرید الدین نے ساتھ لے لیا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد تین افراد کا یہ قافلہ ایک قصبے میں پہنچا جہاں کھیتوں اور درختوں کے بیچوں بیچ ایک کچے لیکن اچھے اور بڑے مکان کے باہر صحن میں چارپائی پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کرتہ اور لاچا پہنے انتظار کر رہا تھا۔ موصوف کے ہاتھ میں چار چار انگوٹھیاں قیمتی پتھروں والی تھیں اور لاٹھی اس نے چارپائی کے ساتھ ہی رکھی ہوئی تھی۔

برآمدے کے پاس ہی صحن میں درختوں کے بیچوں بیچ فرید الدین کی گاڑی رکی اور تینوں گاڑی سے باہر نکلے۔ چارپائی پر بیٹھا آدمی گاڑی رکنے پر لاٹھی کے سہارے چارپائی سے اٹھا۔ لاٹھی کا سہارا محض اس نے عادتاً لیا ورنہ اسے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب وہ اٹھا تو شائلہ نے اس کا جائزہ لیا تقریباً ساٹھ برس عمر ہو گی لیکن اچھی قد و قامت تھی۔ چوڑا چکلا سینہ، صاف رنگت لیکن چہرے پر جھریاں تھیں جو بڑھاپے کی آمد کی خبر دے رہی تھیں۔ چہرے پر ہلکے ہلکے دھبے اور مہاسے جو بڑھتی ہوئی عمر میں عام طور سے نمایاں ہوتے ہیں۔ خشخشی داڑھی اور داڑھی کے مقابلے میں سر کے چھوٹے چھوٹے بال سفید اور گھنے۔ پیرانہ سالی کے باوجود وہ مضبوط اور توانا جسم کا مالک تھا اور چہرے پر تازگی تھی۔

''بسم اللہ۔'' اس نے اٹھ کر تینوں کا استقبال کیا۔

''السلام علیکم شاہ جی!'' فرید نے پاس آ کر سلام کیا۔ ''وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔'' شاہ صاحب نے بہت خلوص سے سلام کا جواب دیا۔ پھر شائلہ اور زارا نے ہاتھ کے اشارے اور سر کی جنبش سے سلام کیا جس کا جواب شاہ صاحب نے بھی سر کی جنبش سے دیا اور پھر انہوں نے دونوں خواتین کو بہ نظر غائر دیکھا جیسے پہچان رہے ہوں یا اندازہ لگا رہے ہوں کہ دونوں میں سے کون سی امیدوار ہے تاہم ان کے دیکھنے کے انداز میں

شرافت جھلکتی تھی۔ ''شاہ صاحب! یہ میری بیگم ہیں زارا بیگم۔'' فرید نے زارا کا تعار
کرایا اور زارا نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کے آداب کہا۔

''جیتی رہو۔'' شاہ صاحب کا ابہام دور ہوا اور انہوں نے زارا کو دعا دی اور
فرید نے شمائلہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔''اور یہ ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا ت
شمائلہ بیگم جو آپ کی زوجہ بننے کی آرزومند ہیں۔'' اتنے سے تعارف سے ہی شمائلہ جیسے
گئی۔ شرم سے اس کے ماتھے پر پسینے کی لکیریں نمایاں ہوگئیں اور اس کا جی چاہا کہ وہ ز
میں گڑ جائے۔ تاہم اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور نظروں کے ساتھ ساتھ سر بھی
دیا۔

''ماشاءاللہ۔'' شاہ صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

......□......

پاکستانی وقار عظیم پوائنٹ ڈاٹ کام

سرسری تعارف میں ہی شاہ جی نے ایک ناقدانہ نظر سے شمائلہ کا جائزہ لے لیا تھا
ں کے بعد انہوں نے دوسری نگاہ شمائلہ پر نہیں ڈالی اور زارا سے مختصر بات کر کے
الدین سے مخاطب ہو گئے۔

''آپ لوگ بیٹھیں نا۔'' انہوں نے سامنے پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کر کے
ا۔ آمنے سامنے دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ دونوں پر نئی دریاں بچھی تھیں اور صاف
رے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔

''آپ ادھر آ جائیں میرے پاس۔'' شاہ جی نے کہا۔

شمائلہ اور زارا سامنے والی چارپائی پر اور فرید بھائی شاہ جی کے برابر بیٹھ گئے۔

''سفر کیسا رہا؟'' شاہ جی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' فرید نے مختصر جواب دیا۔

''کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی نا راستے میں۔'' شاہ جی نے مزید پوچھا۔

''نہیں شاہ جی! تین گھنٹے کا تو سفر تھا سارا۔ کیا تکلیف ہونا تھی۔'' فرید نے راستے
تکلیف کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔

''تین گھنٹے۔'' شاہ جی بولے۔ ''تین گھنٹے دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں اور دیکھا
ئے تو بہت کچھ ہیں۔'' شاہ جی نے فلسفیانہ انداز میں بولنا شروع کیا۔ ''اب یوں لیں کہ
ٹ تین گھنٹے میں خلا کو چھونے لگتا ہے۔ ہوائی جہاز تین گھنٹے میں پاکستان کے ایک
ے سے اڑ کر دوسرے سرے سے باہر نکل جاتا ہے لیکن ریل گاڑی اتنے وقت میں
ر سے جہلم بھی نہیں پہنچتی۔ اگر آپ تانگے سے سفر کرتے تو تانگہ ابھی شاہدرے کے
ہوتا اور اگر آپ نے پیدل سفر کیا ہوتا تو......'' شاہ جی یہاں تک پہنچ کر رکے اور خود
س دیئے اور پھر سب لوگ شاہ جی کی تقلید میں ہنس پڑے۔ ''میں بھی کس فضول بک
میں پڑ گیا ہوں۔'' انہوں نے خود ہی اپنی بے تکی گفتگو کو مسترد کیا اور پھر گھر کے سامنے
ایک جھگی کی طرف دیکھ کر زور سے پکارے۔ ''اوئے پنوں آنا، کتنی دیر لگاؤ گے اور؟''

یہ حکم ایک ملازم پنوں کے لئے تھا جو سامنے والی کٹیا سے آ رہا تھا جس کے ہاتھ میں ایک ٹرے دستر خوان سے ڈھکی ہوئی تھی۔

''آیا سرکار......!'' ملازم نے دور سے ہی جواب دیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہ شاہ جی کے حویلی نما کوٹھے کی طرف بڑھنے لگا۔

''یہ تپائی بیچ میں رکھ دے۔'' جب پنوں ٹرے لے آیا تو شاہ جی نے اسے حکم دیا۔ ملازم نے بیچ میں تپائی رکھی اور پھر ٹرے سے کھانا نکال کے میز پر سجا دیا۔ سرسوں کا ساگ مکئی کی روٹیاں جو خوب مکھن میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ لسی اور اچار الگ سے ایک پلیٹ میں بھنے ہوئے بٹیر رکھے تھے۔

''تم چائے کا بندوبست کرو۔ شہر کے لوگ کھانا کھانے کے بعد چائے پیتے ہیں۔ دوڑ جاؤ۔''

شاہ جی نے ملازم سے کہا۔ ملازم نے پھر سامنے کٹیا کی طرف دوڑ لگائی۔ شاہ جی نے پانی کے جگ سے اپنی انگلیوں میں پوریں گیلی کیں اور پھر تینوں کو مشترکہ طور دعوت طعام دیتے ہوئے کہا۔ ''بسم اللہ کیجئے۔''

''شاہ جی! یہ تکلف کیوں کیا آپ نے؟ ہم نے تو کھانا کھا لیا ہے۔'' فرید بھائی نے ازراہِ تکلف تامل کرتے ہوئے کہا۔

''فرید میاں! جو سوال پوچھا نہ جائے اس کا جواب نہیں دینا چاہئے۔ میں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ نے کھانا کھا لیا ہے یا نہیں۔ میں نے کھانا کھانے کے لئے کہا ہے آپ سے۔ نمبر ایک۔'' وہ یہ کہہ کر رکے، پھر کہنے لگے۔ ''نمبر دو یہ کہ صبح جب آپ گھر سے نکلے ہوں گے وہ کھانا کھانے کا وقت نہیں تھا میں نہیں سمجھتا کہ راستے میں گاڑی روک کے آپ نے کھانا کھایا ہو گا لہٰذا آپ کی یہ بات بلا جواز ہے۔ تناول فرمایئے۔'' انہوں نے دوبارہ کہا اور اب فرید کو شاہ جی کے لہجے میں تحکمانہ انداز زیادہ لگا۔

''اب تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی آپ نے۔'' فرید نے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور پھر شمائلہ اور زارا سے بولا۔ ''بسم اللہ کیجئے۔'' لہٰذا زارا اور شمائلہ نے جب ہاتھ کھانے کی طرف بڑھایا تو پھر شاہ جی کا ہاتھ بھی آگے بڑھا لیکن نوالہ توڑنے سے پہلے ان کی نگاہ شمائلہ کے سڈول خوبصورت ہاتھ اور مخروطی انگلیوں پر مرکوز ہو گئی۔ درمیانی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کا نگینہ بہت پرکشش انداز میں چمک رہا تھا۔

''یہ بلاوجہ کی بات ہے کہ انگوٹھی سیدھے ہاتھ میں نہیں پہننی چاہئے۔ شرع کے اندر

ایسی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ تاہم......'' شاہ جی نے اپنی نگاہیں شائلہ کے ہاتھ پر دوبارہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔'' تاہم اگر کھاتے وقت انگوٹھی سیدھے ہاتھ سے نکال کے بائیں یعنی الٹے ہاتھ میں ڈال دی جائے تو یہ مستحسن ہے۔ اس کا سبب خارجی محرکات ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے خود اپنے سیدھے ہاتھ کی چاروں انگوٹھیاں نکالیں اور چونکہ الٹا ہاتھ پہلے ہی انگوٹھیوں سے مزین تھا اس لئے انہوں نے انگوٹھیاں میز پر رکھ دیں۔ شائلہ نے بھی آہستہ سے انگوٹھی نکالی اور الٹے ہاتھ کی درمیان والی انگلی میں ڈال لی۔ اس عمل کے دوران شائلہ کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے۔ انگوٹھی نکالنے اور ڈالنے کے عمل میں دونوں ہاتھ کی انگلیاں آپس میں جڑیں جو بہت خوبصورت اور دلکش لگ رہی تھیں۔ شاہ جی کی نظریں ابھی تک شائلہ کے ہاتھ اور انگوٹھی پر مرکوز تھیں۔

''ماشاء اللہ'' انہوں نے ایک بار پھر داد دیتے ہوئے زیر لب کہا اور ان کے بولنے سے صاف طور پر معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ انہوں نے کس کو سہرا ہے۔ آیا شائلہ کے ہاتھوں کو، انگوٹھی کو یا پوری شائلہ کو۔

اسی شام دوپہر کے بعد جب فرید، زارا اور شائلہ اور شاہ صاحب کھانا کھا چکے تو تھوڑا سا اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کے بعد حویلی کے اطراف پھیلے ہوئے کھیتوں میں چہل قدمی کو نکل گئے۔ شاہ جی اپنے مہمانوں کو مختلف پھلوں کے درخت، کھیتوں میں اُگنے والی فصلوں کی نوعیت اور جڑی بوٹیوں اور پھلوں پتوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ معلوم نہیں شائلہ کے من میں اس وقت کیا کیا خیالات آ رہے تھے اور مغرب سے چلنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کے جسم کو معطر کر رہی تھی۔ یا تیزاب کی طرح جلا رہی تھی لیکن فرید بھائی اور زارا محسوس کر رہے تھے کہ حویلی ایک خوشنما ماحول میں واقع ہے۔ یہ مٹی کا ایک پختہ اور بڑا کوٹھا حویلی ہی کے نام سے گردونواح میں معروف تھا۔ حویلی کے چاروں طرف کھلے بڑے کھیت اور مختلف اقسام کے درخت تھے۔ کھیت کے ایک سرے پر عین حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے دو تین جھگیاں تھیں جہاں ایک میں شاہ جی کا ملازم پنوں تھا جو اپنے بال بچوں سمیت رہتا تھا جو شاہ صاحب کا خدمتگار بھی تھا اور شاہ صاحب کے کھانے بنانے کے علاوہ مہمانوں کی خاطر تواضع کا ذمہ دار بھی۔ اس کے علاوہ پنوں کی جھگی کے ساتھ ہی ایک بڑا حجرہ بنا ہوا تھا۔ شاہ صاحب کی اپنی بیٹھک اور مہمانوں سے میل ملاقات اسی حجرے میں ہوتی تھی۔ اپنے کوٹھے یا حویلی کے اندر کسی غیر کا داخلہ ممنوع تھا اور شاہ

صاحب اس حویلی کے اندر تنہا رہتے تھے البتہ کوئی خاص قسم کے مہمان آ جائیں جن کے ساتھ فیملیز یا خواتین بھی ہوں جیسے فرید بھائی زارا اور شمائلہ آ گئے تھے تو انہیں شاہ جی حجرے میں نہیں بلکہ اپنی حویلی کے اندر شرف ملاقات بخشتے تھے۔ موصوف ایک انتہائی مرنجاں مرنج، ملنسار، مشفق اور مہربان طبیعت کے آدمی تھے جو اپنے معتقدین اور مزارعین اور دوسروں کے ساتھ بھی بہت اخلاق اور دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔ تعلیمی پس منظر کا کچھ حوالہ نہیں ملتا تھا کہ کتنا پڑھے اور کہاں تک پڑھے ہیں لیکن گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ مطالعہ رکھتے ہیں۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی ہے جنہیں موقع محل کے اعتبار سے استعمال کرتے ہیں۔ گفتگو میں فارسی شعرا اور اشعار کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ کبھی کبھار کبیر اور تلسی داس کو بھی دہراتے ہیں اور کبھی کبھار اپنی گفتگو کا سلسلہ تصوف کی منزلوں سے ملا دیتے ہیں لیکن ان سب خیالات اور تصورات کے باوجود ایک مکمل دنیادار تھے۔ زمینوں کا حساب کتاب اور مزارعوں کے ساتھ صحیح لین دین اور فصل کے بیوپاریوں پر کڑی نگاہ رکھنے والے آدمی تھے۔ سب کے ساتھ انصاف کرتے تھے۔ کسی کا حق کبھی نہیں مارا بلکہ حجرے میں جب داخل ہوتے تو ان کے داخلے سے پہلے کوئی نہ کوئی غرض مند پہلے سے وہاں ضرور موجود ہوتا اور کبھی کسی غرض مند کو مایوس نہیں کرتے تھے تاہم ان کی ازدواجی زندگی متنازع اور کچھ اس طرح کی تھی کہ اس پر کئی طرح کی باتیں ہو سکتی تھیں لیکن شاہ جی کا لوگوں کے ساتھ اچھا اور مشفقانہ رویہ کسی کو شاہ جی پر انگلیاں اٹھانے کا موقع فراہم نہیں کرتا تھا۔ اس دن شاہ جی نے پورا دن زارا، شمائلہ اور فرید بھائی کے ساتھ گزارا۔ دوپہر میں تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد انہوں نے مختصراً حویلی کا پورا جغرافیہ اور محل وقوع ان لوگوں کو بتایا اور ان کی گفتگو اور رویے سے زارا اور فرید بھی بہت متاثر ہوئے اور متاثر تو شمائلہ بھی ہوئی لیکن وہ ایک عجیب کشمکش اور گومگو کے عالم میں تھی کہ آگے جو کچھ ہونا ہے وہ فرید بھائی یا زارا کے ساتھ نہیں شمائلہ کے ساتھ ہونا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ شاہ صاحب ایک طلسماتی شخصیت کے مالک دکھائی دیتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی شخصیت میں ایک راز، ایک تجسس اور ایک اسرار دکھائی دیتا تھا۔ اس دن سہ پہر کے وقت کھیتوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے اچانک شاہ جی رکے تو زارا، شمائلہ اور فرید بھائی بھی رک گئے۔

''اب ایک ضروری بات۔'' شاہ جی نے رکتے ہوئے کہا اور حسب عادت ناک کا ایک نتھنا انگوٹھے کی پور سے بند کر کے دوسرے نتھنے سے ہلکا سا سانس اوپر لیا جیسا پھول پتوں سے معطر تازہ ہوا کا جھونکا دماغ میں داخل کر رہے ہوں۔

"ضروری بات یہ ہے کہ میں شمائلہ خاتون سے علیحدگی میں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جب تک کھیتوں کی سیر کریں کوئی پھل اچھا لگتا ہے تو توڑیں یا اپنے کمرے میں جا کے آرام کریں۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ شام کو واپس......" فریدالدین نے زارا کے ساتھ یہ پروگرام بنایا تھا کہ شام تک وہ لوگ فارغ ہو کے واپس شہر کو روانہ ہو جائیں گے۔

"نا ئیں، نا ئیں، نا ئیں۔" شاہ جی فرید کی بات کاٹ کر بولے۔ "بھئی آپ میکہ ہیں شمائلہ خاتون کا اور شادی کے بعد دلہن کا رابطہ میکے سے اس طرح نہیں ٹوٹنا چاہئے جس طرح آپ توڑ کر جا رہے ہیں۔ اگر ایک ہفتہ نہیں تو کم از کم چار دن آپ ضرور یہاں رہیں گے۔ ویسے بھی ہمارے یہاں مہمان آتا اپنی مرضی سے اور جاتا ہماری مرضی سے ہے۔ ٹھیک......؟" پھر شاہ جی سوالیہ نظروں سے فریدالدین کو دیکھنے لگے۔

"ٹھیک جناب جو حکم۔" فرید نے تائید کی مہر لگائی۔

"تو پھر ہم آپ کو کچھ دیر کے بعد ملیں گے۔" شاہ جی نے کہا اور پھر گردن دھیرے دھیرے دائیں جانب کو اس طرح گھمائی جیسے نماز کا سلام پھیرا جاتا ہے اور آدھا سلام پھیر کر جیسے شمائلہ سے نہایت نرم رو اور مہذب انداز میں بولے۔ "تشریف لائیے اور ہاتھ آگے بڑھا دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ شمائلہ کے پیچھے پیچھے چلنا چاہتے ہیں۔ شمائلہ نے تھوڑا سا تامل کیا ایک سوالیہ نظر فرید بھائی کے چہرے پر ڈالی جہاں فرید بھائی کی آنکھوں میں رضامندی اور سر میں اثبات کی ہلکی سی جنبش تھی اور شمائلہ دھڑکتے دل کے ساتھ شاہ جی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے شاہ جی کے ساتھ ساتھ حویلی کے اندر داخل ہو گئی۔ زارا اور فرید بھائی اپنی جگہ جوں کے توں انتہائی تجسس کی کیفیت میں کھڑے رہ گئے جبکہ زارا کو بارے پر تجسس سے زیادہ تشویش تھی۔

"یہ کیا کیا تم نے۔ شمائلہ کو اکیلی کیوں جانے دیا اس کے ساتھ۔" زارا نے تشویش سے کہا۔

"پاگل ہو تم، شمائلہ نے اسی کے ساتھ تو رہنا ہے۔" فرید نے خیال ظاہر کیا اور پھر تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس میں پریشان ہونے کی بات نہیں، وہ ایک ذمہ دار اور معقول انسان ہے اور پھر ویسے بھی شام تک ان کا نکاح تو ہو ہی جائے گا۔"

"لیکن نکاح سے پہلے......" زارا نے پھر تشویش ظاہر کی۔

"نکاح سے پہلے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی بات چیت کرنا چاہتا ہے وہ۔ نکاح سے پہلے

دس طرح کی باتیں نہیں ہوتی ہیں کیا۔ سب ٹھیک ہوگا۔ پریشان نہ ہو۔" فرید نے زارا
پریشانی دور کرتے ہوئے کہا لیکن درحقیقت وہ خود بھی پریشان ہوگیا تھا اور زبردستی ا
پریشانی کو دور کرنے اور چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ "آؤ چلیں کمرے میں وہاں انتظ
کریں گے۔" اس نے زارا سے کہا اور دونوں کمرے میں چلے گئے۔

"آج غروب آفتاب کے بعد ان شاء اللہ آپ میرے نکاح میں آجائیں گ
اس وقت کمرے میں میرے اور آپ کے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے۔ میں چاہتا ہ
نکاح سے پہلے کھل کر بلاتکلف بات چیت ہو جائے۔ کچھ آپ کہیں کچھ میں کہوں، کچھ آ
سنیں کچھ میں سنوں تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔" شاہ صاحب نے کمرے کی خاموش
میں اپنی مدھم لیکن گھمبیر آواز کی گونج سے ایک ارتعاش پیدا کیا۔ شمائلہ کے من کی عجی
کیفیت ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور دھڑکن سے اس کے اندر ایک ایسی د
دھم پیدا ہو رہی تھی جیسے کوئی نقارہ پیٹ رہا ہو اور یہ احساس اس پر لرزش طاری کر رہا تھا
وہ ایک ایسے اجنبی کے سامنے بیٹھی ہے جو سورج غروب ہونے کے بعد اس کے جسم و جا
کا مالک بن جائے گا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ اس کے ہونٹوں پر جیسے خاموشی کی مہر لگ گئی۔

"بولیئے، کہیۓ کچھ۔" جب شمائلہ کچھ نہ بولی تو شاہ جی نے قدرے توقف سے
کہا۔ شمائلہ پر اس وقت شاہ جی کا ایسا رعب طاری تھا جس کو وہ آسانی سے کوئی نام نہ
دے سکتی تھی اور جس نے اس کی زبان بند کر رکھی تھی تاہم وہ ہمت کر کے بولی۔ اس خیا
سے کہ اس کے مدمقابل شخص کے سامنے ہی اس نے اب بولنا بھی ہے اور چپ بھی ر
ہے لہٰذا شمائلہ نے ہمت کر کے اٹک اٹک کے بولنا شروع کیا۔

"دیکھیۓ...... میں نے جو یہ فیصلہ کیا ہے تو ایک خاص مقصد......"

"ہش ش۔" شاہ جی نے شمائلہ کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔ "مقصد بتانے
ضرورت نہیں۔ کیا میں جانتا نہیں ہوں کہ آپ شادی مجھے پانے کے لئے نہیں، زاہد
پانے کے لئے کر رہی ہیں۔"

اف تو زاہد کا نام بھی جانتا ہے پھر تو یہ میری کہانی بھی جانتا ہوگا شاید بھائی جا
نے بتایا ہوگا۔ شمائلہ نے سوچا اور پھر شاہ جی نے اس سے کچھ کہنے کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ خ
کہنے لگے۔ "لیکن میں بہرحال انسان ہوں۔ میں پتھر کی مورتی کے ساتھ نکاح نہیں
سکتا۔ آپ کا دل بے شک میرے ساتھ نہ ہو اور ہو بھی نہیں سکتا لیکن میں آپ سے یہ تو
رکھوں گا کہ آپ میرے ساتھ زندگی کے رویوں میں بیزاری کا مظاہرہ نہ کریں۔" ش

صاحب روانی سے بولتے بولتے لحہ بھر کو رکے اور شمائلہ کے جھکے ہوئے سر کو ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کے چہرہ اوپر اٹھایا اور پوچھا۔ ''آپ سن رہی ہیں ناں۔''

''جی......'' شمائلہ نے ایسے دھیمی میٹھی سی ''جی'' کہی جیسے کوئی چہچہانے والی بیمار و نزار چڑیا اچانک دلدل میں پھنس کر ایک چھوٹی سی آواز نکال کر اپنی زندگی اور وجود کا ثبوت دیتی ہو۔

''میرے پاس پیسہ ہے، زمین ہے، نوکر چاکر مزارع، معتقدین اور چاہنے والے ہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میں دنیا کی ہر سہولت آپ کو فراہم کروں گا۔ اس کے بدلے میں آپ مجھے ایک مصنوعی خوشی دیں گی۔ مصنوعی اس لئے کہ پہلے تو کوئی خوشی دائمی نہیں ہوتی۔ دوسرے آپ کے جو حالات ہیں اس کے مطابق آپ مجھے دائمی خوشی دے بھی نہیں سکتی ہیں لیکن میری طرف سے آپ کو دائمی خوشی مل سکتی ہے۔ وہ کیسے، وہ یوں کہ میں آپ کے اوپر کبھی سوت نہیں لاؤں گا۔ اس حویلی میں ایسا کبھی نہیں ہوا میں درجن سے زیادہ بیویوں کا شوہر رہا ہوں لیکن ایک وقت میں ایک رہی۔ میں نے ہمیشہ انصاف کیا ہے۔ جب تک کسی نے رہنا چاہا رکھی۔ جب چڑیا نے اڑنا چاہا اڑا دی۔ تمہیں بھی اڑا دوں گا فکر نہ کرنا لیکن تم کو پورا پورا تعاون کرنا ہوگا۔ اگر میرے ساتھ تعاون کرنا منظور ہے تو آج شام کو نکاح ہو جائے گا اور اگر رونے دھونے کے لئے شادی کر رہی ہو تو پھر مت کرو۔ بولو کرو گی تعاون؟''

شاہ صاحب نے سوال پوچھ کر جواب کے لئے وقفہ دیا تو شمائلہ نے پہلی دفعہ سر اٹھا کے بھرپور نظروں سے شاہ صاحب کے جلالی چہرے کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سبحان اللہ۔'' شاہ صاحب نے بھی شمائلہ کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈال کے داد دیتے ہوئے کہا۔ ''عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویر ہیں آپ...... لیکن آپکو چغتائی نے نہیں اس باری تعالیٰ اللہ نے بنایا ہے جو اس کائنات کے حسن کا سب سے بڑا مصور ہے اس لئے اس حسن پر اترانے یا ناز کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی تشکیل میں آپ کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں۔''

مسلسل بولتے ہوئے شاہ صاحب اچانک چپ ہو گئے اور شمائلہ سر جھکا کے اس کی مسلسل گفتار سنتے ہوئے تھکن محسوس کر رہی تھی تاہم اسے شاہ جی کی یہ گفتگو بور نہیں لگی تھی۔ اس کی گفتگو کے اندر شمائلہ کوئی ایسی دلچسپی محسوس کر رہی تھی جسے کوئی نام دینا پھر اس کے

لئے مشکل ہو رہا تھا۔
''تم نے کوئی سوال پوچھنا ہے۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد شاہ جی نے شمائلہ سے سوال کیا۔
''جی۔'' وہ فوراً بولی شاید اس کے ذہن میں کوئی سوال تھا لہٰذا پوچھا۔ ''کیا میں آپ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد زاہد سے مل سکوں گی؟''
''ضرور......'' شاہ جی نے بے ساختہ کہا۔ ''لیکن میری اجازت کے بغیر نہیں۔''
''توبہ......'' شمائلہ نے دل میں کہا۔ ''کتنا زیرک آدمی ہے اقرار بھی نہیں کیا اور انکار بھی نہیں۔'' شمائلہ نے پھر تھوڑا سا توقف کیا اور پھر رضامندی دیتے ہوئے بولی۔
''ٹھیک ہے جی، منظور ہے مجھے۔''
پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ ''اب آپ جایئے فرید اور بیگم فرید منتظر ہوں گے اور منتشر بھی۔ جا کے تیاری کیجئے۔ مغرب اور عشاء کے درمیان نکاح ہو گا۔'' شمائلہ اٹھی اس نے سر اسی طرح جھکائے رکھا۔ کافی حد تک اس کا ڈر اور خوف کم ہو چکا تھا۔ وہ کھڑی رہی غالباً شاہ جی کے حکم کی منتظر تھی۔
''خدا حافظ! شام کو ملاقات ہو گی۔'' شاہ جی نے کہا اور شمائلہ تیز تیز ڈگ بھرتی کمرے سے نکل گئی۔

❁

شام کو نکاح تھا۔ نکاح ایک الگ بیٹھک میں ہوا۔ کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ کچھ اس طرح ساری کارروائی ہوئی جیسے روز کی معمول کی بات ہو۔ ایک مولوی صاحب آئے جو قریب کی کسی مسجد کے پیش امام تھے اور شاہ صاحب کے زیر اثر تھے۔ گواہوں میں ایک شاہ صاحب کا معتقد تھا اور دوسرے فرید بھائی تھے اس کے علاوہ نہ کوئی اور مرد تھا نہ خاتون۔ ایک زارا تھی جو حویلی کے کمرے میں بیٹھی سراپا تجسس بنی ہوئی تھی اور وہی شمائلہ کو نکاح خواں کے کمرے میں ہاتھ تھام کے پہنچا آئی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ شمائلہ کو سرخ جوڑا پہنائے جو وہ آتے وقت لاہور سے ساتھ لے کر آئی تھی لیکن شمائلہ نہیں مانی۔ اس نے اپنے معمول کے جوڑوں میں سے ایک صاف دھلا ہوا جوڑا پہنا تھا جو اس پر بہت جچ رہا تھا۔ میک اپ اس نے اتنا ہی کیا تھا جتنا وہ روزانہ کرتی تھی۔ تاہم اس کے لئے یہ سارا مرحلہ قیامت خیز تھا۔ زارا جب اسے تیار کر رہی تھی تو اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ دلہن نہیں بن رہی ہے بلکہ اس کی میت کو نہلایا اور کفنایا جا رہا ہے جسے آج ہی رات کو دفنا بھی

دیا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ موت کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے اسی طرح شمائلہ بھی اپنے زاہد اور بچوں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے موت سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ نکاح کے وقت زارا کو بھی بلوا لیا گیا تھا کیونکہ شاہ جی نے محسوس کیا تھا کہ شمائلہ گھونگھٹ کے اندر اپنی ہچکیوں کو روک اور چھپا رہی ہے۔ اسی لئے کسی ہمدرد خاتون کا پاس ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا زارا نے شمائلہ کے کندھے اپنے بازو میں لئے اسے اپنے قریب کیا۔ کان میں کچھ کہتی رہی۔ پیار کرتی رہی اور اسی دوران ایجاب و قبول ہو گیا جو مختصر سے چار پانچ لوگ تھے ان میں چھوہارے بٹے دعا ہوئی اور وہیں سے شاہ صاحب شمائلہ کو اپنے جلو میں لئے کمرۂ عروسی میں لے گئے۔

''شرمانا، لجانا، گھبرانا، تڑپنا، تڑپانا، آنسو بہانہ، ہچکچانا، ماننا نہ ماننا، یہ سارا زمانہ آپ گزار چکی ہیں۔ اس کو ہم نے نئے سرے سے شروع نہیں کرنا ہے۔ ہم نے بغیر کسی تمہید کے شروع کی ہوئی کہانی کو جاری رکھنا ہے۔ سمجھ گئی ہیں ناں؟'' شاہ جی نے شمائلہ کو پلنگ پر بٹھانے کے بعد ایک لمبی گفتگو چھیڑی اور شمائلہ کا سر اس کی بک بک سے دکھنے لگا لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک ہی دن میں شمائلہ نے محسوس کر لیا تھا کہ شاہ ایک سنکی اور ابنارمل شخص ہے اور اس کے ساتھ اب جو تقدیر وابستہ ہو گئی ہے تو خندہ پیشانی سے اس تقدیر کو نبھانا ہے۔

''سمجھ گئی ہیں ناں؟'' شاہ جی نے پوچھا۔

''جی۔'' شمائلہ آہستہ سے بولی۔

''شاباش۔'' شاہ جی نے پھر اس کی ''جی'' کو سراہا اور آگے بڑھ کر مسہری کے عقب میں رکھی وارڈ روب کا دروازہ کھول دیا جس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہمہ اقسام لیڈیز کپڑے ہینگروں میں ٹنگے ہوئے تھے۔

''میں رہتا تو گاؤں میں ہوں لیکن عورت کا لباس گاؤں کا نہیں رکھتا ہوں تم جیسا بھی شب خوابی کا لباس پہننا چاہو اس وارڈ روب میں موجود ہے۔ یہ بھاری بھرکم سوٹ اتار کے اپنی مرضی کے مطابق ہلکا پھلکا لباس پہن لو۔ میں دس منٹ کے اندر واپس کمرے میں آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئے۔ شمائلہ تھوڑی ہی دیر میں اس کے مزاج کو سمجھ گئی تھی لہٰذا اس نے اس کی مرضی کے مطابق لباس پہن لیا۔ شاہ صاحب جب واپس آئے تو ایک ترچھی نگاہ سے شمائلہ کو دیکھا۔

''سبحان اللہ۔'' وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔ تھوڑی دیر پہلے جو میرے سر میں درد تھا

اب خود بخود جاتا رہا۔ پھر بھی ایک ٹیبلٹ کھا لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کباٹ کے
اندر سے ایک شیشی نکال کے ایک گولی منہ میں ڈالی اور سر کو جھٹکا دے کر پانی کے بغیر حلق
سے نیچے اتار دی اور شمائلہ سمٹتی چلی گئی۔

''اٹھ جایئے، صبح ہو گئی ہے، باہر صبح بہت خوبصورت ہے۔'' شاہ صاحب نے کھڑکی
سے ہاتھ بڑھا کر پھول کی پتی توڑی اور شمائلہ کے رخسار پر پھیرتے ہوئے بہت پیار سے
کہا۔ شمائلہ رات سوئی ہی کہاں تھی پوری رات انگاروں اور کانٹوں پر لوٹتی رہی۔ ابھی صبح
کے وقت ذرا تھکن اتارنے کی کوشش کر رہی تھی کہ شاہ جی نے پھول کی پتی جو اس کے
رخسار پر پھیری تو اسے یوں لگا جیسے کانٹوں کا جال چل رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ''
جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔'' شاہ جی نے کہا اور حویلی سے باہر نکل گئے۔ شمائلہ بھی ان کے
تعاقب میں باہر آ گئی۔ باہر صحن میں زارا اور فرید بھائی موجود تھے جو ابھی ابھی آنکھیں
ملتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلے تھے اور شاید شمائلہ اور شاہ جی کے بارے میں ہی
سوچ رہے تھے اور شاید رات بھر وہ دونوں بھی نہیں سوئے تھے اور اس عجیب و غریب شادی
کے بارے میں ہی سوچتے اور باتیں کرتے رہے تھے اور زارا کی آنکھوں کی سوجن اور لالی
بتا رہی تھی کہ وہ رات بھر نہیں سوئی ہے اور یہی حال شمائلہ کا تھا اس کی آنکھیں بھی لال تھیں
اور سوجی ہوئی تھیں اور جب دونوں سوجی ہوئی لال آنکھوں کے ساتھ آمنے سامنے ہوئیں
تو استاد امن کے کسی شعر کی تشریح بن گئی تھیں کہ

تہاڈی اکھیاں دی لالی دسدی ایہہ
روئے تسی وی ہو تے روئے اسی وی آں

شاہ جی شمائلہ کو ساتھ لئے قریب آئے اور بہت خوشگوار موڈ میں درختوں اور پتوں
کی طرف دیکھ کر فرید بھائی سے مخاطب ہو کر بولے۔
''فرید میاں دیکھو صبح کتنی خوبصورت ہے۔'' اور فرید نے بلا تامل معنی خیز انداز میں
کہا۔ ''اس میں کیا شک۔''
''ہم ذرا غسل کے لئے جا رہے ہیں۔ چلو گے۔'' پھر شاہ صاحب نے موضوع
بدل کر پوچھا۔
''کہاں شاہ جی؟'' فرید نے استفسار کیا۔
''وہ سامنے درختوں کا جھنڈ دیکھا ہے۔'' شاہ جی نے کھیتوں کی سیدھ میں دور جا

نگ نظر ڈالی اور دور ایک جگہ درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے
ہا۔

"جی دیکھا۔" فریدالدین نے جواب دیا۔

"وہاں چشمہ ہے پانی کا جہاں میں صبح صبح نہاتا ہوں۔" شاہ جی نے کہا اور فرید
کہنے لگے۔ "آ جاؤ۔"

"لیکن سر!" فرید نے قدرے تامل سے کہا۔ "یہ تو بہت دور ہے۔ اگر راستہ ہو تو
اڑی لے چلیں۔"

"صبح کی سیر کبھی کسی نے گاڑی میں کی ہے کیا؟ پیدل چلیں گے اور جب میری عمر
ے آدمی کو دور نہیں لگتا ہے تو تم تو جوان ہو۔ لگاؤ دوڑ میرے ساتھ دونوں کے اسٹیمنا کا
ی امتحان ہو جائے گا۔" شاہ جی نے بہت خوشگوار موڈ میں کہا اور فرید کا ہاتھ تھام کر پھر
لے۔ "آ جاؤ۔"

فرید چل پڑا تو شاہ جی رک کر شائلہ اور زارا دونوں سے مخاطب ہوئے۔ "اور ہاں
ل خانے میں خواتین کے نہانے دھونے کے لئے ٹھنڈا اور گرم پانی موجود ہے۔" شاہ
احب فریدالدین کو ساتھ لئے کھیتوں میں اتر گئے۔ شائلہ بہت گہری اور آبدیدہ نظروں
ے خاموشی کے ساتھ زارا کو دیکھنے لگی جیسے دکھ کی ایک لمبی داستان بیان کر رہی ہو یا کرنا
اتی ہو۔ زارا نے بھی اسے خاموش فریاد کرتی نظروں سے دیکھا اور پھر دونوں کسی
اطیسی قوت سے ایک دوسرے کی طرف کھنچ کر گلے ملیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے
یں۔

⁂

منحنی جسم لبوترا لیکن صاف شفاف تازہ شیو کیا ہوا چہرہ۔ عمر تقریباً اسّی سال کے لگ
ک ہو گی لیکن چہرے پر پیرانہ سالی کی کوئی جھری دکھائی نہیں دیتی تھی جس کی ایک وجہ
ایہ بھی ہو سکتی ہے کہ جسم پر گوشت ہی نہیں اور صاف شفاف چہرے کی جلد ہڈیوں پر اس
ح چڑھی ہوئی تھی جیسے بٹنوں پر ریشمی کپڑا منڈھ دیا گیا ہو، سر کے بال شیمپو کئے ہوئے،
صورت سفید لیکن روشن اور چمکدار اور سر کے ساتھ چپکنے کی بجائے اوپر کی طرف اٹھے
ئے اور اگر یہ مختصر سے بال نہ ہوتے تو کسی تانبے کے چمکدار لگن کی مانند دکھائی دیتا تاہم
ں کی رونق اور چھدرا پن اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ جوانی میں یہ بال ناریل کی
ح گھنے اور الجھے ہوئے رہے ہوں گے یہ تھا مشہور ماہر اور شہر کا نامور سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر

ضامن جو عام ماہرین نفسیات کے برعکس بہت خوش پوشاک اور بہت پروقار آدمی تھا
وضع قطع اور سنوار کے رکھنے کے باوجود اپنے رویے میں ایک روایتی ماہر نفسیات
حاضر دماغ بھی اور غیر حاضر بھی رہتا تھا۔ ہمیشہ کھویا ہوا بھی اور موجود بھی۔ بہت
والا بھی اور بہت چپ رہنے والا بھی۔ تحمل مزاج بھی اور سنکی بھی۔ مریض کے مسئلے
ڈوب کے جذب ہو جانے والا بھی اور بعض اوقات اسے ڈانٹ کے بھگا دینے والا
ڈاکٹر ضامن اس طرح کی ملی جلی شہرت رکھنے والا ایک ماہر نفسیات تھا وہ بے پناہ مصر
ڈاکٹر تھا۔ اس کا پی اے بھی کسی مریض کو اپائنمنٹ اس لئے نہیں دیتا تھا کہ یہ ڈا
ہدایت تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت اس لئے تھی کہ ڈاکٹر کو یقین نہیں تھا کہ وہ کلینک میں آ
یا نہیں اور اگر آ جاتا تھا تو تمام مریضوں کو باری باری دیکھ کے اور فارغ کر کے ج
چاہے نصف رات ہی کلینک میں کیوں نہ ہو جائے۔

شمس اس دن کوئی دو گھنٹے باہر مریضوں کے انتظار کرنے کے کمرے میں بیٹھے
بعد اپنی باری پر اندر ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور جب وہ ڈاکٹر کے سامنے مریضوں
مخصوص کرسی پر بیٹھا تو ڈاکٹر ضامن نے اپنے دبیز شیشوں والا چشمہ اتار کے شیشو
پھونک ماری شمشے ٹشو سے صاف کئے۔ چشمہ آنکھ سے لگایا اور پھر رخ شمس کی طرف
کے ایک لمحے کے لئے اس کو دیکھا اور ایک گھمبیر آواز میں بولا۔ ''جی......'' اور پھر
کہہ کر خاموش ہو گیا اور آنکھ کی بجائے کان شمس کی جانب کر کے سراپا گوش ہو گیا۔

''ڈاکٹر صاحب! بات یہ ہے کہ میرا کیس بہت الجھا ہوا ہے۔''

شمس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر ضامن نے جواب دیتے
کہا۔ ''بیان کیجئے میرے پاس جو بھی کیس آتا ہے الجھا ہوا ہوتا ہے۔''

اور پھر شمس نے سارا قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ وہ کس طرح پاکستان آیا
کیونکر اپنے ایک دیرینہ دوست زاہد کے پاس ٹھہرا اور کیسے دوست کی بیوی شمائلہ پر
گیا اور پھر کیا کیا ہوا اور کیا کیا نہیں ہوا اور پھر شمس نے بتایا کہ شمائلہ جسے وہ حلوہ
لوہے کا چنا ثابت ہوئی اور پھر شمس نے سب کچھ بتا دیا کہ شمائلہ کو حاصل کرنے کے
اس نے کیا کیا طریقے اختیار کئے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ شمائلہ کے اندر اس کے لئے
کا زہر اور تیز اور گہرا ہو گیا اور اب شمس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی ہے کہ شمائلہ کے
مسخر کئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

ڈاکٹر ضامن نے شمس کی یہ ساری کہانی اس کی طرف دیکھے بغیر سنی اور اس د

ا اپنے سامنے رکھے ایک لیٹر پیڈ پر کچھ بے معنی لفظ لکھتا رہا۔ کچھ لکیریں کھینچتا رہا۔ کچھ بے طلب تصویریں بناتا رہا لیکن اس کے کان شمس کی کہانی کی طرف لگے رہے۔ اس نے ب لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا اور نہ شمس کی گفتگو میں مداخلت کی، نہ کوئی بیچ میں سوال چھا اور جب شمس اپنی گفتگو مکمل کر کے خاموش ہوا تو اس وقت ڈاکٹر نے اپنا چہرہ اوپر ٹھایا اور ایک بھرپور اور گھمبیر نگاہ شمس کے چہرے پر ڈالی ایسی گھمبیر نگاہ کہ شمس اپنے رمانہ احساس کی وجہ سے ماہر نفسیات کی نظروں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ تاہم وہ ڈاکٹر کی رف سے کسی رائے اور مشورے کے لئے سراپا انتظار تھا۔

''ہونہہ......!'' ڈاکٹر نے ساری کتھا سننے کے بعد صرف اتنی سی ''ہونہہ'' کی اور ر پیڈ کا صاف صفحہ لے کر تاریخ لکھی پھر شمس کا پورا نام لکھا اور پھر نیچے ایک دوا لکھی جو نی سکون کے لئے تھی اور کسی حد تک خمار آور بھی تھی اور جس کے استعمال سے اچھی نیند بھی سکتی تھی۔

''ایک گولی شام کو بیڈ پر جاتے وقت اور ایک گولی صبح ناشتے کے بعد۔''

''اس سے کیا ہوگا ڈاکٹر صاحب!'' شمس نے نسخہ پڑھتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''اس کے استعمال سے ذہن کو سکون ملے گا۔ اعصاب میں انتشار کم ہوگا اور چونکہ ل آپ کے قدرتی نیند نہیں آتی ہے آپ کو اس لئے یہ گولی سونے میں مدد کرے گی۔'' کٹر نے ٹو دی پوائنٹ جواب دیا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب! میں سونا نہیں چاہتا ہوں۔ میں اس عورت کو حاصل کرنا چاہتا ں۔'' شمس ایک ذہنی مریض کی طرح بے چینی سے بولا۔

''تو میں کیا کروں؟'' ڈاکٹر ضامن چڑ کر بولے۔ ''میں کیا ایجنٹ ہوں اس عورت ؟''

''ڈاکٹر صاحب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' شمس معذرت بھرے لہجے میں بولا۔ ر میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں تو معافی چاہتا ہوں۔ دراصل آپ کے پاس آنے کی وجہ یہی کہ میری ذہنی حالت......''

''مجھے معلوم ہے آپ کی ذہنی حالت۔'' وہ بات کاٹ کر بولے اور کہنے لگے۔ نس آپ کے دماغ پر چھا گئی ہے۔''

''جی بالکل یہی حالت ہے اور اب سب کچھ میرے دماغ میں ہے اور میں اس ت کو فتح کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ نہایت ابنارمل طریقے سے ڈاکٹر کے ساتھ اتفاق کرتے

ہوئے بولا۔

''مجھ سے کیا چاہتے ہو۔'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''مشورہ۔'' شمس ترت بولا۔ ''ایسا مشورہ کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب ہ
جاؤں۔ میری مدد کرو ڈاکٹر صاحب! نہیں تو میں مر جاؤں گا۔''

''کیسے مرو گے؟'' ڈاکٹر نے نہایت تحمل و اطمینان سے پوچھا۔

''خودکشی کرلوں گا۔'' وہ ترت بولا۔ ''میں خودکشی ہی کرنے والا تھا لیکن میں ۔
کسی جگہ پڑھا تھا کہ خودکشی کرنے والا اگر خودکشی سے پہلے ایک مرتبہ رک جائے، کسی ۔
مشورہ کرلے یا ماہر نفسیات کے پاس چلا جائے تو وہ بچ سکتا ہے۔''

''ہونہہ۔'' ڈاکٹر صاحب نے پھر چشمہ صاف کر کے لگایا اور پوچھنے لگا۔ ''کیا ا
کی دوبارہ شادی ہوگئی ہے۔''

''جہاں تک میری اطلاع ہے نہیں ہوئی لیکن وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا کیونک
میں اس کے پیچھے لاہور نہیں گیا۔'' وہ گومگو میں بولا۔

''اگر اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو تمہارا کام ہوسکتا ہے۔ معلوم کرو پھر کوئی مشور
دے سکتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ٹھیک ہے سر! میں معلوم کرتا ہوں۔'' شمس اٹھا اور اٹ
کے نہایت پریشان حال باہر جانے لگا اور دروازے کے پاس پہنچ کر پلٹ کے بولا۔ ''اگ
شادی نہیں ہوئی اس کی تو بھی میں آ کے آپ کو بتاؤں گا اور اگر شادی ہوگئی تو پھر بھی آپ
کے پاس دوبارہ آؤں گا، اسے سربازار برباد کر کے۔'' وہ وحشیانہ انداز میں بولا۔

''آؤٹ۔'' ڈاکٹر نے چشمہ اتارا اور شیشہ صاف کرتے ہوئے نہایت تحمل سے حکم
دیا اور شمس باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر مڑا اور منہ پر ہاتھ پھیر کے اس طرح ڈاکٹر سے
مخاطب ہوا جیسے ڈاکٹر سے ذاتی عناد ہو۔ ''میں جا رہا ہوں لیکن پھر آؤں گا ڈاکٹر! سرخرو ہ
کے آؤں گا۔'' وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

۞

اس دن ہسپتال کے اندر زاہد کے کمرے میں عجیب فضا بن گئی۔ دو ہی دن پہلے زاہ
کو ایک خطرناک سٹروک لگا اور دل کے اس حملے میں زاہد ایک بار پھر بال بال بچا۔ دو دن
اسے آئی سی یو میں رکھنے کے بعد جب واپس کمرے میں لایا گیا تو وہاں بھی وہ خصوصی
نگرانی کے وارڈ کی طرح رکھا گیا تھا اور ڈاکٹروں نے دروازے پر نو وزیٹرز کی تختی لگا دی
تھی اور سختی سے منع کر دیا تھا کہ ہسپتال کے ضروری عملے کے علاوہ کوئی مریض کے پاس ن

جائے۔ اس وقت ایک نرس اچانک زاہد کے کمرے میں آئی ایک جونیئر ڈاکٹر بہت انہماک کے ساتھ زاہد کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ نرس نے آ کے ڈاکٹر کے کان میں آہستہ سے کہا۔

''ڈاکٹر ایک خاتون پیشنٹ سے ملنے کے لئے آئی ہے۔''اور یہ بات زاہد نے بھی سن لی لیکن کوئی اہمیت نہیں دی اور اہمیت ڈاکٹر نے بھی نہیں دی اور نرس کی بات پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔''کمال ہے مجھ سے کیا پوچھتی ہیں آپ، منع کر دو۔ معلوم نہیں سر نے وزیٹرز پر سختی سے پابندی لگا رکھی ہے۔''

''وہ تو ہے ڈاکٹر لیکن یہ خاتون بہت مسئلہ پیدا کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے میں ہر حال میں مریض سے مل کر جاؤں گی۔''نرس نے کہا۔

''دھکے دے کر نکال دو۔''ڈاکٹر نے غصے میں کہا۔''ہاسپٹل ہے یہ مذاق نہیں۔''

''سر! اگر سختی کی تو وہ خاتون مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔''نرس پھر تشویش سے بولی۔

''ہے کون؟''ڈاکٹر نے پوچھا اور زاہد بھی سوچنے لگا کہ ایسی کون خاتون ہو سکتی ہے۔

''تفصیلی تعارف تو نہیں معلوم ڈاکٹر! اپنا نام رخسانہ بتاتی ہے۔''نرس نے کہا۔ 'لندن سے آئی ہے۔''

''رخسانہ......؟''زاہد ایک دم چونکا۔''اوہ گاڈ!''

''کیا آپ جانتے ہیں انہیں۔''ڈاکٹر نے پوچھا۔

''ہاں ڈاکٹر! آپ جب چیک اپ سے فارغ ہو جائیں تو اسے عزت کے ساتھ اندر بھیجیں۔''زاہد نے کہا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

❀......□......❀

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

''خیریت ہے پروفیسر صاحب؟'' جب ڈاکٹر وغیرہ زاہد کا معائنہ کر کے کمر۔
سے چلے گئے تو ڈیوٹی نرس رک گئی اور ازراہ تشویش زاہد سے پوچھا۔ کیونکہ رخسانہ کے آ۔
کی خبر سن کر زاہد کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور کئی گئے تھے اور ڈیوٹی نرس جس کا نا
انیسہ تھا زاہد سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ نہ صرف زاہد سے بلکہ شمائلہ سے بھی بہت قربت
رکھتی تھی کیونکہ جب شمائلہ زاہد کے پاس ہسپتال میں رہی تھی تو دونوں خواتین میں قربت
کے ساتھ ساتھ رازداری بھی ہو گئی تھی۔ شمائلہ نے انیسہ نرس کو اپنی ساری کہانی سنا ڈالی تھ
اور نرس نے بھی اپنا اسی قسم کا دکھڑا شمائلہ کے آگے بیان کیا تھا اور یوں مشترکہ دکھ اور
نے دونوں کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کر دی تھی اور پھر ایک رشتہ اور نکل آیا
دراصل نرس کی چھوٹی بہن زاہد کی اسٹوڈنٹ رہ چکی تھی اور زاہد سے بہت متاثر تھی اور ا
نے انیسہ کو بتایا تھا کہ سر زاہد کالج میں بے انتہا مقبول ہیں اور بہت اچھی شہرت رکھتے ہیں
اس پر استہزاد زاہد کا اپنا اخلاق جس نے ہسپتال کے اسٹاف کو زاہد کا گرویدہ بنا دیا تھا او
نرس انیسہ تو کئی حوالوں سے زاہد کا احترام کرتی تھی اور بہت زیادہ خیال بھی رکھتی تھی۔ اب
جو دو دن پہلے زاہد کو نیا اسٹروک لگا تو انیسہ نے اس کی بہت خدمت کی تھی اور ہر طرح
خیال رکھا تھا اور سختی سے ڈاکٹر کی اس ہدایت پر عمل کرایا تھا کہ ایسی نازک کنڈیشن میں کو
وزیٹر زاہد کو ڈسٹرب نہ کرے۔

عابد صاحب تو ان دنوں دفتری کاموں کے کارن ملک سے باہر گئے ہوئے تھے او
بھابھی نے زاہد کی خبر گیری کرنے کی زحمت نہیں کی تھی، نہ بچوں کو ملانے کے لئے لا
تھی۔ اس دوران نرس انیسہ نے ہمہ وقت زاہد کا بہت خیال رکھا تھا۔ زاہد کے کئی فیور
اسٹوڈنٹس لڑکے اور لڑکیاں بھی آتی رہی لیکن ہسپتال کے عملے نے زاہد سے بہت کم کسی
ملنے دیا۔ ویسے بھی مختلف اوقات میں بار بار آنے سے ہسپتال کے اندر زاہد کا ایک حلقہ بن
گیا تھا۔ کچھ وی آئی پیز نے بھی زاہد کی عیادت کی۔ ایک وزیر صاحب اس لئے آ
تھے کہ ان کی بیٹی زاہد کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ایک سیکرٹری صاحب جن کا تعلق ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ

ے تھا، وہ بھی زاہد کے اسٹوڈنٹ رہ چکے تھے اور ان کی آمد سے عملہ کافی چوکس ہو گیا تھا۔ ان ساری باتوں کے سبب زاہد کو ہسپتال میں ایک خصوصی توجہ ملتی تھی اور نرس انیسہ ویسے ہی زاہد سے بہت متاثر تھی اور خاصا خیال رکھتی تھی۔

''خیریت ہے پروفیسر صاحب؟ کیا بات ہے۔'' جب رخسانہ کا نام سن کر زاہد کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور کئی گئے تو نرس نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے۔'' زاہد ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''کوئی خاص بات؟'' نرس نے دوبارہ پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔'' زاہد نے کہا لیکن نرس نے محسوس کر لیا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے کیونکہ زاہد کے ماتھے پر پسینے کی ایک لکیر نمودار ہو گئی تھی اور قطرے ننھے ننھے موتیوں کی طرح چمکنے لگے تھے۔ نرس نے ایک ٹیشو پیپر سے زاہد کے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور آہستہ سے کہا۔ ''آپ بولیں تو میں اس لڑکی کو بھگا دوں۔''

''نہیں انیسہ جی۔'' زاہد بہت اپنائیت سے بولا۔ ''یہ بیچاری لندن سے آئی ہے میری بیماری کا سن کر۔''

''ہونہہ......'' نرس نے قدرے تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''بس...... کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کی آدمی وضاحت نہیں کر سکتا۔'' زاہد نے جواب دیا۔

''آئی سی۔'' نرس کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی اور زاہد جیسے ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ جہاں رخسانہ اسے ایک جل پری کی طرح غوطے لگاتی اور تیرتی نظر آ رہی تھی۔ وہ زاہد پر اپنے نوکیلے کانٹوں اور ترچھے دانتوں کے ساتھ جھپٹ رہی تھی اور زاہد اپنی جان بچاتا ادھر ادھر لپک رہا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب زاہد اور شمائلہ کی شادی کو ابھی بمشکل دو سال ہوئے تھے۔ زاہد اپنے کالج اور گھر کے اندر خوشگوار زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک ایک دن زاہد کی زندگی کی ہموار سطح پر ایک ارتعاش سا پیدا ہوا اور یہ ارتعاش آگے چل کے ایک طوفانی موج بن سکتا تھا اگر زاہد کے من میں پیچ نہ ہوتا۔

آغاز اس ہلچل کا یوں ہوا کہ ایک دن بی اے کے کلاس روم میں جب زاہد پڑھا رہا تھا تو ڈاک میں ایک لفافہ آیا۔ لفافے پر بھیجنے والے کا پتا نہیں تھا۔ زاہد نے لفافہ کھولا تو رائٹنگ پیڈ کے خوشبودار کاغذ کے اوپر ایک عشقیہ شعر لکھا تھا ساتھ دل کا نشان اور خط کے ساتھ

سرخ گلاب کی ایک پتی رکھی تھی۔ زاہد نے شعر پڑھا۔ کچھ سوچا اور ایک بھرپور نظر کلاس روم میں موجود اسٹوڈنٹس پر ڈالی۔ خصوصی طور پر لڑکیوں کو غور سے دیکھا۔ اسے کسی کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثرات دکھائی نہ دیئے۔ زاہد نے خاموشی سے خط پھاڑا اور کچرے کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پھر یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔

انہیں کبھی ہر روز، کبھی ہفتے میں ایک دو بار اس طرح کا خط کالج کے پتے پر مل جا اور زاہد دانستہ طور پر بی اے فائنل کی کلاس میں سب کے سامنے یہ خط کھولتے، شعر پڑھتے اور پھر طلبا اور طالبات کے تاثرات نوٹ کرنے کے بعد خط کو پھاڑ دیتے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب امتحانات سر پہ تھے۔ کورس تقریباً ختم ہو چکا تھا اور اب سلیبس دہرایا جا رہا تھا۔ کالج کی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ رزلٹ کے بعد فائنل کی کلاس نے رخصت ہو جانا تھا اور پچھلی کلاس نے آگے آ جانا تھا۔ اس لئے لفافے میں موجود اشعار بھی کچھ اس طرح کی غمازی کر رہے تھے۔

یہ ایک انوکھی بات ہونے کے باوجود زاہد کو انوکھی اس لئے نہیں لگتی تھی کہ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ ان کے لیکچرز سننے والے طلباء اور طالبات ان سے متاثر ہیں اور کا اسٹوڈنٹ اور ٹیچرز کے درمیان اس طرح کی ریلیشن شپ اگر بہت زیادہ نہیں تو گا بگاہے دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسی کہانیاں بھی کتابوں میں موجود ہیں۔ ڈرامے بھی بنتے ہیں فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ سو زاہد کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ جو بھی لڑکی اسے یہ خط لکھتی ہے وہ یقیناً ایک افسانوی کردار ہے اور افسانے کی طرح کسی دن یہ کلائمکس خود بخود ختم ہو جائے گا۔ وہ چپ چاپ ان خطوں سے لطف اندوز ہوتا اور اس لطیف تجربے میں اس نے شمائلہ کو بھی شامل کر لیا تھا اور کبھی کبھار خط پھاڑ پھینکنے کی بجائے پڑھ کر گھر لے آتا اور شمائلہ کو دکھا دیتا تھا۔

شمائلہ کبھی کبھار کچھ پریشان اور فکرمند بھی ہو جاتی تھی تاہم زاہد اندر سے مطمئن اور مضبوط تھا اور اسے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پھر اس دن زاہد کو ایک ایسا خط ملا جس کا ایک ایک لفظ، درد محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ لکھنے والی نے قلم کی روشنائی سے نہیں آنسوؤں اور خون میں ڈبو کے لکھا ہے۔ زاہد نے یہ خط بہت تفصیل سے لائبریری میں بیٹھ کے پڑھا اور پھر کلاس روم میں ایک بار پھر یہ خط اسٹوڈنٹس کے سامنے دانستہ پڑھا اور خاص طور پر طالبات کے چہروں کا جائزہ لینے لگے۔

یہ کالج کا آخری دن تھا اور اگلے دن سے کالج بند ہونے والا تھا اور اسٹوڈنٹس اور

اساتذہ ایک دوسرے سے الوداعی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ زاہد نے اس دن پوری کلاس کا ایک بھرپور جائزہ لیا۔ یوں چور تو ان کو معلوم تھا کہ کون ہے لیکن اس دن جب کلاس سے اسٹوڈنٹس جا رہے تھے تو زاہد نے رخسانہ کے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ''رخسانہ تم لائبریری میں آ جاؤ۔'' اور رخسانہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا جیسے وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔

''یس سر۔'' رخسانہ لائبریری میں آئی اور سر زاہد کے پاس والی کرسی کے قریب کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھو۔'' زاہد نے دھیرے سے کہا اور رخسانہ بیٹھ گئی۔ زاہد نے ایک سادہ کاغذ اور قلم رخسانہ کے قریب کیا اور وہ محبت بھرا خط جو زاہد کے نام آیا تھا۔ رخسانہ کے آگے رکھا اور کہا۔ ''اس خط کو نقل کرو۔''

رخسانہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر نظریں جھکا کر دھیرے سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے سر، یہ میرا ہینڈ رائٹنگ ہے اور میں نے ہی خط لکھا ہے۔''

''اس سے پہلے......'' زاہد نے نامکمل فقرہ کہہ کر رخسانہ کی طرف دیکھا۔

''وہ بھی میں نے ہی لکھے تھے۔'' رخسانہ چپ چاپ نظریں جھکائے بولی۔

''کیوں؟'' زاہد نے پوچھا اور رخسانہ چپ رہی کوئی جواب نہیں دیا۔ زاہد نے بھی چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد دوبارہ پوچھا۔

''جواب دو۔ میں نے پوچھا ہے کیوں؟''

''بی کاز آئی لو یو۔'' رخسانہ بے ساختہ بولی۔

شاید اسے انگریزی میں اظہار محبت کرنے میں زیادہ آسانی اور سہولت محسوس ہوئی۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ سر اٹھا کر سر زاہد کے چہرے کی طرف دیکھا تو زاہد کا پریشان لگا جیسے کسی دھماکے سے سہم گیا ہو۔ رخسانہ فوراً اٹھی اور کچھ کہے بغیر تیزی سے گئی۔ یہ اس کا کالج میں آخری دن تھا وہ پھر کالج لوٹ کر نہ آئی۔

❁

کافی وقت گزر گیا رخسانہ کے خطوط والی بات بھولی بسری کہانی بن گئی۔ اس دوران اور شمائلہ کے یہاں ایک ایک سال کے وقفے کے دوران عینی اور علی پیدا ہوئے۔ کی گاڑی بہت خوشگوار طریقے سے چل رہی تھی کہ پھر ایک دن اچانک ایک سنسنی خیز

موڑ آ گیا۔ زاہد کے گھر میں دو تین بار ٹیلیفون آیا۔ گھنٹی بجنے پر ہر بار شائلہ نے فون اٹھایا لیکن کسی نے بات نہیں کی فون بند ہو گیا۔

''اب تم اٹھاؤ۔'' جب ایک پھر گھنٹی بجی تو شائلہ نے زاہد سے کہا۔ زاہد نے فون اٹھایا۔ ''ہیلو۔''

''سر آپ نے پہچانا۔'' دوسری طرف سے ایک سریلی لیکن مدہم آواز تھی۔

''کون؟'' زاہد نے ہر چند کہ آواز کو مانوس پایا اور کسی حد تک آواز شناخت بھی کر لی لیکن فون اتنے دنوں کے بعد اور اتنا اچانک آیا تھا کہ زاہد فوری طور پر نشاندہی نہیں کر سکا۔

''سر آپ کی تو سانس بھی ہم پہچانتے ہیں۔ آپ آواز بھی نہیں پہچانتے۔'' دوسری طرف سے کسی نے کہا۔

''اوہ رخسانہ......'' زاہد چونکا۔ ''دراصل بہت دنوں کے بعد آواز سنی ہے نا تمہاری اس لئے پہنچاننے میں تامل ہوا کہو کیسے یاد کیا آج۔'' زاہد نے پوچھا۔

''سر یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جن کو آدمی بھول جائے۔ میں بھولی ہی کب تھی آپ کو۔'' رخسانہ نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آج ایک دردناک خبر سنانے کے لئے فون کیا ہے۔''

''او گاڈ۔'' زاہد چونکا اور اسے واقعی پریشانی ہوئی کہ لڑکی نے ایک مدت کے بعد فون کیا ہے، شاید کسی حادثے وغیرہ کا شکار ہو گئی ہے یا کچھ اور بات ہو گی۔ ''خیریت تو ہے ناں۔'' زاہد نے پوچھا۔

''نہیں سر خیریت نہیں ہے۔ ماں نے میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔'' رخسانہ نے خبر سنائی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' زاہد علی نے کہا۔

''اچھی بات نہیں ہے سر۔'' وہ ترت بولی۔ ''میں نے ماں سے کہہ دیا ہے کہ میں یہاں شادی نہیں کروں گی۔''

''کیا بات ہے لڑکا تمہیں پسند نہیں کیا۔'' زاہد نے تجسس سے پوچھا۔

''پسند ناپسند کی بات نہیں سر کیونکہ میں نے لڑکے کو دیکھا ہی نہیں لیکن میں شادی وہاں کروں گی جہاں میں کرنا چاہتی ہوں۔'' رخسانہ نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''تو پھر بتا دو ماں کو اپنی پسند۔''

دارالعلم پاکستان دیوانِ ادب

''بتا دی ہے۔'' رخسانہ بولی۔ ''لیکن ماں نے میری پسند کا جان کر قیامت ڈھا دی ہے۔''

''تم کہاں کرنا چاہتی ہو شادی۔'' زاہد نے پوچھا۔

''آپ سے۔'' وہ دھیرے سے بولی اور جیسے ایک دھما کا ہوا اور زاہد کے کان پھٹ گئے۔

''کیا مذاق کرتی ہو تم۔'' زاہد نے بظاہر بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر میرا اور آپ کا مذاق نہیں ہے۔ میں سیریس ہوں اور ماں سے میں نے کہہ دیا ہے کہ اگر میری شادی آپ سے نہ ہوئی تو میں خودکشی کرلوں گی۔''

''تم پاگل ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے بھی ہیں۔'' زاہد نے اب سنجیدگی اختیار کی۔

''مجھے معلوم ہے سر...... لیکن کیا شادی شدہ لوگ شادی نہیں کرتے۔'' وہ برجستہ بولی۔

''کرتے ہوں گے لیکن میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' زاہد نے جھلا کر کہا اور وہ ترت بولی۔ ''ایسا سوچئے سر اب سوچئے۔'' رخسانہ کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہرگز نہیں، آپ فوراً ٹیلیفون بند کریں ورنہ میں بند کردوں گا۔'' زاہد نے کہا تب وہ تڑپ کر بولی۔ ''فون بند نہ کیجئے۔ سر میں جس بلڈنگ میں رہتی ہوں اس کی چوتھی منزل پر ہمارا مکان ہے اور اگر آپ نے فون بند کر دیا تو میں کھڑکی سے کود جاؤں گی اور خون آپ کے سر ہوگا۔'' رخسانہ نے رقت بھری آواز میں دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ گاڈ۔'' زاہد دہل گیا اور اس نے اس دھمکی کو سنجیدگی سے لیا کہ عشق کا جنون لڑکی پر سوار ہے اور جنون میں کوئی کچھ بھی کرسکتا ہے۔

''اچھا سنو۔'' زاہد نے اپنے لہجے میں نرمی اور پیار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے کل فون کرنا اسی وقت۔''

''نہیں سر...... کل آپ مجھے فون کریں گے اسی وقت۔'' وہ فوراً بولی اور ساتھ ہی اپنا فون نمبر بھی بول دیا۔

''ہوسکتا ہے میرے فون کو تمہارے گھر کے اندر پسند نہ کیا جائے اس لئے......''

''نو، نو سر۔'' وہ زاہد کی بات بیچ میں کاٹ کر بولی۔ ''آپ کے فون کو گھر میں کوئی ناپسند نہیں کرسکتا۔ آج کل ہمارے گھر میں صرف آپ کا نام ہی گونجتا ہے۔ ٹیلیفون کوئی

بھی اٹھائیے آپ مجھے بلوا لیجئے گا۔ خدا حافظ سر۔'' اس نے روہانسی ہو کر کہا اور فون بند کر دیا۔

''اب کیا کیا جائے؟'' زاہد نے شمائلہ سے پوچھا۔

یہ تو واقعی مسئلہ بن گئی ہے۔'' شمائلہ نے پریشان ہو کر جواب دیا۔ رخسانہ کا فون بند ہونے کے بعد زاہد نے ساری گفتگو اور گفتگو کا محور شمائلہ کو بتا دیا اور گفتگو کے دوران ایک دو بار اس نے ریسیور بھی شمائلہ کے کان سے لگا دیا تھا اور شمائلہ نے خود اپنے کان سے سن لیا تھا کہ لڑکی زاہد کی دیوانی ہو گئی ہے۔

''یہ سب یکطرفہ ہے شمائلہ۔ میرا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔'' جب شمائلہ کو تھوڑی سی تشویش ہوئی تو زاہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے خواہ مخواہ مجھے اپنا آئیڈیل بنا لیا ہے کچھ اسی قسم کا آئیڈیل جیسا لڑکیاں کسی فلمی ہیرو، اسپورٹس کے کسی سپر اسٹار یا کسی بڑے نامور رومانوی شاعر کو بنا لیتی ہیں۔''

اسے شاید تمہارے کوئی الفاظ پسند آ گئے ہوں گے جو کالج کے زمانے سے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔'' شمائلہ نے زاہد کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے کوئی لفظ ہی پسند آئے ہوں گے میری شکل تو ایسی نہیں۔'' زاہد از راہ مذاق بولا اور پھر دونوں ہنس پڑے۔

''بات مذاق کی نہیں۔'' جب دونوں کی ہنسی رکی تو زاہد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب بتاؤ کیا کیا جائے۔''

یہ تو واقعی مسئلہ بن گئی ہے۔'' شمائلہ نے پریشان ہو کر جواب دیا۔

''مشورہ کیا کیا جائے۔''

''دل کرتا ہے ملنے کو۔'' شمائلہ نے چھیڑا۔

''لاحول۔'' وہ آدھی بات بولا اور پھر کہنے لگا۔ ''میں نے تم سے مشورہ مانگا ہے۔ جان کیسے چھڑاؤں۔''

''میرا مشورہ یہ ہے کہ اگنور کرو۔'' شمائلہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''کل اسی وقت تم سے فون کرنے کو کہا ہے ناں۔ مت کرو فون۔ دیکھو کیا کرتی ہے۔''

''اور اگر کود گئی کھڑکی سے تو۔''

''اتنا آسان نہیں ہے۔'' شمائلہ منہ بنا کر بولی۔ ''بس تم چپ رہو۔'' اور پھر زاہد چپ رہا۔

زاہد تو چپ رہا لیکن اگلا دن رخسانہ کے گھر میں چپ کر کے نہیں گزرا۔ اس نے زاہد کا فون نہ آنے پر ایک حشر اٹھا دیا تھا۔ ایسا حشر کہ جس نے رخسانہ کی ماں کو زاہد علی کے گھر جانے پر مجبور کر دیا۔

''ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہے۔ بتا رہی ہے کہ رخسانہ کی ماں ہے۔'' شمائلہ نے ناشتے کی میز پر زاہد علی کو بتایا۔ یہ چھٹی کا دن تھا اور زاہد خلاف معمول دیر سے اٹھا اور دیر سے ناشتہ کر رہا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' زاہد چونکا۔ ''کہاں ہے؟'' اس نے شمائلہ سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہے؟''

''کچھ بتایا نہیں پریشان لگتی ہے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔'' شمائلہ بولی۔

''کہیں لڑکی سچ مچ اوپر سے کود تو نہیں گئی۔'' زاہد تشویش سے بولا۔

''خدا خیر کرے...... جا کے بات کرو میں ادھر ہی ہوں۔'' شمائلہ نے کہا اور پھر وہ کچن ہی میں رہی جبکہ زاہد خاتون سے بات کرنے کے لئے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

''بیٹے میں جانتی ہوں تمہارا اس میں کوئی دوش نہیں ہے۔ اصل میں میری بیٹی ہی پاگل ہے۔'' خاتون نے آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے انتہائی بے بسی سے کہا اور زاہد کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''نہیں ماں جی ایسا نہ بولیں۔ آپ کی بیٹی پاگل نہیں ہے، وہ بہت اچھی ہے۔'' اس نے خاتون کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور اس کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ کھولتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بیٹے کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ تو کہتی ہے کہ......''

''مجھے معلوم ہے کیا کہتی ہے۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے کیا؟''

''تو پھر تم ہی آ کے کسی وقت سمجھاؤ اسے بیٹے۔''

''میں سمجھا دوں گا۔'' اس نے ماں جی کو ڈھارس دی۔

''تو پھر کب آؤ گے؟''

''کسی بھی وقت آ جاؤں گا۔''

''کسی بھی وقت نہیں بیٹے آج شام کو آ جاؤ ورنہ حالات بہت بگڑ جائیں گے۔''

خاتون نے التجا کی۔

"ٹھیک ہے میں آج ہی آ جاؤں گا۔" زاہد نے وعدہ کیا اور پھر شمائلہ نے بھا اعتماد کے ساتھ زاہد علی کو رخسانہ کے گھر بھجوایا ورنہ وہ واقعی والدین کے لئے مسئلہ پیدا کر دیتی۔

"تم یہ بات قطعی طور پر ذہن سے نکال دو۔ میری اور تمہاری شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تصور جسے کہتے ہیں ناں اس میں ہر چیز آ سکتی ہے لیکن یہ بات میرے تصو سے بھی باہر ہے۔" اسی شام کو زاہد علی رخسانہ کے گھر میں بیٹھا اسے اطمینان کے ساتھ سمجھا رہا تھا۔

"تم اتنے سخت گیر کیوں ہو گئے ہو۔" رخسانہ نے جواب دیا اور پھر فوراً معذرت کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "معاف کرنا میں آپ کو تم کہہ کر پکار رہی ہوں لیکن مجھے تم کہ اچھا لگتا ہے کیونکہ اس میں زیادہ قربت اور اپنائیت ہے۔"

"تم بے شک مجھے تم کہو۔ لیکن میرے ساتھ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔" زاہد نے کہا۔

"کیا شمائلہ سے بہت محبت کرتے ہو۔" رخسانہ نے تجسس سے پوچھا۔

"بے حد وحساب...... آسمان سے حور بھی اتر کے آ جائے تو میں اس کے اوپر نہیں ا سکتا۔" زاہد بولا۔

"میں نے کب کہا مجھے اس کے اوپر لاؤ۔ میں ملازمہ بن کے تمہارے گھر کے کام کروں گی اور برآمدے میں پڑی رہوں گی۔ مجھے بیڈروم بھی نہیں چاہئے میں بس تمہارے اور شمائلہ کے قدموں میں پڑی رہوں گی اور......"

"بس...... بند کرو یہ بک بک...... میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم قدموں میں پڑی رہو۔ میں چاہتا ہوں تم بلند رہو۔ تمہارا درجہ بلند ہو۔ تمہاری جگہ میرے قدموں کی بجائے میری آنکھوں میں رہے اور میں زندگی بھر عزت کے ساتھ تمہارا نام لیتا رہوں۔"

"وہ کیسے؟" رخسانہ نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ ماں جس جگہ کہہ رہی ہے وہاں شادی کر لو۔ پلیز...... میں التجا کرتا ہوں۔" زاہد نے ہاتھ جوڑے۔ "ایک دن آئے گا کہ تم خود محسوس کرو گی کہ تم غلط سوچ رہی تھیں اور میں صحیح فیصلہ کر رہا ہوں۔ میں تمہیں کبھی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ تم ایک بہت اچھی اور پیاری لڑکی ہو۔ پلیز میری بات مان لو۔ میری اور تمہاری شادی نہیں ہو سکتی

پلیز۔''اس نے جڑے ہوئے ہاتھ اور مضبوط کر دیئے۔
''مجھے گناہگار نہیں کریں آپ۔'' رخسانہ نے نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اور رندھی ہوئی آواز میں بولتے ہوئے زاہد کے دونوں ہاتھ پکڑے اپنی آنکھوں سے لگا کے پلکوں سے بہتے اشک پونچھے اور زاہد کے قدموں کو ہاتھ لگا کے اپنی انگلیوں کی پور کو چھو کر آہستہ سے بولی۔''ایک شرط پر۔''
''رخصت تم خود مجھے اپنے ہاتھ سے کرو گے۔''
''مجھے منظور ہے۔'' زاہد نے بلا تامل کہا اور اپنے واجبی سے نفسیاتی علم کی بدولت اس نے اندازہ لگا لیا کہ چونکہ لڑکی کا باپ نہیں ہے اس لئے شاید تحت الشعور میں کسی حد تک ایڈی پس کامپلیکس کے دباؤ میں آ کر اس کے ساتھ یہ رشتہ جوڑ رہی ہے۔
''مجھے منظور ہے بس۔'' وہ دوبارہ بہت جوش سے بولا کہ اس شرط کو منظور کرنے میں کسی طرح کا کسی کو کوئی نقصان نہیں تھا۔
''میری ایک اور بھی شرط ہے۔'' رخسانہ قدرے توقف کے بعد بولی۔
''وہ کیا؟'' اب کے زاہد نے قدرے تشویش سے پوچھا۔
''وہ رخصتی کے بعد بتاؤں گی۔'' رخسانہ نے تجسس قائم کرتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے اس کا جواب بھی میں بعد میں دوں گا۔''

❁

لیکن رخصتی کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ رخسانہ کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا، نہ کوئی دوسری شرط عائد ہوئی۔ تب شمائلہ اور زاہد نے خدا کا شکر ادا کیا۔
''چلو خدا کا شکر ہے اس چیچڑ سے جان چھوٹی ...... میں تو پریشان ہو گئی تھی کہ لڑکی گلے نہ ہو جائے۔'' شمائلہ نے اظہار تشکر بھی کیا اور تشویش بھی ظاہر کی۔
''ویسے جیلس تو تم ہو گئی تھیں۔'' زاہد نے شمائلہ کو چھیڑا۔
''لو ایسے ہی۔ جیلس ہونے والی کونسی بات تھی۔ وہ تو ایک پاگل لڑکی تھی۔'' شمائلہ نے کہا۔
''میری پاگل تھی ناں۔''
''اچھا بس زیادہ شو نہ ماریں۔ شکر کریں خیریت ہوئی۔'' دونوں میں یہ چھیڑ چھاڑ چل رہی تھی کہ زاہد کی نظر کھڑکی سے باہر پڑی ...... کوئی مرکزی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ زاہد نے پریشان ہو کر کہا۔'' جانم خیریت نہیں گزری۔ کوئی ہمارے گھر کی طرف آ رہا

ہے اور تیور اچھے نہیں۔''

''کون؟'' شمائلہ نے تشویش سے پوچھا۔

''یہ تو رخسانہ کا شوہر معلوم ہوتا ہے۔''

''تو......''

معاً دروازے کی گھنٹی بجی۔ شمائلہ اور زاہد دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' زاہد نے کہا اور دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھولا رخسانہ کا شوہر ہی تھا۔ دونوں میں کچھ بات چیت ہوئی اور پھر واپس آ کر شمائلہ سے کہنے لگا۔ ''وہ مجھے ساتھ گھر لے جانا چاہتا ہے۔''

''کیوں خیریت۔'' شمائلہ پریشان ہوئی۔

''معلوم نہیں بہت التجا کر رہا ہے کہ اس کے ساتھ چلوں۔'' زاہد نے کہا۔ ''میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں اس کی گاڑی میں......کوئی بات ہوگئی تو دھیان رکھنا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو مت جاؤ۔'' شمائلہ خوفزدہ ہو کر بولی۔ ''ڈر لگنے لگا ہے مجھے۔''

''ڈر کیسا؟'' زاہد اطمینان سے بولا۔ ''میں نے کوئی چوری نہیں کی، ڈاکہ نہیں ڈالا کوئی گناہ نہیں کیا۔ جرم نہیں کیا۔ پھر کاہے کیلئے ڈرنا۔ میں جا رہا ہوں۔'' زاہد نے کہا اور شمائلہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ زاہد کو رخسانہ کے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا۔

''بات کیا ہے مجھے بتایئے تو سہی۔'' جب گاڑی روانہ ہوئی تو زاہد نے بہت سنجیدہ ہو کر پوچھا اور اس کا شوہر تقریباً روتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پروفیسر صاحب آپ کے بارے میں میں نے بہت کچھ سنا کہ آپ ایک بہت ہی اچھے اور فرشتہ صفت انسان ہیں اس لئے میں آپ کو ساتھ لے جا رہا ہوں کہ آپ ذرا رخسانہ سے بات کریں۔''

''میں ضرور بات کروں گا لیکن قصہ کیا ہے؟'' زاہد نے پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''قصہ یہ ہے سر کہ آج ہماری شادی کو آٹھ دن ہو گئے ہیں لیکن رخسانہ مجھ سے بہت دور ہے۔'' وہ بہت ہی محرومی سے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''کیا؟'' زاہد چونکا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔''

''جی سر آپ سے کیا پردہ...... یہ دیکھئے یہ یہ ناخنوں کے نشان۔'' شوہر نے کار

لاتے ہوئے اپنے چہرے پر ناخنوں کے مختلف نشان دکھائے۔
''ایسا کیوں؟'' زاہد نے از راہ حیرت و استعجاب کہا۔
''سر میں اسی لئے آپ کو ساتھ لے جا رہا ہوں آپ خود تنہائی میں اس سے پوچھ لیجئے۔''

''تعجب ہے۔'' زاہد نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔
بات تعجب کی اور حیران کن ہی نہیں زاہد کے حواس اڑا دینے والی بھی تھی۔ رخسانہ کا شوہر زاہد کو سیدھا اپنے بیڈ روم میں لے گیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔
''کیا بات ہے تم نے کیوں شوہر کا راستہ روک رکھا ہے۔'' زاہد نے بات کو نہایت سلیقے کے ساتھ پوچھا۔
''اس سے پہلے تم نے میری شرط پوری کرنی ہے۔'' رخسانہ بہت تیز اور تیکھی نظروں سے زاہد کو دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ شاید کچھ ہی دیر پہلے سو کر بیدار ہوئی تھی۔ اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔
''شرط؟'' زاہد نے تجسس سے پوچھا۔
''بھول گئے کیا۔ دوسری شرط۔'' رخسانہ نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلی شرط تمہاری یہ تھی کہ میں منصور سے شادی کر لوں۔'' اس نے اپنے شوہر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''سو میں نے تمہاری شرط مان کر منصور سے شادی کر لی اور دوسری شرط میں نے کہا تھا بعد میں بتاؤں گی۔ یاد ہے ناں۔'' وہ پھر بولی۔ ''میں اس وقت تک منصور کو قریب آنے نہیں دوں گی جب تک تم میری دوسری شرط نہیں مان لو گے۔''
''کیا ہے دوسری شرط؟'' زاہد نے خوفزدہ ہو کر متزلزل لہجے میں پوچھا۔
''دوسری شرط یہ ہے کہ میری زندگی میں پہلے تم آؤ گے۔'' رخسانہ نے عجیب انداز میں مطالبہ کیا۔
''کیا؟'' زاہد چونکا جیسے رخسانہ نے ایک ہتھوڑا اس کے سر میں دے مارا ہو۔ ایک طوفان اس کے اندر موجزن ہوا اور اس کی رگ حمیت نے اسے بے قابو کر دیا۔
''خبیث لڑکی۔'' غصے میں اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک زوردار تھپڑ رخسانہ کے منہ پر رسید کیا۔ وہ تھپڑ کے زور کی تاب نہ لا کر پلنگ پر پڑی اور لڑھک کر نیچے جا گری۔ زاہد نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور بہت ہمدردی کے ساتھ اسے سمجھانا شروع کیا۔
''تمہارا شوہر ایک فرشتہ صفت آدمی ہے جو تمہیں سزا دینے کی بجائے تمہاری اصلاح کرنا

چاہتا ہے اگر وہ ایک روایتی شوہر ہوتا تو طلاق کے تین لفظ تمہارے منہ پر دے مارنے کے بعد تمہیں دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا اور پھر پتہ ہے کیا ہوتا۔'' وہ یہاں کہتے کہتے چپ ہوا، رکا اور پھر بولنے لگا۔ ''تم نہ گھر کی رہتی نہ گھاٹ کی۔ دیکھو کفران نعمت مت کرو۔ قدر کرو اپنے شوہر کی اور اپنے گھر کو تباہ کرنے کی بجائے اسے بناؤ۔ ایک لمبی طویل زندگی گزارنی ہے ابھی تم نے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک ہمدردانہ نگاہ رخسانہ پہ ڈالی اور باہر جانے لگا۔ اس وقت رخسانہ کے دیکھنے کا انداز بڑا فرمانبردارانہ تھا۔ وہ بہت معصومانہ انداز سے زاہد کو دیکھتے ہوئے اپنے گال کو معنی خیز انداز میں سہلا رہی تھی۔

''آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں تھپڑ مار دیا۔'' جاتے جاتے زاہد معذرت بھرے انداز میں بولا۔

''آئی ایم پراؤڈ آف دس سر۔ مجھے اس تھپڑ پر زندگی بھر فخر رہے گا۔ اس تھپڑ میں محبت کا دریا موجزن تھا۔ آپ نے پہلی دفعہ میری محبت کا جواب محبت سے دیا ہے اور مجھے پہلی دفعہ تقویت ہوئی کہ میرا خیال رکھنے والا بھی کوئی ہے۔ تھینک یو سر...... تھینک یو ویری مچ۔'' رخسانہ آبدیدہ ہوگئی۔

زاہد نے ایسی نظروں سے رخسانہ کو دیکھا جن میں شفقت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ زاہد کی رخسانہ سے آخری ملاقات تھی۔ اسے البتہ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ لندن چلی گئی ہے اور اب تقریباً آٹھ برس کے بعد اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ لندن سے رخسانہ اس سے ملنے آئی ہے اور وہ ایک بار پھر دم بخود سا ہوگیا تھا۔

❁

زاہد تفکرات کے اتھاہ سمندر میں کھویا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور رخسانہ نرس انیسہ کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور پھر نرس رخسانہ کو زاہد کے بیڈ تک پہنچا کر ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ واپس چلی گئی۔ زاہد رخسانہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سات آٹھ سال کی مدت نے اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی تھی اگر تبدیلی تھی تو بہت خوشگوار تھی کہ رخسانہ کی شخصیت میں پہلے سے زیادہ وقار اور کشش پیدا ہوگئی تھی۔ اب یقیناً وہ زیادہ میچور بھی ہوگئی ہوگی۔ وہ ایک عجیب قسم کے تاثر کے ساتھ دھیرے دھیرے زاہد کی جانب بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش اور ہونٹوں پر زاہد کو حوصلہ دینے کے لئے ایک مسکراہٹ تھی۔ اس نے بال ترشوائے ہوئے تھے اور پاکستانی خواتین کے لباس میں نہیں تھی بلکہ شرٹ اور جین پہن رکھی تھی اور کانوں میں ٹاپس اور گلے میں ایک نیکلس کے علاوہ اور کوئی

زیور اس کے جسم پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف کلائی میں ایک مردانہ گھڑی اور سنہری زنجیر پڑی تھی۔ وہ ایک بے نیازانہ انداز میں زاہد کے بیڈ کے قریب آئی بیڈ کی طرف جھکی زاہد کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما آنکھوں سے لگایا اور ہاتھ کو اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ زاہد کچھ نہ بولا۔ دم بخود رخسانہ کو دیکھتا رہا۔

''وہ جس پر جان نچھاور کرتے تھے، وہ آخر چلی گئی۔'' رخسانہ آبدیدہ ہوکر بولی اور زاہد کی آنکھ بھی بھر آئی۔

''کب آئی ہو؟'' زاہد نے رخسانہ کی بات کے جواب کو گول کر دیا۔

''کل رات۔'' رخسانہ دھیرے سے بولی۔

''کیسے آنا ہوا؟'' زاہد نے یونہی پوچھ لیا۔

''یہاں ایک شو کرنا ہے تھیٹر میں۔ ڈانس کروں گی میں۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

''کیا؟'' زاہد چونکا۔

''تو پھر کیوں پوچھتے ہو کیسے آئی ہوں؟'' رخسانہ کی آواز میں درد تھا، کہنے لگی۔
''آپ کی ایک اسٹوڈنٹ تھی اسما...... یاد ہے۔''

''ہاں ہاں وہ آئی تھی مجھے دیکھنے کچھ دن پہلے ......لندن گئی ہے اپنے میاں کے پاس۔'' زاہد نے کہا۔

''ہاں وہی۔'' رخسانہ بولی۔ ''اسی نے مجھے آپ کی بیماری کا بتایا اور اسی نے بتایا کہ آپ کی بیوی شمائلہ کس طرح آپ کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔''

''اوں ہوں۔'' زاہد ازراہ تصدیق بولا۔ ''وہ نہیں چھوڑ گئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا تھا لیکن اب چھوڑو اس تذکرے کو تم سناؤ کیسی ہو؟ کیسے گزر رہی ہے اور تمہارا شوہر کیا نام تھا اس کا۔''

''منصور۔'' رخسانہ نے لقمہ دیا اور زاہد نے اپنی بات جاری رکھی۔

''منصور کیسا ہے۔ ٹھیک ٹھاک تو ہے ناں ...... وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہارے ساتھ اچھا ہوگا۔''

''اچھا نہیں سر۔'' رخسانہ بولی۔ ''بہت اچھا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ بہت خوش ہیں بلکہ خوش تھے لیکن جب آپ کی کیفیت کا علم ہوا تو میرا سکون اجڑ گیا اور میں نے ایک دن ضائع کئے بغیر پاکستان آنے کی تیاری شروع کر دی۔''

''بہت شکریہ کہ تم نے ایسی محبت سے یاد رکھا ہوا ہے۔'' زاہد دھیمے لہجے میں

بولا۔ ’’لیکن تمہیں صرف مجھے دیکھنے کے لئے نہیں آنا چاہیے تھا ہنستا بستا گھر ہے تمہارا۔ اس میں کوئی شک نہیں تمہارا میاں ایک فرشتہ صفت آدمی ہے لیکن مرد پھر مرد ہوتا ہے۔ بعض اوقات بلاوجہ بھی اس کے من میں شبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور شبہات کی وجہ سے ہنستے بستے گھر ویران ہو جاتے ہیں۔‘‘ زاہد نے بہت دکھ اور تشویش سے کہا یقیناً اس کا روئے سخن اپنے گھر کی طرف تھا۔ ’’تم منصور سے پوچھ کر آئی ہو ناں۔‘‘ اس نے آخر میں سوال کیا۔

’’سر میں نہ صرف منصور سے پوچھ کر آئی ہوں بلکہ منصور ہی کے کہنے سے آئی ہوں اور منصور میرے ساتھ آیا ہے۔‘‘ اور پھر بہت معنی خیز انداز میں بولی۔ ’’آپ ذرا کروٹ بدل کر ادھیر دیکھیں تو سہی۔‘‘ زاہد تجسس میں مبتلا ہوا دھیرے دھیرے کروٹ بدلی اور رخسانہ نے کروٹ بدلنے میں اس کی مدد کی اور جب وہ کروٹ بدل کے دوسری طرف مڑا تو منصور بہت مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا۔

’’السلام علیکم سر۔‘‘ منصور نے نہایت ادب سے سلام کیا اور جھک کر زاہد کا ہاتھ تھاما اور بہت گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

’’اوہ منصور میاں آپ چپ چاپ ادھر کھڑے ہیں۔‘‘ زاہد نے اظہارِ مسرت کیا۔

’’سر میں آپ دونوں کی گفتگو میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔‘‘ منصور پلنگ کے پاس جھک کر بولا۔

’’آہ۔‘‘ زاہد نے فرطِ محبت سے ایک سانس لے کر منصور کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کہنے لگا۔ ’’تم دونوں کو آج اکٹھے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔‘‘

’’یہ اکٹھے آج ہم آپ کی وجہ سے ہیں سر۔‘‘ اب کے رخسانہ بولی۔ ’’میں زندگی کے ہر سانس میں آپ کو یاد کرتی ہوں۔ آپ کی دی ہوئی روشنی آج بھی ہر قدم پر مجھے راستہ دکھاتی ہے، اگر آپ کی ہدایت میرے لئے مشعل راہ ثابت نہ ہوتی تو آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ میرے بھٹکے ہوئے قدم جانے مجھے کہاں لے جاتے۔‘‘

’’اوہ نو نو ڈونٹ ٹاک اباؤٹ دیٹ۔‘‘ زاہد نے موضوع سے ہٹانا چاہا۔

’’ہاں سر ہمارے گھر میں خوشحالی آپ کی رہنمائی کی بدولت ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں آیا جب ہم آپ کو یاد نہ کرتے ہوں اور رخسانہ تو آپ کے نام کا ورد کرتی ہے۔‘‘ منصور نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ’’آپ بہت عظیم آدمی ہیں سر۔‘‘

’’نہیں منصور میاں۔‘‘ زاہد کے دل کو ایک دھکا سا لگا اور وہ مزید کہنے لگا۔ ’’عظیم تو تم ہو منصور۔ جس نے اپنی بیوی پر ایسا پختہ اعتماد کیا جس کی مثال دینا مشکل ہے اور اس

اعتماد ہی کی بدولت آج تم ایک اچھی زندگی گزار رہے ہو۔ خدا تم دونوں کو نظر بد سے بچائے۔'' دعا دیتے ہوئے زاہد کی آواز بیٹھ سی گئی اور وہ رندھی ہوئی آواز میں احساس جرم کے لہجے میں کہنے لگا۔''میں کہاں کا عظیم ہوں کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز بیوی کو محض ایک شبہے کی بنیاد پر طلاق دے کر بے یارومددگار جنگل میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔'' زاہد بولتے بولتے رو پڑا۔

''پلیز کنٹرول کریں۔ آپ کے حوصلے اور اعتماد نے تو دوسروں کو زندہ رکھا ہوا ہے آپ حوصلہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا میں شمائلہ جی کو ڈھونڈوں گی۔ اب اس کی واپسی کا راستہ بنانا میری ذمہ داری ہے۔'' رخسانہ نے زاہد کے آنسو انگلی کی پور سے پونچھے۔

''تھینک یو ویری مچ۔'' زاہد نے رخسانہ کے ہاتھ کو دبایا اور اپنے آپ کو اندر سے مضبوط کر کے پوچھا۔''ایک بات بتاؤ...... کتنے بچے ہیں تمہارے۔''

''کوئی بچہ نہیں ہے سر۔'' رخسانہ فوراً بولی لیکن اس کے بولنے کے انداز میں کسی قسم کی کوئی محرومی نہیں تھی۔''اور ہمیں بچے کی خواہش بھی نہیں ہے نہ مجھے نہ منصور کو۔ اگر دینے والے نے ہمیں نہیں دیئے ہیں تو اس میں بھی کوئی بہتری ہوگی۔ اگر دے دیتا تو ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتے لیکن نہیں دیئے تو شکوہ نہیں۔''

''جی سر ٹھیک کہتی ہے رخسانہ اگر اللہ نے نہیں دی اولاد تو یہ اس کی منشاء ہے اور اس کی منشاء کے خلاف ہم بھٹکیں گے نہیں نہ کوئی غلط قدم اٹھائیں گے۔'' منصور اعتماد کے ساتھ بولا۔

''یقیناً اس کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے تم لوگوں کے لئے اس نے پلے پلائے بچے رکھے ہوں۔'' زاہد نے اچانک ایک انوکھی سی بات کہہ ڈالی۔

''کیا مطلب سر۔'' رخسانہ چونکی۔

''رخسانہ یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا تم میرے بچے کو اپنی گود میں دیکھنا چاہتی ہو۔'' زاہد نے کہا اور رخسانہ چونکی۔

''وہ ایک بھول تھی سر جس کے بارے میں سوچ کر اب بھی ہم دونوں کبھی کبھی ہنستے ہیں۔'' رخسانہ نے قدرے ندامت سے کہا۔

''وہ بھول اب بھی ایک حقیقت بن سکتی ہے۔'' زاہد علی بولا اور رخسانہ سہم سی گئی اور منصور بھی ہکا بکا رہ گیا۔

''وہ کیسے سر۔'' رخسانہ نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''رخسانہ میری زندگی کا بھروسہ کوئی نہیں۔'' زاہد نے دکھ بھرے لہجے میں ٹھنڈی
بھر کر کہا۔''میں ایک ایسا مسافر ہوں جو زندگی کے ڈپارچر لاؤنج میں بیٹھا کسی بلاو۔
منتظر ہے۔''

''سر ایسا نہ کہیں۔'' وہ زاہد کی بات سن کر دہل گئی۔

''سن لو میری بات پہلے۔'' اس نے انگشت شہادت بلند کر کے رخسانہ کو بولنے
منع کیا اور پھر کہنے لگا۔''میرے دو بچے ہیں علی اور عینی۔ میرے بڑے بھائی کے گھر میں
رہتے ہیں لیکن بہت تنگ اور پریشان ہیں وہاں۔ اگر میں مر گیا تو میرے بچوں کے لیے
یتیمی عذاب بن جائے گی۔ تم ان بچوں کو سنبھال لینا رخسانہ! یہ میری آرزو ہے۔''

''سر۔'' رخسانہ زاہد پر جھک گئی اور ٹپ ٹپ اس کے آنسو زاہد کے چہرے پر ٹپکنے
لگے۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

''شمالو جی تیاری کرو۔'' اس دن جب ضامن شاہ کی جیپ رکی تو جیپ سے اترتے ں شاہ جی نے حویلی کے باہر کھڑی شمائلہ کے قریب آ کر کہا اور شمائلہ کو یوں لگا جیسے اسے ھائی ہونے لگی ہے۔ شاہ صاحب ایک تو لاہور سے قصبے تک طویل ڈرائیونگ کر کے آئے ے جبکہ پسینہ ویسے ہی انہیں بہت آتا تھا اور بغل گند کے بھبکے ان کے جسم سے اٹھتے رہتے ے پھر اس بدبو کو چھپانے کے لئے وہ کوئی مخصوص قسم کا عطر لگاتے تھے جس کی مہک کپڑوں و کیڑے سے بچانے والی کافوری گولیوں سے ملتی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی متلی کو روکتی ر اس بیزاری کو بھی چھپاتی جو شاہ صاحب کے قریب ہونے کی وجہ سے اسے محسوس ہوتی ی۔ اندر سے شمائلہ کا دل جانتا تھا کہ وہ شاہ جی کے وجود کو کس طرح برداشت کر رہی تھی ن ظاہر یہی کرتی تھی جیسے اسے شاہ صاحب سے محبت ہوگئی ہو اور یہ سارا تصنع اسی لئے تھا ہ شاہ صاحب خوش رہیں تاکہ جب وہ شاہ صاحب سے چھٹکارا مانگے تو کوئی پس و پیش یا ل نہ کریں۔''

''کہاں کی تیاری میرے سائیں؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''بھئی میں نے کہا تھا ناں کہ کسی دن اچانک ہم ہنی مون کو روانہ ہو جائیں گے سو ل ہماری روانگی ہے۔'' شاہ جی نے نوید سنائی۔

''لیکن ......!'' شمائلہ نے کچھ کہنا چاہا تو شاہ جی اس کی بات روک کر بولے۔

''پہلے پورا پروگرام تو سنو، میں نے ایک ٹریول ایجنسی سے بات کر لی ہے، یہاں ے ہم جائیں گے اسلام آباد ...... اسلام آباد سے مری، پھر مری سے نتھیا گلی، پتریاٹا، یا پھر ادھر سے پہاڑی راستے سے ایبٹ آباد، سوات اور پھر ہم قیام کریں گے ناران ں جہاں جھیل سیف الملوک کا نظارہ کریں گے یا پھر ممکن ہوا تو کالام چلے جائیں گے۔''

''لیکن آپ میری بات تو سنیں ناں ......'' شاہ جی بولتے بولتے ذرا رکے تو شمائلہ ے کہا۔

''بولو......'' شاہ جی نے شمائلہ کو بولنے کا موقع دیتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی کیا ضرورت ہے ہنی مون پر جانے کی، اتنے دن تو ہو گئے شادی کو......!
''شادی کو چاہے کتنے ہی دن کیوں نہ ہو جائیں، ہنی مون کبھی پرانا نہیں ہوتا، ا
ہے میں تو......'' شاہ جی روانی میں بولتے بولتے اچانک رکے اور کہنے لگے۔ ''میں تو ا
ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو شادی کی پچاسویں سالگرہ پہاڑوں پر جا کے بطور ہنی مو
مناتے ہیں۔'' پھر وہ وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''دراصل اتنی تاخیر اس لئے ہو
کہ کچھ فصلوں کی چھٹائی اور بٹائی کا وقت تھا، آڑھتیوں سے لین دین کرنا پڑ گیا، اگر ا
وقت ان سے رقم نہ اٹھاتا تو پھر بات اگلی فصلوں پر چلی جاتی اور پھر یہ بیوپاری ایسی قو
ہے کہ پیسہ دھیلا نکالتے نہیں، باتوں سے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''
''ہم تو ویسے بھی محبت کرتے ہیں، کیا پہاڑوں پہ جا کے پیسہ خرچ کرنا ضرور
ہے؟'' جب وہ باتیں کرتے ہوئے اندر کمرے میں پہنچے تو شمائلہ نے ایک ادا کے ساتھ
اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شاہ جی وہیں نیچے شمائلہ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور اس کے جوتے
ہاتھ لگایا، شمائلہ ایک دم نیچے اتر آئی اور شاہ جی کے پہلو میں بیٹھ کے ان کا ہاتھ اپنے جو
سے الگ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا کرتے ہیں آپ، مجھے گناہگار نہ کریں۔''
''پیسوں کی پھر کیوں بات کرتی ہو، ایک لاکھ بھی ہو تو تمہارے اس جوتے پر
قربان کر دوں۔'' وہ فرطِ محبت سے بولے اور شمائلہ نے نتھنوں کو بند کرتے ہوئے کہ
''اب میں کیا بولوں۔''
کچھ نہ بولو اب...... کھانا نکالو، کھانا کھاتے ہیں پھر آرام کریں گے اس کے !
پیکنگ کریں گے اور صبح روانگی......ٹھیک!''
جب آپ کا حکم ہے تو میں کیسے حکم عدولی کر سکتی ہوں۔'' وہ سرِ تسلیم خم کرتے ہو
بولی۔
''بھئی یوں بولو گی تو ہم نہیں بولیں گے۔ کٹی ہو جائے گی ہماری، بھلا ہم کون
آپ کو حکم دینے والے۔'' شاہ جی نے کہا۔
''میرے سرتاج...... میرے مجازی خدا......'' شمائلہ شاہ جی کے تیور دیکھ کر
ساختہ بولی اور بالوں کو زوردار جھٹکا دیا۔
''بس یہی ادائیں تو آپ کی ہمیں مارے دیتی ہیں۔'' شاہ جی نے کہا اور شمائلہ
زلفوں کو فصل کے دانوں کی طرح رولتے ہوئے بہت رومانٹک موڈ میں بولے۔''
خوب کہا ہے کہ

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

غالب کے اتنے خوبصورت شعر کو شائلہ نے زاہد کے ہمراہ ہزار مرتبہ سنا، پڑھا اور لطف اندوز ہوئی تھی لیکن آج اسے اس شعر سے پہلی دفعہ کراہیت محسوس ہوئی تاہم وہ اگلی صبح شاہ جی کے ہمراہ ہنی مون پر روانہ ہوگئی۔

عابد صاحب کی خوشنما کوٹھی کے باہر رخسانہ اور اس کا شوہر ٹیکسی سے اتر کر جب گیٹ کی طرف بڑھے تو چوکیدار نے انہیں روکا۔

''یہ عابد صاحب کا گھر ہے ناں ......'' منصور نے پوچھا۔

''جی صیب!'' چوکیدار نے جواب دیا۔ ''لیکن صیب ادھر نہیں ہے، وہ مولک سے بار ہے۔''

''بیگم صاحبہ تو ہیں ناں ......'' اب کے رخسانہ نے پوچھا۔

''جی بیگم صیب تو ادھر ہی ہے۔'' چوکیدار نے جواب دیا اور اس سے پیشتر کہ مزید سوال جواب ہوتے، بیگم عابد آوازیں سن کر اور رخسانہ اور ان کے شوہر کو دیکھ کر بولیں۔

''کیا بات ہے چوکیدار؟''

''السلام علیکم بیگم صاحبہ ......!'' اس سے پیشتر کہ چوکیدار کچھ بتاتا، رخسانہ بہت مہذبانہ انداز سے آگے بڑھی اور مصافحے کے لئے ہاتھ بیگم صاحبہ کی طرف بڑھایا۔

''وعلیم السلام۔'' بیگم صاحبہ نے اجنبیت سے جواب دیا۔

''میرا نام رخسانہ ہے، یہ میرے شوہر ہیں منصور۔'' اس نے اپنا اور منصور کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ منصور نے ہاتھ اٹھا کے سلام کیا اور پھر بیگم رخسانہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''فرمایئے۔''

''جی میں آپ کے دیور زاہد صاحب کی اسٹوڈنٹ رہ چکی ہوں، ہم دونوں میاں بوی لندن میں مقیم ہیں، پاکستان آئے تھے تو معلوم ہوا کہ سر زاہد بیمار ہیں، انہی کو ہسپتال ہں دیکھ کر آرہے ہیں، خدا انہیں صحت دے۔'' رخسانہ نے لمبی وضاحت کی۔

''دعا کیجئے۔'' بیگم صاحبہ نے مختصراً جواب دیا۔

''یہ ایک چھوٹا سا کیک ہے۔'' رخسانہ نے ایک بڑا کیک جو بہت اچھی پیکنگ میں نا، بیگم صاحبہ کو پیش کیا۔

''یہ تکلف کیوں کیا آپ نے۔'' بیگم رسماً بولی۔

''پہلی دفعہ آپ کے گھر آئے ہیں تو خالی ہاتھ آنا اچھا تھوڑی لگتا۔'' رخسانہ نے بھی رسماً کہا اور یہ سب باتیں گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی ہو رہی تھیں اور ابھی تک بیگم عابد نے دونوں میاں بیوی کو اندر چل کے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

''ہم دراصل سر کے دونوں بچوں سے بھی ملنا چاہتے تھے۔'' رخسانہ نے حرف مدعا پر آتے ہوئے کہا۔''کیا وہ گھر میں موجود ہیں؟''

''ہاں اندر اپنے کمرے میں ہونگے، کیا باہر بھیجوں انہیں ......'' بیگم عابد نے روکھے انداز سے کہا اور رخسانہ دراصل اندر جا کے بچوں سے ملنا اور ان کا رہن سہن دیکھنا چاہتی تھی۔

''اگر میں اندر جا کے مل لوں تو اچھا ہوگا، کچھ سامان بھی لائی ہوں ان کے لئے۔'' رخسانہ نے خواہش ظاہر کی۔

''ہونہہ ......'' بیگم عابد سوچ میں پڑ گئیں پھر کہنے لگی۔''ایسا ہے میرے میاں ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے مجھے اجازت نہیں ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی مرد گھر کے اندر آئے۔'' بیگم عابد کا اشارہ رخسانہ کے شوہر منصور کی طرف تھا۔

''میرے شوہر باہر بیٹھیں گے گاڑی میں۔'' رخسانہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''میں اکیلی اندر جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے، آپ آ جائیے۔'' بیگم عابد نے بادل نخواستہ کہا اور کیک والا پیکٹ چوکیدار کو دیتے ہوئے بولیں۔

''چوکیدار یہ اندر رکھ آؤ۔'' اور پھر رخسانہ سے مخاطب ہوئی۔''آپ آ جائیے۔''

''منصور وہ سامان لے آئیں گاڑی سے ......'' رخسانہ نے اپنے شوہر سے کہا اور منصور نے گیٹ کے پاس کھڑی گاڑی سے ڈھیر ساری چیزیں نکالیں جن میں ایک بڑی خوبصورت اور مہنگی قسم کی گڑیا تھی اور ایک بڑی اچھی اور خوبصورت جاپانی سائیکل تھی، وہ سامان رخسانہ کے سپرد کر کے خود گاڑی میں جا بیٹھا۔

''یہ گڑیا میری گڑیا کے لئے ہے اور یہ سائیکل میرے گڈے کیلئے ...... ہونہہ ...... کیسی ہے؟'' رخسانہ نے عینی اور علی کو الگ الگ ان کے تحفے دیئے اور پیار سے پچکار کر پوچھا۔

''یہ کیسی ہے سائیکل اور گڑیا؟''

''اچھی ہے۔'' عینی نے کہا۔

''بہت اچھی ہے۔'' علی بولا لیکن رخسانہ نے محسوس کیا کہ دونوں بچے کافی حد تک سہمے ہوئے ہیں، ہر چند کہ مکان جدید طرز کا تھا، اس کے اندر رہنے کی گنجائش بھی بہت تھی لیکن جس کمرے میں عینی اور علی کو رکھا گیا تھا، وہ کمرہ نہیں بلکہ کوئی اسٹور تھا، کمرے کے اندر جوتوں کی بغیر دروازوں والی الماری اور ریک بھی پڑا ہوا تھا جس میں گھر کے لوگوں کے نئے پرانے جوتے پڑے ہوئے تھے اور ان جوتوں سے نکلنے والی پسینے کی بدبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا لوہے کا ٹرنک بھی اسی کمرے میں تھا جس پر تالا نہیں پڑا ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرنک میں بھی کوئی قیمتی شے نہیں بلکہ پرانا سامان رکھا ہوگا۔

علی اور عینی کے سونے کے لئے ڈبل اسٹوری بنا ہوا اوپر نیچے کا ایک بیڈ تھا جو کافی بوسیدہ ہو چکا تھا جو یقیناً عابد صاحب کے بچوں کے لئے کبھی بنایا گیا ہوگا اور اب عینی اور علی کے استعمال میں آ رہا تھا، اس بیڈ کے یہاں رکھنے سے کمرہ جو پہلے ہی چھوٹا تھا، بہت تنگ پڑ گیا تھا اور سائیکل اور گڑیا رکھنے کی وجہ سے اور بھی تنگ ہو گیا تھا لیکن یہ دونوں چیزیں اتنی نئی اور دلکش تھیں کہ سارا کمرہ سج گیا تھا اور دونوں بچے کھلونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہو گئے تھے اس کے علاوہ رخسانہ بسکٹس اور چاکلیٹ بھی لائی تھی جو اس نے بچوں کو دکھا کر ایک کارنس پر رکھ دیئے تھے اور دونوں بچوں سے اپنا تفصیلی تعارف بھی کرایا تھا اور یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ اور اس کا شوہر ان بچوں کے بہت خیر خواہ ہیں اور خدانخواستہ ان پر کوئی برا وقت آ جائے تو اس کے لئے یہ عندیہ دیا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لندن بھی لے جائیں لیکن یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ اس وقت رخسانہ کا پہلا مقصد بچوں کو خوش کرنا تھا تاکہ وہ ماں کی دوری اور باپ کی بیماری کا غم بھولے رہیں۔

''دیکھو یہ گڑیا بولتی بھی ہے۔'' رخسانہ نے گڑیا کا ایک بٹن دبایا تو وہ بہت خوبصورت اور مزاحیہ قسم کا انگریزی کا گانا گا کے کامیڈی کرنے لگی، اس پر عینی اور علی دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور رخسانہ بھی بچوں کا ساتھ دینے کے لئے خوب ہنسی اور بار بار گڑیا کا پیٹ دبا کر اسے چلاتی رہی۔

''آنٹی یہ آوازیں اس کے پیٹ سے نکل رہی ہیں ناں......؟'' جب گڑیا تھوڑی دیر کو چپ ہوئی تو علی نے نہایت معصومیت سے کہا۔

''ہاں بیٹے دنیا کی جتنی آوازیں ہیں ناں، وہ سب پیٹ سے نکلتی ہیں۔'' رخسانہ

نے بے ساختہ جواب دیا لیکن فوراً اسے احساس ہوا کہ وہ یہ فقرہ بچوں کی سطح سے اوپر کا بول گئی ہے لہٰذا دونوں بچے اس کے جواب پر کھلکھلا کر ہنسے اور عینی، گڑیا کو دبا دبا کر آوازیں نکالنے لگی۔

''میں سائیکل چلاؤں؟'' علی نے بہت پر تجسس نظروں سے سائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں ...... چلانے ہی کیلئے تو لائی ہوں۔'' وہ شفقت سے بولی اور علی کو سائیکل پر بیٹھنے میں مدد کی۔ علی نے سائیکل پر سوار ہو کر دو چار پیڈل مارے تو سائیکل دیواروں سے ادھر ادھر ٹکرانے لگی۔

''یہاں جگہ نہیں ہے۔'' علی نے کہا۔ ''میں باہر لے جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ......'' رخسانہ نے جواب دیا۔

''یہ جگہ سائیکل چلانے کے لئے تھوڑی ہے، باہر لے جاؤ سائیکل باہر...... لان میں بہت جگہ ہے تم بھی گڑیا وہیں لے جا کر کھیلو اور میں اب جاؤں گی۔'' رخسانہ نے کہا۔

''آپ نے شربت نہیں پیا۔'' رخسانہ جب جانے لگی تو علی نے میز پر رکھے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا جو سرخ رنگ کے کسی پانی ملے شربت سے بھرا ہوا تھا اور جو گھر کا ملازم اس کے لئے رکھ گیا تھا۔

''بس ٹھیک ہے ...... میرا موڈ نہیں ہے۔'' رخسانہ نے شربت کو نظر انداز کر کے دونوں بچوں کو پیار کیا اور باہر نکل گئی۔ گاڑی میں منصور انتظار میں بیٹھا تھا، سرخ رنگ کے شربت کا ایک گلاس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر بھی بھرا ہوا رکھا تھا اور منصور نے اسے چھوا بھی نہیں تھا اور جب گاڑی چلنے لگی تو اٹھا کے گلاس چوکیدار کے حوالے کیا۔

''بہت خبیث عورت ہے۔'' جب گاڑی روانہ ہوئی تو منصور نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا اور جواب میں رخسانہ نے آنکھ سے اشارہ کر کے اپنے ڈرائیور کی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے اشارے سے چپ رہنے کی تلقین کی اور گاڑی کوٹھی کے علاقے سے دور ہو گئی۔

❁

سہ پہر کے وقت جب عابد صاحب کے دونوں بچوں کی وین دروازے پر آ کر رکی تو عینی اور علی دونوں اس وقت بہت خوش خوش لان میں کھیل رہے تھے، علی سائیکل چلا رہا تھا اور عینی، علی کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہوئی اپنی جاپانی گڑیا کے گانے سن رہی تھی اور دونوں

بہن بھائی خوب چہک رہے تھے۔ شمائلہ کے جانے کے بعد اور باپ کی بیماری کے بعد آج پہلی مرتبہ دونوں اس قدر خوش ہوئے تھے، ان کے اسکول کی پڑھائی اور تو اتر بھی کافی عرصے سے متاثر ہو رہا تھا، بہت پابندی اور شوق سے پڑھنے والے بچے پڑھائی سے اس طرح محروم ہوتے چلے گئے کہ اسکول جانے اور لکھنے پڑھنے کی عادت سے ہی محروم ہوتے چلے جا رہے تھے اور دن بھر تائی کی جھڑکیاں سہتے اور تایا زاد بہن بھائی کی بدزبانی کا شکار ہوتے یا ان سے مار کھاتے ہوئے گزر جاتا، تاہم اب انہوں نے اس صورتحال کو اپنی تقدیر سمجھ کے قبول کر لیا تھا اور اس انتظار میں دن گزار رہے تھے کہ ماں جب لوٹے گی اور باپ جب ٹھیک ہو جائے گا تو پھر دونوں اپنے گھر جا بسیں گے اور پھر پہلے کی طرح ہو جائیں گے تب تک انہیں تایا تائی کے گھر کا عذاب جھیلنا ہو گا لیکن انہیں پہلی ہی ملاقات میں رخسانہ آنٹی بہت اچھی لگی تھی جو اتنی ڈھیر ساری چاکلیٹ اور بسکٹ کے علاوہ اتنی اچھی سائیکل اور ایسی عمدہ گڑیا لے کر بھی آئی تھی اور دونوں بہن بھائی بہت خوش گڑیا اور سائیکل کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے کہ وین رکی اور عابد صاحب کے دونوں بچے نومی اور نینا وین سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ وہ ایک بہت اچھے اور مہنگے انگریزی اسکول کی یونیفارمز پہنے ہوئے تھے اور فر فر انگریزی بولتے ہوئے اندر آ رہے تھے، علی اور عینی کا اسکول تو اتنا بڑا نہیں تھا لیکن وہ نومی اور نینا کی انگریزی سے بہت اچھی انگریزی جانتے تھے کیونکہ زاہد نے ان کو اردو اور انگریزی بہت اچھی طرح پڑھائی تھی اور زبان کے معاملے میں نومی اور نینا کے سامنے کسی قسم کے کمپلیکس کا شکار نہیں تھے لیکن نومی اور نینا کے رہن سہن، ان کا اسکول اور ٹھاٹ باٹ نے دونوں کو بہت متاثر کر رکھا تھا اور وہ کافی حد تک کمپلیکس کا شکار بھی ہو گئے تھے تاہم اس دن رخسانہ آنٹی کی آمد سے دونوں بہت خوش تھے اور بہت خوش خوش لان میں کھیل رہے تھے کہ نومی اور نینا اندر داخل ہوئے اور پہلے تو سائیکل اور گڑیا کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے کیونکہ نہ تو سائیکل معمولی تھی اور نہ ہی گڑیا کوئی عام سی تھی۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کے قدم رک گئے اور انگریزی بھی تھم گئی، وہ نفرت کی نظروں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلے گئے۔

''ممی! یہ لوگ سائیکل اور گڑیا کہاں سے لائے ہیں؟'' نومی نے ماں سے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''اور بھی بہت سی چیزیں ہیں ان کے کمرے میں بھائی۔'' نینا نے مزید حیرت کا اظہار کیا اور نومی جیسے تڑپ سا گیا۔

''وٹ دا ہیل از گوئنگ آن ان دس ہاؤس ممی۔''

''ڈونٹ گیٹ ایکسائیٹڈ ......'' ماں نے کہا۔''بتاتی ہوں۔'' اور پھر بیگم عابد نے ساری بات بتائی کہ کوئی رخسانہ نام کی عورت ان کے لئے یہ سب کچھ لے کر آئی ہے۔

''ہونہہ ......'' نومی نے کچھ سوچا اور پھر بہن کا ہاتھ تھام کر بولا۔''کم آن نینا لیٹس گو آؤٹ سائیڈ۔''

''پہلے کپڑے تو بدل لو۔'' ماں نے کہا۔''اور کچھ کھا پی لو۔''

''ابھی نہیں ممی ......!'' نومی نے کہا اور بہن کا ہاتھ تھاما اور دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ اس وقت باہر لان میں علی اور عینی بہت خوش دونوں سائیکل چلا رہے تھے اور جاپانی گڑیا کے گانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''اے روکو سائیکل ...... لان کیوں خراب کر رہے ہو؟'' نومی نے لان میں آتے ہی حکم دینے کے انداز میں علی سے کہا۔''رکو میں کہتا ہوں۔'' جب علی نہیں رکا تو نومی نے دوبارہ کہا اور علی نے سائیکل کو بریک لگا دیا۔

''لان کیوں خراب کر رہے ہو؟'' نومی نے دوبارہ پوچھا۔

''بھائی میں لان تو نہیں خراب کر رہا۔'' علی نے انکساری سے جواب دیا۔

''تو پھر تمہارا باپ خراب کر رہا ہے؟'' نومی بدتمیزی سے بولا۔

''باپ کو گالی نہ دو بھائی ......'' علی دکھی ہو کر بولا۔''میرا باپ تو ......''

''بکومت، نیچے اترو سائیکل سے، ساری گھاس خراب کر دی۔'' نومی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''گھاس تو لان میں ہے ہی نہیں نومی بھائی، وہ خراب کہاں سے کرے گا۔'' اب کے عینی نے اپنے بھائی کی طرف داری کرتے ہوئے مداخلت کی۔

''تو چوپ ......'' نومی نے عینی کو گھرکی دی اور نینا نے عینی کی گڑیا چھین کر گڑیا کو بے دردی سے دبانا اور مروڑنا شروع کر دیا اور بولی۔''تم سے کس نے کہا بولنے کو ......''

''میری بہن کی گڑیا کیوں خراب کر رہی ہو، واپس کرو۔'' علی سائیکل سے نیچے اترا اور نینا سے بولا۔

''میں کروں گی، کروں گی، کروں گی خراب ......'' نینا بہت جیلس ہو کر بولی اور گڑیا کی گردن پکڑ کے مروڑنا شروع کیا تو گڑیا کے اندر سے عجیب عجیب فریاد کرتی آوازیں نکلنے لگیں، یہ دیکھ کر عینی بہت پریشان ہوئی، علی کو مدد کے لئے پکارا۔

''بھائی دیکھو میری گڑیا خراب کر دی، بھائی، بھائی، بھائی ......'' وہ چلانے لگی۔

''دیتی ہو گڑیا واپس کہ نہیں ......'' علی نے نینا کے ہاتھ سے گڑیا چھینی تو نینا کو ہلکا سا دھکا بھی لگا۔

''تو نے میری بہن کو دھکا دیا ہے، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' نومی علی پر جھپٹ پڑا، علی نے بھی اپنا بچاؤ کیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے، نینا، عینی سے جھپٹ پڑی اور جیسے بچوں میں گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی، گتھم گتھا ہونے میں علی، نومی پر کچھ بھاری پڑا یا ویسے ہی نومی گر گیا، گرنے سے اس کی ساری یونیفارم گیلی مٹی سے اٹ گئی اور نومی کا چہرہ بھی غبار آلود ہو گیا اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔

''ممی، ممی، ممی ...... یہ مجھے مار رہا ہے۔'' اس دوران نینا بھی چلائی۔ ''ممی، ممی، ممی ......''

بیگم عابد نے شور سنا تو بھاگتی ہوئی باہر آئی اور علی اور عینی دونوں کو تھپڑ مارنے شروع کر دیئے اور گالیاں بھی دینے لگی۔ ''خدا تمہیں غارت کرے بدبختو ...... ایک تو ہمارے سر پہ مونگ دلتے ہو، پھر ہمارے بچوں کو مارتے بھی ہو، آخر ہو کس ماں کے ......'' بیگم صاحبہ دونوں کی پٹائی کرنے لگی اور نومی نے ایک بیٹ اٹھا لیا جو پاس ہی لان میں پڑا تھا اور گھما گھما کر سائیکل کو کوٹا کہ اس کا ہینڈل ٹیڑھا ہو گیا، پہیوں کی اسپوکس ٹوٹ گئیں اور نینا نے گڑیا کو پکڑ کر اس کے بخیئے ادھیڑنے شروع کر دیئے۔

''چلو تم دونوں اندر ......'' بیگم صاحبہ نے نومی اور نینا کو اندر کی طرف دھکیلا اور پھر بولی۔ ''میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ ان کے منہ نہ لگو ...... دیکھو کیا حلیہ بنا لیا ہے اپنا۔'' وہ اپنے دونوں بچوں کو پچکارتے ہوئے اندر لے گئی۔ وہ جب اندر گئے تو عینی نے اپنی ادھڑی ہوئی گڑیا کو اٹھایا، سینے سے لگایا اور روتے ہوئے بولی۔ ''بھائی میری گڑیا ......!'' اور علی نے اپنی سائیکل کو دیکھا جس کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا تھا، وہ بہن کو تسلی دینے کی بجائے خود بھی رو پڑا اور آنسو بہاتے ہوئے بولا۔ ''بہن میری سائیکل ......!''

اور پھر دونوں اپنی ٹوٹی ہوئی سائیکل اور ٹوٹی ہوئی گڑیا کے پاس بیٹھ کے اس طرح رونے لگے جیسے دو یتیم بچے ماں باپ کی قبروں پر بیٹھے روتے ہیں۔

❁

اس دن کوئی خاص چھٹی تھی کہ شہر میں اور ہسپتال میں بھی سناٹا تھا، او پی ڈی کا اسٹاف بھی اکا دکا ہی حاضری پر تھا، نرسیں اور ڈاکٹرز ڈیوٹی روم سے غائب تھے اور زاہد کے

پاس بھی کوئی اسٹاف یا تیماردار موجود نہیں تھا اور زاہد کی طبیعت آج کچھ بہتر تھی، اس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کمرے کے اندر اور برآمدے میں تقریباً پانچ منٹ کی چہل قدمی کی تھی اور اب تکیہ اونچا کر کے بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے جو اس کا دوست بھی ہوگیا تھا، کوئی اچھی رومانٹک کتاب یا تاریخی قصہ پڑھنے کی اجازت دی تھی، وہ بھی مختصر تا کہ ذہن پر زیادہ زور نہ پڑے اور اخبار پڑھنے سے پرہیز کرنے کو کہا تھا اور از راہ مذاق شام کے اخبارات کی قطعی ممانعت کر دی تھی تا کہ ٹینشن نہ ہو اور ویسے بھی شام کے اخبارات کا مزاج زاہد کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھا اور وہ کتاب کے مطالعے میں زیادہ خوش تھا۔ اس دن وہ کوئی بہت ہی دلچسپ اور پرتجسس کتاب پڑھنے میں مصروف تھا اور کتاب میں اتنی دلچسپی اور ایسا سسپنس تھا کہ وہ صفحات میں کھوگیا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے تمام مسائل اور دکھ بھولا ہوا تھا کہ اچانک ایک ہلکی سی دستک نے اس کی نظروں کو کتاب کے صفحے سے ہٹایا اور اس نے نگاہ ترچھی سی کر کے دروازے کی طرف دیکھا۔

''یارب العالمین، جل تو جلال تو۔'' زاہد کانپ گیا، اسے شمس کی شکل نظر آئی، وہ تقریباً دروازے کے اندر آ چکا تھا لیکن زاہد کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ وہ خواب میں بھی اس شیطان کو کئی بار دیکھ چکا تھا، اسے پھر محسوس ہوا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنے کا آغاز کر رہا ہے، اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی اور اپنے سیدھے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر چٹکی لی، یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔

''اوں ہوں ...... تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو اس وقت ...... میں جیتا جاگتا تمہارے سامنے موجود ہوں۔'' شمس نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ ''اس حادثے یا خوشگوار لمحے کے بعد آج میں پہلی دفعہ تمہارے سامنے آیا ہوں، لیکن میرے چہرے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔''

''اس لئے کہ تم ایک انتہائی بے غیرت اور بے شرم آدمی ہو۔'' زاہد اپنے بے قابو ہوتے ہوئے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔

''وہ تو میں ہوں۔'' شمس نے بہت دھیمے لہجے میں بے شرمی سے اعتراف کیا۔

''فوراً نکل جاؤ یہاں سے باہر، آستین کے سانپ ......'' زاہد کا غصہ بے قابو ہو رہا تھا۔

''اس میں کیا شک ہے، اگر کسی نے آستین کا سانپ دیکھنا ہو تو مجھے دیکھ لے کیونکہ دوسرے سانپ تو بہت نظر آتے ہیں، آستین کے دکھائی نہیں دیتے۔'' وہ نہایت آرام سے بولا۔

''نرس ......!'' زاہد چلایا۔ ''کوئی ہے ......'' زاہد کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

''دیکھو چلانے کی ضرورت نہیں زاہد، میں کچھ کہنے آیا ہوں، کہہ کے چلا جاؤں گا، میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں ہے، جو تکلیف میں تمہیں پہنچا چکا ہوں اس سے زیادہ کیا پہنچاؤں گا، اس لئے خاموش رہو، تم مکالمے کے آدمی ہو، مکالمہ بولتے، مکالمہ سنتے ہو، مجھے تھوڑا سا وقت دو۔'' وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا بیڈ کے قریب آ گیا لیکن اتنا قریب نہیں کہ زاہد کا ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ سکے، زاہد بھی غصے کو قابو میں کرتے ہوئے اس طرح خاموش ہوا جیسے واقعی اس کے منہ سے کچھ سننا چاہتا ہو۔

''زاہد ......!'' اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''جو کچھ ہوا، اس کے ذمہ دار تم بھی ہو۔'' زاہد تجسس سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں اور تم یکجان دو قالب تھے اور تمہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ عورت کے معاملے میں، میں ہمیشہ دل پھینک رہا ہوں، تمہیں یاد ہے ناں ہم دونوں اکٹھے لڑکیاں تاڑتے تھے لیکن تم شریف آدمی تھے اور میں ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر تمہارا ہاتھ دبا دیا کرتا تھا اور میری اس حرکت پر انجوائے تم بھی کرتے تھے، یہ الگ بات ہے میں حاصل کر لیتا تھا، تم اس کے حصول میں شریک نہیں ہوتے تھے۔''

''بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' زاہد نے جذبات پر قابو پا کے کہا۔

''بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اتنی خجل خواری کے باوجود میں شمائلہ کو ابھی تک حاصل نہیں کر سکا اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بہت ڈھٹائی سے بولا۔ ''اب اگر مجھے وہ مل جاتی ہے تو میری ایک خواہش پوری ہو جائے گی جبکہ تمہارا نقصان کوئی نہیں ہوگا بلکہ فائدہ ہوگا، تم سے اب کہنا صرف یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم اب وہ کہاں ہے لیکن تم سے آ کر ضرور ملے گی اور اسے مشورہ دو کہ مجھ سے شادی کر لے، میں اسے رکھوں گا نہیں، واپس تمہارے پاس بھیج دوں گا، تم دوبارہ شادی کر لینا ...... یہ میرا وعدہ ہے ...... اور بے ایمان آدمی کا وعدہ پکا ہوتا ہے۔''

''گیٹ آؤٹ ...... گیٹ آؤٹ آئی سیڈ۔'' زاہد کی قوت برداشت جواب دے گئی، وہ غصے سے کانپتے ہوئے چلایا اور پھر دروازے کی طرف دیکھ کر جیسے مدد کے لئے پکارا۔ ''نرس، نرس ...... ڈاکٹر، ڈاکٹر، وارڈ مین ...... کہاں مر گئے سب ......'' زاہد کی سانس پھول گئی۔

''بلاوجہ اپنا بلڈ پریشر ہائی نہ کرو، طبیعت کچھ سنبھلی ہے پھر بیمار ہو جاؤ گے، ویسے
آج کوئی نرس یا ڈاکٹر ہسپتال میں ہے نہیں اور کسی کو بلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے،
خود چلا جاؤں گا لیکن ایک اچھا مشورہ دینے آیا تھا، جو ہو گیا تھا، وہ بہت غلط ہوا لیکن
وقت واپس پیچھے نہیں جا سکتا لہٰذا آگے کا سوچنا چاہیے، مجھے معلوم ہے تم شمائلہ کو واپس
چاہتے ہو، اگر میرے ساتھ شادی کرے گی تو میری اور تمہاری بھی آرزو پوری ہو جا
گی، وہ جب چاہے گی، میں اسے چھوڑ دوں گا ...... سوچ لو۔'' وہ کہتے کہتے ایک لمحے
لئے رکا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد زاہد نے بڑی مشکل
اپنے جذبات کو کنٹرول کیا اور پھر ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔ ''کیا ایسا ہو سکتا ہے
اور پھر وہ سوچتا رہا۔

شمائلہ کا پتہ پوچھتا شمس ایک دن لاہور فریدالدین اور زارا کے گھر آخر کار پہنچ
گیا، اسے نہ معلوم زاہد کی گفتگو سے اندازہ ہوا تھا یا کسی اور ذریعے سے معلوم ہوا کہ شما
واپس فرید اور زارا کے گھر چلی گئی ہے لیکن اسے آگے کا حال احوال معلوم نہیں تھا۔
''یہاں کیسے آئے آپ ......؟'' فریدالدین اچانک شمس کو اپنے دروازے پر د
کر ٹھٹکا۔ زارا بھی حیران ہوئی اور حیرانی سے زیادہ دونوں میاں بیوی کو پریشانی لاحق ہو
کیونکہ وہ شمائلہ اور زاہد کی زندگی مکمل طور پر تباہ کر کے آج ان کے سامنے کھڑا تھا۔
''دیکھئے فرید صاحب! آپ نے جتنا مجھے غلط سمجھا صحیح سمجھا۔'' شمس تمہید باند
ہوئے بولا۔ ''لیکن غلط آدمی بھی کبھی کبھی صحیح بات کہہ سکتا ہے ...... میں ایک صحیح کام کر
کے لئے آیا ہوں اور آپ کے ساتھ اطمینان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' شمس نے
اس لہجے میں کہا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بات کرنے کا خواہشمند ہے۔ شمس کی ا
ان کہی التجا پر فرید نے زارا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ زارا نے فرید کی جان
متجسس نگاہ ڈالی جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ مشورہ کر رہے ہوں کہ آیا اس آدمی
اندر بلانا چاہئے یا نہیں ...... پھر جیسے دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کر لیا
اسے اندر بلانے میں کوئی حرج نہیں، اگر شمائلہ یہاں موجود ہوتی تو پھر فریدالدین ا
جوتے مار کر باہر ہی سے بھگا دیتا بلکہ غنڈوں سے پٹوا دیتا اور غنڈوں سے پٹوانے کی د
وہ اسے دے بھی چکا تھا لیکن آج صورتحال مختلف تھی اور شمس کا یہاں آنا ان کے لئے بہ
پراسرار اور معنی خیز تھا اس لئے وہ اس کی آمد کا مقصد بھی جاننا چاہتے تھے۔

''اندر آجائیے۔'' فریدالدین نے کہا۔لیکن ان کے لہجے میں روکھا پن تھا۔

''شکریہ ......!'' شمس نے دھیمے لہجے میں شکریہ ادا کیا اور سر جھکا کے فریدالدین کے ساتھ ساتھ اندر ڈرائنگ روم کے باہر لابی میں رکھی کرسیوں کی طرف لے جا کر بٹھا دیا۔شمس بالکل نظریں جھکائے ہوئے ایک شریف آدمی کی طرح اندر گیا اور کرسی پر وہ اس طرح سر اور نگاہیں جھکا کے بیٹھا جیسے کوئی شرمیلا دولہا پہلی مرتبہ اپنے سسرال میں سلامی لینے کے لئے آ کر بیٹھتا ہے، معلوم نہیں یہ اس کا تصنع تھا یا وہ فریدالدین سے خوف محسوس کر رہا تھا۔

''فرمائیے ......!'' جب وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو فرید نے چائے، پانی کا پوچھے بغیر بہت روکھے پن سے پوچھا، زارا بھی صورتحال جاننے کے لئے فرید کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''بات یہ ہے جناب کہ جو ہو گیا، میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا ہوں، اس کا فائدہ بھی کچھ نہیں ہے، سانپ گزر جائے تو لاٹھی پیٹنے کا فائدہ نہیں۔'' شمس نے بات شروع کی۔

''سانپ موجود ہے ابھی ......'' فرید نے شمس کی بات کاٹ کر کہا اور زارا نے فرید کا ہاتھ آہستہ سے دبا دیا جس کا مطلب تھا کہ اسے بولنے کا موقع دیا جائے۔

''آپ نے ٹھیک اشارہ کیا ہے کہ مجھے بولنے کا موقع دیا جائے۔'' اس نے زارا کے اشارے کو بھانپ لیا۔

''اف خدایا کس قدر تیز آدمی ہے، شیطان کی نظریں ہر طرف گھومتی ہیں۔'' زارا نے سوچا اور فرید نے بھی اس کی شیطانی نظروں کا نوٹس لیا۔

''تم اندر جاؤ زارا ......!'' فرید نے زارا سے اس طرح کہا جیسے حکم دے رہا ہو۔
زارا اٹھ کے اندر چلی گئی۔

''بات یہ ہے کہ دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں دیکھ کر آدمی کی نیت خراب ہوتی ہے، میں تیسری کو نہیں مانتا۔'' زارا کے اندر جانے کے بعد شمس نے بہت تحمل کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ''وہ دو چیزیں کیا ہیں، ایک دولت اور دوسری عورت ...... اور اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں سچ کہوں کہ شائلہ ایک بھرپور عورت ہے اور میری نیت خراب ......''

''بند کر یہ بکواس حرام ......'' فرید نے ایک تھپڑ مارا اور خشم آلود ہو کر اسے فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ ''میرے سامنے اس عورت کے بارے میں تم بکواس کر رہے ہو، جس کو میں نے بہن بنایا ہے۔''

''میں آپ کے اس رشتے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔'' شمس نے گال سہلاتے

ہوئے کہا۔ ''آپ نے گھر آئے مہمان پر ہاتھ اٹھا کے اچھا نہیں کیا۔''

''تم مہمان نہیں بلائے جان ہو۔'' فرید نے اپنے غصے کے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''گھر میں آئے سوّر کو بھی نہیں مارا جاتا ہے۔'' شمس نے کہا۔

''تم سوّر سے بھی بدتر ہو۔'' فرید نے فوراً جواب دیا۔

''نو پرابلم ......'' شمس بھی ترکی بہ ترکی بولا۔ ''کوئی بھی گالی میرے لئے اب گالی نہیں ہے اس لئے میں ان باتوں پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، صرف وہ بات کہنا چاہتا ہوں جس کے لئے میں یہاں آیا تھا۔''

''جلدی سے بھونکو......'' فریدالدین انتہائی توہین آمیز لہجے میں بولا اور شمس کسی قسم کی توہین محسوس کئے بغیر کہنے لگا۔ ''میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا تھا، وہ مقصد اگر حل ہو جائے تو شائلہ اور زاہد کی زندگی تباہی سے بچ سکتی ہے، میری بدنیتی میں بھی زاہد اور شائلہ کے لئے نفع پوشیدہ ہے۔''

''جلدی سے اپنی بات ختم کرو۔'' فریدالدین کیلئے بھی شمس کی بات میں دلچسپی اور تجسس پیدا ہوا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ شائلہ یہاں آئی ہوئی ہے۔'' شمس کن انکھیوں سے اندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو......!'' فرید نے کڑے تیور کے ساتھ کہا۔

''تو یہ کہ دس منٹ میں نکاح خواں آ جائے گا، میرے ساتھ اس کے دو بول پڑھوا دیجئے، حلالے کی شرط پوری ہو جائے گی، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو تاریخ آپ بتائیں گے، اس تاریخ کو طلاق دے کر اسے واپس زاہد کے پاس بھجوا دوں گا۔'' اس نے انتہائی شریفانہ لہجے میں کہا اور پھر واپس اپنی خصلت پر آتے ہوئے بولا۔ ''زاہد اور شائلہ کی زندگی واپس اپنے ڈگر پر آ جائے گی اور میری حسرت بھی نکل جائے گی۔''

''آؤٹ...... گیٹ آؤٹ آف ہیئر۔'' فرید نے اسے انگلی کے اشارے سے اٹھ کر باہر جانے کو کہا اور خود شمس سے پہلے اٹھ کے کھڑا ہو کر مزید کہنے لگا۔ ''شائلہ کو بیوی بنانے کی حسرت تمہاری کبھی نہیں پوری ہوگی اور تم یہ حسرت دل میں لے کر اس دنیا سے چلے جاؤ گے کیونکہ شائلہ کی شادی ہو چکی ہے۔''

''ہیں......!'' شمس چونکا اور پھر بولا۔ ''کس کے ساتھ......؟'' اس کی امیدوں پر

ے اوس پڑ گئی۔
''تمہیں اس سے غرض نہیں ہونا چاہیے کہ کس کے ساتھ اور نہ اس کا خیال دل میں انا لیکن اتنا بتا دوں جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے ناں اس کے بارے میں اگر ہ چا بھی تو وہ تمہیں زندہ دیوار میں چنوا دے گا۔'' فرید نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور شمس یک لمحہ چپ ہوا اور پھر معنی خیز طریقے سے کہنے لگا۔ ''کیا وہ مغل بادشاہ ہے اور میں انارکلی وں۔''

اس نے قدرے توقف کیا اور پھر مزید بولا۔ ''اگر ایسا ہے تو خیال رکھنا کہیں شمائلہ کو نارکلی نہ بنا دے۔''

''گیٹ لاسٹ ...... دفع ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں کہتا ہوں۔'' فرید اس ی بات سے ذرا گھبرا بھی گیا اور غصے سے چراغ پا بھی ہو گیا۔

''جاتا ہوں، جاتا ہوں۔'' شمس اٹھ کے باہر جانے لگا اور جاتے جاتے رکا اور پھر لا۔ ''مجھے پانی کا ایک گلاس ملے گا؟''

''وہ سامنے میونسپلٹی کا نلکا لگا ہوا ہے، جا کے پی لو۔'' فرید بہت بے رحمانہ انداز ں بولا اور شمس کسی قسم کی ذلت محسوس کئے بغیر باہر چلا گیا۔

''افوہ ......'' اس کے جانے کے بعد فرید نے سر پکڑ لیا۔

''یہ تو بہت بے غیرت آدمی ہے۔'' زارا جو اندر سے اس کی باتیں سن رہی تھی، اٹھ ے فرید کے قریب آئی۔

''بے غیرت چھوٹا سا لفظ ہے اس کے لئے ......'' فرید نے جواب دیا اور پھر دونوں اں بیوی اس فکر میں کھو گئے کہ شمس کہیں کھوجتا ہوا شاہ جی کے علاقے میں نہ پہنچ جائے۔

''اف دم گھٹ رہا ہے ذرا سانس لینے دیں۔'' شمائلہ نے پہاڑیوں کے بیچ گھرے رناران کے ایک ہوٹل کے کمرے میں خود کو شاہ جی کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے ہا۔ جہاں وہ تین دن سے کسی سزا یافتہ قیدی کی طرح سزا کاٹ رہی تھی۔

''کیا فائدہ شاہ جی! ہم اتنی دور پہاڑوں پر آئے بھی ایک کمرے میں قید ہیں اور بھی جھیل سیف الملوک کے پاس ......'' شمائلہ چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ چاردیواری ے باہر رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ شاہ صاحب کی قربت سے دور رہے کیونکہ اب اس ے ہر شے ناقابل برداشت ہوتی چلی جا رہی تھی۔

''ضرور ......ضرور ......'' وہ شمائلہ کے مطالبے پر بہت ہی پیار سے اس کا ہم خیال ہو کر بولے۔ ''واقعی میں بہت بدذوقی کا ثبوت دے رہا ہوں کہ ناران کی پرفضا پہاڑیوں میں آ کر بھی چار دیواری میں بند ہوں لیکن یہ بھی تو سوچو۔'' وہ شمائلہ پر ایک بھرپور نگاہ ڈال کر بولے۔ ''کہ کیوں بند ہوں، اگر کمرے میں تم ہو گی تو کون بدذوق ہو گا جو کمرے سے باہر جانا چاہے گا، کیا باہر کا منظر تم سے زیادہ خوبصورت ہے؟''

''ہٹیئے مجھے بنائیے نہیں ...... چلیں جھیل سیف الملوک کی طرف ......'' شمائلہ نے مصنوعی ادا سے کہا اور بالوں کو جھٹکا دیا۔

''اگر جھیل سیف الملوک میری ہوتی تو میں تمہاری ایک ادا پر تمہاری نذر کر دیتا۔'' شاہ جی ایک دم رومانٹک ہو کر بولے۔ ''وہ کون شاعر تھا جو اپنے محبوب کے تل کے بدلے سمرقند اور بخارا اس کی نذر کر رہا تھا۔''

''وہ اس لئے نذر کر رہا تھا کہ سمرقند اور بخارا اس کا اپنا نہیں تھا۔'' شمائلہ نے طنز کیا اور جواب میں شاہ جی ترت بولے۔ ''جیسے جھیل سیف الملوک میری نہیں ہے۔'' اور یہ کہہ کر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنسے اور شمائلہ کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا، وہ بھی جھوٹ موٹھ ہنسنے لگی۔

''وہ جی آپ کا ٹیلیفون آیا ہے۔'' معاً ہوٹل کا چوکیدار بغیر دستک کے اندر آ گیا اور آتے ہی بولا۔ کیونکہ ٹیلیفون کمرے میں نہیں بلکہ باہر استقبالیہ کے کاؤنٹر پر تھا۔ شاہ جی اور شمائلہ دونوں ٹیلیفون کے نام پر چونکے کہ اس قدر دور کس کا ٹیلیفون آ سکتا ہے۔

''میرا ٹیلیفون ......؟'' شاہ جی نے حیرت و استعجاب کے ساتھ چوکیدار سے پوچھا۔

''نہیں جی آپ کی بیٹی کا ......'' چوکیدار نے شمائلہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''فون کرنے والے نے بی بی کا نام لیا ہے۔''

شاہ جی کا خون کھول گیا۔ ''ادھر آ ......!'' جب چوکیدار جانے لگا تو شاہ جی نے انتہائی ندامت اور برہمی سے اسے پکارا، چوکیدار پلٹا تو شاہ جی توہین آمیز لہجے میں کہنے لگے۔ ''کل وہ تیرے ساتھ ہوٹل کے باہر کون عورت تھی؟''

''وہ میری بیوی تھی صاحب ......!'' چوکیدار نے کہا۔ ''ہم دونوں میاں، بیوی ادھر ہی کام کرتے ہیں۔''

''اچھا کمال ہے ...... میں سمجھا تمہاری پوتی ہے۔'' شاہ جی نے بدلہ اتارتے ہوئے کہا۔

''صاحب......!'' چوکیدار تڑپا۔

''دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔'' شاہ جی نے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

شمائلہ شاہ جی کی بے بسی پر اندر ہی اندر لطف اندوز ہوئی اور پھر کہنے لگی۔''فون سن
ؤں!''

''کس کا فون ہے......؟'' شاہ جی نے استفسار کیا۔''اس کمبخت نے فضول بکواس
کے موڈ آف کر دیا۔'' وہ بڑبڑانے لگے۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

''کس کا فون ہوسکتا ہے جو یہاں پہاڑوں پر آ گیا۔'' وہ تذبذب میں پڑ گئے اور کچھ مشتبہ نظروں سے شمائلہ کو دیکھنے لگے۔

''مجھے کیا معلوم؟'' شمائلہ انتہائی معصومیت سے بولی۔

''میں نے تو کسی کو یہاں آنے کا نہیں بتایا۔ نہ کسی کو ہوٹل کا نمبر دیا۔ میرے پاس تو کوئی ٹیلیفون نمبر ہے ہی نہیں۔''

''سر وہ ہولڈ کیا ہوا ہے فون!'' چوکیدار پھر اندر آ کے بولا اور شاہ جی اسے دیکھتے ہی غصے میں آ گئے۔ ''اس سے پیشتر کہ یہ بندہ تیسری دفعہ بلانے آئے تم سن آؤ فون۔ ورنہ اس کی میں اچھی طرح خبر لوں گا۔'' شاہ جی اسے گھورنے لگے کیونکہ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی شمائلہ کو شاہ جی کی بیٹی کہا تھا اور یہ سن کر شاہ جی کے اندر ایک احساس کمتری سا پیدا ہو گیا تھا۔

''اوئے ادھر آ۔'' چوکیدار جانے لگا تو شاہ جی نے اسے پکارا۔

''کلائی پکڑے گا میری۔'' شاہ جی نے کلائی آگے میز پر کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر میری کیا مجال۔'' چوکیدار ذرا سہما سا بولا۔

''نہیں کوشش کر کے دیکھ لے ذرا۔'' شاہ جی اسے چیلنج کرتے ہوئے بولے اور پھر یکدم غصے میں کہنے لگے۔

''اوئے میں تمہیں ٹانگوں سے پکڑ کر گھماؤں گا تو جھیل سیف الملوک کے دوسرے سرے پر پہنچا دوں گا سمجھے۔'' انہوں نے کسی پہلوان کی طرح ہتھیلیاں جھاڑیں۔

''کیا ہو گیا آپ کو...... چھوڑیں بھی۔'' شمائلہ نے اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے کہا اور شاہ جی اپنی جھینپ چھپاتے ہوئے بولے۔ 'تم جاؤ فون دیکھو کس کا ہے۔'' وہ شمائلہ سے بولے اور پھر چوکیدار سے کہنے لگے۔ ''کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے دفعہ ہو جا۔'' اور چوکیدار کندھے دبا کر چپ چاپ باہر نکل گیا اور شاہ جی اپنی باڈی شیشے میں دیکھنے لگے اور شمائلہ کے بارے میں سوچنے لگے۔

شمائلہ ہوٹل کے کاؤنٹر پر فون سننے کے لئے گئی ہوئی تھی۔

''ہیلو......شمائلہ نے پرتجسس انداز میں فون سنا۔کون؟''

''ہیلو شمائلہ میں ہوں زارا۔'' دوسری طرف زارا تھی اور زارا کی آواز میں کسی قدر تھکن اور پریشانی بھی تھی۔ شمائلہ بھی زارا کی آواز سن کر پریشان ہوگئی کہ زارا نے جانے کیسے ہوٹل کا پتہ اور نمبر دریافت کرلیا کیونکہ شمائلہ اور شاہ جی تو کوئی ہفتے بھر سے نکلے ہوئے تھے اور وہ مری، نتھیا گلی، ایوبیہ، ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے ناران پہنچے تھے۔ لہٰذا شمائلہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''زارا جی آپ کہاں ہیں۔ کیسے فون کیا اور یہاں کا پتہ کیسے معلوم ہوا لیکن پہلے یہ بتاؤ خیریت تو ہے ناں۔'' شمائلہ نے سخت پریشانی کے عالم میں پوچھا کیونکہ زاہد بیمار تھا اور شمائلہ کا سارا دھیان زاہد کی طرف لگا ہوا تھا۔

''ہاں ہاں بالکل خیریت ہے تم پریشان نہ ہو۔'' زارا نے شمائلہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اوتھینک گاڈ۔'' شمائلہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر پوچھا۔''اب بتاؤ کیا قصہ ہے اور یہاں تم نے کیسے فون کیا؟''

''یہاں فون کرنے سے پہلے میں نے مری کے خاص خاص ہوٹلوں میں فون کیا اور تم لوگوں کا نام بتایا لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ پھر نتھیا گلی، پتریاٹا میں پوچھا تو پتریاٹا والے نے بتایا کہ اس نام کے دو گیسٹ تھے جو چیک آؤٹ کر گئے۔ پھر مجھے اچانک ٹورازم والوں کا خیال آیا جن کے ساتھ شاہ جی نے پیکیج ڈیل کی تھی انہوں نے ٹریس کرکے مجھے بتایا کہ تم لوگ ناران میں ہو اور یہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔'' زارا نے تفصیل بتائی اور پھر کہنے لگی۔ ''تمہارے فرید بھائی کل سے تمہیں تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔''

''اللہ فرید بھائی کو میری زندگی بھی دے دے۔ لیکن مسئلہ کیا ہے زارا جی۔'' شمائلہ نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

''شمائلہ مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے اور مسئلہ ہو بھی سکتا ہے۔'' زارا نے بات کو قدرے گھما کر کہا۔''پریشان ہونے والی بات نہیں لیکن ویسے ہی میں تمہارے نوٹس میں لانا چاہتی ہوں کہ ذرا چوکس رہو۔'' زارا نے تمہید باندھتے ہوئے کہا اور شمائلہ چوکس تو تھی ہی مزید پریشان بھی ہوگئی۔

''بات کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''بات یہ ہے کہ شمس یہاں آیا تھا۔'' زارا نے جیسے دھماکا کیا۔
''کیا......؟'' وہ چونکی۔ ''کہاں آیا تھا؟''
''لاہور ہمارے گھر۔'' زارا نے بتایا اور پھر کہنے لگی۔ ''وہ تم سے شادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔''
''کیا؟ اس کی یہ مجال۔ زارا جی آپ نے اس کی بکواس سن لی اور اس کو گھر آلے دیا۔'' شمائلہ نے شکایتاً کہا۔
''بکواس کیا سن لی فرید نے اس کے ساتھ وہ کیا ہے کہ اس کی سات پشتیں یاد رکھیں گی۔'' زارا نے کہا اور پھر خبردار کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اس کمینے آدمی کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ کتے کی طرح بو سونگھتا ہوا ادھر ادھر گھوم رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہیں تلاش کرتا ہوا پہاڑوں پر نہ پہنچ جائے چوکس رہنا۔'' زارا نے خبردار کیا اور شمائلہ پریشان ہوگئی۔
''کیا بات ہے چندا۔'' شمائلہ نے جب فون بند کیا تو شاہ جی اس کے پاس آئے اور اسے پریشان دیکھ کر پوچھنے لگے۔ ''کس کا فون تھا؟''
''شاہ جی زارا کا فون تھا۔ شمس ان کے گھر آیا تھا اور دھمکی دے کر گیا ہے۔'' شمائلہ نے فکرمند ہو کر جواب دیا اور شاہ جی بات کو بہت غیر اہم سمجھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ شمائلہ نے شاہ جی کو اپنی تمام کہانی سنا رکھی تھی اور اس کہانی کے اندر شمس کا جتنا کردار تھا وہ بھی بتا دیا تھا اور اس طرح شاہ جی شمس سے غائبانہ طور پر واقف تھے۔
''بس اتنی سی بات پر پریشان ہو۔'' شاہ جی نے بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔
''کبھی تم نے زندہ گاڑ دینا سنا ہے۔''
''جی ہاں سنا ہے۔'' شمائلہ بولی اور پھر شاہ جی نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا۔ ''کبھی کسی کو زندہ گڑتے ہوئے دیکھا ہے۔''
''جی نہیں۔'' شمائلہ نے ترت جواب دیا اور شاہ جی بھی بغیر تامل کے بولے۔ ''میں نے زندہ گاڑے ہیں لوگ۔'' وہ جلدی میں کہہ گئے۔
''جی!'' شمائلہ چونکی اور شاہ جی مہر صداقت ثبت کرتے ہوئے دھیرے سے بولے۔
''جی۔'' اور پھر کہنے لگے۔ 'اگر میرے سامنے آگیا وہ بندہ تو میں اسے ماروں گا

نہیں زندہ گاڑ دوں گا۔" اور پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے کہنے لگے۔ "اور اب یہ ذکر کر کے میرا موڈ خراب نہ کرنا۔ چلو جھیل سیف الملوک کا نظارہ کرنے چلیں۔" اور پھر دونوں جھیل کی طرف چلے گئے۔

جھیل کے کنارے شاہ جی ایک ایسی جگہ جا بیٹھے جہاں وہ آسانی سے اپنے پاؤں صاف ستھرے پانی میں ڈبو سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے جوتے اتار کے پیچھے رکھے۔ پاؤں پانی میں ڈبوئے اور پھر ہاتھ شمائلہ کے پاؤں کی طرف بڑھائے جیسے چھونا چاہتے ہوں۔ شمائلہ جس نے پہلے ہی اپنے پاؤں سمیٹ رکھے تھے مزید سمٹ گئی۔

"سائیں مجھے گنہگار نہ کرو۔" اس نے اپنے پاؤں اور پیچھے ہٹا لئے۔

"نکالو یہ سینڈل۔" شاہ جی نے اس کا پاؤں پکڑ لیا اور پاؤں کو اپنی گود میں رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "ہم میاں بیوی ہیں اور میاں بیوی کے درمیان محبت کے رشتے میں گناہ اور ثواب کا تصور نہیں ہوتا۔ چھونے دو مجھے اپنے ان پھول کی پنکھڑیوں جیسے پاؤں کو اور پھر ہمیں یہاں کون دیکھتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے شمائلہ کے دونوں پاؤں سے سینڈل اتار دیئے اور اس کے پاؤں نیچے پانی میں ڈال دیئے۔

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔" شمائلہ لجائی یہ اس کے نزدیک شاہ کا نیا چہرہ تھا۔

"شرمندہ تو یہ ساری فضا ہو رہی ہے تمہارے حسن کے آگے۔" شاہ جی نے بے ساختہ کہا۔ "یہ مہکتی ہوئی فضائیں، یہ ہوائیں، یہ جھرنوں کا پانی، جھیل کی روانی، آبشار کی گنگناتی جلترنگ ہر چیز اس وقت تمہارے حسن کے سامنے شرمندہ ہے۔" وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے اور اپنے پاؤں کو سائیکل چلانے کے انداز میں چلاتے ہوئے پانی کے قطرے شمائلہ کی طرف اڑانے لگے اور بولے۔ "ذرا پانی میں ڈوبے ہوئے ان پیروں کو دیکھو جیسے سنہری مچھلیاں ڈبکیاں لگا رہی ہوں۔" شمائلہ کو اسکے ان رومانوی لفظوں سے گھن آنے لگی تھی لیکن برداشت کرتی رہی۔

"آپ کچھ زیادہ ہی رومانٹک نہیں ہو رہے ہیں میرے سائیں۔" شمائلہ نے اپنی نفرت چھپاتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں جگہ ایسی ہے۔ موقع ایسا ہے اور پھر تم چیز بھی تو ایسی ہو کہ یہ سنگریزے بھی اس وقت رومانٹک ہو رہے ہوں گے۔ اسی جھیل نے تو سیف الملوک اور بدیع جمال کی رومانوی داستان کو جنم دیا تھا۔" وہ رکے شمائلہ کچھ پوچھنے لگے تو وہ شمائلہ کے بولنے

سے پہلے ہی ایک رومانوی رو میں بولے۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ بدیع جمال تم سے زیادہ حسین ہو گی۔''

''یہ کیا کہتے ہیں آپ میں تو کچھ نہیں سمجھ رہی ہوں۔'' شمائلہ واقعی کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ شاہ جی کی باتوں سے چکرا سی گئی تھی۔

''کچھ مت سمجھو۔ بس اتنا سمجھو کہ تم شہزادی بدیع جمال سے کم نہیں ہو۔'' وہ بہت جذباتی ہو کر بولے اور پھر بولتے چلے گئے۔ ''اور پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ داستان سچی ہے یا فرضی جبکہ تم فرضی نہیں زندہ حقیقت ہو اور یہ جتنی بھی دنیا کی بڑی بڑی رومانوی داستانیں ہیں ناں ان میں سے بیشتر فرضی ہیں بلکہ سب فرضی ہیں اور ان کے ساتھ منسوب ندی نالے اور شہر بھی فرضی ہیں اور ان داستانوں کی شہرت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان چاہنے والوں کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں اور یہ لوگ وجودی قربتوں سے محروم رہ گئے تھے جبکہ تم اور میں ......'' شاہ جی نے فاصلہ کم کرنے کی کوشش کی تو شمائلہ نے ہاتھ بڑھا کر فاصلہ برقرار رکھا اور کہنے لگی۔ ''آپ بات کریں آپ بولتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں دور ہو جاتا ہوں۔'' انہوں نے فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے کہا اور پھر کہنے لگے۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم شہزادی بدیع جمال، ہیر، سوہنی، صاحباں، لیلیٰ اور جولیٹ، سب سے خوبصورت ہو۔''

''بس بس شاہ جی۔'' اب کے شمائلہ نے شاہ جی کے ہونٹوں پر اپنی نرم و نازک مخروطی انگلیاں رکھیں اور بولی۔ ''اتنی تعریف نہ کریں میں خوشی سے مر جاؤں گی۔''

''مریں تمہارے دشمن ...... او شالو مرنے کا نام نہ لو۔'' وہ جذباتی ہو گئے۔ ''آؤ آج سارے غم بھول کر خوشی کی جھیل میں ڈوب جائیں۔'' وہ سچ مچ شمائلہ کو لے کر جھیل میں اتر گئے اور پھر ٹھنڈے پانی کی وجہ سے جلد ہی باہر نکل آئے اور ایک سوکھے ہوئے پتھر پر بیٹھ کے فرحت بخش دھوپ اور معطر ہوا سے اپنے نم آلود کپڑے سکھانے لگے۔

''شاہ جی آپ کے ہاتھ تو خوبصورت تھے ہی لیکن ان یاقوتی انگوٹھیوں نے انہیں اور پروقار بنا دیا ہے۔'' شمائلہ نے شاہ جی کا انگوٹھیوں بھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت جذباتی انداز میں اپنے تصنع کو چھپاتے ہوئے کہا۔ وہ ان کا دل جیتنا چاہتی تھی۔

''سچ کہتی ہو؟'' شاہ جی نے پوچھا۔

''کیا میں نے آپ سے کبھی جھوٹ بولا ہے؟'' شمائلہ نے جواب دیا۔

''تو پھر میں دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی ہوں اور یہ میرے ہاتھ خوبصورت

ں بلکہ تمہارے مرمریں ہاتھوں کے بیچ آ کر خوبصورت ہو گئے ہیں۔''

''میرے سونڑے شاہ جی۔'' کچھ لمحے توقف کے بعد شمائلہ نے گنگناتی ہوئی آواز
ں آہستہ سے پکارا اور شاہ جی کو یوں لگا جیسے ستار کا ایک تار ان کے کان میں گونج گیا ہو۔
ر کے رس کی سی میٹھی گونج۔

''جی۔'' وہ میٹھے دھیمے لہجے میں بولے۔

''کوئی فرمائش کروں۔'' شمائلہ ان کے ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

''حکم میری شاہزادی۔'' وہ بچھ سے گئے۔

''عرض ہے۔'' وہ نہایت معصومیت اور پیار سے بولی۔

''تم کہو تو سہی تارے نہیں توڑ کے لا سکتا اور جو حکم کرو۔''

''یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ جب کہو گی میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔'' شمائلہ نے اپنے
ے میں بہت مٹھاس اور پیار پیدا کیا لیکن پھر بھی ڈر ڈر کے بولی کہ کہیں شاہ جی اس بات
وڈ آف نہ کر لیں۔''آپ نے وعدہ کیا تھا کہ......''

''یاد ہے میری شہزادی۔'' شاہ جی پیار بھرے لہجے میں بولے۔

''تو پھر اب مجھے چھوڑ دو نا شاہ جی۔'' شمائلہ جرأت کر کے بول ہی گئی۔''مجھے
ق......''

''کیا مجھ سے بیزار ہو گئی ہو۔'' شاہ جی نے برا منائے بغیر استفسار کیا۔''نہیں نہیں
ں بات نہیں ہے۔'' وہ فوراً بات کی نفی کرتے ہوئے بولی اور پھر وضاحت کرتے ہوئے
نے لگی۔''دراصل آپ کو تو پتہ ہی ہے نا میں نے زاہد کے پاس واپس جانے کے لئے
پ سے شادی کی تھی۔'' اب ذرا ہمت کر کے وہ کھل کر بولی۔''آپ نے کہا تھا کہ جب
و گی تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

''چھوڑ دوں گا میری جان چھوڑ دوں گا۔'' وہ چھوڑنے کی بجائے پکڑتے ہوئے
لے اور گلا کھنکار کر شمائلہ کے کندھے پر سر رکھا اور پختہ سروں کے ساتھ معروف فلمی گیت
نے لگے۔''ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں۔'' اور پھر یوں لگا جیسے شاہ جی
تے گاتے خود ہی ایک نشے کی سی کیفیت میں کھو گئے ہوں۔ انہیں محمد رفیع کا گایا ہوا یہ گانا
ا یاد تھا اور کسی بھی جگہ سر تان کی کوئی غلطی کئے بغیر ڈوبی ہوئی آواز میں شمائلہ کے
دھے کا سہارا لے کر گاتے رہے۔ شمائلہ کو شاہ جی کی آواز کا لوچ، آواز کی گھمبیرتا بہت
ی لگی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ گانا شاہ جی نہیں گا رہے ہیں بلکہ شمائلہ زاہد کے

سرہانے بیٹھی ہے زاہد کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہو اور جیسے وہ کوچ کی تیاری میں ہوا
شمائلہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر رو بھی رہی ہو اور گا بھی رہی ہو کہ

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں......

وہ گانا سنتے سنتے خود گانے لگی اور جیسے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ زاہد کے سرہا۔
بیٹھی اپنی نازک نازک مخروطی انگلیوں کے ساتھ بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔

''تمہارے بال کتنے الجھ گئے ہیں میں کسی دن یونہی بیڈ پہ لیٹے لیٹے شیمپو کروں گی
پتہ ہے وہ ماں جی تھی ناں لاہور والی ان کے بال بھی اسی طرح الجھے رہتے تھے جب م
گئی ناں تو ان کے بال کسی شیمپو کی شیشی کا اشتہار بن گئے تھے۔ نرم و نازک ملائم چمکدا
تمہارے بال بھی میں ٹھیک کر دوں گی بہت الجھ گئے ہیں۔''

زاہد زہر خند طریقے سے اس کے خواب میں ہی ہنسا اور کہنے لگا۔ ''جب زندگی
الجھ گئی ہے تو بالوں کے الجھاؤ کی کس کو فکر۔''

''مجھے فکر ہے ناں۔'' شمائلہ خواب ہی میں بولی۔

''لیکن میں اب آ گئی ہوں تو یہ سب ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اس نے دہرایا۔ ''نر
و نازک ملائم چمکدار......''

تم جس کی زندگی میں ہوگی اس کی زندگی بلاشبہ نرم و نازک، ملائم، روشن، چمکدا
اور قابل رشک ہوگی شمائلہ......'' زاہد جواب دیتے ہوئے آبدیدہ ہو گیا اور شمائلہ بھ
آبدیدہ ہوگئی جیسے اس کا سہانا خواب بھی مایوسی کی اوس میں ڈوب گیا ہو۔ کوئی اسے پکا
کے خواب سے بیدار کر رہا تھا۔

''شمالو...... شمالو...... شمالو۔'' دور سے آتی ہوئی آواز جب اس کے کانوں کے
نزدیک آئی تو اسے لگا جیسے اس کے کان میں کوئی مچھر بھنبھنا رہا ہو۔ شاہ جی کے ہونٹ اس
کے کان کی لو کو چھو رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر اس نے آنکھ کھولی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہ
کہ جھیل کے کنارے کا محل وقوع بدلا ہوا تھا جب شاہ جی اس کے کندھے پر سر رکھ کے
بہت میٹھے سروں میں ''ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر'' گا رہے تھے تو وہ کوئی اور مقام تھا اور اب و
جھیل کے کنارے سے ذرا ہٹ کر ایک مختلف جگہ پر لیٹی ہوئی تھی۔ شاہ جی کے کندھے کی
چادر اس کے نیچے بچھی ہوئی تھی اور شاہ جی کی واسکٹ تکیے کی شکل میں اس کے سر کے نیچ
تھی۔

''یہ کہاں آ گئی ہوں میں۔'' وہ ایکدم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''تم بتاؤ کہاں ہو اور کہاں تھیں پہلے۔'' شاہ جی نے بہت پیار سے اسے دیکھتے اور اس کے الجھے ہوئے بالوں کی لٹ کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں جھیل کے کنارے تھی۔ آپ کا سر میرے کندھے پر تھا آپ گا رہے تھے اور میرے کان میں آپ کے مدھر سروں کے ساتھ جھرنے کی ترنگ بھی گونج رہی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ پتہ نہیں۔'' شمائلہ بہت معصومیت اور بے خبری کے عالم میں تھی۔

''اس کے بعد کیا ہوا میں بتاتا ہوں۔'' شاہ جی بہت پیار بھرے لہجے میں بولے۔ 'اس کے بعد یہ ہوا کہ سر تو میں نے تمہارے کندھے پر رکھا تھا کہ گاتے گاتے سو جاؤں لیکن سو تم گئیں۔ میں نے تمہارا سر نیچے زمین پر آہستگی سے رکھا تو دیکھا نیچے پتھر تھے اور جب تمہیں پتھروں پر سویا دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ پتھر مجھے چبھ رہے ہوں۔'' شاہ جی بولتے بولتے بہت جذباتی ہو گئے تھے اور شمائلہ حیرت سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ شاہ جی بولتے رہے۔ ''اور پھر میں نے آہستگی سے تمہیں اٹھایا اور یہاں ہریالی کے بیچ چھاؤں میں سلا دیا۔''

''ارے۔'' وہ چونکی۔

''کیا میں اتنی بے خبر سو رہی تھی۔'' شمائلہ نے حیرت سے پوچھا۔

''جتنا تم سوچ سکتی ہو اس سے بھی زیادہ بے خبر اور میں تمہارے پاس بیٹھا تمہیں دیکھتا رہا اور دیکھتا رہ گیا مجھے یوں لگ رہا تھا کوئی جل پری پانی سے نکل کر خشکی میں آ کے سو رہی ہے۔''

''وہ دراصل ......'' شمائلہ کچھ شرمائی کچھ پریشان ہوئی اور جواز پیش کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''دراصل میں رات جاگی جو ہوں۔''

''ہاں ہاں یہ بات تو ہے۔'' شاہ جی بولے۔ ''آج رات تم سو جانا۔'' انہوں نے ذرا قدرے توقف کیا اور پھر کہنے لگے۔ ''میں نے آج تمہاری دن کی نیند سے فائدہ اٹھایا۔''

''جی؟'' وہ چونکی۔

''ہاں!'' شاہ جی معنی خیز انداز میں ہنسے اور پھر پاس ہی پڑے ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ ''وہ دیکھو۔''

شمائلہ نے نظریں گھما کر پتھر کی طرف دیکھا تو پتھر پر ''ش ش'' کے دو حروف کندا

دکھائی دیئے۔
''ش ش یہ کیا؟'' شمائلہ مزید چونکی۔
''جب تم سو رہی تھیں تو میں ایک نوکیلے پتھر سے ''ش ش'' کے دو حروف کندا کر رہا تھا۔'' وہ شمائلہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے معنی خیز انداز میں بولے۔
''لیکن ......، شمائلہ کنفیوژ ہو گئی تھی۔
''لیکن کچھ نہیں۔'' انہوں نے شمائلہ کی بات کاٹی اور ہاتھ تھام کر کہنے لگے۔''یہ دو حروف شین شین ہماری محبت کی یادگار ہیں یعنی شمائلہ شاہ۔'' شمائلہ شاہ جی کی اس بات پر دم بخود ہو کر حیرت زدہ انداز میں دیکھنے لگی۔
''حیران کیوں ہو رہی ہو شین سے شمائلہ اور شین سے شاہ۔ جب ہم نہیں ہوں گے تو شاید ہماری محبت کی داستان بھی اس جھیل کے حوالے سے منسوب ہو جائے گی۔''
''آپ کی عقل گھاس کھا گئی ہے شاہ جی۔'' شمائلہ اپنے غصے پر کنٹرول نہیں کر سکی اور سوچنے لگی کہ یہ شخص اذیت پسند ہی نہیں پاگل بھی ہے۔
''ہر عشق کرنے والے کی عقل گھاس کھا جاتی ہے شالو۔'' وہ شمائلہ کی بات کا برا منائے بغیر بہت جذباتی انداز سے بولے اور شمائلہ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں محبت کی داستان لکھنے سے پہلے آپ یہ بھول گئے ہیں کہ میں نے دوبارہ زاہد سے شادی کرنی ہے۔''
''سہ بارہ کرو۔ مجھے اس سے کیا ...... ہیر کی شادی کھیڑوں سے نہیں ہوئی تھی کیا. لیکن آج ہیر ہیر ہے اور رانجھا رانجھا۔'' وہ بے ساختہ بولے۔
''اف میرے خدایا ...... یہ بڈھا تو سٹھیا گیا ہے۔'' شمائلہ اندر ہی اندر لرز گئی اور اپنے ہوش و حواس قابو کر کے بہت سنجیدہ اور جواب طلب لہجے میں بولی۔''شاہ جی آپ مجھے صاف صاف بتا دیں کہ آپ مجھے کب چھوڑ رہے ہیں۔''
''ابھی نہیں۔'' شاہ جی بھی سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔''اور جب تک میں اجازت نہ دوں آئندہ اس موضوع پر بات نہ کرنا۔'' ایسا لگتا تھا وہ جلال میں آ رہے ہیں ...... شمائلہ سمٹ سی گئی۔
''اور اٹھو اب چلو، ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں کہیں تمہیں سردی نہ لگ جائے۔'' انہوں نے شمائلہ کا ہاتھ تھاما اور شمائلہ چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے ہوٹل کی طرف چل پڑی کمرے کے جہنم میں۔

اس دن اچانک فرید اور زارا کے گھر کے سامنے جیپ رکی تو دونوں میاں بیوی گھر
تھے۔ زارا نے اندر سے جھانکا تو خوشی سے اچھل گئی فرید کو بے اختیار پکارا۔ ''فرید باہر
دیکھو کون آیا ہے؟'' اور پھر زارا نے لپک کر بیرونی گیٹ کھول دیا۔ جیپ کے اندر
نے کی جگہ نہیں تھی باہر ہی کھڑی رہی اور شاہ جی اور شائلہ جیپ میں سے نکلے۔

''صبر صبر سنبھل کے۔'' شاہ جی نے شائلہ کا ہاتھ تھامنا چاہا لیکن شائلہ
تک جیپ سے اتر چکی تھی۔

''بھئی لو تمہارا میکہ آ گیا ہے خوش ہو جاؤ۔'' شاہ جی نے کہا۔

شائلہ بے اختیار زارا کے گلے لگ گئی اتنے میں فرید الدین بھی باہر آ گیا۔ وہ شاہ
کو سلام کر کے بہت مؤدبانہ انداز سے ملا اور پھر سب لوگ بہت خوش خوش اندر چلے
گئے۔

''بھئی یہ اپنوں سے ملنے کے لئے سخت پریشان تھیں۔ کہنے لگی میکہ بہت یاد آتا
ہے۔'' اندر جب سب لوگ دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو شاہ صاحب نے بات کا
آغاز کیا۔ ''میں حیران ہوا میں نے کہا بھئی فرید صاحب نے تو مجھے بتایا تھا کہ تمہارے
ماں باپ نہیں ہیں۔ اس پر یہ کہنے لگی ماں باپ نہیں ہیں لیکن بھائی اور بھابھی تو ہیں۔ فرید بھائی
اور زارا ہی تو میرا میکہ ہے۔ میں نے کہا بھئی کمال ہے محبت ہو تو ایسی۔ آج تو اپنے بھی
اس طرح ایک دوسرے کو نہیں چاہتے۔'' شاہ جی بولے۔

''شاہ جی یہ آپ کو کیسے خیال ہوا کہ ہم اس کے اپنے نہیں ہیں۔'' فرید نے کہا۔

''مسٹیک ...... بھئی مسٹیک ہو گئی۔'' شاہ جی فوراً بولے۔ ''اسی لئے تو میں نے صبح ہی
کہا کہ چلو میکے بلکہ دو تین دن وہاں رہ جاؤ تا کہ تمہارا دل بہل جائے۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا سر۔'' فرید نے دل سے کہا اور شاہ جی ترت بولے۔
''بھئی ہم تو غلامی پر یقین نہیں رکھتے تھے لیکن تمہاری بہن نے ہمیں غلام بنا دیا ہے۔''

''آپ کا بہت بہت ممنون ہوں شاہ جی کہ آپ میری بہن کا اس قدر خیال رکھتے
ہیں۔'' فرید نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ کل ......''

''ہش ش ش۔'' شاہ جی فرید کی بات روکتے ہوئے بولے اور معنی خیز انداز میں
کہنے لگے۔ ''کل کی بات نہ کرو فرید جی زندگی جو ہے وہ صرف آج ہے۔ نہ گزری ہوئی کل
کا نام زندگی ہے اور نہ آنے والی کل کا نام زندگی ہے۔ بس آج جو ہے نا آج اس آج کو

پاکستان ورچوئل لائبریری

اچھی طرح گزارو۔ کل کس نے دیکھی۔'' یہ کہہ کر شاہ جی نے جلال کی سی کیفیت میں ہاتھ بلند کیا۔ جس کا مطلب تھا اب آگے کچھ نہیں بولنا۔ وہ سر جھکا کے کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے اور دوسروں کو بھی کھانے پر توجہ دینے کا اشارہ کیا۔ کھانا کھا چکے تو فرید نے شاہ جی سے کہا۔ ''شاہ جی بہت اچھا ہوا آپ آ گئے آج ورنہ ہم کل آپ کی طرف آنے والے تھے۔''

''زہے نصیب مجھے معلوم ہوتا تو میں ایک دن اور نہ آتا کل آپ سے ڈھوک میں ملاقات ہو جاتی۔'' شاہ جی نے کسی قدر تاسف سے کہا۔ ''آج کل پھل بھی بہت لگا ہے کھا کر خوش ہوتے۔''

''نصیب میں ہوا تو پھل بھی کھا لیں گے۔ اصل میں آپ سے ملاقات مقصود تھی۔ ہم لوگ ایک ہفتے بعد یہاں سے لندن اور پھر امریکہ جا رہے ہیں۔'' اب کے زارا نے انکشاف کیا۔

''کیا؟'' شائلہ چونکی کیونکہ یہ خبر شائلہ کے لئے بھی نئی اور حیران کن تھی۔ ''یہ اچانک......''

''اچانک ہی ہو گیا ہے۔'' زارا نے کہا اور شاہ جی بھی دنگ رہ گئے۔

''قصہ کیا ہے؟'' شاہ جی نے متجسس ہو کے پوچھا۔

''بتاؤ نا فرید۔'' زارا نے فرید کی طرف دیکھا اور پھر فرید نے تفصیل بتائی کہ اس نے لاٹری کا ایک ٹکٹ لے لیا تھا جو اکثر و بیشتر وہ لیتا رہتا ہے۔ اس دفعہ اچانک اس ٹکٹ پر پوری دنیا کے ہوائی سفر کی لاٹری نکل آئی ہے۔ اکیلا وہ جانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا تھوڑا کم خرچ کیا اور زارا کے ٹکٹ کا بندوبست بھی کر لیا اور اب دونوں میاں بیوی اکٹھے جا رہے ہیں اور دونوں کو خوشی اس بات کی زیادہ ہے کہ یہ ان کا پہلا غیر ملکی سفر ہے۔ دونوں بہت زیادہ پرجوش تھے لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ شائلہ سن کر اگرچہ خوش بھی ہوئی ہے لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار آ گئے تھے جسے فرید اور زارا دونوں نے محسوس کیا۔

''یقین کرنا شائلہ بہن اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں بھی ساتھ لے جاتا۔'' فرید نے دلجوئی کی۔ ''بلکہ زارا نے تمہارے بغیر جانے سے منع کر دیا تھا۔''

''ہاں شمو میرا بالکل ہی جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اکیلی رہ جاتی پیچھے۔'' زارا نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا کیا زارا باجی۔ ایسے موقع زندگی میں روز روز تھوڑی آتے ہیں۔'' شائلہ

نے خوشی کا اظہار کیا۔
''کوئی بات نہیں اگر زندگی رہی تو شائلہ کو لے کر اگر امریکہ نہیں تو یورپ کے سفر پر تو ضرور جاؤں گا۔'' شاہ جی بہت امید افزا لہجے میں بولے۔
''ان شاء اللہ۔'' فرید نے رسمی تائید کی اور پھر پوچھنے لگا۔''آپ کا پہاڑوں کا دورہ کیسا رہا؟''
''بھئی یہ تو آپ شائلہ سے پوچھیں بہت انجوائے کیا ہے۔ محبت کی داستان رقم کر کے آئے ہیں ہم لوگ۔'' وہ چہکے۔
''کیوں شائلہ۔'' فرید نے شائلہ کی طرف دیکھ کر رسماً پوچھا۔
''جی......'' شائلہ آہستہ سے بولی اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ پھر زارا نے شاہ جی اور شائلہ کا کمرہ ٹھیک کیا کہ رات اچھی بسر ہو لیکن شاہ جی سہ پہر کا قیلولہ کر کے ہی کمرے سے باہر نکل آئے اور واپسی کا اعلان کیا۔
''کیوں شاہ جی۔ رات رہ جائیں ناں۔'' فرید نے اصرار کیا۔''ہمارا تو خیال تھا آپ رہنے کے لئے آئے ہیں۔''
''بھئی رہنے کے لئے میں نہیں شائلہ آئی ہے اور اب جبکہ آپ اتوار کی شام کو دساور کے لئے روانہ ہو رہے ہیں تو میں اتوار کی صبح کو آ جاؤں گا اور آپ دونوں میاں بیوی کو ایئرپورٹ پر الوداع کہہ کر شام کو ہم دونوں میاں بیوی اپنے قصبے میں چلے جائیں گے۔'' شاہ جی نے ایک لمبا جواب دیا تو زارا نے بھی اصرار کرتے ہوئے کہا۔''آپ صبح چلے جاتے تو اچھا تھا۔''
''بھئی نہیں ابھی جانے دو مجھے۔ ویسے بھی مجھے سسرال میں رہنے کی عادت نہیں۔'' وہ ازراہ مذاق بولے اور اس سے پیشتر کہ زارا مزید اصرار کرتی شائلہ نے چپکے سے زارا کا ہاتھ دبا دیا کہ مت روکو اور زارا نے چپکے سے فرید کو آنکھ کا اشارہ کیا جانے دو۔
''میں یہاں سکون کا سانس لینے کے لئے آئی ہوں اور آپ لوگ یہاں بھی اسے روک رہے ہیں۔'' جب شاہ جی کی جیپ روانہ ہو گئی تو شائلہ نے انتہائی تھکی ہوئی سانس لے کر کہا۔
''کیا بات ہے شائلہ۔'' فرید نے ازراہ محبت پوچھا۔
''کچھ نہیں بھائی جان بہت اصرار کر کے میں نے اسے راضی کیا تھا کہ وہ مجھے چند روز یہاں چھوڑ جائے اور آپ بھی اب جا رہے ہیں۔'' وہ خوشی اور غم دونوں کیفیتوں کی

وجہ سے آبدیدہ ہو گئی تھی خوشی اسے اس بات کی تھی کہ فرید اور زارا یورپ کے سفر پر جا رہے تھے اور غم یہ تھا کہ اس کے غمخوار جا رہے ہیں۔

''پریشانی کی کیا بات ہے شائلہ؟ ہم کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہے ہیں۔ بس ایک مہینہ۔'' فرید نے تسلی دی۔

''ہو سکتا ہے ایک مہینے سے پہلے ہی لوٹ آئیں۔'' فرید نے ڈھارس دی۔

''اور کیا۔'' زارا تائید کرتے ہوئے بولی۔

''اب تم آرام کرو۔ تھکی ہوئی ہو۔ کل جب فریش ہو گی تو خوب باتیں ہوں گی۔''

رات جب کھانا کھا چکے تو فرید نے بہت پیار کے ساتھ شائلہ سے کہا اور زارا شائلہ کے ساتھ اس کے کمرے میں ساتھ لے گئی۔

''کپڑے بدل لو۔ لو یہ میری نائٹی پہن لو۔'' شائلہ جلدی میں غالباً اپنے کپڑے ٹھیک سے ساتھ نہیں لائی تھی تو زارا نے اسے شب خوابی کا لباس دیا اور جب شائلہ نے کپڑے تبدیل کیے تو زارا کو اچانک شائلہ کے بدن پر پڑے ہوئے نیل کے نشان نظر آئے۔

''اوئی میں مر گئی۔ یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں جان۔'' زارا شائلہ کا زخمی بدن دیکھ کر لرز گئی۔ ''یہ کیا ہوا شائلہ جی۔'' زارا رندھی ہوئی آواز میں چیخی۔

''کچھ نہیں زارا جی کچھ نہیں۔'' شائلہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی زارا کے گلے لگ گئی اور اتنا روئی کہ زارا کا لباس اس کے آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

''کچھ بتاؤ گی نہیں۔'' زارا نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' شائلہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی۔

''اگر کچھ بتا دیا تو وہ بہت نقصان پہنچائے گا۔ میں ایک اور راکشس کے پاس پھنس گئی ہوں زارا۔''

''چپ میری جان چپ۔'' زارا نے اسے گلے لگایا اور کہنے لگی۔ ''تم مجھے سب کچھ بتاؤ۔ فرید اسے چھوڑے گا نہیں۔''

''نہیں نہیں زارا جی۔'' شائلہ سہم گئی اور بولی۔

''تم یا فرید بھائی اسے کچھ نہیں کہو گے۔ اس نے کہا ہے اگر میں نے کچھ بتایا تو نتیجہ ٹھیک نہیں نکلے گا۔ اس نے خطرناک دھمکی دی ہے۔''

''میں ابھی فرید سے بات کرتی ہوں۔'' زارا غصے سے چراغ پا ہو کر بولی اور اٹھ

کھڑی ہوگئی۔اس کا خون کھولنے لگا۔
"نہیں زارا جی خدا کے لئے نہیں۔" شمائلہ نے زارا کا پلو کھینچ کر اسے دوبارہ بٹھا
اور آنسو پونچھ کر تحمل سے کہنے لگی۔"شرط پوری ہوگئی اب میری جان اس سے چھڑا
ا۔"
"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں تو جب چاہو گی چھٹکارا مل جائے گا۔" زارا نے اطمینان
ا۔
"نہیں زارا جی بات اتنی آسان نہیں ہے۔ وہ مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں۔" شمائلہ
مایوسی سے کہا۔
"کیسے نہیں چھوڑے گا۔" جب فرید کو پتہ چلا تو وہ بم کی طرح پھٹ پڑا اور کہنے
۔"میں نے اس کو پچاس ہزار روپے دیئے ہیں شادی کرنے کے...... اور اس نے طلاق
وعدہ کیا ہے۔"
"کیا؟" شمائلہ چونک گئی۔"بھائی جان آپ نے اسے پیسے دیئے ہیں۔"
"جی ہاں۔ پورے پچاس ہزار اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جب مطالبہ
یں گے وہ طلاق دے دے گا۔" فرید اپنی بات پر زور دے کر بولا۔
"یہ کیا کیا آپ نے بھائی جان اسے آپ نے پیسے کیوں دیئے۔" شمائلہ حیرت
ہوکر بولی۔
"اس کا دھندا یہی ہے۔ وہ پیسے لیتا ہے اور حسب وعدہ بیوی کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسی
ے وہ لوگ جو طلاق کے بعد پچھتاتے ہیں اور دوبارہ آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں وہ
ہ سے یا اسی قبیل کے ملتے جلتے لوگوں سے سمجھوتہ کرکے شادی کر لیتے ہیں کیونکہ یہ
رے کے مطابق بروقت طلاق دے دیتے ہیں۔ اب تم دوسری ہی کہانی سنا رہی ہو۔"
ید بھائی نے پریشان ہوکر کہا۔
"مجھے تو اس نے منع کر دیا ہے بھائی جان۔" شمائلہ مایوسی سے بولی۔
"تم نے طلاق مانگی ہی کیوں ایسا کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے کہنا چاہئے تھا۔
خود اس سے بات کرتا۔" فرید نے کہا۔
"بس غلطی ہوگئی ...... میں کچھ زیادہ ہی عجلت میں تھی۔ زاہد شدید بیمار ہے۔ بچے
لوم نہیں کس حال میں ہوں گے۔ رہ رہ کے یاد آرہے تھے میں تقاضا کر بیٹھی۔" شمائلہ
امت اور تاسف سے بولی۔

''بہر حال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ...... شاہ اتوار کو آ رہا ہے میں خود ا
ے بات کروں گا۔'' فرید نے شمائلہ کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ایسی کی تیسی ا
کے بڑے بھی انکار نہیں کر سکتے۔''

''بھائی جان آپ فی الحال اس کے ساتھ سختی سے بات نہ کیجئے گا۔ وہ مختلف موڈ
آدمی ہے کوئی بات اسے اچھی نہ لگی تو بھگتنا مجھے پڑے گا۔ کوئی دھمکی وغیرہ بھی نہ د
اسے۔'' شمائلہ مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

''تم فکر نہ کرو میں اطمینان کے ساتھ اس سے بات کروں گا۔'' فرید نے شمائلہ
تسلی دی۔

''ارے فرید میاں کیوں پریشان ہوتے ہو آپ ......'' جب اتوار کی صبح صبح ش
صاحب گاؤں سے لاہور فرید اور زارا کو الوداع کہنے کے لئے پہنچے تو فرید نے شمائلہ
چھٹکارا دینے کا مطالبہ کیا تو شاہ صاحب نے نہایت ٹھنڈا دھیما لہجہ اختیار کرتے ہو۔
جواب دیا۔ ''ارے فرید میاں کیوں پریشان ہوتے ہو آپ ...... ارے آپ کے لئے
میری جان بھی حاضر ہے، جب آپ حکم کرو گے میں یہ جان آپ کی خدمت میں پیش
دوں گا۔'' وہ انتہائی ڈرامائی طریقے سے بجھ جانے کے انداز میں بولے اور فرید۔
اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے عرضی ڈال دی ہے فیصلہ آپ کے ہاتھ م
ہے کب فیصلہ کرو گے آپ؟''

''جب آپ چاہو گے ......'' شاہ صاحب بہت اطمینان سے بولے۔ ''آج
آپ لوگ جا رہے ہو۔ خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ ...... جب واپس آ جاؤ گے تو دونو
بھائی بیٹھ جائیں گے دومنٹ میں فیصلہ ہو جائے گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ شاہ صاحب۔ آپ واقعی ایک نوبل آدمی ہیں۔'' فر
نے مصلحتاً خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''من آنم کہ من دانم۔ زیادہ تعریف کر کے گناہ نہ کماؤ فرید میاں۔'' وہ نہایت
انکساری سے بولے اور شمائلہ جو قریب ہی کھڑی شاہ صاحب کی گفتگو سن رہی تھی اس کے
لئے شاہ صاحب کا یہ رخ زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ اس نے بہت چپکے سے زارا کے کا
میں کہا۔ ''زارا جی خدا کرے یہ اپنی بات پر قائم رہے کیونکہ اس کے ایک سو منہ ہیں۔
جب چاہتا ہے ایک چہرہ اتار کے دوسرا چہرہ چڑھا لیتا ہے۔''

''اللہ کرے یہ اپنے لفظوں پر قائم رہے۔'' زارا نے دعا دی اور پھر شام کو زارا اور
کا جہاز ٹیک آف کر گیا۔ شمائلہ شاہ صاحب کے ساتھ جیپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔
نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور ہچکیوں کو روکا ہوا تھا اور اس کے سارے دکھ درد ان ہچکیوں
سمٹے ہوئے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گھر نہیں کسی جہنم میں جا رہی ہے اور اس
کے دروازے کی کنجی فرید بھائی کے پاس ہے جن کا جہاز اس وقت آسمان میں اڑ رہا

''گیٹ آؤٹ آف ہیئر۔'' اس دن عابد رخسانہ کے اوپر بہت زور سے چیخے اور
نہ کا شوہر اس دن بھی عابد کے گھر کے اندر نہیں آیا تھا ورنہ شاید وہ عابد کی طرف سے
یوی سے کی گئی بدتمیزی برداشت نہ کر پاتا اور پھر نتیجہ اور بھی خراب ہو جاتا۔ ہوا یوں
خسانہ کے شوہر منصور کی چھٹی ختم ہو چکی تھی اور وہ پاکستان سے فیکس کر کے دو بار توسیع
چکا تھا اور ڈیپارٹمنٹ نے اس کی رخصت میں مزید توسیع کرنے سے منع کر دیا تھا۔
میں اس کی جاب جا سکتی تھی اور وہ سرکاری ملازمت کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ رخسانہ کی
سے بھی پرائیویٹ نوکری تھی جو ختم ہو چکی تھی اور اسے زیادہ فکر بھی نہیں تھی کہ واپس
جا کر اپنے تجربے کی بنیاد پر آسانی سے دوسری ملازمت کر سکتی تھی اور نہ بھی حاصل
تو اسے اطمینان تھا کہ ایک ایسے ملک میں رہتی ہے جو ایک ولفیئر اسٹیٹ ہے جو اپنے
وزگاروں، بیماروں، نحیف و نزاروں اور بوڑھوں کی کفالت کا ذمہ دار ہے لیکن
نہ کا شوہر اپنی سرکاری ملازمت داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا اس لئے جونہی عابد بیرون ملک
اپس آئے تو منصور نے اپنی بیوی رخسانہ سے کہا کہ وہ زاہد صاحب کی نصیحت اور
پر عمل کرتے ہوئے زاہد کے بچے عابد سے مانگ لے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لندن
ائیں لیکن یہ مطالبہ رخسانہ نے غالباً قبل از وقت کر دیا تھا کیونکہ زاہد بہرحال زندہ تھا
ں نے یہ نہیں کہا تھا کہ رخسانہ اس کی زندگی میں ہی بچوں کو اپنا لے اور اگر زاہد زندہ
وتا اور زاہد کے بچے عابد کے گھر میں کتنے ہی ذلیل و خوار اور نظر انداز کیوں نہ ہو
وتے عابد کی غیرت کبھی انہیں اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے بھائی کی اولاد کو اٹھا کے
جنبی کے سپرد کر دیتے لیکن رخسانہ کا اپنا مسئلہ تھا کہ اسے واپسی میں جلدی تھی لہٰذا وہ
نگنے کے لئے عابد کے گھر پہنچ گئی اور جب اس نے حرف مدعا بیان کیا تو عابد صاحب
پا ہو گئے اور اپنے غصے اور جذبات پر کنٹرول نہ رکھتے ہوئے بہت بدتمیزی کے ساتھ

رخسانہ پر چلانے لگے۔

''یو گیٹ آؤٹ آف ہیئر۔ یہ میرے بچے ہیں۔ ہمارے بچے ہیں۔ کوئی لا
نہیں کہ میں انہیں کسی یتیم خانے کے حوالے کر دوں۔''

''سر میں یہ بچے کسی یتیم خانے میں نہیں لے جا رہی ہوں گھر لے جاؤں گ
سے لگا کے پالوں گی، میری اپنی اولاد نہیں ہے۔ یہی میری اپنی اولاد ہو گی۔''
انکساری سے بولی۔

''اپنی اولاد نہیں ہے تو اپنی اولاد پیدا کرو۔'' اب کے بیگم عابد نے مداخلت
ہوئے توہین آمیز انداز میں کہا اور مزید کہنے لگی۔ ''یہ کونسی کتاب میں لکھا ہے
عورتیں دوسروں کی گود اجاڑ کر اپنی گود آباد کریں۔''

''شٹ اپ......'' اب کے رخسانہ برداشت نہ کر سکی اسے طیش تھا جب وہ
علی اور عینی کے لئے کھلونے لے کر آئی تھی اور بیگم عابد نے اس کے ساتھ توہین آمیز
کیا تھا اور پھر اس کے بچوں نے عینی اور علی کے کھلونے جب توڑ دیئے تو اپنے
ڈانٹنے کی بجائے اس نے عینی اور علی کو برا بھلا کہا تھا پھر اسے اس سلوک کا بھی علم
نے عینی اور علی کے ساتھ روا رکھا ہوا تھا لہٰذا ان سب باتوں نے مل کر رخسانہ کے
بیگم عابد کے لئے ایک نفرت پیدا کر دی تھی اس لئے جب انہوں نے رخسانہ کو بانجھ
کا طعنہ دیا تو وہ برداشت نہ کر سکی اور دانت پیس کر گالی دی۔

بیگم عابد اس گالی کے لئے تیار نہیں تھیں۔ وہ غصے میں تھر تھر کانپنے لگیں
صاحب بھی اپنے گھر کے اندر اپنی بیوی کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکے۔ ان کا
کھول گیا اور غصے سے بے قابو انہوں نے رخسانہ پر ہاتھ اٹھایا اور چلا کر بولے۔

''یو شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ آف مائی ہاؤس۔'' لیکن اس سے پہلے
صاحب کا ہاتھ رخسانہ کے چہرے پر پڑتا کسی نے ان کا ہوا میں لہراتا ہوا ہاتھ بیچ
سے پکڑ لیا۔

''بی ہیو یور سیلف لائیک اے جنٹلمین۔'' یہ رخسانہ کے شوہر منصور کی آواز
اچانک شور سن کر اندر آیا تھا اور اس نے عابد کی کلائی کو اپنے فولادی شکنجے میں جکڑ
عابد پیچھے مڑے تو منصور کو دیکھا جس سے ایک مرتبہ ہسپتال میں ان کے کمرے
رسمی سا تعارف ہو چکا تھا۔ منصور ایک کسرتی بدن والا اور مضبوط آدمی تھا اور عابد
کیا کہ اس کا ہاتھ ایک فولادی گرفت میں ہے۔

''سولائزڈ سوسائٹی میں مرد عورت کے اوپر ہاتھ نہیں اٹھاتا ہے اور خاص کر جب وہ دوسرے کی بیوی ہو......'' منصور نے بہت پُراعتماد انداز میں کہا اور اپنی فولادی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی چھوڑ کر عابد صاحب کی کلائی اپنے پنجے سے آزاد کر دی۔ بیگم عابد غصے میں تھر تھر کانپنے لگیں اور عابد صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطروں کی ایک جھالرسی ابھر آئی۔

''یو پلیز لیو مائی ہاؤس۔'' عابد صاحب نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔''اور آئندہ کبھی یہاں نہیں آنا۔''

''او کے......'' منصور نے رخسانہ کا ہاتھ تھاما اور بولا۔''آ جاؤ......''

اور دونوں میاں بیوی گھر سے باہر نکل گئے۔ زاہد کے دونوں بچے علی اور عینی یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور ڈرے سہمے ہوئے تھے۔

''فکر نہ کرنا بچو، میں پھر آؤں گی۔'' رخسانہ نے جاتے جاتے دونوں کے گال کو آہستہ سے چھوا اور کان میں کہہ کر نکل گئی۔

''تم لوگوں کو ابھی وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میرے مرنے کے د میرے بچوں کو سنبھالنا۔'' جب شام کو رخسانہ اور منصور، زاہد سے ملنے کے لئے گئے تو اہد نے ساری روداد سننے کے بعد کہا۔

''سر ہم لوگ آپ کی موت کا دن نہیں دیکھ رہے، نہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہماری اہش تھی کہ ہم بچوں کو اپنے ساتھ وہاں لے جاتے، انہیں وہیں تعلیم دلاتے اور وہاں کی ریت انہیں مل جاتی۔'' منصور نے کہا۔

''کیونکہ ہم لوگ مزید یہاں نہیں رک سکتے...... کل ہماری فلائیٹ ہے لیکن علی اور ں کی حالت اس گھر کے اندر دیکھی نہیں جاتی۔'' رخسانہ نے دکھ کے ساتھ کہا۔''وہ وہاں ت دکھ میں ہیں۔''

''شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔'' زاہد رو پڑے۔

''آپ حوصلہ رکھیں سر سب ٹھیک ہو جائے گا اور آپ بھی ان شاء اللہ ٹھیک ہو یں گے اور میں جلد لوٹ آؤں گی......'' رخسانہ نے کہا اور جب دونوں میاں بیوی نے لگے تو زاہد نے آہستہ سے پکارا۔

''رخسانہ!''

''جی سر......'' رخسانہ فوراً رکی اور پلٹ کے پاس آئی۔ منصور بھی قریب آ گیا۔

''شمائلہ کا کچھ پتہ چلا ......'' زاہد نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''نہیں سر...... میں اسے نہیں ڈھونڈ سکی۔'' رخسانہ نے مایوسی سے جواب دیا۔
''اینی وے ......'' زاہد نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کے رخسانہ کو دیا اور کہنے لگے۔''یہ میرے ایک وکیل دوست کا کارڈ ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو ان سے مل لینا۔''
''اینی میسج ......؟'' رخسانہ نے تجسس سے پوچھا۔
''وہ سب کچھ بتا دیں گے ......'' زاہد نے جواب دیا اور دونوں میاں بیوی زاہد سے الوداعی ملاقات کر کے چلے گئے۔
اگلے دن ان کی فلائٹ بھی لندن کے لئے ٹیک آف کر گئی۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام وقار عظیم

اس دن عابد صاحب کے گھر میں ایک ٹیلیفون نے ایسی کھلبلی مچا دی کہ جس کا کبھی انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا اور بیگم عابد کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور وہ ایک انجانے خوف سے تھر تھر کانپنے لگی تھیں۔

ہوا یوں کہ عابد صاحب تو پہلے ہی توسیعی ملازمت پر تھے۔ ریٹائرمنٹ کا وقت تو دو سال قبل ہی پورا ہو چکا تھا لہٰذا اب انہیں مزید توسیع نہیں ملی اور وہ ملازمت سے فارغ ہو گئے لیکن انہیں ملازمت چھوڑنے پر ملا بہت کچھ تھا۔ چالیس پچاس لاکھ کے تو بقایا جات تھے جو انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کی بدولت فوراً حاصل کر لئے تھے اس کے علاوہ بہت پیسہ تھا۔ ملازمت کے دوران کچھ اپنے نام سے کچھ بیگم کے نام سے ٹھیک ٹھاک جائیداد بھی بنا لی تھی جس کا کرایہ بھی وصول کر رہے تھے اور لاکھوں کے پلاٹس اور مکان دکانیں فروخت بھی کی تھیں۔

اوپر کی آمدنی کا چرچا تو کم وبیش ہر افسر کے بارے میں ہوتا ہے لیکن عابد صاحب کی اس معاملے میں شہرت مختلف اور اچھی تھی۔ اچھی یوں تھی کہ وہ مستحق آدمی کا کام کسی لالچ اور رشوت کے بغیر کر دیتے تھے اور کبھی کسی سچے اور صحیح آدمی کے کام کے راستے میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتے تھے لیکن جب کوئی موٹی مرغی ان کی چھری کے نیچے آ جاتی اور غلط کام کرانا چاہتی تو پھر عابد صاحب الٹی چھری سے ایسی موٹی مرغی کو ذبح کر دیتے تھے۔ ذاتی طور پر صاف ستھری زندگی گزارنے والے آدمی تھے۔ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ شراب نوشی نہیں کی۔ عورتوں کے چکر میں کبھی نہیں پڑے۔ اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والے اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ پروقار اور پراعتماد زندگی تھی لیکن ایک خامی جو اکثر لوگوں میں ہوتی ہے اور اکثر میں نہیں ہوتی۔ وہ خامی عابد صاحب کے اندر بہت زیادہ تھی اور وہ یہ کہ بیوی کے معاملے میں بہت کمزور دبے ہوئے اور زن مریدی کی آخری سطح کو چھونے والے آدمی تھے۔ اگرچہ دفتر کے اندر زندگی بھر شیر بنے رہے لیکن بیوی کے سامنے زندگی بھر ایک چوہے کی طرح زندگی گزاری اور کبھی بیوی سے کسی معاملے پر اختلاف کرنے کی جرأت

نہیں کر سکے تاہم بیگم عابد نے ہر طرح سے عابد صاحب کی عزت اور وقار کا خیال رکھا
انہیں کبھی کسی معاملے میں بے عزت نہیں ہونے دیا لیکن ہمیشہ ان پر حاوی رہی ہیں۔ا
من مانی کی اور ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کیا اور عابد صاحب نے کبھی یہ جرات نہیں کی کہ
بیگم کے کسی فیصلے سے اختلاف کا سوچ بھی سکتے۔

سو زاہد صاحب کے بچوں کو اپنے گھر لانے کا فیصلہ اگرچہ عابد صاحب کا تھا لیکن
غریبوں مسکینوں اور لاوارثوں کی طرح ایک پسماندہ سے کمرے میں رکھنے کا فیصلہ بیگم عا
کا تھا۔ زاہد کی بیماری کی وجہ سے کافی عرصے تک علی اور عینی کی تعلیم میں تعطل رہا لیکن ا
صورت حال نے جب زاہد کو اسپتال میں بہت پریشان کیا تو عابد صاحب نے دونوں
ایک نئے اور اچھے سکول میں داخل کروا دیا اور ان کے پک اور ڈراپ کے لئے اسکول
بس لگوا دی۔ وہ اچھے کپڑے اور اچھی یونیفارم پہن کے گھر سے باہر نکلتے تھے اور یہ
عابد کی خواہش تھی کہ عینی اور علی گھر سے جب باہر نکلیں تو ٹیپ ٹاپ میں ہوں کیونکہ یہ
کے خاندان اور ان کے شوہر کی عزت کا سوال تھا اور عزت کے اس مسئلے کو وہ بہت ا
طرح سے نبھا رہی تھیں۔ لہٰذا عینی اور علی جب گھر سے باہر نکلتے تھے تو بہت سجتے تھے
دونوں ہر لحاظ سے عابد صاحب کے نومی اور نینا سے بہتر معلوم ہوتے تھے کہ دونوں نینا
نومی سے زیادہ اسمارٹ اور خوبصورت تھے۔

تاہم گھر سے باہر عام تاثر یہی تھا کہ چاروں بچے عابد صاحب کے ہیں اور بیگم
زاہد کی بیماری اور شب و روز کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھے تو وہ بھی
حتمی فیصلہ کرے کہ زاہد کے بچوں کا کیا کرنا ہے۔ کیونکہ عابد صاحب کی ریٹائرمنٹ
بعد بیگم صاحبہ کے معمولات میں بھی کافی تبدیلی آ رہی تھی۔ ایک بات تو سب کی نظر
میں آ گئی تھی کہ عابد صاحب اب ملازمت پر نہیں ہیں انہوں نے اس سلسلے میں عالمی ا
اداروں کے ساتھ کچھ روابط پیدا کرنے شروع کئے تھے جہاں سے انہیں پہلے بھی پیش
کے اشارے مل چکے تھے اور بیگم کے مشورے کے ساتھ وہ باہر چلے جانا چاہتے تھے۔ لیکن
بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ عابد صاحب کے پاس بہت پیسہ ہے اور اس
کی وجہ سے بیگم عابد خاصی سوچ بچار میں تھیں اور فکر مند بھی تھیں۔ انہوں نے کافی پیسہ
کی شکل میں ملک سے باہر بھجوا دیا تھا اور شہر کی بڑی بڑی دکانوں اور شو رومز سے
کے بہت بھاری زیورات خرید کر بینک کے لاکروں میں رکھوا دیئے تھے۔ ایسی پراپرٹی
عابد صاحب یا خود بیگم اور بچوں کے نام پر تھی اس میں سے کچھ فروخت کر دی تھی اور

فروخت کے لئے مختلف پراپرٹی ڈیلرز سے کہہ رکھا تھا جو آجکل بیگم صاحبہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

پھر ادھر کچھ اخبارات میں پکڑ دھکڑ کی خبریں بھی آنے لگیں کہ جنہوں نے اپنی ملازمت کے دوران اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خوب مال کمایا اور ان مال بنانے والوں میں اڑتا اڑتا سا نام عابد صاحب کا بھی اخبار میں آیا۔لیکن عابد صاحب اثر ورسوخ میل ملاپ اور یار باش قسم کے آدمی تھے انہوں نے روشنائی سوکھنے سے پہلے ہی اپنا نام مٹوا دیا اور پھر کوئی نام کوئی تذکرہ نہیں آیا۔لیکن تلوار جب سر پر لٹک جائے تو گرنے کا خطرہ عابد صاحب کم اور بیگم عابد زیادہ محسوس کر رہی تھیں لہٰذا انہوں نے اپنے دونوں بچوں کو پیش بندی کے طور پر امریکہ میں داخلہ دلوا کر اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنی ایک امریکہ میں مقیم بہن کے پاس بھجوایا اور یوں بعد میں خود نقل مکانی کرنے کا راستہ اپنے لئے ہموار کر لیا۔یہ سارے پروگرام بیگم عابد نے ہی بنائے تھے اور عابد صاحب بھی بیگم سے اختلاف کی گنجائش نہیں رکھتے تھے اور ویسے انہیں ایک اندیشہ تو تھا کہ ان کی خفیہ دولت ان کی ظاہری آمدنی سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتی اور اگر ان سے گوشوارے طلب کر لئے گئے اور حساب کتاب پوچھا گیا تو اب وہ کسی ایسی حیثیت میں نہیں ہیں کہ اپنا بچاؤ کر سکیں۔سو عابد صاحب نے بھی بیگم کی ہم خیالی میں اپنا ایک ذہن بنا لیا تھا ہر چند کہ سردست زندگی آرام سے گزر رہی تھی ان کے دونوں بچے امریکہ میں اپنی خالہ کے پاس پہنچ چکے تھے اور علی اور عینی عابد صاحب ہی کے پاس تھے۔اسکول جا رہے تھے اور نہ جاننے والوں کو یہی پتہ تھا کہ عابد صاحب کے اپنے ہی بچے ہیں۔

وہ صبح گھر سے نکل کر تھوڑی دور کوئی تین چار منٹ پیدل چلنے کے بعد مین روڈ پر چلے جاتے جہاں ان کے اسکول کی بس آتی اور اسی پوائنٹ پر اس علاقے کے تین چار بچے اور بھی آجاتے اور سب اسی پوائنٹ سے بس پر بیٹھتے اور اسی پوائنٹ پر بس سے اتر جاتے۔کبھی کبھار علی اور عینی بس کے آنے سے پہلے پوائنٹ پر پہنچ جاتے لیکن بعض اوقات علی اور عینی کو گھر سے نکلنے میں تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو بس والا دو چار منٹ انتظار کرتا اور وقفے وقفے سے ہارن بجا کے اپنی آمد کا اعلان کرتا ہارن کی آواز عابد صاحب کے گھر کے اندر تک سنائی دیتی اور بیگم عابد بچوں کو جلدی نکلنے کے لئے ڈانٹ پلا دیتی اب جب سے ان کے اپنے بچے چلے گئے تھے تو ان کا رویہ علی اور عینی کے ساتھ پہلے کی طرح سخت گیر نہیں رہا تھا اور ڈانٹ ڈپٹ بھی اگر کرتیں تو ماں کی طرح نہ سہی چچی تائی کی طرح ہی کرتی تھیں

سو اس دن بھی صبح صبح عینی اور علی اپنے وقت پر ہی بس کی آمد سے پہلے گھر سے نکل گئے تھے لیکن پانچ دس منٹ کے بعد مین روڈ سے جب بس کے ہارن کی مسلسل آوازیں آنے لگیں تو عابد صاحب اور بیگم عابد بھی ہارن کی طرف متوجہ ہوئے لیکن انہیں معلوم تھا کہ بچے بروقت گھر سے نکل گئے ہیں لہٰذا اب جو بس والا ہارن بجا رہا ہے تو یہ کسی اور گھر کے بچوں کے لئے ہوگا۔ لہٰذا وہ مطمئن ہو گئے لیکن شام کو جب عینی اکیلی واپس آئی تو تائی تایا کو تشویش ہوئی۔

''علی کہاں ہے؟'' عینی کو اکیلا دیکھ کر عابد صاحب نے تشویش سے پوچھا۔

''تایا جی کیا علی گھر نہیں آیا؟'' عینی نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کیا۔

''نہیں تو......! اکٹھے ہی تو آتے ہو تم دونوں۔'' تائی کو تشویش ہوئی اور انہوں نے پوچھا۔

''کچھ پتہ نہیں کہاں چلا گیا؟'' اب عینی کو تشویش ہوئی اور وہ تقریباً رونے کے انداز میں کہنے لگی۔ ''چھٹی کے وقت میں نے اسے بہت ڈھونڈا' وین والے انکل نے بھی تلاش کیا۔ آوازیں دیں۔ پھر وین والے انکل اندر اسکول میں گئے۔ ٹیچر نے بتایا کہ چھٹی کے وقت اندر تھا پھر روز کی طرح چھٹی کے وقت باہر چلا گیا۔''

''اوہ گاڈ۔'' عابد صاحب دہل گئے اور پوچھا۔ ''چھٹی کے بعد کسی لڑکے نے نہیں دیکھا اسے کیا؟''

''معلوم نہیں۔'' عینی رونے لگی۔

''تم رو نہیں۔ وہ آجائے گا۔ شاید کسی دوست کے ساتھ رک گیا ہو۔ میں ابھی اسکول جا کے اچھی طرح دیکھتا ہوں۔'' عابد صاحب نے عینی کو تسلی دی۔ اسے اندر بھیجا اور خود تیار ہو کے جانے لگے تو بیگم نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

''میں اسکول جا رہا ہوں ٹیچرز سے ملوں گا اور پھر تھانے میں رپورٹ لکھواؤں گا۔''

عابد صاحب نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ بیگم فون کے قریب تھی اس نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو۔'' بیگم فون پر بولی۔

''اپنے شوہر کو فون دو۔'' دوسری طرف سے ایک دھیمی لیکن کسی حد تک کرخت مردانہ آواز سنائی دی۔

''کون صاحب ہیں آپ۔'' بیگم فون کرنے والے کے لہجے سے ڈر گئی تھی۔

''فون مسٹر عابد کو دیں۔'' اب کے آواز میں غصہ اور حکم تھا۔

''ہولڈ کریں۔'' بیگم نے کہا۔

''آپ کے لئے فون ہے۔'' بیگم نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کے عابد صاحب سے کہا۔ بیگم خاصی پریشان ہو گئی تھی۔ ''نام نہیں بتایا۔'' بیگم نے کہا اور عابد صاحب بھی پریشان ہو گئے حالانکہ پریشانی کی بات بظاہر نہیں تھی کہ عابد صاحب کے گھر میں ٹیلیفون کالز کا بعض اوقات تانتا بندھ جاتا تھا اور ٹیلیفون کا آنا ایک معمول کی بات تھی لیکن معلوم نہیں ایک پریشان کن سچویشن میں وہ ٹیلیفون کی گھنٹی سن کر ہی پریشان ہو گئے تھے۔

''ہیلو۔'' عابد صاحب نے بیگم کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کہا۔ اسی دوران بیگم نے دوسرے کمرے سے دوسرے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور سننے لگی۔

''مسٹر عابد۔'' دوسری طرف کی آواز تھی۔

''بول رہا ہوں۔'' عابد صاحب نے کہا۔

''لڑکی گھر پہنچ گئی ہے ناں۔'' دوسری طرف سے بولنے والے نے پر رعب آواز میں کنفرمیشن چاہی۔

''کون بول رہے ہیں آپ؟'' عابد صاحب نے غصے میں پوچھا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' دوسری طرف کی آواز میں بھی رعب تھا۔
'ہاں یا ناں میں جواب دو لڑکی گھر پہنچ گئی ہے یا نہیں۔''

''ہاں پہنچ گئی ہے۔'' عابد صاحب کا اب غصہ خوف میں بدل گیا تھا۔ ''لیکن......''
نہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن کچھ نہیں اور بہت کچھ بھی ہے۔'' دوسری طرف کے بندے نے عابد صاحب لی بات کاٹی اور کہنے لگا۔ ''لڑکا ہمارے پاس ہے اور بخیریت ہے۔'' دوسری طرف سے وازآئی اور عابد صاحب سر سے پاؤں تک کانپ گئے۔ انہیں یکلخت سو فیصد یقین ہو گیا لہ علی اغوا ہو چکا ہے۔

''میری بات سنو تم ہو کون اور۔''

''دیکھو بیچ میں مت بولو مجھے پوری بات کرنے دو پھر بولنا۔'' دوسری طرف والا مجھلاہٹ میں بولا۔ ''ہم چاہتے تو لڑکی کو بھی اٹھا لیتے یا صرف لڑکی کو ہی اٹھاتے لیکن یوں کا ہم بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں اس لئے ہم نے آپ ے بیٹے کو اٹھایا ہے۔'' عابد صاحب ٹوٹ پھوٹ سے گئے۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

انہوں نے شکست خوردگی کے عالم میں پوچھا۔

''وہ بھی بتا دیں گے۔'' یرغمالی کہنے لگا۔''اس وقت صرف یہ چاہتا ہوں کہ شور نہ کریں اڑوس پڑوس میں ذکر نہ ہو۔ اسکول میں بچے کو نہ ڈھونڈیں تاکہ پولیس کیس نہ بنے۔ اگر آپ نے پولیس سے رابطہ کیا یا کسی طرح بھی پولیس کو معلوم ہوگیا تو آپ کے اور بچے کے لئے نقصان دہ ہوگا۔''

''لیکن اب تو آپ بتا دیں کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟'' عابد صاحب نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں عاجزی سے کہا۔

''جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ آپ پولیس کے پاس نہیں گئے ہیں تو پھر ہم اپنا منہ کھولیں گے ابھی نہیں۔'' اس نے بات ختم کی اور ٹیلیفون بند کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ کا سارا کچا چٹھا ہمارے پاس موجود ہے اور آپ کی بیگم دوسرے ٹیلیفون پر اس وقت ہماری بات سن رہی ہوں گی' نہ سن رہی ہوں تو انہیں بھی بتا دیں کہ منہ بند رکھیں۔''

''اوہ میرے خدایا۔'' بیگم کا ہاتھ لرزہ منہ سے ہائے نکلی اور ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''ہاں ہا ہا ہا۔'' اغوا کنندہ کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔''چور کے پاؤں کتنے کمزور ہوتے ہیں ہاتھ سے ریسیور چھوٹ جاتا ہے اور منہ سے ہائے نکل جاتی ہے۔''

''بچہ کہاں ہے؟'' عابد صاحب نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''لو بچے سے بات کرلو۔'' اس نے کہا اور غالباً فون علی کے ہاتھ میں دے دیا علی ہچکیاں لیتے ہوئے فون پر بولا۔''تایا ابو تایا ابو یہ لوگ مجھے اٹھا کر لے آئے ہیں۔''

''تم گھبراؤ نہیں بیٹے سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' عابد صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پوچھا۔''تم ہو کہاں؟''

''پھر چکر دینے والی بات کرتے ہو۔'' اغوا کرنے والے نے ریسیور لے لیا اور برہم لہجے میں بولا۔''اس غریب کو کیا معلوم کہ کہاں ہے؟ میں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس تم ویسے ہی کرو جیسا میں نے کہا ہے اور میرے دوسرے ٹیلیفون کا انتظار کرو۔''

''میری بات سنو......'' عابد صاحب نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے اپنے فون کے سی ایل آئی پر دیکھا لیکن فون کے اسکرین پر نمبر نہیں آیا تھا۔

''اف میرا خدایا۔'' وہ بے جان مردے کی طرح صوفے پر دھنس گئے۔ بیگم ان

...موں میں بیٹھ کر خوف سے کانپنے لگی اور عینی ڈری سہمی ہوئی دور کھڑی تھی۔

''آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟'' ماہر نفسیات نے شمس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' شمس نے ترنت جواب دیا۔

''ڈو سم تھنگ۔'' فوراً شمس کی بیماری کی تشخیص کرتے ہوئے بولا۔ ''مطلب یہ ہے ...ر بیکار آدمی یعنی آپ کی طرح کا آدمی جو کچھ نہ کر رہا ہو وہ چور یا مجرم بن جاتا ہے یا پھر ...ر ہو جاتا ہے۔ آپ کی بیکاری نے آپ کے اندر دونوں چیزیں پیدا کر دی ہیں اور آپ ...رجحان جرائم کی طرف بھی ہو گیا ہے اور بیمار بھی ہو گئے ہو یعنی ذہنی بیمار۔''

''سر میں نے نہ تو کوئی جرم کیا ہے اور نہ ہی میں بیمار ہوں۔'' شمس سائیکاٹرسٹ کی ...یص اور تجزیے کی تردید کرتے ہوئے بولا اور ڈاکٹر نے فوراً اسے ٹوکتے ہوئے جواب ...ا۔ ''یہ کیا جرم نہیں ہے کہ دوسرے کی بیوی اور وہ بھی دوست کی بیوی پر تسلط قائم کرنے ...کوشش کی اور اب بھی اس پر مسلط ہونے کے لئے ہر ناجائز حربہ استعمال کرنے کی کوشش ...ہو۔ یہ جرم بھی ہے اور ذہنی بیماری بھی۔''

''ذہنی بیماری ہی کے لئے تو میں بار بار ایک ماہر نفسیات کے پاس آ رہا ہوں...... ...بتائیے کچھ۔''

''حل یہی ہے کہ لفنگا پن چھوڑ کے کچھ کام کرو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''لیکن میں کام نہ کرنے کے باوجود کسی سے بھیک نہیں مانگتا سر۔ پیسہ ہے میرے ...اور بیٹھ کے کھاتا ہوں اور بیٹھ کے کھا سکتا ہوں۔''

''ایسے لوگ جو کوئی کام نہیں کرتے اور بیٹھ کے کھاتے ہیں مہذب سوسائٹی ...پیراسائٹس کہلاتے ہیں اور یہ پیراسائٹس سوسائٹی کے لئے ناسور بن جاتے ہیں۔'' ...کاٹرسٹ نے سخت گیر اور درشت رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور شمس دلبرداشتہ ہو کر ...۔ ''آپ مجھے دل برداشتہ کر دیتے ہیں سر۔''

''دل۔ بر۔ داشتہ......'' ڈاکٹر لفظوں کو الگ الگ کر کے بولا اور ہنسنے لگا۔ ''ہاہاہا ...ہ۔''

''سر ایسا نہیں چلے گا۔ وہ عورت جسے شمائلہ کہتے ہیں میرے دل میں بیٹھ گئی ہے۔'' ...ج ہو کر بولا۔

''اسے اکالو دل سے۔ اور کوئی کام کرو۔ اگر پیسہ بینکوں میں جمع ہے تو اسے کام میں لاؤ تاکہ پیسہ گردش میں آئے اور بزنس میں لگ جاؤ اور مزید پیسہ کماؤ۔ اتنا پیسہ کہ پیسے کی دنیا میں ایک پیسے والے کی حیثیت سے مشہور ہو جاؤ۔''

''پھر؟'' شمس ڈاکٹر کے مشورے پر سوالیہ نشان بن کے بولا۔

''پھر ہو سکتا ہے شمائلہ خود ہی کھنچی ہوئی تمہارے پاس آ جائے۔ پیسے میں بہت کشش ہوتی ہے۔'' سائیکاٹرسٹ نے کہا۔ ''اس طرح بھٹکو گے بھی نہیں اور دل بہلا رہے گا۔ ذہن مصروف رہے گا اور ہاتھ پاؤں کام کریں گے۔ پھر شمائلہ کو حاصل کرنے کا جو تمہارے دماغ میں کلبلا رہا ہے ہو سکتا ہے وہ بھی سویا رہے اور پھر جب کچھ کام دھندا کرنے لگ جاؤ تو پھر میرے پاس آنا۔''

''چلو یہ بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔'' شمس نے ڈاکٹر کا چیلنج قبول کیا کچھ دن اپنے اوپر جبر کر کے اس نے شمائلہ کی یاد کو اپنے من کی تختی سے مٹانے اور کھرچنے کی کوشش کی اور پھر ایک دن بینک سے بڑی رقم نکال کے ایک جاننے والے جوہری کے پاس گیا اور پتھروں کے والے سے کچھ کاروبار کی بات کی۔''

''یہ دیکھیے نیلم' یاقوت' پکھراج اور الماس......'' جوہری ہیرے دکھانے لگا۔

''بس' بس' بس' بس۔'' شمس نے جوہری کو بولتے بولتے ازراہ مذاق روکا۔ ''ارے یعقوب صاحب زندگی بھر نیلم' یاقوت' پکھراج اور الماس وغیرہ کے چکروں میں پھنسا رہا اب پتھر بھی آپ وہی دکھا رہے ہیں۔''

''وہ بھی پتھر تھیں شمس صاحب اور یہ بھی مورتیاں ہیں یا پھر دونوں پتھر ہیں'' جوہری راز داری کے انداز میں بولا۔ ''اس کاروبار میں تو پتھروں سے گزرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے سر۔ زندگی بھر انہیں پتھروں پر چلتے رہے ہیں اور چل لیں گے۔ سنا ہے یہی کہکشاں کی طرف لے جاتے ہیں۔'' شمس بھی ذو معنی انداز میں بولا۔

''بر و بر بر و بر۔'' جوہری نے جواب دیا اور پھر شمس من میں معلوم نہیں کیا سودا لیے انہیں پتھروں کے راستے پر چل پڑا اور پتھروں کا سوداگر بن گیا۔

❁

عابد صاحب کے گھر میں ہو کا عالم تھا۔ شام تک ایسی خاموشی اور سراسیمگی طاری تھی کہ اگر پتا بھی کھڑکتا تو کوٹھی میں خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ ڈاکو نے سختی سے منع کیا تھا کہ پولیس سے رابطہ نہیں کرنا اور نہ ہی یہ بات کوٹھی کی چار دیواری سے باہر نکلنی چاہیے۔ ز

جب تک اسپتال میں تھا اس کی طبیعت حیران کن طور پر سنبھل گئی تھی اور ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اس کی ایک دو روز میں چھٹی ہو جانا تھی ورنہ ایسا بیمار جس کو اوپر نیچے کئی دل کے دورے پڑے ہوں اس کے زندہ بچنے کی امید کم رہ جاتی ہے۔ پہلے تو اس کے دل کے ساتھ کچھ ایسی پیچیدگیاں تھیں کہ آپریشن بائی پاس فنی بنیادوں پر نہیں ہو سکتا تھا اور خود زاہد بھی کسی بڑے آپریشن کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ اگر وہ اوپن ہارٹ سرجری کے دوران مر گیا تو پھر ساری امیدیں ساتھ مر جائیں گی وہ اپنے اس بیمار دل کے اندر جہاں ابھی تک شمائلہ بس رہی تھی سرجری کے دوران اسے اپنے ساتھ نہیں مارنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے ایک بار جو اسے سزا دی ہے وہ کافی سے زیادہ تھی۔ اس نے اپنے قلم سے اپنی محبوب بیوی کے بارے میں ایسی سزا لکھ دی ہے کہ جس کی رو سے نہ وہ مرتی ہے نہ جیتی ہے۔ یا پھر روز مرتی ہے اور روز جیتی ہے اور اس نے اپنے بیمار دل میں اسے مارا نہیں زندہ رکھا ہوا ہے اور وہ ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ اسپتال سے زندہ گھر جانا چاہتا تھا تا کہ شمائلہ کو ڈھونڈے اور شرعی تقاضے پورے کرنے میں اس کی مدد کرے اور پھر ایک مرتبہ پھر اپنے دل کے ساتھ اپنے گھر میں اپنے پیارے پیارے بچوں کے ساتھ رہ کے اپنے گناہوں کی تلافی کرے' اسے ڈاکٹروں نے ایک بار پھر فوری طور پر ایک آپریشن کا مشورہ دیا تھا وہ اس کے لئے ذہنی طور پر اب تیار بھی ہو گیا تھا لیکن وہ اس سے پہلے ایک مرتبہ شمائلہ کو واپس اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا تھا تا کہ شمائلہ کی موجودگی میں آپریشن کرائے پھر جو ہوتا ہے وہ ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ جئے گا بھی تو ایک امید کے ساتھ اور مرے گا بھی تو اس امید کے ساتھ کہ اس کے بعد اس کے بچے اپنی ماں کے پاس ہوں گے۔

بچوں کے لئے زاہد اسپتال میں بہت بیقرار رہا تھا کیونکہ ہفتہ دس دن سے اس نے بچوں کو نہیں دیکھا تھا اور وہ تقریباً ہر روز بھائی سے خواہش ظاہر کرتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سلمان اور عینی کو اسپتال لے آئیں۔ بیگم عابد بچوں سے اتنی اٹیچ نہیں تھیں کہ وہ زاہد کی خواہش کی تکمیل کا خیال کرتیں اور عابد صاحب کا یہ تھا کہ وہ زاہد کے پاس کم و بیش ایک آدھ چکر لگا لیتے تھے لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ گھر سے سیدھے اسپتال جائیں بلکہ وہ کہیں آفس یا کسی میٹنگ میں کسی دعوت میں یا کسی اور ملاقات یا کام کے سلسلے میں گھر سے نکلے ہوتے اور پھر اپنی گاڑی کا اسٹیئرنگ اچانک اسپتال کی طرف گھما دیتے اور کھڑے کھڑے ہی زاہد کو دیکھ کر آ جاتے۔ تاہم انہوں نے زاہد سے پکا وعدہ کیا تھا کہ کیونکہ اتوار کو

بچوں کی بھی چھٹی ہوتی ہے لہٰذا وہ اتوار کے دن کسی بھی وقت دونوں بچوں کو بہر حل ہا
سے ملوانے کے لئے اسپتال لائیں گے۔ لیکن اتوار سے دو ہی دن پہلے جب علی اغوا ہو
تو عابد صاحب نے محسوس کیا کہ دو دن بعد آنے والا اتوار جیسے ہزاروں کوس دور ہو گیا
اور زاہد اسپتال میں اتوار کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن رہا تھا کہ ان لمحات میں سے کس
لمحے کے اندر اس کے بچے اس سے ملنے کے لئے آئیں گے۔ اس کے فرشتوں کو بھی معلو
نہیں تھا کہ اس کے ایک بچے پر کیا بیت گئی ہے۔ عابد صاحب کے گھر میں اس روز دن کی
روشنی کے باوجود پرانے اور متروک قبرستان کی تاریکی کا سا اندھیرا اور سناٹا طاری تھا۔

''میں تو کہتی ہوں پولیس کو خبر کرو۔'' بیگم عابد نے سرگوشی کے انداز میں عا
صاحب کے کان میں کہا اور ایک طویل خاموشی کے اندر ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور بیگم عا
خود ہی اس ارتعاش سے خوفزدہ ہو گئی جیسے یہ ارتعاش لاؤڈ اسپیکر پر گونج گیا ہو۔

''سوچ لو...... بچے کو ہی نہیں تمہیں بھی دھمکی دی ہے اور مجھے بھی۔'' عابد صاحب
نے ایک سہا ہوا جواب دیا۔

''ہائے اللہ۔'' بیگم کلیجہ تھام کے رہ گئیں۔ ''اب کیا کریں۔''

''انتظار کرو۔'' عابد صاحب نے کہا۔ ''دوسرے ٹیلیفون کا انتظار کرو۔'' اور پھر
بیوی کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''لیکن خیال رکھنا ادھر ادھر سے کسی کا فون آئے تو
ذکر نہ کرنا۔''

''ہرگز نہیں۔'' بیگم سہم کر بولی اور ان کے جسم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ عینی
ابھی تک ایک کونے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ تایا تائی کی حالت دیکھ کر اور زیادہ خوفزد
ہو گئی تھی اور رو بھی رہی تھی اور معلوم نہیں کہاں سے بیگم عابد کے من میں بے حسی کی راکھ
سے نیچے سے عینی کے لئے ممتا کی ایک جوت روشن ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر عینی کو
گلے سے لگا لیا۔

''پریشان نہ ہو میری بچی سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ جذبات بھرے لہجے میں
بولیں اور غالباً جذبات کے سوتے کی نمو کا ایک سبب وہ خلا تھا جو ان کے اپنے بچوں کے
امریکہ چلے جانے سے پیدا ہو گیا تھا اور غالباً ان کے موجود نہ ہونے کا ایک اطمینان بھی تھا
کہ اگر وہ یہاں ہوتے تو علی کی بجائے یہ حادثہ نومی یا نینا کے ساتھ ہوتا۔

''پریشان نہ ہو میری بچی سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' بیگم نے عینی کو دلاسہ دیتے
ہوئے کہا لیکن وہ خود عینی سے زیادہ پریشان تھیں۔ انہوں نے عینی کو ایک کمرے بند رہنے

کی تلقین کی۔ گیٹ کے چوکیدار کو کچھ نہیں بتایا لیکن اسے چوکس رہنے کا حکم دیا اور خود میاں بیوی دونوں اپنے بیڈ روم میں اس مخصوص ٹیلیفون سیٹ کے پاس دم بخود بیٹھے رہے جس پر اغوا کرنے والے کا پہلا ٹیلیفون آیا تھا۔

لمحہ لمحہ انتظار کرتے سہ پہر گزر گئی۔ شام آئی ڈھل گئی دونوں میاں بیوی گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پی کر ہونٹوں کو تر کرتے رہے اس کے علاوہ کوئی چیز کسی نے زبان پر نہیں رکھی کسی یار دوست کا' احباب کا' رشتہ دار کا' جان پہچان والے یا کسی اجنبی کا فون آیا بھی تو فوراً مصروفیت کا بہانہ کر کے بند کر دیا اور ایک سے دوسری بات نہیں کی اور کانوں کی کھڑکیاں اس مخصوص ٹیلیفون کے لئے کھلی رکھیں جس نے ان کا سکھ چین چھین کر ان کی روح اپنے قبضے میں کر لی تھی۔

''ٹریں ں ں ں ں۔'' مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت تھا جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے تین گھنٹیاں بجنے دیں کیونکہ ٹیلیفون کرنے والے نے کہا تھا کہ اس کا ٹیلیفون تین گھنٹیوں کے بعد اٹھایا جائے۔ دونوں میاں بیوی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس کا فون ہے تاہم انہوں نے تین گھنٹیاں بجنے دیں اور تیسری گھنٹی پر عابد صاحب نے بہت اضطراب کے عالم میں لیکن تیزی کے ساتھ ٹیلیفون اٹھایا۔

''ہیلو۔'' وہ گھبرائے ہوئے بولے اور ان کی بیگم نے بھی چپکے سے بہت بے آواز طریقے کے ساتھ دوسرا ٹیلیفون اٹھا کے کان کے ساتھ لگا لیا دوسری طرف سے اسی کا فون تھا جس کے وہ منتظر تھے۔

''بیگم سے کہو ٹیلیفون نیچے رکھ دے۔ میں نہ تو دو آدمیوں سے بات کرنا چاہتا ہوں نہ چاہتا ہوں کہ میری بات دو آدمی سنیں۔'' دوسری جانب وہی گھمبیر مردانہ آواز تھی۔ عابد صاحب اور بیگم عابد دونوں گھبرا گئے۔

وہ دراصل بیگم نے پریشانی میں ریسیور اٹھا لیا۔'' عابد صاحب گھبراہٹ میں بولے اور بیگم کو سرزنش کرنے کے انداز میں کہا۔ ''ریسیور رکھ دو نیچے۔'' اور بیگم نے اس طرح ریسیور نیچے رکھا جیسے ان کے ہاتھ سے گر گیا ہو۔

''اب سنو غور سے مجھے بچے کے عوض تاوان چاہئے۔'' اغوا کرنے والے نے کہا اور پھر مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگا۔ 'رقم کب اور کہاں چاہئے یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔'' میرے اگلے فون کا انتظار کرو۔''

''لیکن کتنی رقم۔'' عابد صاحب نے بوکھلاہٹ میں پوچھا۔

''ایک کھوکھا۔کھوکھے کا مطلب سمجھتے ہو ناں۔ایک کروڑ روپے۔'' یرغمالی نے کہا۔
''کیا؟'' عابد صاحب بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔''یہ اتنی بڑی رقم ...... ہیلو ہیلو ہیلو۔''

عابد صاحب ''ہیلو ہیلو'' کہتے رہے لیکن وہ رقم بتا کر ٹیلیفون بند کر چکا تھا۔
''کیا مانگ رہا ہے؟'' بیگم نے گھبراہٹ میں پوچھا۔
''ایک کروڑ روپیہ۔'' عابد صاحب دل تھام کر بولے۔لیکن انہوں نے اپنے حواس قائم رکھے تھے مگر بیگم بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔انہیں اتنی رقم کا سن کر غش آ گیا۔

زاہد کو صبح ہی صبح ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ کل تک آپ اسپتال سے فارغ ہو جائیں گے۔ کچھ دوائیں کچھ ہلکی ہلکی ورزش تجویز کی گئی تھی' کچھ پرہیز بتایا گیا تھا اور ایک نئی انجوگرافی کے بعد آخرکار ایک آپریشن بائی پاس کا فیصلہ ڈاکٹروں نے مل جل کر صلاح مشورے سے کرلیا تھا کیونکہ آئے دن دل کے معاملے میں گڑبڑ زاہد کے لئے خطرناک ثابت ہورہی تھی لہٰذا ہر وقت خطرے سے بچنے کے لئے ایک خطرے کا رسک لینا ڈاکٹروں نے بہتر سمجھا۔کم از کم روز روز کا کھٹکا تو ختم ہو جائے گا۔ رہ گیا رسک تو وہ ایک چھوٹے آپریشن میں بھی ہے اور بڑے آپریشن میں ہے اور خاص طور پر یہ فیصلہ اس لئے بھی کیا گیا کہ اب یہ زاہد کا فیصلہ تھا۔زاہد جو کبھی بھی آپریشن کے لئے تیار نہیں اس نے اچانک طے کرلیا کہ آر یا پار ...... وہ آپریشن کرا لے گا تاکہ اتنے زمانے سے وہ زندگی اور موت کی سرحدوں کے درمیان کھڑا ہے اس کو عبور کر جائے اور پھر شمائلہ اور بچوں کو ہمیشہ کے لئے پا لے یا ہمیشہ کے لئے کھو دے تاہم یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔سردست زاہد کے لئے یہ نوید تھی کہ ایک دن بعد اسے اسپتال سے رخصت کر دیا جائے گا اور وہ بہت مطمئن بھی تھا اور بہت پریشان بھی۔مطمئن اپنی قلبی صورت حال سے تھا کہ ڈاکٹروں کی رائے میں دل کی حالت بہت بہتر ہو رہی ہے اور اسی اطمینان کے باعث اسے اسپتال سے چھٹی بھی دی جا رہی ہے لیکن پریشانی کا سبب اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں چھپا ہوا تھا جو سامنے نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال یہ بات اس کے لئے باعث اطمینان تھی کہ شمائلہ سے وقتی دوری سہی لیکن اب وہ گھر میں سارا وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزار سکتا ہے۔
''ہیلو ...... جی بھائی جان۔آپ خیریت سے تو ہیں ناں۔'' زاہد نے فوراً عابد بھائی کو موبائل کیا جو گھر میں ہی موجود تھے۔

''ہاں ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' عابد بھائی نے قدرے ہڑبڑا کر جواب دیا۔
''آپ آئے نہیں دو دن سے اسپتال۔'' زاہد نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے ناں۔''
''وہ ہاں ...... ارادہ تو کیا تھا لیکن پھر کچھ ایسے کام ......'' عابد صاحب اکھڑے اکھڑے سے بولے۔
''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ آپ کی آواز کچھ ......'' زاہد نے تشویش ظاہر کی۔
''ہاں وہ ذرا نزلہ زکام تھا ٹمپریچر بھی ہو گیا۔ اسی لئے تمہاری طرف آ نہیں سکا۔'' عابد صاحب نے بات بنائی۔
''اپنا خیال رکھئے بھائی جان۔'' زاہد ان کے معمولی نزلہ زکام سے بھی پریشان ہو گیا اور پھر پوچھنے لگا۔ ''بھابھی تو خیریت سے ہیں ناں۔''
''ہاں وہ ٹھیک ہیں بس وہ بھی گھر سے نکل نہیں سکیں۔''
''آپ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں آپ کی آواز کچھ بیٹھی بھی ہے۔'' اس نے تشویش سے کہا۔
''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' عابد صاحب فوراً بہت نارمل ہو کر کہنے لگے۔
''نومی نینا کی امریکہ سے کوئی خبر آئی؟'' زاہد نے بھائی جان کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔
''ہاں ہاں فون آتا رہتا ہے۔'' عابد صاحب بولے اور آخرکار زاہد حرفِ مدعا پہ آیا بنی جن کی خیر خیریت وہ سب سے پہلے پوچھنا چاہتا تھا مصلحتاً سب سے بعد میں پوچھی۔
''بھائی جان علی اور عینی کا کیا حال ہے۔'' وہ بہت دکھ اور دھیمے لہجے میں بولا اور س کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ اپنی اولاد کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔
''ٹھیک ہیں دونوں۔'' عابد صاحب دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بولے۔
''ہفتے بھر سے انہیں بھی نہیں دیکھا۔'' زاہد ایسے بولا جیسے کوئی پیاسا کہہ رہا ہو کہ سے سخت پیاس لگی ہے۔
''ہاں ہاں میں انہیں لے کر آؤں گا۔ بہت جلد۔'' عابد صاحب نے جلدی سے کہا۔
''اگر قریب ہوں علی یا عینی تو بات کرا دیں پلیز۔'' زاہد کے لہجے میں التجا تھی۔
''وہ ابھی سکول سے نہیں آئے ہیں بچے۔'' عابد صاحب نے بات بنائی۔

''اچھا......'' زاہد قدرے حیرت سے بولا۔ ''لیٹ نہیں ہو گئے۔''
''وہ کبھی کبھی وین لیٹ ہو جاتی ہے۔ صبح کچھ ٹھیک سے چل بھی نہیں رہی تھی وین۔ بس آنے ہی والے ہوں گے۔'' عابد صاحب نے کچھ اس طرح کہا کہ زاہد مطمئن ہو جائے۔

''اچھا بھائی جان۔ ایک اچھی خبر ہے۔'' زاہد بچوں سے ہٹ کر موضوع بدلتے ہوئے بولا اور عابد صاحب لمحہ بھر کو چپ ہو کر سوچ میں پڑ گئے کہ زاہد کے پاس اچھی خبر کیا ہو سکتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ علی کے اغوا کی خبر اس کو بھی مل چکی ہو اور اب علی بازیاب ہو کر اسپتال آ گیا ہو۔'' کاش بات ایسی ہی ہو۔

''ہاں ہاں خبر سناؤ کیا خبر ہے۔'' عابد صاحب تجسس سے بولے۔

''بھائی جان ڈاکٹروں کا خیال ہے میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں اور کل وہ مجھے اسپتال سے چھٹی دے رہے ہیں۔'' زاہد نے بھائی کو مژدہ سنایا۔

''اوہ گڈ۔'' عابد کیلئے یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی کہ جس کو سننے کا وہ منتظر تھا۔ زاہد کا اسپتال میں آنا جانا تو اب معمول بن گیا تھا اور ڈاکٹر نرسیں بھی اسے آئے دن اسپتال میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں اور نرس انیسہ جو زاہد سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی زاہد سے ہلکی مذاق کرتی تھی اور اس نے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا تھا۔ ''سر آپ کے دل کو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیوں مجھے ایمبولینس اسپتال لے آتی ہے۔'' زاہد نے بھی از راہ مذاق پوچھا۔

''ایمبولینس لاتی نہیں آپ خود آتے ہیں اسپتال۔'' انیسہ نے مذاقاً کہا۔

''کیوں؟'' زاہد نے پوچھا۔

''بس آپ خوبصورت نرسوں اور لیڈی ڈاکٹروں کے درمیان جو رہنا چاہتے ہیں۔'' انیسہ نے چھیڑ چھاڑ کی۔

''ارے نہیں انیسہ جی اس اسپتال میں تو کوئی خوبصورت نرس یا ڈاکٹر ہے ہی نہیں. چھانٹ چھانٹ کے بدصورت عورتیں یہاں بھرتی کر رکھی ہیں۔'' وہ بھی مذاق میں بولے.

''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' انیسہ نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ میں اس شہر کی سب سے......''

''بدصورت نرس ہوں۔'' زاہد نے بات کاٹ کر کہا تھا اس پر نرس اور زاہد دونوں

ہنس پڑے اور نرس نے اپنی ہنسی روکی اور پاس ہی لگے شیشے میں اپنے حسین چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اترا کر زاہد سے پوچھا۔ ''سر سچ بتایئے کیا میں واقعی شہر کی سب سے بدصورت نرس ہوں۔''

''نہیں۔'' زاہد نے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''شہر کی نہیں ملک کی۔''

اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ معاً ٹیلیفون کی آواز گونجی۔

''ہاں زاہد۔'' عابد صاحب بولے ابھی دونوں بھائی ٹیلیفون پر بات کر رہے تھے۔ ''بھئی یہ تو بہت اچھی خبر ہے کل کس وقت تمہیں ڈسچارج کریں گے۔'' عابد صاحب نے پوچھا۔

''معلوم نہیں بھائی جان کل سینئر ڈاکٹر آئیں گے تو پتہ چلے گا۔ ہوسکتا ہے کل نہ بھی ڈسچارج کریں۔'' زاہد نے ایک خیال ظاہر کیا۔

''خدا کرے کل نہ ہی ڈسچارج کریں۔'' عابد نے دل میں کہا کیوں کہ اس کا مفاد اسی میں تھا کہ زاہد ابھی کچھ دن اور اسپتال میں رہے اس لئے کہ اگر زاہد گھر آ گیا اور علی کو اس نے گھر میں نہ پایا تو وہ اسے کیا جواب دے گا اور یہ صدمہ زاہد کیسے برداشت کرے گا لہٰذا اس نے چپکے سے فون بند کر دیا اور گہری سوچ اور تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''کیا کہہ رہا ہے زاہد۔'' بیوی نے عابد صاحب کو گم صم دیکھا تو پوچھا۔

''کہہ رہا تھا کل شاید چھٹی ہو جائے۔'' عابد صاحب نے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے فی الحال اسے اسپتال سے ادھر ہی لانا پڑے گا اور میں پریشان ہوں کہ علی کے بارے میں اسے کیا بتاؤں گا۔''

''وہ تو خبر سن کر مر جائے گا۔'' بیگم عابد نہایت بے رحمی سے بولیں۔

''خدا نہ کرے۔'' بھائی پھر بھائی تھا وہ اتنا بے رحم تبصرہ ہضم نہیں کر سکا۔ ''لیکن یہ ہے کہ اسے یہ خبر سنانا بہت مشکل ہے۔ میں ڈاکٹر سے بات کروں گا کہ دو چار دن مزید اسے اسپتال میں روک دیں مگر......''

''مگر......'' بیوی نے تجسس سے پوچھا۔

''مگر پہلے ادھر تو دیکھ لیں کیا ہوتا ہے اغوا کرنے والے نے آج رات فائنل ٹیلیفون کرنے کے لئے کہا اور پھر دونوں میاں بیوی ٹیلیفون کے پاس بیٹھے مجسم انتظار بن گئے۔

تین دن سے عابد صاحب کے گھر میں کھانا پینا بند ہو گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ا
حلق سوکھا ہوا تھا اور چولہے تقریباً بجھ گئے تھے۔ عینی کو بیگم صاحبہ یا عابد صاحب کبھی کچھ
دودھ دلیا بسکٹ وغیرہ کھانے کو دے دیتے تھے لیکن اس کے حلق سے بھی کوئی چیز نیچے نہیں
اتر رہی تھی۔ وہ مظلومیت کی ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر بن گئی تھی کہ جسے نہ تو مصور اپنے
رنگوں میں بنا سکتا تھا نہ مصنف اپنے لفظوں میں بیان کر سکتا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف او
زبان جیسے ساکت ہو گئی تھی۔ اس کا باپ اسپتال میں بیمار پڑا تھا ماں کا کچھ پتہ نہیں بس ا
پتہ تھا جو لوگوں سے ملتا تھا کہ ماں بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی ہے اور یہ دونوں بھائی بہن
یتیموں کی طرح تایا کے گھر میں آن پڑے تھے۔ جہاں دونوں بہن بھائی اور کچھ نہیں ا
گلے مل کر رو لیتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے یا مل جل کے کھیل لیتے تھے لیکن
بدقسمتی اور مصیبت ہر جگہ ان کا تعاقب کرنے لگی۔ بھائی بھی جدا ہو گیا اور ایسا جدا ہوا کہ
اس کے معصوم اور ننھے سے ذہن میں کچھ سما ہی نہیں رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے اور یہ بھی نہیں
معلوم تھا کہ بھائی ملے گا بھی یا نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اٹھانے والے بھائی کو کیوں
اٹھا کر لے گئے۔ عینی کی سمجھ میں تو ابھی تک کوئی بات پوری طرح نہیں آئی تھی کہ ماں انہیں
چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔ باپ نے ماں کو کیوں نکال دیا اور وہ خراب انکل ان کے گھر میں آ
کر کیوں رہے تھے اور سب کے باپ تو ٹھیک ٹھاک ہیں تو اس کا باپ کیوں بیمار رہنے لگا
ہے اور وہ تائی تایا کے گھر میں کیوں رہتی ہے اور اس کے بھائی کو لے جانے والے کون
لوگ ہیں۔ وہ تو بس خوف کا ایک نمونہ بن گئی تھی اور عابد صاحب نے تین دن سے اسے
اسکول بھی نہیں بھیجا تھا اور اسکول والوں کو بھی عابد صاحب نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ بات
دوسرے سے تیسرے کان تک نہ پہنچے تاہم بات کہاں تک چھپ سکتی تھی گھر کے ملازمین
اور خانساماں وغیرہ کو کچھ بھنک لگ گئی تھی اور ظاہر ہے جب ایک سے دو دو سے تین تک
بات جائے تو پاس پڑوس کو بھی سن گن لگ گئی تھی تاہم بات کو الم نشرح نہیں کیا گیا۔ نہ کسی
ریکارڈ پر آئی تھی لیکن گھر میں چھائی ہوئی خوف و ہراس کی فضا ہر لمحے گہری، ہولناک اور
دبیز ہو رہی تھی۔

''ٹریں ں ں ں ں۔'' ٹھیک رات کے گیارہ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اغوا کرنے
والے نے یہی وقت بتایا تھا۔

''ہیلو۔'' عابد صاحب لرزیدہ آواز میں بولے۔

''اگر رقم کا بندوبست کر لیا ہو تو میں جگہ اور وقت کا تعین کروں۔'' دوسری طرف

سے آواز آئی۔

''دیکھئے ایک کروڑ میں کسی طرح نہیں دے سکتا۔ اگر تاوان ہی لینا ہے تو اتنا لیں جو میں دے سکوں۔'' عابد صاحب نے عجز وانکساری سے کہا۔

''کم کریں مطالبہ۔''

''نو بارگیننگ۔'' ڈاکو نے جواب دیا۔ ''ہم پارٹی سے اتنی ہی رقم مانگتے ہیں جو پارٹی دے سکتی ہے۔ ہمیں سب معلوم ہے آپ کے پاس پاکستانی کرنسی کتنی ہے۔ ڈالرز کتنے ہیں۔ بینک بیلنس کیا ہے۔ لاکرز میں زیورات کتنے ہیں۔ کتنا انکم ٹیکس آپ نے دیا اور کتنا چھپایا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کی بیگم اس وقت دوسرے ٹیلیفون پر ہماری گفتگو سن رہی ہے۔ بے شک سن لے...... میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی جان لیں کہ ہم سب جانتے ہیں۔'' ڈاکو ایک ہی سانس میں بول گیا اور بیگم عابد جو واقعی دوسرے ٹیلیفون پر بات سن رہی تھی سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

''بولو۔ جواب دو۔'' ڈاکو نے تھوڑے سے وقفے کے بعد کہا۔ ''اگر کروڑ زیادہ ہے تو آخر کیا دو گے۔''

''مجھے تھوڑا سا وقت دے دو۔'' عابد صاحب انکساری سے بولے ان کے لہجے سے لگتا تھا کہ جیسے وہ بارگیننگ کر کے علی کو چھڑا لینا چاہتے ہیں۔

''میں ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد فون کروں گا۔ سوچنے کے لئے آدھا گھنٹا بہت ہے۔''

❁

''بارگیننگ کے موڈ میں تو بندہ آ گیا ہے لیکن لگتا ہے کہ بہت نیچے آیا تو پچاس لاکھ سے نیچے نہیں آئے گا۔'' عابد صاحب نے سوچ بچار کے بعد کہا۔

دونوں نے اپنے اپنے حساب سے خیالی گھوڑے دوڑائے۔

''تو۔'' بیگم عابد چونکی۔

''تو کیا رقم تو دینی پڑے گی۔'' عابد صاحب بولے۔

''پاگل ہو گئے ہو۔ پچاس لاکھ کا مطلب سمجھتے ہو۔'' بیگم نے کہا۔

''اگر میں کما سکتا ہوں پچاس لاکھ تو گن نہیں سکتا کیا۔'' عابد صاحب نے ترت جواب دیا۔

''سمجھ بھی سکتا ہوں۔''

''تو کیا ہم نے ان لوگوں کے لئے کمایا ہے؟'' بیگم مشتعل لہجے میں بولیں۔

''تو پھر کیا کیا جائے۔ تم کیا سمجھتی ہو کتنی آفر دینی چاہئے۔'' عابد صاحب نے پوچھا۔

''ایک پائی بھی نہیں۔'' وہ جھٹ سے بولیں۔

''تم پاگل ہوگئی ہو۔ وہ بچے کو مار دیں گے۔'' عابد صاحب نے تشویش ظاہر کی۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' بیگم نے علی کی زندگی اور موت کے معاملے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک پائی بھی میں انہیں نہیں دوں گی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔'' عابد صاحب نے پریشانی کے عالم میں پوچھا تو بیگم کہنے لگیں۔ ''اتنے بڑے افسر رہے ہو تم اتنے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات اب بھی ہیں ...... یہ سارا اثر ورسوخ کس کام آئے گا آخر۔''

''اثر ورسوخ کیا کرے گا اس وقت۔'' انہوں نے بے بس ہوکر پوچھا۔

''پولیس کو انفارم کرو۔'' بیگم عابد کھٹ سے بولیں۔

''نہیں ہرگز نہیں۔'' عابد صاحب نے خوفزدہ ہوکر بے ساختہ کہا۔ ''میں پولیس میں نہیں جاؤں گا۔''

''تو پھر میں جاؤں گی پولیس کے پاس۔'' بیگم عابد بکھر کر بولیں۔ ٹیلیفون ڈائری اٹھائی پولیس اسٹیشن کا نمبر دیکھا اور ریسیور اٹھا کے نمبر گھمانے لگیں۔

''رکو رکو بیگم ہوش کے ناخن لو یہ کیا کرتی ہو۔''

''ہوش کے ناخن تم لو اور پرے ہٹو اس وقت۔'' بیگم نے عابد صاحب کو پرے دھکیلا اور جلدی سے نمبر ڈائل کر دیا۔ تھانے سے فون اٹھایا گیا تو بیگم بولیں۔ ''ہیلو پولیس اسٹیشن ایک رپورٹ لکھئے۔''

اور پھر انہوں نے اغوا کی رپورٹ لکھوا دی اور عابد صاحب دم بخود دیکھتے رہ گئے۔

❀......□......❀

بیگم عابد نے جب عجلت میں پولیس کو فون کرنے کے بعد ریسیور نیچے رکھا تو وہ دم بخود کھڑے عابد صاحب کا چہرہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ عابد صاحب پر رعب رکھنے والی اور ان کو ہر اعتبار سے ڈامینیٹ کرنے والی خاتون تھی جو کبھی عابد صاحب کے رعب اور دبدبے سے مرعوب نہیں ہوئی تھی لیکن اس دن پہلی مرتبہ عابد صاحب کا چہرہ دیکھ کر خوف کھا گئی۔ عابد صاحب کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا غصہ، گھبراہٹ، ایک وحشت اور دہشت تھی جو بیگم عابد نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، وہ ان کی نظروں سے نظریں ملانے کی سکت اپنے اندر نہیں پا رہی تھی، عابد صاحب پھٹی پھٹی اور خونخوار آنکھوں سے بیگم کو دیکھے جا رہے تھے جیسے کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو گیا ہو، جیسے وہ اسے کچا چبا جانا چاہتے ہوں۔

''میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔'' بیگم نے خاموشی توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے اظہار کیا لیکن عابد صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں، وہ اسی طرح سکتے کے عالم میں دم بخود اسے دیکھتے رہے۔ بیگم پھر بولی۔

''بلکہ آپ کو بھی یہی کرنا چاہئے تھا جب پہلی دفعہ ڈاکو کا ٹیلیفون آیا تھا اسی وقت پولیس کو مطلع کر دینا چاہئے تھا۔'' بیگم عابد نے عابد صاحب کے تنے ہوئے وجود کو نرم کرنے کے لئے مزید وضاحت کی لیکن عابد صاحب سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح بدستور تنے رہے اور قہر آلود نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔

''کیا ہو گیا تمہیں......؟'' اب کے بیگم نے برہمی سے کہا۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولے۔

''مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو، بولتے کیوں نہیں؟'' جواب میں عابد صاحب پھر بھی کچھ نہ بولے لیکن لگتا تھا کہ ان کے اندر کوئی اور روح سرایت کر گئی ہے۔ وہ غصے کے عالم میں اس طرح پھولتے چلے گئے جیسے گاڑی کے ٹائر کے ٹیوب میں کوئی ہوا بھر رہا ہو اور پھر جب وہ ٹیوب ہوا سے پھٹنے پر آ گئی تو عابد صاحب کے اندرونی نظام میں جیسے ایک تشنج پیدا ہوا، ان کا چہرہ غصے میں لال ہو گیا اور ہاتھ جیسے بجلی کے کرنٹ سے جھٹکا کھا

کے اٹھا اور گھما کے انہوں نے زناٹے کا تھپڑ بیگم کے گال پر رسید کر دیا اور بیگم تھپڑ کے زا
سے آندھی میں اڑتے شہتیر کی طرح دور دیوار سے جا ٹکرائی۔

''خبیث عورت ......!'' انہوں نے تھپڑ کے ساتھ ہی بیگم کو گالی دی۔ بیگم دم بخو
ہو گئی۔ اس کے منہ پر پڑنے والا زندگی میں پہلا طمانچہ تھا، وہ گال سہلاتے ہوئے اٹھی او
عابد صاحب کی طرف زخم خوردہ شیرنی کی طرح بپھر کر بڑھی۔

''تم نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔'' وہ غرائی۔

''کاش یہ تھپڑ تمہیں میں نے بہت پہلے مارا ہوتا۔'' انہوں نے بیگم کو جو ابھی پورا
طرح سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ دوسرا تھپڑ مار کے فرش پر گرا دیا۔

بیگم نے شوہر کا یہ روپ کبھی نہ دیکھا تھا، اب دیکھا تم سہم گئی اور پھر فرش سے اٹھنے
کی کوشش نہیں کی، ڈری ڈری، سہمی سہمی نظروں سے عابد صاحب کو دیکھنے لگی۔ عینی کمرے
کے باہر سہمی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی اور اس کے لئے یہ ساری صورتحال حیران کن تھی۔

''کم آن ......'' عابد صاحب تیزی سے باہر نکلے اور جاتے جاتے عینی کا ہاتھ تھا
کر اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے عینی کو بوسیدہ کمرے کی
بجائے اپنے بیڈروم کے ساتھ والے اپنے بچوں کے کمرے میں لٹا دیا۔

عینی کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر عابد صاحب اپنے بیڈروم میں آ گئے اور وہ آنے
والے کسی ان دیکھے اور انجانے طوفان کی آمد سے سخت پریشان تھے، انہیں یقین تھا کہ و
کڈنیپر سے بارگیننگ کر کے تاوان کی رقم کو کم کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے، ایک
ایسے ہندسے پر وہ سمجھوتہ کر سکتے تھے جس کے ادا کرنے میں انہیں دشواری نہ ہوتی اور علی
کی جان بھی بچ جاتی اور بلاوجہ پوری دنیا میں خبر پھیلنے کی بجائے اندر ہی اندر تصفیہ ہو
جاتا۔ لیکن بیگم کے لالچ اور خودغرضی نے اب ایسی صورتحال پیدا کر دی تھی کہ عابد صاحب
کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے جب بات پولیس تک پہنچی تو کھیل ان کے ہاتھ سے
نکل گیا اور اب آگے خطرہ ہی خطرہ تھا۔

وہ پریشان حال ایک صوفے میں دھنسے بیٹھے تھے اور آنے والے حالات کے خوف
میں کھوئے ہوئے تھے کہ بیگم اندر آئی۔

وہ زندگی بھر عابد صاحب کی چہیتی بیگم رہی تھی، زندگی بھر عابد صاحب نے دوسروں
پر اور بیگم نے عابد صاحب پر حکومت کی تھی، زندگی بھر عابد صاحب پاؤں دھو کر پینے والے

شوہروں کی طرح رہے تھے، انہوں نے اس کے رخسار کو پھول پتیوں سے تو کئی بار چھوا ہوگا لیکن برہمی میں ایک ہلکی سی چپت لگانے کا بھی تصور کبھی نہیں کر سکتے تھے اور آج جب بیگم کمرے میں داخل ہوئی تو وہ داخل ہونے سے پہلے عابد صاحب کے ہاتھوں دو زناٹے کے تھپڑ کھا چکی تھی اور یہ وہ یادگار تھپڑ تھے جن کے نشانات بیگم کے چہرے پر سنگتراش کی چھینی سے کندا کئے ہوئے نشانوں کی طرح پختہ ہو چکے تھے۔

وہ ایک لاڈلی اور منہ چڑھی بیوی کی طرح نخرہ دکھا کر گال کو سہلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی، ظاہر ہے اسے یہی توقع تھی کہ اب تک عابد صاحب کے غصے کا بخار اتر چکا ہوگا اور نہیں احساس ہو گیا ہوگا کہ وہ زندگی بھر جس عورت کے اشاروں پر ناچتے رہے ہیں، اس کے ساتھ آج انجانے میں اچھا سلوک نہیں کیا لہٰذا وہ اس کو دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کے اس سے اپنے کئے کی معافی مانگیں گے اور پتہ نہیں وہ پاؤں بھی پکڑ لیں لہٰذا بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی رونی صورت بنالی اور ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر سہلانے لگی لیکن اس کا سارا صوراتی منظر یہ دیکھ کر ختم ہو گیا کہ عابد صاحب ایک بالکل مختلف آدمی دکھائی دے رہے تھے، ان کے چہرے پر بیگم کے لئے کوئی پچھتاوا نہیں تھا، کوئی ہمدردی نہیں تھی اور پریشانی کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی غصے کے عالم میں تھے اور بیگم کو یوں لگا کہ عین ممکن ہے کہ وہ جنون میں آ کر آج اس کی ہڈیاں ہی نہ توڑ بیٹھیں۔ بیگم نے فوراً اپنا نخرہ ختم کیا اور گال سے ہاتھ ہٹا دیئے اور عابد صاحب کے پاس صوفے پر بیٹھنے کی بجائے ان کے قدموں میں بیٹھی اور نہایت ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''ایم آئی سوری ......!،، اس نے نہایت فراخدلی کے ساتھ شوہر کے منہ سے سوری سننے کی بجائے خود سوری کیا اور مزید کہنے لگی۔ ''مجھے اور مارلو، جتنا مار سکتے ہو مارو، مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

اب کیا فائدہ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، اب انتظار کرو اس سین کا جو ہونے والا ہے۔'' عابد صاحب منہ دوسری طرف موڑ کر بے رحمی سے بولے اور اس سے پیشتر کہ مزید کوئی بات چیت ہوتی، معاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ٹریں ں ں ں ں ...... دونوں کے کان کھڑے ہو گئے، دونوں میں سے کسی کا ہاتھ فون اٹھانے کے لئے نہیں بڑھا، جب تین چار گھنٹیاں بجیں تو عابد صاحب نے تحکمانہ انداز میں بیگم سے کہا۔

''اٹھاؤ......!''

''ہیلو......'' بیگم نے فون اٹھایا۔ ''جی کون ...... جی جی ...... ہولڈ کریں۔'' پھر بیگم

نے فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے کہا۔"ڈی آئی جی کا فون ہے۔"

"اب تو آئیں گے پولیس کے فون ......" عابد بڑبڑائے اور فون بیگم کے ہاتھ سے لے لیا، اس دوران دوسرے ٹیلیفون کی گھنٹی بھی بج گئی، عابد صاحب نے بیگم کو دوسرے ٹیلیفون کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود ڈی آئی جی سے بات کرنے لگے۔

"ہیلو......! جی السلام علیکم! میں عابد علی بول رہا ہوں۔" انہوں نے فون پر ڈی آئی جی سے گفتگو شروع کی۔"بس جی کیا بتائیں ...... جی ہاں آج تیسرا دن ہے...... آپ سے زیادہ اس بات کو کون جانتا ہے کہ پولیس کو لوگ انفارم کیوں نہیں کرتے، وہ بات تو ہے لیکن میں بھی بہرحال اسی سوسائٹی کا ایک حصہ ہوں اور وقت پڑنے پر میری سوچ بھی ایک عام آدمی کی سوچ کی طرح ہو سکتی ہے ...... بس انہی وجوہات کی بناء میں نے قانون کا سہارا نہیں لیا تھا ...... میں آج بھی نہ بتاتا لیکن میری بیگم نے آخر کار رپورٹ لکھوا دی... نہیں صاحب اب کیا ان سے بارگین کروں گا، بارگیننگ کا وقت تو نکل گیا، اب بچے کی سیفٹی اللہ اور آپ کے ہاتھ میں ہے، اینی وے تھینک یو ویری مچ ...... مجھے یقین ہے پولیس جو قدم بھی اٹھائے گی، اس میں بچے کا تحفظ یقینی ہوگا، جی ہاں ...... جی جی ...... جی جی... تھینک یو ویری مچ۔"

عابد صاحب نے فون بند کر کے بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو دوسرے ٹیلیفون کو ریسیو کر کے آئی تھی، بیگم خاصی سراسیمہ تھی۔

"کس کا فون تھا......؟" عابد صاحب نے پوچھا۔

"کچھ بولا نہیں، بند کر دیا۔" بیگم خوف زدہ ہو کر بولی اور دونوں چپ ہو گئے۔

عابد صاحب خاموش ہو کر ایک کونے میں بیٹھ گئے پھر ٹیلیفون کی ایک گھنٹی اور بجی، اب کے عابد صاحب نے اٹھایا۔

"جی ......!" انہوں نے نارمل طریقے سے بات کرنے کی کوشش کی۔"اچھا، اچھا ...... جی میری بیگم نے علاقے کے پولیس اسٹیشن کو ساری رپورٹ لکھوا دی ہے، ابھی ابھی ڈی آئی جی صاحب کا فون بھی آیا تھا، ان کو بھی میں نے صورتحال سے آگاہ کر دیا ہے، بس وہی بات ہے کہ مجھ سے تاوان مانگا گیا تھا، میں نے نہیں دیا، بارگیننگ ہو رہی تھی شاید معاملہ طے پا جاتا لیکن اب مسئلے کا حل میرے پاس نہیں پولیس کے پاس ہے، جی مجھے یقین ہے پولیس جو قدم بھی اٹھائے گی، سوچ سمجھ کر اٹھائے گی اور اس بات کو پیش نظر رکھے گی کہ اس معاملے میں بچے کی زندگی خطرے میں نہ پڑے، جی تھینک یوں ویری مچ۔" فون

بند کر کے متجسس بیوی کی جانب دیکھ کر بولے۔

''علاقے کے ایس پی کا فون تھا۔''

''ایک بات کہوں ......؟'' بیگم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟'' عابد صاحب گویا ہوئے۔

''کچھ نہیں ......'' وہ گھبرا کر چپ ہوگئی اور شوہر کے تیور دیکھ کر بھول گئی کہ اس نے کیا کہنا تھا کیونکہ عابد صاحب سخت ہیجانی کیفیت میں مبتلا نظر آرہے تھے۔

''مجھے ڈاکوؤں نے نہیں تم نے مخمصے میں ڈال دیا ہے، تم جو ایک لالچی عورت ہو۔'' وہ گالی دینے کے انداز میں بیگم سے مخاطب ہوئے اور بیگم سے کسی خوف اور مصلحت کے بغیر بولتے رہے۔ ''تم نے بچے کے مقابلے میں پیسے کو زیادہ اہمیت دی لیکن یہ بھول گئیں کہ انسان کی زندگی پیسے سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ بچہ کوئی غیر نہیں ہمارے اپنے سگے بھائی کا بچہ ہے اور تم یہ بھی بھول گئیں کہ تمہارے اپنے بھی بچے ہیں اور ان کے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے، اگر امریکہ میں ہیں تو کیا ہوا۔''

''بس بس خدا کے واسطے بس ......'' وہ تڑپ کر بولی اور کہنے لگی۔ ''آگے کچھ نہ بولنا اور دے دو ڈاکوؤں کو جو کچھ مانگتے ہیں، دے دو اور علی کو بچالو۔''

''اب کہاں سے بچالوں اور کہاں سے دے دوں، اب تو معاملہ پولیس نے ٹیک اوور کر لیا ہے، اب تو وہ بندہ فون بھی نہیں کرے گا۔'' عابد صاحب انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی میں بولے، معاً ٹیلیفون کی ایک اور گھنٹی بجی۔

ٹریں ں ں ں ں ں ......'' اٹھاؤ فون، آج تم ہی اٹھاؤ سارے فون ......'' عابد صاحب جھلا کر بولے اور بیگم نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا۔ ''ہیلو ......'' وہ فون پر بولی۔ ''جی آپ کون ...... ایک منٹ دیکھتی ہوں۔'' اس نے فون ہولڈ کرایا اور عابد صاحب سے آہستگی سے بولی۔ ''کسی اخبار کے دفتر سے فون ہے۔''

''کیا بولوں اسے میں ......'' عابد صاحب جھنجھلا کر بولے۔ ''اب تو سارا پریس اور میڈیا کھڑکے گا۔'' عابد صاحب سخت شش و پنج میں تھے تاہم انہیں معلوم تھا کہ ٹیلیفون لائن بند کر دینا اب مسئلے کا حل نہیں ہے کہ کسی وقت بھی ڈاکو کا فون آ سکتا ہے اور اب بھی شاید بچاؤ کی اور باعزت سمجھوتے کی کوئی سبیل نکل آئے، انہوں نے پریس والے سے فون پر بات کرنا ہی مناسب سمجھا۔

''ہیلو ......!'' عابد صاحب نے فون اٹھایا اور اخباری رپورٹر نے جسے پولیس کے

ذرائع سے اغوا کی خبر مل چکی تھی، اس خبر کی توثیق کرنا چاہی۔

''جی ہاں آپ نے جو خبر سنی ہے، وہ درست ہے۔'' انہوں نے رپورٹر سے کہا۔ ''ہماری کسی سے کوئی سودے بازی نہیں ہو رہی اور ہم اس سے زیادہ کسی بات میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔'' انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور اس کے بعد کئی اخبارات کے دفاتر سے فون آئے جنہیں پولیس کے ذرائع سے اغوا کی خبر مل چکی تھی اور وہ عابد صاحب سے اس کی تصدیق اور تفصیل چاہتے تھے لیکن عابد صاحب نے کسی کو کوئی تفصیل نہیں بتائی، وہ مختصر بات کے بعد فون بند کر دیتے تھے۔ عینی کو تو عابد صاحب نے میٹھی میٹھی باتوں کی لوری دے کر اپنے بچوں کے کمرے میں سلا دیا تھا کیونکہ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے پولیس سے رابطہ کر کے نہ صرف علی کی زندگی انہوں نے خطرے میں ڈال دی ہے بلکہ اپنے بنگلے کے در و دیوار کے اندر کی فضا بھی اب انہیں غیر محفوظ معلوم ہونے لگی تھی۔ بیوی اپنے رویے پر نادم بھی اور خوف زدہ بھی اور عابد صاحب سخت تناؤ کا شکار تھے اور دونوں میاں بیوی نے ایک عجیب خوف اور دہشت کی فضا میں رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی، انہیں کڈنیپر کے فون کا شدت سے انتظار بھی تھا اور خوف بھی ...... وہ جانتے تھے کہ ابھی اسے پولیس کے ساتھ رابطے کی خبر نہیں ملی ہوگی لیکن پھر بھی وہ ہر ٹیلیفون کی گھنٹی پر لرز جاتے تھے۔ نصف رات تک پولیس کے مختلف افسران اور اخبارات کے مختلف رپورٹروں کے فون آتے رہے اور نصف رات کے قریب جب ٹیلیفون کی گھنٹیاں خاموش ہو گئیں اور گھر میں قبرستان کی رات جیسی خاموشی اور ویرانی چھا گئی تو ٹیلیفون کی ایک گھنٹی نے کمرے کی ویرانی اور خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

''ہیلو ......!'' عابد صاحب دھیمے اور پر تجسس لہجے میں بولے کیونکہ انہیں اتنی رات گئے آنے والا ٹیلیفون بالکل مختلف اور الگ سا لگا تھا۔

''عابد صاحب آپ نے جو کچھ بھی کیا، اچھا نہیں کیا۔'' دوسری طرف سے کڈنیپر کی زخم خوردہ آواز تھی۔

''دیکھئے آپ جو کوئی بھی ہیں، میری بات سنئے، کچھ تھوڑی سی غلط فہمی ہو گئی ہے ...... دراصل پولیس کے پاس ......''

''خاموش ......!'' دوسری طرف ٹیلیفون پر ایک بہت گونجدار آواز سنائی دی، عابد صاحب کو اس ڈانٹ نے چپ کرا دیا۔ ''اب تمہارے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے عابد! صرف تمہیں سننا ہوگا اور غور سے سنو۔ آنے والے اڑتالیس گھنٹے تمہارے لئے بہت

خطرناک ہوں گے اور کسی وقت بھی ایک بوری میں بند دھپ کی آواز اپنے گھر کے باہر سن سکتے ہو اور یہ ایک لاش ہوگی اور ہاں یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے اپنے بچے ملک سے باہر چلے گئے ہیں...... دنیا بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔

''میری بات سنو......تم جو چاہو گے...... ہیلو ہیلو...... ہیلو۔'' عابد صاحب ''ہیلو ہیلو'' کرتے رہ گئے لیکن اس نے کوئی بات نہیں سنی اور فون بند کر دیا اور یوں عابد اور بیگم عابد کے لئے رات کانٹوں کی سیج بن گئی اور انہیں جونئی فکر لاحق ہوگئی، وہ یہ تھی کہ صبح زاہد کو کیا بتائیں گے، اس رات اخبارات کی دنیا میں خبروں کے انبار لئے جو ٹیلی پرنٹر کھڑک رہے تھے، اس کی کھڑکھڑاہٹ میں ایک ایک کالی خبر اور تصویر کے ساتھ عابد علی کی جان بھی کھڑک رہی تھی۔

اس رات نرس انیسہ کی رات کی ڈیوٹی تھی، کام بھی وارڈ میں ہلکا تھا، کسی مریض کی ایسی نازک کنڈیشن بھی نہیں تھی کہ وارڈ میں ٹینشن ہوتی سو مریض اور عملہ بھی مطمئن تھا، ایک نوجوان مرد ڈاکٹر ڈیوٹی پر تھا جو ایک ہاؤس جاب کرنے والی لیڈی ڈاکٹر کو ساتھ لے کر ڈاکٹرز کیفے ٹیریا میں چائے پینے گیا تھا پھر لوٹ کر نہیں آیا، اس نے اپنا موبائل نمبر نرس انیسہ کو دے رکھا تھا کہ اگر اشد ضرورت پڑ جائے تو رنگ کر دے ورنہ نہیں۔ رات کی ڈیوٹی پر مامور بھنگن نجیراں ایک خاکروب صادق مسیح کو لے کر ہسپتال کی عقبی بند گلی میں چلی گئی تھی۔

نجیراں چھ بچوں کی ماں تھی اور صادق مسیح پانچ بچوں کا باپ تھا لیکن جب دونوں کی ایک ساتھ ڈیوٹی لگتی اور یہ دونوں فرصت کے اوقات میں جب کھانا کھانے یا چائے پینے کے بہانے ہسپتال کے کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کے ایک دوسرے کے کان میں کھسر پھسر کرتے تو کسی کبوتر اور کبوتری کی طرح رومانٹک جوڑا لگتے تھے اور محسوس نہیں ہوتا تھا کہ دونوں اپنے اپنے گھروں کے اندر نصف نصف درجن بچے چھوڑ کر آئے ہیں۔ یہ رات ہسپتال میں سب کے لئے پرسکون تھی۔ مریض بھی آرام سے تھے، ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر بھی کیفے ٹیریا کے ہنگامے میں گم ہو گئے تھے، نجیراں اور صادق بھی بند گلی میں اپنی محبت کے اسرار و رموز کی گرہیں کھول رہے تھے اور نرس انیسہ کسی ڈائجسٹ کی پرتجسس کہانی پڑھتے پڑھتے ڈائجسٹ سمیت ڈیوٹی روم سے اٹھ کر زاہد صاحب کے کمرے میں آ گئی تھی اور وارڈ بوائے کو بول دیا تھا کہ وہ زاہد صاحب کے کمرے میں ہے۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، صبح دور تھی لیکن افق کے اندھیرے میں پڑی ہوئی دراڑیں سحر کی نوید سنا

رہی تھیں، آس پاس کے درختوں پر پرندے سوئے ہوئے تھے لیکن کہیں کہیں پھڑ پھڑانے کی صدا بھی آ رہی تھی، دور پرے کے مکانوں میں تہجد گزاروں کی کھڑکیاں کہیں کہیں روشن ہوئی تھیں اور کہیں کہیں رات کو جاگنے والے عیش پرستوں نے روشنیاں گل کر دی تھیں۔

یہ عجیب وقت ہوتا ہے کہ جب رات بھی عروج پر نہیں ہوتی، صبح بھی بالائے بام نہیں ہوتی، یہ روشنی اور اندھیرے کا ایک سنگم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کے لئے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوتے ہیں اور گھروں میں نقب لگانے والے چوروں کے لئے یہ مناسب ترین وقت ہوتا ہے اور انیسہ اپنے ڈائجسٹ کے زیر مطالعہ صفحے میں انگلی رکھے زاہد علی کے کمرے میں داخل ہوئی تھی، کمرے کی تمام بتیاں بجھی ہونے کے باوجود ٹیبل لیمپ کی ملگجی روشنی کمرے میں موجود تھی جس سے کمرے کی ہر شے غیر نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی، زاہد اس وقت بہت پرسکون نیند میں تھے، انیسہ دھیرے دھیرے زاہد کے قریب آئی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ایک دلکش مسکراہٹ زاہد کے ہونٹوں پر دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ اس وقت زاہد یقیناً کوئی بہت خوشگوار اور سہانا خواب دیکھ رہے ہیں، انیسہ کو ان کے مسکراتے اور پنکھڑیوں کی طرح کھلتے بند ہوتے ہونٹ بہت پیارے لگے، دونوں کے خیالات میں بھی کافی ہم آہنگی ہو چکی تھی، انیسہ اپنے بہت سے دکھ سکھ زاہد کے ساتھ شیئر کر چکی تھی، زاہد کی زندگی کی کتاب کے اوراق بھی زمانے کی چلتی ہوئی ہوا کے سامنے گردش کر رہے تھے اور پھر جب شمائلہ آئی تھی تو اس وقت انیسہ اور شمائلہ بہت قریب ہو گئی تھیں اور ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھیں لہٰذا زاہد اب انیسہ کو اپنی کہانی کے کرداروں سے الگ ہو کر بھی الگ نہیں لگ رہا تھا، وہ پروفیسر زاہد کی بے خبری سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچنے لگی۔

پتہ نہیں مرد کتنا ہی وفادار ہو، اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ نرس انیسہ نے سوچا اور پھر فوراً ہی دوسرا خیال اسے عورت کے بارے میں آیا، عورت کونسی ہمیشہ نیک پروین رہتی ہے، اس کا تو دوسرا نام ہی مرد نے بے وفا رکھا ہوا ہے، پھر انیسہ نے یہ ساری سوچ ذہن سے جھٹک دی اور اس نے اپنے چہرے کو دھیرے دھیرے آگے بڑھایا لیکن جب بال برابر فاصلہ رہ گیا تو انیسہ کے اندر سے عقل کا پاسبان جیسے یکلخت ''خبردار'' کہہ کر بیدار ہو گیا اور وہ ساکت ہو کر رہ گئی، کسی چیز نے روکا اسے

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

وہ چپ چاپ پیچھے ہٹی اور پروفیسر زاہد کے سرہانے کی طرف رکھی ہوئی کرسی پر آواز انداز میں بیٹھی، ٹیبل لیمپ کی روشنی کا رخ اپنی طرف کیا اور ڈائجسٹ کھول کے ہاں سے کہانی کو پڑھنا شروع کیا جہاں چھوڑی تھی۔

کہانی بہت دلچسپ اور پرتجسس تھی، اسے کہانی کی ہیروئن کے کردار میں بہت حد اپنی زندگی کے واقعات کا عکس نظر آ رہا تھا، اسے پڑھتے پڑھتے یوں لگا جیسے رائٹر اسے اچھی طرح جانتا ہو، وہ پڑھتی چلی گئی اور پڑھتے پڑھتے اس طویل کہانی کے سمندر میں ی گئی اور وقت کا پتہ ہی نہیں چلا، وقت کا احساس اسے اس وقت ہوا جب ہسپتال کی گلی اندر سائیکل دوڑانے والے اخبار کے ہاکر کی آواز گونجی، یہ ہاکر منہ اندھیرے اخبار کر ہسپتال کی گلیوں سے گزرتا تھا اور وراڈ کے ڈیوٹی روم میں اخبار پھینک جایا کرتا تھا، اخبار آتے ہی فوراً اسے کھول کر کچھ ایسی دلچسپی سے دیکھا کرتی جیسے کسی خاص خبر کا بینی سے انتظار ہو لہٰذا وہ ڈائجسٹ کے صفحے پر پھر نشانی چھوڑ کے ڈیوٹی روم میں گئی اور ینڈ میں گول کیا ہوا اخبار اٹھا لائی جسے زاہد کے کمرے تک پہنچتے ہوئے اس نے کھول ر بینڈ ڈسٹ بن میں ڈالا اور اخبار کی سرخیاں دیکھتے ہوئے وہ زاہد کے سرہانے اسی ی پر جا بیٹھی جہاں ٹیبل لیمپ کا رخ اس کی طرف تھا، اس نے معمول کے مطابق اخبار شہ سرخی دیکھی، دوسری ذیلی سرخیوں پر ایک نگاہ ڈالی پھر بیک پیج کی سرخیاں دیکھیں، ی ہسپتال، ڈاکٹرز یا نرسوں کے حوالے سے اسے خبر نظر نہیں آئی جنہیں وہ بہت توجہ سے ا کرتی تھی پھر اس کے مطلب کی کوئی اور خبر بھی نہیں تھی تاہم اس نے اپنی عادت کے ابق اخبار کو کھول کے اندر کے صفحات پر بھی ایک پھسلتی سی نگاہ ڈالی۔

اس نے موٹی موٹی سرخیاں دیکھ کر اخبار کو واپس اسی ترتیب سے بند کیا جس ترتیب وہ کھلنے سے پہلے تھا اور جب وہ اخبار کو تہہ کر کے پیچھے میز پر رکھنے لگی تو اچانک ایک ل کالم کی ایک تصویر نظر آئی، اس نے اخبار واپس اٹھایا اور چھوٹی تصویر کو دیکھا جو جانی نی لگ رہی تھی، اس نے نام پڑھا تو چونکی کہ وہ مسٹر عابد علی، سر زاہد علی کے بڑے بھائی تصویر تھی اور جو کم و بیش روزانہ تھوڑی دیر کے لئے ہسپتال کا ایک راؤنڈ لگاتے تھے اور ہار نرس انیسہ سے بھی ان کی ''ہیلو ہائے'' ہوتی تھی اور وہ زاہد کی صحت کے بارے میں پوچھتے تھے۔

''خدا خیر کرے، ان کی تصویر آخر کیوں اخبار میں چھپی ہے؟'' انیسہ نے ب
اسے تشویش ہوئی کہ وہ کچھ اور سمجھ رہی تھی اور اسے عابد صاحب کی سلامتی کے حوالے سے
دوسری طرف دھیان گیا تھا، انیسہ نے بے چینی اور اضطراب کے عالم میں جلدی جلد
تصویر کے نیچے لگی چھوٹی سرخی اور خبر پڑھنا شروع کی۔

''اوہ مائی گاڈ......!'' وہ خبر پڑھ کر دہل گئی، خبر زاہد صاحب کے بیٹے اور عا
صاحب کے بھتیجے علی کے اغوا سے متعلق تھی۔ انیسہ خبر پڑھ کر تھر تھر کانپنے لگی، اس نے جلد
سے اخبار لپیٹا اور آہستہ سے گدے کے نیچے رکھ دیا، اس وقت تک غالباً زاہد کی نیند پو
ہو چکی تھی یا پھر بیڈ میں ہلکی سی جنبش سے زاہد کی آنکھ بہت پرسکون طریقے سے کھل گئی، ا
نے انیسہ کو سامنے بیٹھے ہوا دیکھا تو جیسے کھل گیا، وہ انیسہ کو دیکھ کر ہمیشہ بہت خوش ہوتا تھا۔

''ہیلو......!'' زاہد مسکرایا اور انیسہ کو وش کیا۔

''ہیلو......!'' انیسہ نے جوابی طور پر وش کیا اور مسکرائی اور یہ مسکراہٹ اس کی جر
تھی کیونکہ زاہد کے بیٹے علی کی جو خبر اس نے ابھی ابھی پڑھی تھی، اس کے زہر نے انیسہ
اندر سے مسکراہٹ کی ایک ایک لکیر کھینچ لی تھی۔

''کب سے بیٹھی ہو......؟'' زاہد نے نیند کی حسین رانی کو ایک ہلکی سی جمائی
ساتھ رخصت کرتے ہوئے پوچھا۔

''کافی دیر سے......!'' انیسہ بولی۔

''شاید میں آج بہت سویا ہوں۔'' زاہد نے تھوڑی سی کروٹ لی اور رخ صحیح طور
انیسہ کی طرف کیا۔

''ماشاءاللہ! اچھی نیند لی ہے آپ نے......!'' انیسہ نے تائید کی۔

''دراصل میں آج بہت خوش تھا۔'' زاہد نے اپنے بدن کو تھوڑا اکڑا کے ریلیک
کیا۔

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔'' انیسہ جبری گفتگو کرتے ہوئے بولی۔

''پتہ ہے ناں آج میری چھٹی ہونے والی ہے۔''

''ہاں پتہ ہے! ڈاکٹر تو یہی کہہ گئے تھے، اب وہ آ جائیں تو فیصلہ کریں گے۔
انیسہ نے کہا۔

''بھئی فیصلہ تو ہو گیا ہے، وہ کیا فیصلہ کریں گے......؟'' زاہد ترت بولا اور ل
لاابالی طریقے سے کہنے لگا۔ ''معلوم ہے میں نے اب کیا فیصلہ کیا ہے، میں نے یہ فیصلہ

کہ آج کے بعد ہسپتال آ کے آپ لوگوں کو تنگ نہیں کروں گا، اب اگر ٹھیک ہو گیا تو میں
گھر میں مرنا پسند کروں گا، ہسپتال نہیں آؤں گا۔''
''ہش ش......ش...... خدا کے لئے ایسا نہ بولیں۔'' انیسہ، زاہد کی اس بات سے ہل
گئی اور بولی۔ ''ہسپتال سے جاتے ہوئے اچھی اچھی باتیں سوچنی چاہئیں۔''
''اچھی بات یہ ہے کہ میری سوچ شائلہ سے شروع ہوتی اور شائلہ پر ختم ہونے کے
بعد بچوں سے شروع ہوتی ہے اور بچوں پر ختم ہوتی ہے۔'' زاہد بہت جذباتی انداز میں
بولا۔ ''انیسہ جی! ایک بات بتاؤ۔''
''جی......!'' انیسہ بہت وابستگی سے بولی۔
''اگر شائلہ کبھی تمہیں ملی تو اسے میرے بارے میں کیا بتاؤ گی؟'' زاہد نے پر تجسس
لہجے میں پوچھا۔
''کیا بتاؤں......؟'' انیسہ نے دریافت کیا۔
''اس سے کہنا میں نے اسے معاف کر دیا ہے، وہ بھی مجھے معاف کر دے۔'' زاہد
نمی ہوئی آواز میں بولا اور آبدیدہ ہو گیا۔
''سر......!'' آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ جب شائلہ جی آپ سے ملیں گی تو
آپ خود بھی تو اسے کہہ سکتے ہیں۔'' نرس انیسہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔
ہاں میں خود بھی کہہ سکتا ہوں اور خود کہوں گا لیکن اس صورت میں اگر میری اور اس
کی ملاقات ہو گئی تو...... اور اگر ملاقات سے پہلے مر گیا تو......!''
''پلیز سر......!'' اب کے نرس انیسہ زخمی پرندے کی طرح تڑپ کر بولی۔ خدا کے
لئے ایسا نہ بولیں...... اب تو آپ خدا کا شکر ہے ٹھیک ہو گئے ہیں بالکل......!''
''اس میں کوئی شک نہیں کہ مَیں ٹھیک ہو گیا ہوں لیکن موت تو برحق ہے ناں......''
زاہد نے کہا۔
''موت تو برحق ہے لیکن میری دعا ہے کہ میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔''
نرس انیسہ دل کی گہرائیوں سے بولی۔
''کیوں......؟'' زاہد، انیسہ کی بات سن کر چونک گیا۔ ''اتنا بڑا ایثار کیوں؟''
''پتہ نہیں......'' اس نے عجیب سے انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش دی اور ٹکر ٹکر زاہد
کے معصوم اور عالمانہ چہرے کو دیکھنے لگی، معاً دھڑ سے دروازہ کھلا اور وارڈ مین ایک اخبار
ہاتھ میں لئے تیزی سے اندر داخل ہوا اور واویلا مچانے کے انداز میں بولا۔ ''سر جی......

سر جی! آج آپ نے اخبار دیکھا؟"

"ارے کیا ہے؟" نرس انیسہ گھبرائی، وہ تو بات کو چھپا رہی تھی۔ "لے جاؤ اِ واپس اور سر کو صبح صبح تنگ مت کرو۔" انیسہ غصے میں بولی اور وارڈ مین کو پیچھے دھکیلنے کوشش کی۔

"ارے کیا کرتی ہو سسٹر! دیکھو تو سہی اس میں خبر کیا ہے؟" وارڈ مین پھر آ بڑھا اور کہنے لگا۔ "اس میں سر کے بیٹے کی خبر ہے۔"

"کیا ......؟" زاہد چونکا۔ "میرے بیٹے کی خبر! کیسی خبر، اخبار لاؤ۔" زاہد گھبراہٹ میں تحکماً کہا اور اس سے پیشتر کہ اخبار وارڈ مین سے جھپٹ لینے کی کوشش وہ پلنگ سے نیچے گر جاتے، وارڈ مین خوف زدہ ہو کر آگے بڑھا اور انیسہ بے بس ہو کر ہٹ گئی۔ اخبار کا وہ کالم جہاں عابد صاحب کی تصویر اور علی کے اغوا کی خبر شائع ہوئی وارڈ مین نے کھول کے نمایاں کر رکھا تھا۔ زاہد نے اخبار کا پورا صفحہ کھول لیا اور ایک ہا سے اخبار کا ایک سرا اور دوسرے ہاتھ سے دوسرا سرا پکڑ کے اخبار کو اس طرح چہرے سامنے کیا کہ زاہد کا چہرہ اخبار کے صفحے کے پیچھے چھپ گیا۔

"اوہ گاڈ ......؟" عابد صاحب کی تصویر دیکھتے ہی زاہد کو ایک جھٹکا لگا اور وہ ا گیا۔

"یہ کیا کیا تم نے بے وقوف ......!" نرس انیسہ وارڈ مین کو دروازے کی طرف گئی اور سرگوشی میں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں ایک بیمار آدمی کو ا طرح کی خبر بہت آرام سے سنائی جاتی ہے۔"

"سوری سسٹر! غلطی ہو گئی، موٹی عقل کا آدمی ہوں۔" وارڈ مین نے معا چاہتے ہوئے کہا۔

"دفعہ ہو جا اور لے جا اپنی اس موٹی عقل کو اپنے ساتھ۔" انیسہ نے پھر ز وارڈ مین کو ڈانٹا اور وہ شرمندہ سا ہو کر چلا گیا۔ زاہد صاحب اخبار کا صفحہ اپنے چہرے آگے پھیلائے اور چہرہ چھپائے ابھی تک خبر میں گم تھے۔

"سر! آئی ایم سوری ...... میں نے اخبار بہت پہلے دیکھ لیا تھا لیکن میری سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ خبر آپ کو کیسے سناؤں، اس بے وقوف آدمی نے واویلا مچا دیا۔" انیسہ کہنا شروع کیا اور بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ یہ ایک ایسی خبر ہے کہ جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں لیکن پھر میں آپ سے یہی کہوں گی کہ ا

پریشان نہ ہوں، اس لئے کہ جیسا خبر میں آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کراچی کی ساری پولیس الرٹ ہو گئی ہے، ان شاء اللہ آپ کا بچہ خیریت سے ہے اور بہت جلد آپ کو ملے گا۔'' انیسہ نے زاہد کو تسلی دیتے ہوئے بہت انسیت سے کہا لیکن زاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے اخبار کو ابھی تک اپنے چہرے کے سامنے پھیلا رکھا تھا۔

''لائیے اخبار اب مجھے دے دیں۔'' انیسہ نے اخبار ان کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی لیکن زاہد صاحب نے اخبار نہیں چھوڑا۔

''چھوڑیئے اخبار......!'' انیسہ نے اخبار کو تھوڑا سا کھینچا تو اخبار بیچ میں سے پھٹ گیا لیکن زاہد صاحب کے ہاتھ سے چھٹا نہیں۔

''سر......سر......!'' نرس انیسہ گھبرائی اور ان کے ساکت و جامد چہرے کو دیکھ کر خوف زدگی میں پکاری۔''سر جی......!''

لیکن زاہد کے چہرے اور جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی، آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے اخبار کو دیکھ رہی ہوں اور مڑی ہوئی انگلیوں کے اندر اخبار کے ٹکڑے پھنسے ہوئے تھے۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آج کے بعد ہسپتال آ کے آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔'' تھوڑی دیر پہلے انیسہ سے کیا ہوا وعدہ جیسے انہوں نے پورا کر دکھایا۔

''سر جی......!'' انیسہ نے ایک فلک شگاف چیخ بلند کی جو ہسپتال کے اندر دور دور تک گونج گئی اور اس چیخ کی گونج میں زاہد کی سانسیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھیں۔

فرید بھائی اور زارا کو تفریحی دورے پر گئے ہوئے ایک ڈیڑھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا اور اگر وہ واپس آتے تو یقیناً پہلے ہی دن شمائلہ سے ٹیلیفون پر رابطہ ضرور کرتے لیکن ان کی کوئی اطلاع نہیں تھی اور شاہ جی نے فرید سے وعدہ کیا تھا کہ ایک مہینے بعد جب وہ لوگ واپس آئیں گے تو وہ طلاق کا کاغذ اس کے ہاتھ میں بلا حیلہ وہاں دیں گے اور پھر یوں وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے گی لیکن ڈیڑھ مہینے والوں کی اور فرید بھائی کی اطلاع آئی تھی اور نہ ہی شاہ جی نے شمائلہ کی نجات کی بات کی تھی اور شمائلہ نے بھی یہ تذکرہ اس لئے نہیں چھیڑا کہ فرید جیسے اترے، شمائلہ اور کہا تھا کہ وہ خود ہی بات کریں گے اور پھر شمائلہ کو یہ بھی اندیشہ اس سے پوچھا۔ بات کی تو وہ پہلے کی طرح کہیں چڑ نہ جائیں اور چڑ کر بالکل ہی

نہایت صبر وتحمل کے ساتھ شاہ جی کے جبر کے بلڈوزر کے نیچے کچلی جارہی تھی اور اف نہیں کر رہی تھی تاہم گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے شاہ جی آج کل ایک ہی خوشگوار رنگ میں تھے اور ہزار جان سے شائلہ پر فریفتہ ہو رہے تھے۔

ایک دن کھیت میں ننگے پاؤں شبنمی گھاس پر ٹہلتے ہوئے کسی کیڑے نے شائلہ کے تلوے میں کاٹ لیا تو شائلہ کو یوں لگا جیسے زور کی سوئی چبھ گئی ہو، اس نے بے اختیار ایک سسکی لی اور ''اوئی'' کی آواز نکالی اور پاؤں پکڑ کے لحہ بھر کو بیٹھ گئی، شاہ جی جو کیاری میں آگے آگے چل رہے تھے، ایک دم رکے اور یوں تڑپے جیسے شائلہ کو نہیں شاہ جی کو تکلیف پہنچی ہو۔

''کیا ہوا میری جان ......!'' وہ تڑپ کر بولے اور ایک دم شائلہ کے پاؤں پر جھک گئے۔

''کسی کیڑے نے تلوے میں کاٹ لیا ہے شاید۔''

''اوہ خدایا......!'' شاہ جی پریشان ہو گئے اور فوراً شائلہ کا پاؤں اپنی گود میں رکھ کر ناراضی کے انداز میں بولے۔ ''سو دفعہ کہا ہے کہ ننگے پاؤں کھیت میں نہ آیا کرو۔''

''آپ ہی نے تو کہا ہے کہ گھاس میں پڑی ہوئی شبنم پر ننگے پاؤں چلا کروں۔'' شائلہ ناز و ادا سے بولی۔ وہ اکثر اس طرح کی ادائیں شاہ جی کو دکھا یا کرتی تھی تا کہ وہ خوش رہیں اور اس کا مطالبہ پورا کرنے میں پس و پیش نہ کریں لیکن ساتھ اسے یہ اندیشہ بھی رہتا تھا کہ اداؤں پر بہت زیادہ فریفتہ ہو کر وہ کہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دام محبت میں گرفتار نہ کرلیں تاہم وہ یہ رسک لے رہی تھی اور شاہ جی کے دل میں نفرت کی بجائے محبت کا جذبہ پیدا کر رہی تھی۔

''ہاں یہ بھی میں نے ہی کہا تھا۔'' وہ خود کو قصوروار گردانتے ہوئے بولے اور پھر شائلہ کا تلوا جو دیکھا تو گھبرا گئے۔ ''یہ تو خون بہہ رہا ہے، کہیں کسی زہریلے کیڑے نے نہ ہو، کہیں بچھو کا ڈنک نہ ہو۔'' شاہ جی مزید گھبراہٹ سے بولے۔

آ ئے اللہ......!'' شائلہ ڈر کر چونکی۔ ''اب کیا ہوگا؟'' شائلہ نے گھبرا کر کہا۔

ا نہ ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، اگر یہ زہر ہے تو میں ابھی اسے ختم کر دیتا

نہیں آ رہوں نے شائلہ کے پاؤں پر اپنا منہ رکھ دیا پھر شائلہ کو اطمینان دلاتے

کہنا شروع، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر یہ زہر تھا تو تمہارے

نہیں کہا جا ئمیرے اندر آ گیا ہوگا۔''

''یہ کیا کیا آپ نے ......؟'' شمائلہ سچ مچ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔''میری زندگی کی خاطر آپ نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی ...... کیوں ......؟''

''اس کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔'' وہ بے ساختہ بولے۔''اگر جواب ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ میری ہزار زندگیاں بھی ہوں تو تمہاری ایک زندگی پر قربان کردوں۔''

''اوہ میرے خدایا......!'' شمائلہ نے دل ہی دل میں کہا اور سوچنے لگی کہ یہ بات تو شاید یہ سچے دل سے کہہ رہا ہے اور پھر وہ سوچنے لگی کہ اگر واقعی سچے دل سے بول رہا ہے تو پھر میرا کیا ہوگا؟

''اٹھو اب اندر چلیں۔ اندر چل کے میں یہاں تھوڑی سی اسپرٹ لگاؤں گا اور ایک موٹی سی پٹی بھی۔'' شاہ جی نے شمائلہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

تقریباً دو مہینے جب گزر گئے اور فرید بھائی اور زارا کا کچھ پتہ نہ چلا تو شمائلہ کو بہت پریشانی ہوئی اور وہ ہر وقت اداس رہنے لگی، شاہ جی نے کئی بار فرید کے گھر فون بھی کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا، آخر ایک دن شمائلہ کی اداسی دیکھ کر وہ لاہور شمائلہ کو لے کر روانہ ہوئے۔''ارے بھئی تمہارے میکے کا معاملہ ہے، چلو دیکھ آتے ہیں اور دوپہر کا کھانا آج ہم سسرال ہی میں کھاؤں گا...... ہاہاہا......!'' وہ شمائلہ سے ازراہ مذاق بولے۔

''کیوں نہیں میرے سائیں۔'' شمائلہ نے اتفاق کیا اور کہنے لگی۔''پتہ نہیں وہ آئے بھی ہیں کہ نہیں۔''

''ضرور آ گئے ہوں گے ان شاء اللہ۔'' شاہ جی ڈھارس دیتے ہوئے بولے اور جیپ کی رفتار کو خاصا تیز رکھا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے ہی وہ فرید اور زارا کے گھر پہنچ گئے لیکن وہاں گھر کا بیرونی نقشہ ہی دیکھ کر دونوں بہت حیران ہوئے کیونکہ گھر اندر باہر سے رنگ و روغن ہو رہا تھا اور مزدور رنگ ساز وغیرہ بہت تندہی سے کام میں مصروف تھے، زارا یا فرید بھائی وہاں کہیں نہیں دکھائی دے رہے تھے اور ایک معزز سا سفید پوش آدمی کام کرنے والوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

''ان سے پوچھو۔'' شمائلہ نے شاہ جی سے کہا اور شاہ جی جیپ سے اترے، شمائلہ بھی ساتھ اتری اور دونوں سفید پوش آدمی کے پاس گئے اور شاہ جی نے اس سے پوچھا۔

''معاف کیجئے گا گھر کے مکین کہاں ہیں؟''

''اس گھر میں کوئی رہتا نہیں ہے، میں مالک مکان ہوں، رنگ و روغن کرا
ہوں، کرایہ پر دینے کا ارادہ ہے۔'' مالک مکان نے ایک ہی سانس میں بتا دیا لیکن ان
اس بات نے شمائلہ اور شاہ جی کو الجھا دیا۔

''لیکن یہاں فرید صاحب رہتے تھے اور ان کی بیگم، وہ کہاں گئے؟'' شمائلہ بے
ہو کے بولی۔

''آپ ان کے عزیز ہیں کیا؟'' مالک مکان نے پوچھا۔

''جی ہاں ......'' شاہ جی نے مختصراً کہا اور مالک مکان نے نہایت دکھ کے ساتھ کہا

''میرے بہت پرانے کرایہ دار تھے، وہ بہت اچھے تھے، دونوں میاں بیوی ......''

''لیکن ہیں کہاں ......؟'' شمائلہ تڑپ کر بولی۔

''وہ تفریح کرنے یورپ اور امریکہ کے دورے پر گئے تھے۔'' مالک مکان
کہا۔

''تو کیا ابھی تک واپس نہیں آئے۔'' شمائلہ بے چین ہو کر بولی۔

''بی بی! اب وہ شاید کبھی واپس نہیں آئیں گے، کہتے ہیں امریکہ کی کسی ریاس
میں ان کا جہاز کریش ہو گیا۔'' مالک مکان نے کہا اور شمائلہ، مالک مکان کا جملہ مکمل ہو
سے قبل ہی بے ہوش ہو گئی۔

......□......

''اب کیسی طبیعت ہے۔'' شمائلہ نے ایک طویل نقاہت کے بعد جب آنکھ کھولی تو شاہ جی نے بہت پیار اور ہمدردی سے پوچھا۔ وہ دو دن سے بستر پر غم سے نڈھال پڑی تھی اور وقفے وقفے سے اس پر بے ہوشی کا دورہ سا پڑ جاتا تھا۔ دو دن سے وہ چپ چاپ تھی۔ اس نے کوئی بات چیت بھی نہیں کی تھی اور کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ شاہ جی لاہور سے کچھ جوس کے ڈبے ساتھ لے آئے تھے اور اپنے باغ کا ڈھیر سارا پھل لا کے ٹوکری میں رکھ دیا تھا اور کئی بار سیب کی پھانک چھیل کر شمائلہ کے منہ میں ڈالی تھی لیکن شمائلہ اس طرح منہ سے نکال دیتی تھی کہ اگر حلق سے کوئی چیز اس نے نیچے اتاری تو قے ہو جائے گی۔ تاہم شاہ جی کے بے حد اصرار پر کبھی کبھار وہ جوس کے ڈبے کو منہ لگا کے اسٹرا کے ساتھ ایک دو قطرے پی لیتی تھی جس کی بدولت ہونٹ اور زبان تر ہو جاتی تھی اور جسم میں تھوڑی بہت توانائی بھی پہنچ جاتی تھی۔

شاہ جی ان دنوں ایک بالکل مختلف اور ہمدرد شوہر بن گئے تھے۔ شمائلہ جب فرید بھائی اور زارا کے حادثے کا سن کر بیہوش ہو گئی اور اس کے دانت ایک دوسرے سے جڑ گئے تو شاہ جی اس وقت جتنا پریشان ہوئے اتنا پریشان انہوں نے خود کو کبھی نہیں پایا تھا۔ وہ فوراً اسے جیپ میں ڈال کے ایک پرائیویٹ ہسپتال لے گئے تھے جہاں ڈاکٹرز نے شمائلہ کو تھوڑی طبی امداد پہنچائی۔ اسے ہوش میں لائے اور شاہ جی کو تسلی دی کہ محض صدمے کی وجہ سے ایسا ہے اور کچھ اس سے بڑھ کر بھی ہو سکتا تھا لیکن قدرت نے بچت کر دی پھر ہر ڈاکٹر نے شاہ جی کو تسلی دی تھی کہ وہ بیگم کو بے خوف ہو کر گھر لے جا سکتے ہیں لیکن کچھ دن انہیں آرام کی ضرورت رہے گی اور یہ بھی کہ شمائلہ کو چند روز تک کوئی ذہنی یا جسمانی دباؤ نہیں پڑنا چاہئے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ خوش رکھا جائے اور احتیاطاً ہسپتال والوں نے سکون کے لئے کچھ دوائیں بھی ساتھ دے دی تھیں اور یہ دوائیں کھا کر شمائلہ زیادہ تر لیٹی یا سوئی رہتی تھی۔ اس دن وہ ناشتہ کرنے کے بعد صبح سے بے خبر سوئی ہوئی تھی اور شاہ جی اس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ انہوں نے عورتیں تو انگنت دیکھی تھیں لیکن اتنی تفصیل سے

بھی بے خبر سوئی ہوئی جواں عورت کو نہیں دیکھا جتنا اس دن شمائلہ کو دیکھتے رہے۔ وہ کبھی سیدھی لیٹتی، کبھی اس کروٹ، کبھی اس کروٹ اور ہر کروٹ شاہ جی کے لئے دلنشین تھی۔

شاہ جی شمائلہ سے زیادہ کرشمہ قدرت کے قائل تھے کہ جس نے شمائلہ کو بے پناہ حسن ہی نہیں دیا بلکہ ہر ادا اور ہر انداز کا حسن بخشا تھا کہ سوتے ہوئے اگر کوئی کروٹ بھی لیتی تو کسی جمال پرست مصور کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح نقوش اور خم نمایاں ہو جاتے اور شاہ جی کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ جاگتے میں زیادہ خوبصورت لگتی ہے یا سوتے میں زیادہ دلکش۔

آج شاہ جی کو گھر سے باہر کئی کام تھے جن میں ایک اہم کام ان کا آستانہ تھا کہ مہینے میں ایک دن ان کے دور پرے سے بہت سے مرید آتے تھے، جہاں عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ نشست اور الگ الگ ملاقات کا انتظام تھا۔ جہاں حاجت مند اپنی امیدیں اور حاجتیں لے کر آتے اور شاہ جی سے انفرادی دعا کی درخواست کرتے اور شاہ جی سب حاجت مندوں کے لئے الگ الگ دعا کرتے وہ حاجت مند سے کہتے تھے کہ اللہ سے جو کچھ بھی مانگنا ہے اس کے لئے دل میں نیت باندھو اور آنکھیں بند کر کے خشوع و خضوع کے ساتھ رب سے لو لگا لو۔ اس دوران واقعی شاہ جی اپنے مریدوں کے لئے ٹوٹ کر دعا مانگتے۔ کسی کی حاجت پوری ہو جاتی کسی کی نہیں ہوتی کہ دعا قبول کرنے والی تو اللہ کی ذات ہے اور جس کی حاجت پوری ہو جاتی اس کا شاہ جی پر اور زیادہ پختہ یقین ہو جاتا لیکن یہ ایک الگ معاملہ تھا جس کا شمائلہ کو زیادہ علم نہیں تھا، وہ بس اتنا جانتی تھی کہ مکانوں سے دور میدان اور کھیتوں کی حدود سے باہر شاہ جی کی بیٹھک ہے جہاں ان کے مرید آتے ہیں ان کے دوست احباب آتے ہیں ان کے فصلوں کے خریدار آڑھتی اور بیوپاری آتے ہیں جن سے شاہ جی باہر ہی باہر معاملہ کر لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ شمائلہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی جاننا چاہتی تھی اور خود شاہ جی نے بھی باہر کے تمام معاملات کو اپنی حویلی کے معاملات سے الگ رکھا ہوا تھا اور کسی کو حویلی یا اس کے احاطے کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ شاہ جی کا کوئی عزیز رشتہ دار بھی گھر کے اندر نہیں آتا تھا۔ رشتے داروں سے ملاقات کے لئے بھی انہوں نے گھر سے باہر بیٹھک کے قریب ایک الگ بیٹھک رکھی ہوئی تھی۔ گھر کے وسیع و عریض رقبے میں صرف شاہ جی خود یا ان کی زوجہ رہ سکتی تھی۔

حویلی کے باہر شاہ جی کے کتنے رخ تھے، اس کے بارے میں شمائلہ ایک سرسری خبر رکھتی اور یہ جانتی تھی کہ وہ بیک وقت ایک چھوٹے موٹے پیر، ایک اثر و رسوخ والے

زمیندار، ایک بزنس مین اور پھر سب سے اہم بات جو اس کے علم میں آئی تھی وہ یہ کہ ٹوٹے ہوئے دلوں اور شکستہ رشتوں کو بہت نیک نیتی کے ساتھ حلالے کی ڈور سے دوبارہ جوڑ دیتے تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ انہوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ دوسرے کی ضرورت کے تحت شادی اور دوسرے ہی کی ضرورت کے تحت اسے طلاق بھی دے دیتے تاکہ وہ حسب خواہش واپس اپنے سابق شوہر کے پاس جا کر از سر نو شادی کر کے اپنے گھر کی خوشی دوبارہ سمیٹے اور نئے سرے سے اجڑا ہوا گھر آباد کرے۔

وہ ایسے کئی ویران اور برباد گھروں کی تاریکی میں حلالے کے دیے سے اجالا کر چکے تھے اور فرید بھائی نے شائلہ کی جو شادی، شاہ صاحب سے کروائی تھی اس کا بڑا سبب یہی تھا کہ عمر رسیدہ یا ادھیڑ عمر آدمی ہے۔ اپنے اس کام کے معاملے میں اچھی ساکھ رکھتا ہے لہٰذا کچھ دن شائلہ کو رکھے گا اور پھر چھوڑ دے گا لیکن شائلہ کو ایسی امید دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

شاہ جی نے شائلہ کو اپنی ذاتی اور ازدواجی زندگی کے کئی رخ دکھائے تھے۔ اس نے شائلہ پر بے پناہ ظلم بھی کئے تھے۔ ایسے مظالم جن کی روداد نہ ہر کسی کو سنا سکتی تھی نہ جس کی علامتیں ہر کسی کو دکھا سکتی تھی۔ پھر اس نے شاہ جی کو بے پناہ محبت کرنے والے آدمی کی شکل میں دیکھا جو اپنی حیثیت اور عمر سے قطع نظر رومیو جولیٹ جیسے پریمیوں کی مثال قائم کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہے کہ وہ جھیل سیف الملوک کے پہاڑوں پر محبت کی نئی داستان رقم کرے گا۔ پھر اس نے شاہ جی کو مرد کی شکل میں اذیت دینے والے کے روپ میں دیکھا جس نے اسے اتنا مارا کہ شاید کسی کوچوان نے گھوڑی یا گدھی کو نہیں مارا ہوگا اور اسے حکم دیا کہ وہ چیخنا چاہتی ہے تو منہ میں کپڑا رکھ کے اور دانتوں کو دبا کے چیخے تاکہ اس کی چیخ کمرے کی چار دیواری کی کھڑکی یا روزن سے باہر نہ نکلے۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ شاہ جی کی شخصیت تضادات کا نمونہ ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، اسے نبھانا ہے۔

اس نے شاہ جی کے سب رخ دیکھے اسی لئے اس نے زارا اور فرید بھائی سے کہا تھا کہ اس کے کم از کم سو چہرے ہیں اور وہ جب چاہتا ہے ایک چہرے کے اوپر دوسرا چہرہ چڑھا لیتا ہے لیکن شاہ جی کا سب سے حسین اور خوبصورت چہرہ اس نے وہ دیکھا تھا جو اس نے فرید بھائی اور زارا کے حادثے کی خبر سن کر شائلہ کو پہنچنے والے صدمے کے بعد چڑھا لیا تھا۔ یہ چہرہ ایک ہمدرد کا چہرہ تھا، ایک محبت کرنے والے ذمہ دار آدمی کا چہرہ تھا، اپنے سینے کے اندر دوسرے کے لئے دکھ درد کا احساس رکھنے والے انسان کا چہرہ تھا اور وہ آج

تین دن سے شمائلہ کی خدمت میں مصروف تھا اور انہوں نے خدمت اور محبت کی مثال قائم کر دی تھی اور مثال سے شمائلہ خوش کم اور پریشان زیادہ تھی کہ اسے پریشانی اس بات کی تھی کہ ایسی محبت کے مظاہرے کے بعد شاہ جی کہیں کمبل ہی نہ ہو جائیں۔

''اب کیسی طبیعت ہے۔'' شام کو جب شمائلہ نے تھوڑی سی آنکھ کھولی تو شمائلہ کے سرہانے ایک کرسی پر بیٹھے شاہ جی نے از راہ محبت پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔'' شمائلہ مختصر بولی۔

''دل پر کوئی بوجھ تو نہیں ہے ناں۔'' شاہ جی اس پر جھکے بغیر کچھ فاصلے سے بولے۔

''نہیں۔'' شمائلہ نے پھر مختصر جواب دیا۔

''تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے مولا۔'' شاہ جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کے اس طرح رب کا شکر ادا کیا کہ ان کے دعائیہ لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں لگ رہی تھی۔

''کیا وقت ہوا ہے؟'' شمائلہ نے قدرے توقف سے پوچھا اور ایک جمائی لے کر خود کو نیند کے خمار سے باہر لانے کی کوشش کی۔

''شام کے چھ بج رہے ہیں۔'' شاہ جی نے گھڑی دیکھے بغیر کہا جیسے انہوں نے لمحے گن رکھے ہوں۔

''چھ......'' وہ چونکی اور پھر کہنے لگی۔ ''میں ناشتہ کر کے سوگئی تھی۔ پورا دن......''

''ہاں تم نے آج پورا دن سو کے گزارا ہے اسی لئے تمہاری طبیعت بھی بحال لگ رہی ہے۔ ماشاءاللہ......'' شاہ جی از راہ محبت بولے۔

''اوہ......'' شمائلہ ایک بار پھر چونکی اور قدرے معذرت بھرے انداز میں کہنے لگی۔ ''آج آپ نے سارا دن میرے سرہانے بیٹھ کے گزار دیا۔'' وہ شاہ جی کی ممنون ہو رہی تھی۔

''تو کیا ہوا؟'' شاہ جی ترت بولے۔

''تھک گئے ہوں گے۔'' شمائلہ نے بھی ترت جواب دیا۔

''بیٹھے بیٹھے...... بھلا بیٹھے بیٹھے بھی تھکتا ہے کوئی۔'' شاہ جی نے منطق جھاڑی۔

''کیوں نہیں۔ بیٹھے بیٹھے تو زیادہ تھک جاتا ہے آدمی۔'' شمائلہ پھر بلا توقف بولی۔

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کون کس کے سرہانے بیٹھا ہے۔'' شاہ جی بھی فوراً اس طرح بولے جیسے مقابلہ مکالمہ بازی ہو رہا ہو۔ ''اگر ساری عمر تمہارے سرہانے بیٹھا

وں گا تو نہیں تھکوں گا۔" اور پھر خود ہی فوراً بولے۔"خدا نہ کرے زندگی میں کبھی تم
بارہ ایسے صدمے کا شکار ہو۔"

"دوبارہ اس سے بڑا صدمہ کیا ہو سکتا ہے میرے سائیں کہ اللہ نے دو پالے
ے بہن بھائی دیئے تھے اور دونوں دنیا سے بیک وقت اٹھ گئے۔" شمائلہ ایک ٹھنڈی
الس لے کر بولی اور شاہ جی دوبارہ مدلل جواب دیتے ہوئے بولے۔"اسی نے دنیا سے
مائے نا جس نے دیئے تھے۔ سو جس کی چیز تھی اس نے واپس لے لی۔ اب تمہیں صبر کرنا
ا۔"

"صبر ہی کر رہی ہوں ورنہ مر نہ گئی ہوتی۔" شمائلہ نے بے ساختہ کہا اور خود کو حوصلہ
نے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔"صدمے پہ صدمہ برداشت کر رہی ہوں لیکن ڈھیٹ
ں کہ نہیں مرتی۔"

"ایسا نہ بولو تمہیں اس وقت سب سے زیادہ حوصلے کی ضرورت ہے کیونکہ تم نے
ا بہت کچھ کرنا ہے۔" شاہ جی نے کہا اور بڑھ کر شمائلہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں
م کر آہستہ سے سہلایا اور شمائلہ کو شاہ جی کے انداز میں بڑی شفقت محسوس ہوئی اور پہلی
، اس نے اپنے اندر شاہ جی کے لئے نفرت کی کمی دیکھی۔

"آپ کو تو آج باہر کے بہت ضروری کام کرنے تھے۔"

"کام کی کوئی بات نہیں۔" شاہ جی بولے اور پھر کہنے لگے۔"کام تو ہوتے رہتے
لیکن آج مریدوں کا دن تھا دور دور سے آئے تھے۔"

"تو......" شمائلہ ازراہ تاسف بولی۔

"کچھ نہیں لنگر تو چلتا رہا۔" شاہ جی بولے اور پھر کہنے لگے۔"دعا نہیں ہو سکی۔"

"چچ چچ۔" شمائلہ سچ مچ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔"یہ تو بہت افسوس
ات ہے کہ دعا نہیں ہو سکی۔ آپ کو چلے جانا چاہیے تھا۔"

"تمہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر کیسے جاتا۔" شاہ جی نے کہا۔

"لیکن ایک میری خاطر کتنے لوگوں کا نقصان ہوا۔"

"کوئی نقصان نہیں ہوا۔" شاہ جی نے تسلی دی۔"کل میں نے سب کو ایک ہی
، میں بلایا ہے اجتماعی دعا ہو گی۔ قبول کرنے والا اللہ ہے۔" شاہ جی عقیدت سے
ے، اتنے میں شمائلہ اٹھ کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور سر کو ایک دو جھٹکے دے کر بالوں کا جوڑا
ور پھر ہونٹوں میں پکڑی ہوئی پن جوڑے میں ٹانک دی۔ شاہ جی اسے ٹکر ٹکر دیکھتے

رہے۔ اسے شمائلہ کے بال کھولنے اور پھر باندھنے کا انداز بہت اچھا لگا۔

''اب اٹھو تھوڑی سی سیر کرتے ہیں کھیتوں میں۔ بہت اچھی سرسوں پھولی ہوئی ہے۔'' انہوں نے شمائلہ کا ہاتھ تھاما اور پھر مزید کہنے لگے۔ ''لیکن اب تمہیں ننگے پاؤں نہیں جانے دوں گا۔'' اس پر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنسے اور شمائلہ بھی اپنا غم وقتی طور پر بھول کے از راہ مذاق بولی۔ ''اندر سے جی تو چاہتا ہوگا کہ میں ننگے پاؤں چلوں۔''

''وہ کیوں؟'' شاہ جی نے کسی ننھے معصوم بچے کے انداز میں پوچھا۔

''تاکہ پھر مجھے کوئی چیز کاٹے، پھر میرے تلوے سے خون نکلے اور پھر آپ م خون پی جائیں۔'' شمائلہ نے مذاق کرتے ہوئے کہا اور اس پر دونوں بے ساختہ ہنسے اا سرسوں کے کھیت کی طرف چلے گئے۔

''ادھر آ میرا بیٹا۔ میرے پاس بیٹھ...... میں آج تجھ سے ضروری باتیں کرنا چاہ ہوں۔'' اس دن علی کو اغوا کرنے والے شخص گلفام نے اپنے پاس مکان کی چھت پر ایک ہوادار جگہ پر بٹھایا اور بہت پیار سے سمجھانے لگا۔

گلفام ایک گھٹے ہوئے مضبوط بدن والا 35-40 سال کی عمر کا آدمی تھا۔ اس ا مکان ایک اچھے علاقے میں لیکن سوسائٹی کے دوسرے مکانوں سے دور الگ تھلگ تھا مکان ایک سنگل اسٹوری بنگلہ تھا جس کے اوپر ایک پینٹ ہاؤس تھا جہاں گلفام کے مختلف پروگرامز بنتے اور بگڑتے تھے۔ گلفام کبھی ایک پڑھا لکھا اور جوشیلا نوجوان تھا بیچلری ڈگری لینے کے بعد ماسٹر کی ڈگری کے لئے پڑھ رہا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں ضعیف اور بیمار تھی۔ دو جوان بہنیں بیاہنے کے قابل تھیں بلکہ شادی کی سرحد عبور کر والے دور سے گزر رہی تھیں لیکن واجبی سی شکل صورت ہونے کے سبب اور شرافت کی وا سے کہیں کوئی معقول کیا غیر معقول رشتہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ گلفام کے گھر کے مالی حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ اس نے تعلیم چھوڑ کے نوکری تلاش کرنا شروع کی اور جگہ اپنی بی اے کی ڈگری اور ایم اے فرسٹ ایئر کی مارک شیٹ دکھاتا پھرتا رہا لیکن ڈھونڈنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ ملک میں ڈھونڈنے سے خدا تو مل جاتا ہے لیکن نوکری نہیں سکتی، اس دوران دوسرا سانحہ یہ ہوا کہ باپ کے بعد ماں بھی مر گئی اور اب دونوں بہنوں کے سر پر گلفام ہی کا سایہ رہ گیا۔ حالانکہ وہ دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا اور ہونا تو چاہئے تھا کہ ماں باپ کی موت کے بعد بڑی بہنوں کا سایہ اسے ممتا اور شفقت کی چھاؤں

ہوتا لیکن لڑکی بڑی ہو یا چھوٹی وہ لڑکی ہوتی ہے، کمزور ہوتی ہے اور لڑکا بڑا ہو یا چھوٹا جب ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو پھر لڑکے کو ہی سرپرست بننا پڑتا ہے لہٰذا اس نے سرپرست بن کر بڑی مشکلوں سے چھوٹی بہن رانو کے لئے ایک رشتہ ڈھونڈا اور شادی کر دی، ہر چند کہ وہ سسرال میں خوش نہیں تھی لیکن گلفام نے دل کو اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ چلو شادی تو ہوگئی۔ ایڈجسٹ بھی ہو جائے گی لیکن بڑی بہن شانو کا فرسٹریشن بڑھتا گیا کہ اسے شادی کی کوئی امید نہیں رہی تھی، ماں کا چھوڑا ہوا کچھ طلائی زیور اس کے پاس موجود تھا پھر اس کے حصے کی باپ کی طرف سے ملی ہوئی رقم بھی گلفام نے امانت کے طور پر گھر پر رکھی ہوئی تھی، اس کے علاوہ شانو کو بچپن سے سلائی کڑھائی کا شوق تھا اور اس نے اس شوق کی تکمیل میں جہاں گھر کے لئے بہت سی چیز بنا رکھی تھیں اور اکثر اپنے جہیز کے کپڑے اور دوسری چیزوں کو دیکھ دیکھ کے خوش ہوتی تھی اور انہیں کیڑوں سے بچانے کے لئے کبھی کافوری گولیاں بکس میں ڈالتی تھی اور کبھی تیز دھوپ میں دن بھر پھیلائے رکھتی کہ محفوظ رہیں۔

اور یوں ہفتے دن مہینے اور سال گزرتے گئے اور گلفام کی بہن نے اپنے جہیز کو تو بہت تگ و دو سے کیڑوں سے بچائے رکھا لیکن اپنی جوانی کو دیمک سے نہ بچا سکی۔ اسے اندر ہی اندر دیمک لگتی گئی۔ اس کا رنگ جو پہلے ہی بے رنگ تھا زرد ہو گیا، بالوں میں سفید تار نمایاں ہو گئے اور چہرے پر چھائیاں چھا گئیں۔ وہ بہت عرصے تک کلر لگا کے ان سفید تاروں کو چھپاتی رہی اور کئی طرح کی جلد کی کریموں سے چھائیاں رگڑتی رہی لیکن پھر اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ کس لئے۔ اس نے سب کچھ ترک کر کے اپنے وجود کو اور قوت ارادی کو بھی ڈھیلا چھوڑ دیا۔

پھر محلے کا ایک مرد جس کی بیوی معذور سی تھی وہ اسے اپنے اندر دلچسپی لیتا ہوا معلوم ہوا، شانو کے اندر موہوم سی امید پیدا ہوئی اور ایک دن موقع پا کر اسے ملا بھی اور شانو نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر اس مرد نے شادی کا پیغام دیا تو وہ قبول کر لے گی اور پھر اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ اس کی معذور بیوی کی خدمت کرنے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھے گی، اسی لئے اس نے اس اجنبی مرد کو اپنے گھر میں عین اس وقت ملاقات کا موقع فراہم کر دیا تھا جب گلفام حسب معمول اپنے لئے نوکری اور اس کے لئے رشتہ تلاش کرنے کے لئے نکلا ہوا تھا لیکن وہ مرد انہیں مردوں میں سے ایک تھا جنہیں بیوی کی نہیں عورت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس کی بیوی معذور تھی، اس نے یہ سمجھا تھا کہ شانو چونکہ شادی کے بغیر عمر

گزار رہی ہے اس لئے اسے بھی شاید کسی کی ضرورت ہوگی لیکن شانو ایک ضبط وتحمل والی باکردار لڑکی تھی اس نے تنہائی اور موقع کے باوجود پڑوسی کی ہوس کا نشانہ بننے سے انکار کر دیا اور اسے سخت سست کہہ کر گھر سے نکال دیا، پھر کیا ہوا کہ وہ لڑکی شانو جواب ایک پوری عورت بن چکی تھی اور صبر کے گھونٹ پی کے اپنے گھر کی چاردیواری کے اندر خودساختہ قید بھگت رہی تھی کہ ایک دن دیوار پھلانگ کے دو ڈاکو اندر آ گئے اور دو گھر کے باہر پہرا دینے لگے۔ اس وقت شانو گھر میں اکیلی تھی۔ ڈاکوؤں نے گن پوائنٹ پر اسے ایک ایک کر کے لوٹنا شروع کیا۔ اس کے طلائی زیورات لوٹے جو اس کی ماں نے اس کے حصے کے جہیز کے لئے رکھے ہوئے تھے اس کی رقم چھینی جو باپ اس کے لئے ورثے میں چھوڑ گیا تھا اور پھر سب سے اہم چیز جو اس سے چھین کر لے گئے جس کی وہ نوجوانی اور اب جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کی سرحد تک حفاظت کرتی چلی آئی تھی وہ تھی اس کی آبرو...... وہ بھی لٹ گئی اور پھر اس نے نہ تو چیخ چیخ کے محلے کو جمع کیا نہ بھائی کی واپسی کا انتظار کیا کہ وہ آئے اور اسے دکھڑا سنائے۔ تھانے میں رپورٹ لکھوائے اور اس نے سوچا کہ رپورٹ سے کیا ہوگا۔ اس کی لٹی ہوئی عزت تو دنیا کی کسی بھی روشنائی سے لکھی ہوئی رپورٹ واپس نہیں لاسکتی اور اگر اس نے لٹنا ہی ہوتا تو وہ اتنا عرصہ گھٹ گھٹ کے کیوں جیتی، وہ اس محلے دار کو ذلیل کر کے گھر سے کیوں نکال دیتی، اسی دن لٹ جاتی۔ اس نے سوچا کہ اگر واویلا مچائے گی تو اور جگ ہنسائی ہوگی اور پھر شہر کے کچھ ادارے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر پریس میں بیان دیں گے۔ کانفرنسیں ہوں گی انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے آوازیں بلند ہوں گی اس کے پاس ٹی وی اور اخبارات سے لوگ انٹرویو لینے کے لئے آئیں گے۔ ''ہاں تو کیا ہوا کس طرح سب کچھ ہوا۔'' وہ شانو سے تفصیل پوچھیں گے اور چاہیں گے کہ شانو سب اس طرح بیان کرے کہ لفظوں سے بنائی ہوئی تصویر کو کوئی ڈرامہ نگار ڈرامائی تشکیل دے دے۔

''لیکن پھر کیا ہوگا پھر جب مال لٹ گیا کیا واپس آ جائے گا فرض کرو اگر رقم واپس آ گئی، زیور واپس مل گئے، اس کی آنکھوں کا نور کم کرنے والے سلائی کڑھائی کے کام کی چیزیں اگر واپس مل بھی گئیں تو کیا اس کی عزت کی ٹوٹی ہوئی تجوری واپس مل سکے گی۔''

''کیا فائدہ۔'' اس نے بھائی کی آمد کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور ایک خط بھائی کے نام لکھ کر ٹیبل پر چھوڑ دیا اور اس نے خود ہی محسوس کیا کہ سب کچھ لٹانے کے باوجود اگر کوئی چیز اس کی کوئی نہیں لوٹ سکا تو وہ ہے اس کی غیرت اور اس کا معاشرے کے خلاف احتجاج

کا حق۔

اور جب اس کا بھائی گلفام شام کو ایک رشتے اور ایک نوکری کی موہوم سی امید لے کر گھر لوٹا تو شانو اپنے کمرے کے اندر پنکھے سے لٹکی ہوئی احتجاج کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ سانحہ اور حادثہ گلفام کے لئے ٹرننگ پوائنٹ تھا جہاں سے اس نے زندگی کے راستوں پر یو ٹرن لیا۔ اس نے اپنی ڈگریاں، مارک شیٹ، نذر آتش کر دیں اور ایک گینگسٹر جونی کے پاس چلا گیا۔ جو کئی دنوں سے گلفام کی ٹوہ میں تھا اور اسے پیشکش کر چکا تھا کہ وہ جونی کا گینگ جوائن کر لے اور نوکری کے لئے جوتے چٹخانے چھوڑ دے۔ لیکن گلفام اس کے جھانسے میں نہیں چڑھا اور عزت و محنت کے راستوں پر رزق حلال کی تلاش کرنے کی تگ و دو کرتا رہا لیکن جس دن اس کی بہن کی جان و مال کے ساتھ اس کی زندگی عزت و آبرو، ظلم و بربریت کے برقی پنکھے کے ساتھ لٹک گئی تو اس دن گلفام نے اپنی محنت ہمت اور حوصلے کی لاشیں وقت کے بلڈوزر کے نیچے کچل دیا اور رات دن کی محنت اور پڑھائی سے حاصل کی ہوئی ڈگریوں اور مارک شیٹوں کو مایوسی کی آگ میں جلا کر ایک گن اٹھا لی اور جونی کی گینگ جوائن کر لی۔ جونی کی دی ہوئی ٹریننگ کے ساتھ اس نے چند برس ایک چھوٹی گینگ کے ساتھ ڈکیتیاں ڈالیں، گھر لوٹے، بینک لوٹے، گاڑیاں چھینیں، راہگیروں کا مال ہتھیایا اور خوب پیسے اکٹھے کئے لیکن جو کچھ لوٹتا تھا وہ پائی پائی جونی کے حوالے کرتا تھا اور جونی اسے دس ہزار روپیہ ماہوار ادا کرتا تھا اور کبھی کبھار خوش ہو کر اوپر سے بھی کچھ انعام دے دیتا تھا۔ باقی جونی کا اپنا حساب جو اوپر والوں سے چلتا تھا اس سے گلفام کا واسطہ نہیں تھا۔

سو اس طرح گلفام نے اپنی گینگ کے ساتھ مل کر لاکھوں روپے لوٹے اور اس کی تنخواہ دس ہزار سے پندرہ ہزار ہو گئی لیکن زندگی کا خطرہ کئی ہزار گنا زیادہ بڑھ گیا لہٰذا گلفام نے ایک دن اپنے باس جونی سے ٹکر لے لی اور اپنے لڑکوں کو لے کر جونی سے الگ ہو گیا اور ایک متوازی گروپ بنا لیا اور لڑکوں کے معاوضے میں بھی اضافہ کر دیا اور لڑکے بہت خوش ہو کر گلفام کے ساتھ کام کرنے لگے۔ جہاں تک انڈر ورلڈ اور مافیا کا تعلق تھا تو گلفام ان سب لوگوں سے واقف تھا اور جو معاملہ جونی اوپر والوں اور نیچے والوں سے پہلے خود کرتا تھا اس کا حساب کتاب گلفام کو بھی آتا تھا لہٰذا اس نے اب براہ راست خود سب سے معاملات طے کر لئے اور بے خطر ہو کے چھوٹی بڑی ڈکیتیاں اور اغوائے برائے تاوان کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ان وارداتوں میں اس کے کچھ لڑکے پھنس بھی گئے لیکن گلفام کے پاس لڑکوں کو باہر نکالنے کے کئی راستے موجود تھے۔ وہ دو چار دن سے زیادہ کسی کو اندر نہیں رہنے دیتا تھا اور کوئی معاملہ عدالت تک نہیں جانے دیتا تھا۔ چلا بھی جاتا تو بھی اسے پروا نہیں تھی۔ سب سے اچھی بات جو اس کی گینگ کی تھی، وہ یہ تھی کہ انہوں نے کبھی کسی کی جان نہیں لی تھی۔ گلفام نے انہیں ہدایت کر رکھی تھی کہ جان لینے کی دھمکی دو لیکن جو زندگی اوپر والے نے دی ہے وہ انسان سے چھینو نہیں اور لڑکوں کو یہ بات بہت پسند تھی۔ وہ پھنس جاتے تھے لیکن بندے کو مارتے نہیں تھے اور انہیں یقین تھا کہ اگر پھنس گئے تو پروا نہیں کہ گلفام پیچھے موجود ہے۔ سو وہ ایک ڈاکو تو تھا حالات نے اس کے اندر ایک مجرمانہ جذبہ ضرور پیدا کر دیا تھا لیکن اس کے اندر کی انسانیت ابھی مری نہیں تھی اور اسی انسانیت کے ناتے علی کے ساتھ اس کو بہت ہمدردی ہو گئی تھی۔

عابد علی صاحب کے بارے میں لڑکوں نے یہی اطلاعات فراہم کی تھیں کہ انہوں نے اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر ان گنت دولت کمائی ہے اور دو بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھجوا دیا جبکہ دو ادھر ہی پاکستان میں ان کے پاس موجود ہیں۔ کوئی صحیح اور مکمل کوائف گلفام کے پاس آئے نہیں تھے کہ جو دو بچے علی اور عینی ان کے پاس رہ گئے ہیں وہ ان کے اپنے نہیں بلکہ ان کے بیمار بھائی پروفیسر زاہد علی کے ہیں۔ یہ تفصیلات اسے اخبارات اور کچھ اپنے ذرائع سے زاہد علی کے انتقال کے بعد معلوم ہوئیں اور گلفام کو اس بات سے بہت دکھ ہوا کہ علی کے حوالے سے کسی قسم کا تاوان ادا کرنے سے عابد صاحب نے انکار کر دیا اور بچے کی زندگی داؤ پر لگا دی، اس لئے کہ ان کا اپنا نہیں تھا اور پھر جب زاہد علی کا انتقال ہوا تو ساری تفصیلات اخبار میں آئیں اور پتہ چلا کہ ان کے بے شمار اسٹوڈنٹس اور دانشور دوست جنازے میں شریک ہوئے تو وہ خود بھی جنازہ کے شرکاء کو دور سے دیکھ آیا تھا جہاں اسے عابد علی ایک جگہ کندھا دیتا ہوا نظر تو آیا لیکن بعد میں سوم کے دن لڑکوں نے بتایا کہ وہ کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ نہ عابد علی، نہ بیگم عابد علی۔ گلفام نے کئی بار ان کے گھر کے ٹیلیفون نمبروں پر فون کیا کہ سودے بازی کر کے تاوان کی رقم کو نیچے لے آئے اور بھاگتے چور کی لنگوٹی والے محاورے کے مصداق جو ملتا ہے لے لے......لیکن گھر پر فون اٹھانے والا ہی کوئی نہیں تھا اور پھر ایک ہفتے کے بعد گلفام کو اطلاع ملی کہ عابد علی نے کسی کو پاور آف اٹارنی دے دیا اور مکان فروخت کر کے وہ ملک سے باہر چلے گئے ہیں اور علی کی بہن عینی کا اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ آیا اسے وہ ساتھ لے گئے ہیں یا کسی کو

ے گئے ہیں۔ گلفام کے لڑکے بھی پریشان ہو گئے کہ علی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے کیونکہ موت کا تصور اس گینگ کے پاس نہیں تھا۔ وہ کبھی کسی کو مارتے نہیں تھے لیکن ڈرانے دھمکانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے مار دینے کی دھمکی ضرور دیا کرتے تھے اور علی کو مار دینے کی دھمکی بھی گلفام نے عابد صاحب کو دی تھی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور عابد صاحب اور بیگم عابد نے اپنی طرف سے علی کو موت کے حوالے کر دیا اور خود غائب ہو گئے ور گلفام کے لئے مسئلہ پیدا کر دیا کہ علی ان کے لئے ایک ذمہ داری بن گیا۔ گلفام کے گینگ کے لڑکوں نے گلفام کو مشورہ دیا کہ علی کو گلی میں چھوڑ دیا جائے آگے وہ جانے اور اس کا کام لیکن گلفام کا دل نہیں مانا وہ کہنے لگا کہ اس معصوم بچے کو گردش حالات کے حوالے کر کے چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے قوت پرواز نہ رکھنے والے کبوتر کے بچے کو بلیوں کے سامنے چھوڑ دیا جائے۔ لہٰذا گلفام نے فیصلہ کر لیا کہ وہ علی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک دن علی کا ہاتھ تھاما اور اس کو مکان کی چھت پر لے گیا۔

''ادھر آ میرا بیٹا۔ میرے پاس بیٹھ ...... میں آج تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' گلفام نے بہت پیار اور ہمدردی سے اپنے پاس بٹھایا۔ علی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ شروع میں بہت روتا رہا اسے اپنا اغوا ایک جنوں پریوں کی کہانی کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ گلفام اور اس کی گینگ کے لڑکوں سے بہت خوفزدہ رہا لیکن گلفام کا رویہ اس کے ساتھ اتنا مشفقانہ تھا کہ وہ دھیرے دھیرے مانوس ہو گیا۔ وہ اس کے لئے پھل بسکٹ، چاکلیٹس اور دوسری اچھی اچھی چیزیں کھانے کو منگواتا اور کولڈ ڈرنک کا پورا کریٹ اس کے سامنے ہوتا کہ جب جی چاہے پی لی۔ سو اس طرح کا پیار بھی اس کے لئے عجیب سا تھا کہ ڈاکو ٹیلیفون پر عابد کو دھمکی دیتا کہ وہ بچے کو مار دے گا لیکن ٹیلیفون رکھنے کے بعد علی کو گود میں اٹھا کے پیار کرتا اور چمکارنے لگتا۔ وہ اس کو موت کے گھاٹ اتارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پہلے بھی بچے اغوا کئے۔ بڑوں کو بھی یرغمال بنایا اور وارثوں کو دھمکیاں دیں کہ مار دے گا لیکن کبھی کسی کو خراش نہیں پہنچائی، تاہم وہ ہر وقت پریشان اور خوفزدہ رہتا تھا کہ اس نے جو پیشہ اختیار کیا ہے اس میں موت کا کھیل کسی وقت بھی کھیلا جا سکتا ہے تاہم ابھی تک اس کا نہ تو پولیس مقابلہ ہوا تھا نہ ہی کسی کی جان لینے کا کڑا امتحان اس کے سامنے آیا تھا۔ اس دن بہت سوچ بچار کے بعد علی کو اپنے پاس بٹھایا اور علی سے جو گفتگو کرنے لگا، وہ اس کی سوچ اور ذہنی سطح سے اونچی تھی تاہم وہ اسے سمجھاتا رہا۔

''دیکھو بیٹے یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا باپ مر چکا ہے۔'' اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ علی نے رونا شروع کر دیا۔

''میرا بابا مر گیا ہے۔'' وہ روتے روتے بولا اور گلفام نے اسے پیار سے ڈانٹ پلائی۔ ''اے رو نہیں نالائق میں نے تمہیں رونے کے لئے نہیں کہا۔'' گلفام نے کہا تو علی چپ ہو گیا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ تیرا باپ مر گیا ہے اور ماں کا پتہ نہیں، بتا بھی رہے ہیں کہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اللہ معافی۔'' گلفام نے بولتے بولتے کانوں کو ہاتھ لگایا اور علی نے محو حیرت ہو کر گلفام کو دیکھا اور وہ بولتا گیا۔ ''تمہارے باپ نے تمہیں تایا تائی کے پاس چھوڑا تھا لیکن وہ لوگ اپنی جان بچا کے ملک سے ہی نکل گئے اور اب تمہاری بہن کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے؟''

''اوں اوں عینی ی ی......'' وہ بہن کا سن کر پھر رونے لگ گیا۔

''اے چپ۔'' گلفام نے ڈانٹ پلائی۔ ''پھر رونے لگا۔ میری بات پوری سن لے میرے پاس اتنا ٹائم نہیں کہ تمہیں سارا وقت لیکچر دیتا رہوں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اب تمہارا دنیا میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے اور میں نے تمہیں اغوا کر کے اپنے لئے ایک عذاب مول لیا ہے اور اب میں ہی اس عذاب کو بھگتوں گا بھی۔ فیصلہ یہ کیا ہے میں نے کہ تم ہمارے پاس رہو گے۔'' یہاں تک کہہ کر وہ چپ ہوا، غور سے ایک نظر علی کو دیکھا۔ گلفام نے پاس رکھا ہوا چونگا اٹھا کے انٹر کام پر کہا۔ ''ذرا چھت پر آ جاؤ۔''

فوراً ہی درمیانی عمر کی ایک خوبصورت طرحدار عورت زینے طے کر کے اندر آئی۔

''ہم تمہیں بیٹا بنا کے پالیں گے۔ یہ رانی ہے تمہاری ماں اور میں ہوں تمہارا باپ۔ لیکن تمہارا نام تمہارے باپ پروفیسر زاہد علی کے نام سے ہی چلے گا، کہتے ہیں لوگ کہ وہ ایک بڑا عالم فاضل آدمی تھا۔ لیکن تقدیر اس کی بڑی نہیں تھی۔ چچ چچ......'' اس نے گفتگو روکی اور اظہار افسوس کر کے لمحے بھر کو چپ ہوا جیسے وہ علی کے باپ کے بارے میں سوچ رہا ہو۔

''اینی وے۔'' گلفام نے سوچ کا دھارا توڑا اور علی سے مخاطب ہوا، یہ جانے بغیر کہ وہ اس کی گفتگو سمجھ پا رہا ہے کہ نہیں۔ ''ہم نے یہ طے کیا تھا کہ کسی اولاد کو جنم نہیں دیں گے کیونکہ ڈاکوؤں کے بچے نہیں ہونا چاہئیں۔ وہ بڑے ہوں گے تو ڈاکو بنیں گے اور اگر کچھ اور بن جائیں گے تو بھی ڈاکو کے بچے کہلائیں گے۔ لیکن تمہارا کیا کریں تم تو پیدا شدہ ہمیں ملے ہو۔ سو ہم تمہیں پالیں گے لیکن یہ فیصلہ بعد میں کریں گے کہ تمہیں ڈاکو بنائیں

گے یا کچھ اور...... سمجھے۔''

گلفام نے علی کی طرف دیکھ کر کہا اور علی نے کچھ ایسے تاثرات دیئے جیسے کہہ رہا ہو کچھ نہیں سمجھا۔ گلفام نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم تمہیں پڑھائیں گے، لکھائیں گے ڈگریاں اور ڈپلومے دلائیں گے لیکن اس لئے نہیں کہ تم نوکری ڈھونڈو۔ نوکری اس ملک میں عنقا ہو گئی ہے۔ عنقا سمجھتے ہو ایک پرندے کو کہتے ہیں جو حقیقت میں نہیں ہے اسی طرح نوکریاں بھی فرضی ہیں۔ یہ ڈگریاں کسی کام کی نہیں۔ پہلے کلرک بناتی تھیں اب صرف پارلیمنٹ کا ممبر یا وزیر بناتی ہیں۔''

یہ کیا اس کے ساتھ بک بک شروع کر رکھی ہے اسے ان باتوں کا کیا علم ہے۔'' معاً گلفام کی بیوی رانی نے بیچ میں مداخلت کی۔

''اس کو ان باتوں کا علم ہونا چاہئے۔'' وہ بیوی سے بولا۔ ''لے جاؤ اسے، تم بچہ نہیں پیدا کرنا چاہتی تھیں ناں۔ قدرت نے پلا پلایا دے دیا ہے۔ اسے ہم خوب لکھائیں پڑھائیں گے اور پڑھا لکھا کر ڈاکو بنائیں گے۔''

''توبہ اللہ......'' رانی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''کیوں میں پڑھا لکھا ڈاکو نہیں ہوں کیا۔'' گلفام ترت بولا اور یہ سب شہر کے لوگ جنہوں نے بندوقیں نہیں اٹھائی ہوئی ہیں یا اٹھائی ہوئی ہیں کون ہیں سب۔ لے جاؤ اسے۔'' گلفام بولا اور رانی، علی کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئی۔

ڈائمنڈری خوب چل نکلی۔ یہ ڈائمنڈز کی ایک چھوٹی سی دکان کا نام تھا جو شمس نے کھولی تھی لیکن اس دکان میں گاہک بہت کم لیکن بہت بڑے بڑے پیسے والے آتے تھے کیونکہ یہ ایک چھپا ہوا کام تھا جو ہر آدمی کے مطلب اور ہر آدمی کے سمجھنے کا نہیں تھا۔ اسے صرف ثریا نام کی افریقی عورت سمجھتی تھی جسے شمس لاڈ اور پیار سے کالٹو کہتا تھا۔ کالٹو وہ اسے کالی ہونے کی مناسبت سے کہتا تھا۔

شمس کی کالٹو سے ملاقات نیروبی کے ایک شاپنگ سنٹر میں ہوئی تھی اور شمس اسے ایک نظر دیکھتے ہی لٹو ہو گیا تھا کیونکہ عورت تو اس کی ویسے ہی کمزوری تھی، اس نے ہر ملک، ہر قوم اور ہر رنگ کی عورت کی قربت حاصل کی تھی لیکن ایسی کو کبھی بے نقاب اور بے حجاب نہیں دیکھا تھا جو کوئلے کی طرح کالی ہو اور ثریا کوئلے کی طرح کالی تھی۔

وہ کچھ پتھر جیب میں ڈال کر نیروبی گیا تھا اور وہاں سے کچھ پتھر خرید کے امارات

سے ہوتا ہوا پاکستان لوٹنا چاہتا تھا۔ وہ اب ایک کل وقتی بزنس مین بن گیا تھا اور اس نے پتھروں کی سوداگری یا اسمگلنگ شروع کر دی تھی اور یہ کاروبار اس نے اپنے ماہر نفسیات ڈاکٹر کے مشورے سے شروع کیا تھا کیونکہ وہ بار بار اس کے پاس جاتا تھا۔ شمائلہ کا ٹیومر اس کے دماغ میں کہیں پھنس گیا تھا جو روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور جس کے لئے نہ کوئی دوا میڈیکل سائنس نے ایجاد کی تھی نہ کوئی آپریشن اس کا علاج تھا کہ رسولی کو نکال باہر کر دے اور میڈیکل سائنس کے اندر کوئی ایسی لیبارٹری بھی نہیں تھی جہاں اس ٹیومر کا معائنہ کر کے تشخیص اور علاج دریافت کیا جا سکے۔ لہٰذا شمس کے ڈاکٹر نے اپنے طور پر جو علاج سوچا تھا وہ یہی تھا کہ شمس کوئی کاروبار شروع کر دے اور چونکہ شمس نے ہیرے جواہرات میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا اس لئے ڈاکٹر نے اسے اسی کاروبار کو شروع کرنے کا مشورہ دیا اور شمس اس مشورے پر عمل پیرا ہوا تو اسے کاروبار کی ابتدا ہی میں ایک بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے پاس نقد پیسہ تو نہیں تھا لیکن مشرق وسطیٰ سے آنے کے بعد اس نے جو بچت سرٹیفکیٹ خریدے تھے اس نے کیش کرا لئے اور ایک بروکر کے مشورے سے کسٹم میں پڑا ہوا سکریپ بہت سستی نیلامی میں خرید لیا۔ اس اسکریپ کو اس نے موٹر کاروں کے اسپیئر پارٹس کا ہول سیل کرنے والے ایک بیوپاری کے سامنے جب کھولا تو اس میں سے بڑی اور چھوٹی گاڑیوں کے ایسے پارٹس نکلے تو مارکیٹ میں بالکل ناپید تھے۔ یہ سارا اسکریپ ہول سیل بیوپاری نے فوراً خرید لیا اور یوں شمس کو اس سودے میں اتنا منافع ہوا کہ وارے نیارے ہو گئے۔

سب سے بڑا چمتکار تو یہ ہوا کہ اسے ایک زنگ آلود چھوٹا سا ڈبہ ملا جو اس نے اٹھا کے الگ رکھ دیا تھا اور جب اس ڈبے کو توڑ کے کھولا تو اس میں سے میلے کچیلے چھوٹے چھوٹے پتھر نکلے۔ ان پتھروں کی جب اس نے ایک جوہری کے کارخانے سے کیمیکل سے صفائی کروائی تو جوہری کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اس نے شمس کو بتایا کہ یہ تو بہت ہی قیمتی ڈائمنڈ ہیں جو شمس سے ایک ہی جواہرات کے ڈیلر نے لاکھوں میں خرید لئے، یوں شمس کو ایک لائن مل گئی اور وہ پتھروں کی تجارت میں ہمہ تن مصروف ہو گیا اور شمائلہ کا دھیان وقتی طور پر اس کے من سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک بیوپاری چوناوالا کے کہنے سے نیروبی کا چکر لگایا اور ثریا کا ایڈریس اور حوالہ بھی اسے اسی تاجر نے دیا تھا۔ جب وہ ثریا کا پتہ ڈھونڈتا ہوا نیروبی اس کے گھر پہنچا تو کسی نے اسے بتایا کہ وہ قریب ہی ایک شاپنگ سنٹر میں گئی ہوئی ہے، شمس اس کی تلاش میں شاپنگ سینٹر پہنچ گیا۔ غائبانہ تعارف تو تاجر نے کرا

دیا تھا اور حلیہ بھی بتا دیا تھا لہٰذا شمس جب شاپنگ سنٹر پہنچا تو اس وقت اسٹور میں پانچ چھ سے زیادہ لوگ نہیں تھے وہاں اسے ایک کوئلے کی طرح کالی بجھنگ عورت نظر آئی لیکن جو کالی ہونے کے ساتھ ساتھ شمس کو بہت صحتمند اور بلا کی پرکشش لگی۔ وہ بلا تامل سیدھا اس عورت کے پاس پہنچا اور آہستہ سے پکارا۔ ''ثریا۔''

''یس......'' ثریا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پلیز ٹو سی یو...... میرا نام شمس ہے۔'' شمس نے ہاتھ ملایا اور اپنے دوست چونا والا کا کارڈ نکال کے دکھایا۔

''اوہ گڈ۔'' ثریا نے کارڈ دیکھ کر کہا۔ ''آپ نے کیسے پہچانا مجھے۔''

''چونا والا نے آپ کا حلیہ بتایا تھا اور بولا تھا ثریا سے کالا عورت گاڈ نے پیدا نہیں کیا۔ ابھی ہم ادھر دیکھا دھویں کا مافق ایک ہی عورت تھا۔'' وہ چھوٹتے ہی بے تکلف ہوگیا۔

''یو پکا بدمعاش۔'' ثریا کھلکھلا کر بولی۔ ''چونا والا نے ہم کو فون پر بتایا تھا اور ٹھیک بتایا۔''

''کیا بتایا تھا؟'' شمس نے پوچھا۔

''بولا تھا ہم کالا ہے لیکن تم کو چونا لگائے گا۔'' اس پر دونوں خوب ہنسے اور اس پہلی ہی ملاقات میں دونوں کے درمیان دوستی بھی ہوگئی اور پارٹنر شپ بھی۔ ثریا پتھروں کی بہت پرکھ رکھتی تھی۔ ان کے نام، قیمتیں، مقام، ہر شے سے واقف تھی اور سب سے جو اہم کام وہ جانتی تھی اور جس کی ایکسپرٹ تھی وہ یہ تھا کہ پتھروں کے حوالے سے تقویم کا علم جانتی تھی کہ کس کی یوم پیدائش کے مطابق کونسا پتھر ہونا چاہیے۔ کس کے نام کے ساتھ کیسا پتھر منسوب ہوگا لہٰذا اس نے شمس کو بہت سے ترشے اور غیر ترشے پتھر خفیہ بازاروں اور خفیہ افراد سے خریدنے میں مدد کی۔ بہت سامان وہاں سے لے کر دونوں آئے اور کراچی شہر میں ایک چھوٹی لیکن خوبصورت دکان لے کر آرٹی فیشل جیولری سے سجائی لیکن اس آرٹی فیشل جیولری کی آڑ میں یوم پیدائش اور نام کے پتھروں کا کام خوب چمکایا۔ ثریا بندے کا نام پوچھتی، تاریخ پیدائش پوچھتی اور پھر اسے بتاتی کہ نیلم، پکھراج، الماس، مون اسٹون، یاقوت یا پھر اور درجنوں نام تھے جو وہ پتھر کی شکل دیکھ کر بندے اور بندے کی شکل دیکھکر پتھر کا نام بتا دیتی تھی اور یوں شمس اور ثریا کی ''ڈائمنڈری'' بہت اچھی چل پڑی۔ اکٹھے بزنس کرتے، اکٹھے رہتے تھے۔ دکان کے قریب ہی کچھ فاصلے پر انہوں نے ایک بہت

اچھا اپارٹمنٹ لے لیا تھا اور جہاں شمس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا تھا اور ثریا جسے وہ کالٹو کالٹو کہتا تھا اور ثریا اس کے منہ سے کالٹو سن کر بہت خوش ہوتی تھی اسے پہلی دفعہ ثریا کے سیاہ بجھنگ وجود کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ اکثر لوگ رات کو حسین کیوں کہتے ہیں اور دونوں میں بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ چاہے وہ انڈراسٹینڈنگ دکان میں ہو جائے، بیڈروم میں ہو۔ شمس نے کبھی اسے کالے رنگ کا طعنہ نہیں دیا تھا لیکن اس کی سیاہ رنگت پر وہ چھیڑ چھاڑ بہت کرتا، جسے کالٹو بہت انجوائے کرتی تھی۔

ایک دن کیا ہوا کہ دونوں نے ایک بزنس مین کے گھر ڈنر پر جانا تھا۔ اس دن ثریا نے ڈنر پر جانے کے لئے سیاہ لباس پہنا اور جب گھر سے نکلنے لگے تو شمس نے اس کے سراپے کو غور سے دیکھا اور از راہ چھیڑ چھاڑ بولا۔ ''آج عریاں ہی جاؤ گی۔''

''یو پکا بدمعاش ...... چونا والا ٹھیک بولتا تھا۔'' ثریا نے کہا اور پیار سے مکے مارنے لگی۔

اس رات دونوں خوب مخمور تھے۔ رات نصف سے زیادہ گزر گئی تھی، نشے میں دونوں کھل کر اندر سے باہر آ گئے تھے اور خوب باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ثریا لمحہ بھر کو چپ ہوئی اور سنجیدگی سے پوچھا۔

''شم۔'' وہ شمس کو شم ہی کہتی تھی۔ ''کیا تم مجھ سے سچ مچ لو کرتا ہے۔''

''بہت میری جان کالٹو۔ میں نے اتنی لو آج تک کسی سے نہیں کی ہے۔ کسی گوری عورت سے بھی نہیں۔'' وہ بہک کر بولا۔

''لیکن میں تو بہت کالی ہوں۔'' اس نے قدرے احساس کمتری سے کہا۔

''تو کیا ہوا؟'' شمس بے ساختہ بولا۔ ''سنگھاڑا بھی تو تمہاری طرح کالا ہوتا ہے۔''

''سنگاڑا کیا ہوتا ہے؟'' اس نے بے خبری میں پوچھا۔

''ایک پھل ہے، ایک کھانے کی چیز ہے باہر سے کوئلے کی طرح اور اندر سے دودھ کی طرح سفید اور مزیدار جس طرح تم۔''

''کیا اب تم کو شمالا یاد نہیں آتی ہے۔'' ثریا نے پوچھا کیونکہ شمس نے اور شمس کے ڈاکٹروں نے ثریا کو شمائلہ کی ساری داستان سنا رکھی تھی اور اب ثریا پوری کوشش کر رہی تھی کہ شمس شمائلہ کو بھول جائے۔

''کون شمائلہ...... ٹو ہیل ود......'' اس نے ایک گھونٹ اور دھویں کے ایک مرغولے

میں شمائلہ کے نام کو اڑا دیا۔

''تو پھر تم ہم سے اسلامی طریقے سے نکاح کیوں نہیں کرتا۔'' ثریا نشے کے باوجود حرف مدعا پر آ گئی۔

''یو مین شادی۔'' اس نے پھر ہانک لگائی۔

''ہاں شادی۔'' ثریا نے کہا۔

''اوہ مائی ڈیئر کالٹو۔'' اس نے کالٹو کو نشے میں ایک جگہ سے اٹھا کے دوسری جگہ بٹھا دیا اور بولا۔ ''دیکھو شادی اسلامی طریقے سے ہو، کرسچن طریقے سے ہو، ہندو طریقے سے ہو، یہودی طریقے سے ہو...... کچھ فائدہ نہیں، بیکار ہے شادی۔ جسٹ انجوائے دی لائف اور ہم انجوائے کر رہے ہیں...... آرنا ٹ وی......''

''شم دیکھو......''

''ہش ش ش۔'' وہ شاید مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شمس نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور بہت سنجیدگی سے بولا۔ ''دیکھو میری کالٹو۔ ایک بات غور سے سن لو۔ میں عورت کو حاصل کرتا ہوں شادی نہیں۔ اگر میں نے شمائلہ کو حاصل کر لیا ہوتا تو اس کے ساتھ بھی شادی نہیں کرتا۔''

''کیا......؟'' ثریا چونکی۔

''ہاں میری کالٹو اب بھی میں اسے حاصل کروں گا شادی نہیں۔'' وہ بولا۔

ثریا اس کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئی۔

❁

اس دن شاہ جی کے گھر کا عجیب رنگ تھا۔ جب سے شمائلہ کے ساتھ شاہ جی کی شادی ہوئی تھی تو شاہ جی نے معلوم نہیں گرگٹ کی طرح کتنے رنگ بدلے تھے اور شمائلہ نے ہر رنگ کو دیکھا اور برداشت کیا لیکن اس دن شمائلہ نے شاہ جی کو جو اپنا رنگ دکھایا تو وہ اس کا بالکل نیا اور انوکھا رنگ تھا۔ نہ شمائلہ نے کبھی پہلے دکھایا تھا نہ شاہ جی نے دیکھا تھا۔ شاہ جی دم بخود رہ گئے تھے۔

❁......□......❁

شمائلہ اس طرح اشتعال میں آ گئی تھی جیسے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو، وہ بازو پھیلا پھیلا کراور اچھل اچھل کر شاہ جی کو برا بھلا کہہ رہی تھی اور شاہ جی دم بخود سامنے بیٹھے تھے۔

''تم فراڈ ہو۔ بے ایمان ہو، جھوٹے ہو، مکار ہو۔تمہارے سو چہرے ہیں۔روپ بدل بدل کر لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو۔'' شمائلہ گالیاں دیتے دیتے تھک کر ایک لمحے کو چپ ہوئی تو شاہ جی بولے۔

''اور کچھ......'' شاہ جی ذرا بھی اشتعال میں نہ آئے بلکہ جب شمائلہ لمحے بھر کو چپ ہوئی تو تحمل سے بولے۔''کچھ اور کہنا تو کہہ لو۔''

''جتنا بھی کہوں کم ہے آج میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ جوتا اٹھا کے تجھے مارنا شروع کر دوں۔'' وہ مزید غضبناک ہو کر توہین آمیز لہجے میں بولی۔

''تو شروع کر دو کس نے تمہارا ہاتھ روکا ہے۔'' شاہ جی نہایت عجز و انکساری سے بولے۔

''یہی تو تمہارا منافقانہ روپ ہے۔تم گھڑی میں کچھ، گھڑی میں کچھ ہو جاتے ہو۔'' وہ شاہ جی کی انکساری ہی دیکھ کر بولی اور کہنے لگی۔''تم نے ایک وقت میں مجھے اتنا پیار کیا کہ میرے تلوے چاٹے، پھر دوسرے لمحے مجھے ہنٹروں سے پیٹا۔کبھی میرے جوتوں میں بیٹھے، کبھی جوتا میرے سر پر مارا۔تم ایک ہی زبان سے ہاں ایک ہی زبان سے ناں کرتے ہو۔تم تضادات کا ایک مجموعہ ہو، جھوٹے فریبی مکار۔'' وہ گالیاں دیتے دیتے تنگ آ کر چپ ہو گئی تو شاہ جی ٹھنڈے لہجے میں بولے۔''تو اب تم کیا چاہتی ہو...... بیٹھ کے بات کرو۔''

''تمہیں معلوم ہے، میں کیا چاہتی ہوں۔'' وہ زچ ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔''تم سے شادی میں نے طلاق کے لئے کی تھی۔فرید بھائی نے تمہیں پچاس ہزار روپے اس لئے

دیئے تھے کہ تم طلاق دے دو گے۔ اس لئے نہیں کہ زندگی بھر کے لئے میرے ساتھ نتھی ہو جاؤ گے۔''

''غلط۔'' شاہ جی بلا تامل تردید کرتے ہوئے بولے۔''میں نے پچاس ہزار طلاق کے لئے نہیں شادی کے لئے وصول کئے تھے۔ میں پیسے لے کر شادی کرتا ہوں، مفت نہیں۔''

''کیا کرائے کے ٹٹو ہو۔'' وہ توہین آمیز لہجے میں بولی۔

''تم کہہ سکتی ہو کہ کرائے کا ٹٹو ہوں۔ لیکن میں اس کام کے پیسے لیتا ہوں۔ شادی دوسروں کی خواہش پر کرتا ہوں، اپنی خواہش پر نہیں۔ اور یہ پیسے انہیں عورتوں پر خرچ کرتا ہوں اور اپنے اوپر بھی تا کہ......''

''تم ہو ہی بے غیرت......'' شمائلہ کی گالیوں کی نہ تو رفتار کم ہوئی تھی اور نہ تعداد ...... اور اس نے شاہ جی کو بات بھی پوری نہیں کرنے دی۔

''خاموش کتے کی نسل۔'' اب کے شاہ جی جلال میں آ گئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لگتا تھا ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔

''خبردار میرے باپ کو گالی نہ دینا۔'' شمائلہ تنک کر بولی۔ ''ورنہ......''

''ورنہ کیا کر لو گی تم...... کتیا کو کتے کی نسل نہ کہوں تو کیا کہوں۔'' شاہ جی اب واقعی بے قابو ہو گئے تھے۔

''کیا کہا......'' شمائلہ بھی کھڑی ہو گئی اور غصے سے کانپنے لگی۔

''میں نے کہا۔ ''کتیا۔'' شاہ جی نے دہرایا اور پھر کہنے لگے۔''کتیا ہو تم کتیا۔ اگر کتیا نہ ہوتی تو فرشتے جیسے شوہر کو چھوڑ کر اس کتے کو اپنے پیچھے نہ لگا لیتی۔'' انہوں نے یہ بات اس انداز میں کہی کہ ایک تیر شمائلہ کے دل میں ترازو ہو گیا۔

''یہ غلط ہے۔'' وہ کلیجہ تھام کر بولی۔

''یہ صحیح ہے۔'' شاہ جی ترت بولے۔''عورت اگر خراب نہ ہو تو مرد کبھی خراب نہیں ہوتا۔ پہلے عورت خراب ہوتی ہے وہ اپنے لباس اور اپنی زینت کی مرد کے سامنے نمائش کرتی ہے۔ ادائیں دکھاتی ہے، اکساتی ہے اسے کچھ کرنے پر۔''

''تم بکتے ہو۔'' شمائلہ جیسے موم کی طرح پگھل کر بولی اور صوفے پر دھنس سی گئی۔

''میں ٹھیک کہتا ہوں۔'' شاہ جی اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولے۔''جب وہ پہلی دفعہ تمہاری طرف راغب ہوا تھا تو تم نے اسی دن ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید

کر کے اس کا سامان اٹھا کے باہر پھینک دیا ہوتا تو مصائب کی یہ کہانی اسی دن ختم ہو جاتی اور نوبت یہاں تک نہ آتی لیکن تم اسے ڈھیل دیتی گئیں جیسے پتنگ کو ڈھیل دیتے ہیں اور جب پیچ لڑنے لگے تو پھر تم نے اپنی ڈور کھینچی اور بوکاٹا کا شور بلند ہو گیا۔''

''بس خدا کے واسطے بس کرو...... اور اپنے جھوٹ کا یہ پلندہ بند کرو۔'' وہ بے بس ہو کر ہچکیوں سے رونے لگی تو شاہ جی اٹھے اٹھ کر اس کے پاس صوفے کے بازو پر بیٹھے، ان کے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے اور ازراہ ہمدردی بولے۔ ''بلاوجہ خود بھی اشتعال میں آ گئی ہو اور مجھے بھی مشتعل کر دیا۔'' شاہ جی ہمدردانہ لہجے میں بولے اور شائلہ کے سر کو تھام کر اپنے پہلو کے ساتھ لگا لیا۔ ''اب تمہیں میں بالکل نہیں ستاؤں گا۔ جو کہو گی مانوں گا...... بولو کیا چاہیے۔'' شاہ جی نے پوچھا۔ وہ ایک دم پھر بدل گئے تھے جیسے گرگٹ نے رنگ بدلا ہو۔

''طلاق......!'' شائلہ ترت بولی۔ اس خیال سے کہ کہیں شاہ جی نے جو کھلا آپشن دیا ہے وہ کہیں اس پیشکش سے دستبردار نہ ہو جائیں۔ ''میرے بچے پریشان ہوں گے۔ میں ان کی وجہ سے پریشان ہوں۔ زاہد معلوم نہیں کس حال میں ہوگا۔ میں فوراً واپس جانا چاہتی ہوں۔ آپ نے کافی عرصہ مجھے اپنے پاس رکھ لیا ہے اب......''

''کوئی شک نہیں......'' شاہ جی شائلہ کی بات کاٹ کر بولے۔ ''کوئی شک نہیں، میں نے درجنوں شادیاں کی ہیں۔ اچھی سے اچھی عورت آئی میرے پاس، جن کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے کسی کو زبردستی نہیں روکا۔ اپنے اوپر جبر کیا، صبر کیا لیکن چھوڑ دیا سب کو۔''

''تو پھر مجھے کیوں نہیں چھوڑتے ہو۔'' شائلہ کا غصہ بھی اتر گیا تھا۔ وہ بہت نرمی اور عاجزی سے بولی۔

''میں خود سوچتا ہوں کہ میں نے تمہیں کیوں نہیں چھوڑا۔ شاید تمہارے جیسی عورت پہلے میری زندگی میں نہیں آئی۔ جو نشہ مجھے تمہاری قربت میں ملا کبھی پہلے نصیب نہیں ہوا۔ جب تمہیں چھوڑنے کا تصور کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں کتنا احمق ہوں کہ اپنی خوشیاں سمیٹ کے دوسرے کے حوالے کر رہا ہوں یا اپنا دل نکال کے دوسرے کو دے رہا ہوں۔ میں کاروباری شادیاں کرتا ہوں۔ شاید تم نے ٹھیک کہا۔ میں کرائے کا ٹٹو ہوں۔ چاہتا ہوں عورت جب تک میرے پاس رہے دکھاوے کی محبت کرے اور میں بھی دکھاوے کی محبت کرتا رہوں لیکن اس دکھاوے دکھاوے میں مجھے تم سے پیار ہو گیا اور میں نے وعدہ خلافی

نہ کرنے کا وعدہ کرنے کے باوجود یہ عہد توڑا، وعدہ خلافی کی۔ تمہیں تمہاری مرضی کے بغ
اپنے پاس روکے رکھا لیکن اب ......"

"لیکن اب ......" جب شاہ جی بولتے بولتے چپ ہوئے تو شائلہ نے لقمہ دی
ہوئے تجسس سے پوچھا۔

"لیکن اب میں نے طے کرلیا ہے کہ تمہیں جبراً نہیں رکھوں گا اپنے پاس، اور ت
جب چاہو گی طلاق دے دوں گا۔" شاہ جی نے بہت عجز کے ساتھ کہا اور پھر مزید کہن
لگے۔"حالانکہ ایک اور بہت اچھی عورت ہے جو ایک مہینے سے پیچھے پڑی ہوئی ہے شادی
کے لئے، اس کا بھی یہی مسئلہ ہے وہ جلد از جلد اپنے شوہر کے پاس واپس جانا چاہتی ہے
......لیکن میں اسے ٹال رہا ہوں۔"

"تو پھر اس پر بھی رحم کریں اور مجھ پر بھی رحم کریں۔ جلدی سے کرلیں شادی اس
کے ساتھ اور مجھے طلاق دے دیں۔" شائلہ نے کہا۔"اس کا بھی بھلا ہو جائے گا اور میر
بھی۔"

"میں بھی کیسا بدنصیب آدمی ہوں۔" شاہ جی نے ایک لیٹر پیڈ اٹھایا اور قلم کھول
کے پیڈ سامنے رکھتے ہوئے بولے۔"شاید ہی کسی کی زندگی میں اتنی عورتیں آئی ہوں جتنی
عورتیں میری زندگی میں آئی ہیں اور شاید ہی اتنی نفرت عورت کی طرف سے کسی کو ملی ہو
جتنی مجھے ملی ہے۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولے۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"لکھ دوں طلاق ......؟" انہوں نے قلم کاغذ پر رکھا اور دکھ بھرے لہجے میں
بولے۔

"لکھ دیں اور آزاد کردیں مجھے۔" شائلہ بے اختیار بولی اور شاہ جی نے قلم کو
حرکت دینے سے قبل ایک بھرپور نگاہ سے شائلہ کو دیکھا اور پھر کہنے لگے۔"آخری بار اس
حسن کو بھرپور نظر سے دیکھنے دو۔"

"دیکھ لو، مجھے اعتراض نہیں۔" شائلہ سنجیدگی سے بولی۔

"لیکن ایک بات سن لو غور سے ......" شاہ جی نے قلم کو کاغذ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" شائلہ نے تشویش سے پوچھا کیونکہ اسے لگا کہ شاہ جی باتوں میں لگا رہے
ہیں اور طلاق نامہ لکھنے میں تامل سے کام لے رہے ہیں۔

"تم نے کہا ناں آزاد کردو۔" شاہ جی بولے اور پھر معنی خیز انداز میں کہنے لگے۔
میں ابھی آزاد کردوں گا ایک منٹ لگے گا لیکن یاد رکھو جو پرندہ قفس کی قید میں ہوا سے

اگر فوری طور پر پنجرہ کھول کے اڑا دیا جائے تو اسے کوئی باز شکرا کھا جاتا ہے یا کتا بلی......"
وہ سنجیدگی سے بولے۔
''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' شمائلہ کی تشویش مزید بڑھی۔
''اگر میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں تو کیا اکیلی جاؤ گی۔''
'ہاں، میں اکیلی آئی تھی، اکیلی چلی جاؤں گی۔''
''جب کی اور بات تھی اب کی اور بات ہے۔ اس وقت تم نروس ہو کر آئی تھیں اب ایک آس لے کر جا رہی ہو۔''
''تو......'' شمائلہ سوالیہ نشان بن گئی۔
''تو کچھ نہیں ...... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کراچی جاؤں اور تمہارے شوہر زاہد کے سامنے تمہیں طلاق دوں۔'' شاہ جی نے بہت سنجیدگی کے ساتھ خواہش ظاہر کی۔ ''اگر تمہارے فرید بھائی زندہ ہوتے تو میں تمہیں انہیں کے حوالے کر: کیونکہ معاملہ انہی سے طے پایا تھا لیکن اب......''
''لیکن اب آپ پھر اپنی بات سے مکرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔'' شمائلہ دل برداشتہ ہو کر بولی۔
''ہرگز نہیں۔'' شاہ جی نے فوراً ہاتھ اٹھا کر شمائلہ کی بات کی تردید کی۔ میں حلیفہ کہۃ ہوں کہ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ میں زاہد کے سامنے پہلا کام یہ کروں گا کہ تمہیں طلاق دوں گا۔ یہ تمہارے مفاد میں ہے۔''
''تو کب چلو گے؟'' شمائلہ نے سمجھوتے کے انداز میں پوچھا کیونکہ جہاں اتنا وقت اس کے ساتھ گزارا تھا وہاں کراچی تک کا سفر بھی گوارا کر لے گی اور پھر اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اسی بات پر شاہ بگڑ نہ جائے۔
''جب تم کہو گی۔'' شاہ جی نے بے ساختہ کہا۔
''ابھی اسی وقت۔'' شمائلہ نے بے چینی سے جواب دیا۔
''اب تو رات ہو گئی ہے۔'' شاہ جی نے قدرے تامل سے کہا۔
''کوئی بات نہیں تیاری کرتے ہیں، لاہور پہنچتے تک صبح ہو جائے گی۔'' شمائلہ جیسے ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی تھی۔
''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ سامان باندھو اپنا بھی اور میرا بھی ...... میں ڈرائیور کو جا کے دیکھتا ہوں کیونکہ جیپ تو ایئرپورٹ سے واپس آ جائے گی۔'' شاہ جی بھی جانے کے

لئے تیار ہو گئے اور شائلہ جیسے بے چین ہو گئی۔ خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شاہ جی ڈرائیور کو دیکھنے کے لئے باہر نکل گئے اور شائلہ نے عجلت میں اپنا سوٹ کیس شاہ جی کا بکس اور دوسری جو ضروری چیزیں سامنے آئیں پیک کر دیں۔

نصف رات کے قریب جیپ شاہ جی کے گھر سے نکلی اور ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

ڈرائیور جیپ چلا رہا تھا اور شاہ جی اور شائلہ جیپ کی آخری نشست پر بیٹھے تھے اور آج پہلی مرتبہ شائلہ کو شاہ جی کی قربت سے گھن نہیں آ رہی تھی بلکہ قربت اچھی لگ رہی تھی کیونکہ یہ الوداعی قربت تھی اور اس کے بعد اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شاہ جی کی قید سے آزاد ہو جانا تھا۔

''ایک بات کہوں۔'' شاہ جی نے بہت جذباتی انداز میں اس طرح زیر لب کہا کہ آواز ڈرائیور کے کانوں تک نہ جائے۔

''ہونہہ......'' شائلہ بھی دھیرے سے بولی۔

''میں تمہیں بہت مس کروں گا۔'' شاہ جی واقعی دل کی گہرائیوں سے بولے اور شائلہ نے محسوس کیا کہ شاہ جی اس وقت سچ بول رہے ہیں۔

''میں بھی......'' شائلہ نے بھی دھیرے سے مختصر سا جواب دیا اور شاہ جی شائلہ کے جواب سے یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ وہ سچ بول رہی ہے یا دل رکھ رہی ہے۔

لاہور ایئر پورٹ پر جب وہ پہنچے تو اسی وقت کچھ دیر قبل نائٹ کوچ روانہ ہو چکی تھی، ورنہ شائلہ نائٹ کوچ سے ہی سفر کرتی۔ تاہم انہوں نے کچھ دیر ایئر پورٹ پر انتظار کیا اور صبح پہلی فلائٹ سے کراچی روانہ ہو گئے۔

''کیا خیال ہے کہاں جائیں پہلے۔'' کراچی ایئر پورٹ پر پہنچنے کے بعد شاہ جی نے شائلہ سے پوچھا۔ وہ ایئر پورٹ کی حدود سے ابھی باہر نہیں نکلے تھے اور دیگر مسافروں کے ساتھ جہاز سے نکل کر ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھے باہر دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

''گھر ہی چلیں ناں...... اب تک تو زاہد گھر جا چکا ہوگا۔'' شائلہ نے پرتجسس انداز میں کہا۔ وہ بہت زیادہ جوش میں تھی۔ راستے بھر جہاز میں بھی اس کا تجسس دیدنی تھا۔ اس نے پہلی دفعہ شاہ جی کے ساتھ ایک بہت خوشگوار سفر کیا تھا۔ آج وہ جی بھر کے شاہ جی کو خوش کرنا چاہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنا سب کچھ شاہ جی کے سپرد کر کے زاہد کے پاس

چلی جاتی۔ جہاز کے سفر میں اس نے بہت محبت کے ساتھ شاہ جی سے باتیں کیں اور شاہ جی صدقے قربان ہوتے گئے اور ایک مرتبہ بے اختیار کہہ اٹھے۔ ''شائلو جی آج بہت دل کر آیا ہے تمہارے اوپر......''

''سو بسم اللہ ......'' شائلہ نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ''دل بے شک آ جائے لیکن نیت نہیں خراب کرنا۔''

''اب نیت باندھ لی۔ خراب نہیں ہو سکتی۔'' شاہ جی نے کہا۔ ''آج حقدار کو اس کا حق مل جائے گا۔''

''اوہ میرے شاہ جی کتنے اچھے ہو تم۔'' شائلہ نے شاہ جی کے کندھے پر آہستہ سے سر رکھ دیا اور پیار بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ ''پتہ ہے میرا جی چاہتا ہے۔'' اس نے آدھا فقرہ بولا اور شاہ جی نے پوچھا۔

''کیا......؟''

''تم بتاؤ کیا......؟'' وہ انتہائی بے تکلف ہو کر شاہ جی سے پوچھنے لگی۔

''میں بتاؤں کیا؟'' شاہ جی نے کہا۔

''ہونہہ۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''بتاؤ میرا دل کیا چاہتا ہے اس وقت ......'' اس نے جہاز میں اردگرد بیٹھے مسافروں کی موجودگی سے بے خبر ہو کر پوچھا اور ویسے بھی جہاز کی نشستوں پر سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

''تمہارا دل چاہتا ہے تم میرے کندھے پر سر رکھ کے سو جاؤ۔'' شاہ جی بولے۔

''اوں ہوں غلط ......'' شائلہ نے شاہ جی کے کندھے سے سر اٹھایا اور ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا دے کر بولی۔ ''میرا جی چاہتا ہے اس وقت کہ پر لگا کے اڑوں اور کراچی پہنچ جاؤں زاہد اور بچوں کے پاس۔''

''ہاہاہا......'' شاہ جی نے دھیرے دھیرے ہنسنا شروع کیا۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟'' شائلہ نے پوچھا۔

''تمہارے پاگل پن پر......'' شاہ جی نے کہا اور بولے۔ ''ارے پگلی ہم جہاز میں بیٹھے اڑ ہی تو رہے ہیں۔''

''افوہ ......'' اب کے شائلہ اپنے اوپر ہنسی اور پھر کہنے لگی۔ ''میں بھی کتنی پاگل ہوں۔''

''پاگل بھی ہو اور تمہارا شوق بھی ہے۔ شوق وصال یار۔'' شاہ جی نے دبی زبان

ں کہا اور شمائلہ کے پرتجسس چہرے کی طرف دیکھنے لگے جہاں انتظار کی عجیب کیفیت ھائی دے رہی تھی۔

''یہ جہاز اتنا آہستہ کیوں اڑ رہا ہے۔'' شمائلہ نے بے قرار ہوکر پوچھا۔

''جہاز آہستہ نہیں ہے، تمہارے دل کی رفتار تیز ہے۔''

''شاید......'' وہ دھیرے سے بولی۔

''ہم تھوڑی ہی دیر میں کراچی کے قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترنے والے ں۔'' اچانک جہاز کے مائیک پر ایک گنگناتی نسوائی آواز گونجی۔

''اوہ ...... اب تو واقعی دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی ہے۔'' شمائلہ بولی اور آگے کو کر بیٹھی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' شاہ جی نے کہا۔

''دل میرا دھڑک رہا ہے تمہیں کیسے معلوم؟'' شمائلہ نے معصومیت سے پوچھا۔

''دیکھ نہیں رہی ہو تمہاری دھڑکن سے نہ صرف میری کرسی بلکہ پورا جہاز ہل رہا ہے۔'' شاہ جی برجستہ بولے اور دونوں کھلکھلا کر ہنسے اور پھر جب وہ ایگزٹ کی جانب سرے مسافروں کے ساتھ سامان کی طرف جارہے تھے تو شاہ جی نے پوچھا۔

''کیا خیال ہے کہاں جائیں پہلے؟''

''گھر چلیں ناں اب تک زاہد گھر جاچکا ہوگا۔'' شمائلہ نے بے چینی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' شاہ جی نے اتفاق کیا اور پھر رائے دیتے ہوئے بولے۔ ''لیکن ا خیال ہے پہلے ہوٹل میں چیک ان کرلیں۔''

''وہ کیوں؟'' شمائلہ نے تجسس سے پوچھا۔

''بھئی اپنا سامان وغیرہ کمرے میں رکھیں گے پھر تم گھر جانا۔'' شاہ جی نے کہا۔

''لیکن کیوں ......؟'' شمائلہ نے تکرار کی اور شاہ جی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ذرا عقل اور صبر سے کام لو۔ زاہد کا گھر ابھی تمہارا گھر نہیں ہے۔ اس کے پاس ر کے میں تمہیں طلاق کا کاغذ دوں گا۔ تم ملاقات کرنا بچوں سے ملنا اور پھر اطمینان سے ح کے وقت کا تعین کرنا اور جیسے زاہد کہے گا ویسے کرنا ...... اور یہ سب کچھ آج ہی ہو ئے گا ...... لیکن فی الحال ہوٹل چلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' شمائلہ کی سمجھ میں بھی بات آ گئی۔ ''چلو پہلے ہوٹل چلتے ہیں۔'' ئلہ نے کہا اور پھر دونوں نے ایک فورسٹار ہوٹل کا کمرہ بک کیا۔ ہاتھ منہ دھوکر تازہ دم

ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کیا اور پھر دونوں نیک تمناؤں کے ساتھ ایک ٹیکسی لیکر زاہد کے گھر پہنچے جو کبھی شمائلہ کا بھی گھر تھا۔

''یہاں تو تالا لگا ہوا ہے۔'' شمائلہ جب گھر کے دروازے پر پہنچی تو دھک سے رہ گئی۔

''یہ کیا......؟'' وہ پریشان ہوگئی۔

''پریشان نہ ہو۔ زاہد دل کا مریض تھا ہسپتال میں اس کا آنا جانا رہتا تھا...... ہو سکتا ہے خدانخواستہ پھر......'' شاہ جی نے کہا اور وہ شاہ جی کی بات کاٹ کر بولی۔ ''خدا نہ کرے۔''

''یوں کرو، ادھر ادھر کسی پڑوسی سے پوچھو۔ انہیں صورت حال معلوم ہوگی۔'' شاہ جی نے مشورہ دیا۔

''نہیں شاہ جی...... پتہ نہیں پڑوسی میرے بارے میں جانے کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔ میں ان کا سامنا نہیں کروں گی جب تک زاہد سے ملاقات نہ ہو جائے۔'' وہ شاہ جی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

''یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔'' بات شاہ جی کی سمجھ میں بھی آ گئی اور پھر پوچھنے لگے۔ ''تو پھر کہاں چلیں؟''

''عابد بھائی کے یہاں چلتے ہیں۔ بچے تو تھے ہی بھائی جان کے پاس...... ہوسکتا ہے زاہد بھی ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر بھائی جان کی طرف چلا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے وہ لوگ وہیں ہوں گے۔'' شمائلہ نے خود ہی اپنے آپ کو تسلی دی۔

''بھائی جان کا گھر معلوم ہے ناں؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر چلو......'' اور پھر وہ دوبارہ ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد عابد صاحب کے بنگلے کے سامنے موجود تھے۔

بنگلے پر پہنچتے ہی شمائلہ کو بنگلے کے بیرونی رخ میں کچھ تبدیلی سی نظر آئی کہ گیٹ کے پاس کبوتروں کا ڈربہ دکھائی دیا جو پہلے نہیں تھا پھر چبوترے پر ایک بلڈاگ بندھا ہوا تھا جس نے شمائلہ اور شاہ جی کو دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیا۔ یہ بلڈاگ بھی پہلے نہیں تھا۔ گیٹ کا باوردی گارڈ بھی وہ معلوم نہیں ہوتا تھا جو عابد صاحب کے پاس تھا لیکن اس بات کو شمائلہ نے زیادہ اہمیت نہ دی کہ گارڈ اور چوکیدار تو بدلتے رہتے ہیں۔

وہ بنگلے کے لان میں دور دور تک نظر دوڑا رہی تھی کہ شاید علی اور عینی پاس کہیں کھیلتے ہوئے نظر آ جائیں اور ماں کو دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو کر باہر کی طرف لپکیں۔ وہ ٹیکسی سے باہر نکل آئی، شاہ جی بھی ٹیکسی سے اترے اور ٹیکسی والے کو ایک جانب رکنے اور انتظار کرنے کو کہا۔ شائلہ آگے بڑھی اور گیٹ کے پاس جا کر دیدے پھاڑ پھاڑ کے اندر لان میں دیکھنے لگی کہ شاید کوئی نظر آ جائے۔ بچے، بھابھی، ان کے بچے، زاہد، بھائی جان کوئی تو سامنے ہوگا لیکن کوئی سامنے نہیں تھا۔ ایک بوڑھی پروقار خاتون وہیل چیئر پر سامنے آئی جسے ایک نوجوان لڑکی آہستہ آہستہ چلا رہی تھی۔ شائلہ نے گیٹ سے اندر جانا چاہا۔ شاہ جی پیچھے کھڑے رہے۔

''جی بی بی ......'' جب شائلہ گیٹ سے اندر کی طرف مڑی تو پہرہ دینے والے گارڈ نے آگے بڑھ کر روکا۔

''عابد صاحب ہیں گھر میں یا ان کی بیگم ......'' شائلہ نے پوچھا۔

''کون عابد صاحب؟'' گارڈ نے دریافت کیا۔

''عابد صاحب جو رہتے ہیں یہاں۔'' شائلہ بولی۔ ''جن کا گھر ہے۔''

''بی بی یہ تو فخرالدین صاحب کا بنگلہ ہے۔'' گارڈ نے کہا۔ ''ادھر تو کوئی عابد صاحب نہیں ہے۔''

''یہ کیا کہتے ہیں آپ یہاں تو عابد صاحب رہتے ہیں، یہ انہیں کا گھر ہے۔'' شائلہ نے اصرار کیا تو بڑی بی بی کی وہیل چیئر چلانے والی لڑکی جب تک گیٹ کے پاس آ چکی تھی۔ اس نے شائلہ اور گارڈ کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ وہ وہیل چیئر چھوڑ کر شائلہ کے قریب آئی اور بہت ہی مہذب انداز میں کہنے لگی۔

''السلام علیکم فرمائیے۔''

''وعلیم السلام ...... میرا نام شائلہ ہے۔ یہاں عابد صاحب رہتے تھے، جیٹھ ہیں میرے۔ اب یہاں ......'' شائلہ نے ادھوری سی بات کہی۔

''اب یہاں ہم رہتے ہیں۔ میرے ڈیڈی نے یہ بنگلہ خرید لیا ہے۔'' لڑکی نے بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا ......!'' شائلہ پریشان ہو گئی۔ ''عابد صاحب اور فیملی کا کچھ پتہ ہے کہاں ہیں؟''

''بیٹے ہم نے یہ بنگلہ پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے خریدا ہے۔ انہی کے پاس پاور آف

اثارنی تھی۔'' اتنے میں ایک بڑے صاحب اندر سے نمودار ہوئے اور شمائلہ اور لڑکی گفتگو سن کر بولے۔ ''میری ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن یہ بنگلہ عابد صاحب کے پر ہی تھا۔'' انہوں نے مزید وضاحت کی۔

''سر کچھ معلوم ہے عابد صاحب کہاں شفٹ ہو گئے۔'' شمائلہ نے استفسار کیا۔

''ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے بیٹی لیکن سنا ہے وہ فیملی کے سا امریکہ شفٹ ہو گئے۔'' بڑے صاحب نے وضاحت کی تو شمائلہ نے بہت بے چین ہو پوچھا۔ ''ان کے بھائی تھے پروفیسر زاہد علی ان کے بارے میں کچھ معلوم ہے سر؟''

''نہیں یہ سب کچھ ہمیں معلوم نہیں۔ سوری۔'' بڑے صاحب نے معذرت بھر انداز میں کہا اور پھر کہنے لگے۔ ''آپ لوگ اندر آ جائیں کوئی چائے پانی وغیرہ۔''

''نہیں سر تھینک یوں ویری مچ ......'' شمائلہ بہت ہی مایوس ہو کر بولی اور پلٹ واپس شاہ جی کے پاس آ گئی جو گیٹ کے پاس کچھ فاصلے پر کھڑے سب کچھ سن ر تھے۔

''اب کیا کیا جائے؟'' شمائلہ شکست خوردہ انداز میں شاہ جی سے پوچھنے لگی۔

''دل چھوٹا نہ کرو ...... اسی شہر میں ہوں گے کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔ اگر عا صاحب امریکہ گئے ہیں تو زاہد اور تمہارے بچے تو امریکہ نہیں گئے ہوں گے۔'' شاہ جی۔ ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ادھر ہی کہیں ہوں گے۔''

''کہاں ڈھونڈیں انہیں؟'' شمائلہ نے مایوس ہو کر کہا اور پھر خود ہی آس بھر لہجے میں بولی۔

''ہسپتال چلیں۔ ہو سکتا ہے ہسپتال میں ہوں اور پھر وہاں سے صحیح پتہ بھی معلوم سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے ہسپتال ہی چلنا چاہیے۔'' شاہ جی نے کہا اور پھر دونوں اس ہسپتا کی طرف چلے گئے جہاں زاہد زیر علاج تھا۔

''یہاں تو کوئی اور ہے!'' شمائلہ جب شاہ جی کے ہمراہ ہسپتال میں پہنچی تو وہ کہ اور جانے کی بجائے سیدھی اس کمرے میں گئی جہاں پہلے زاہد زیر علاج تھا۔ وہ اس کمر میں کسی اور کو دیکھ کر بجھ سی گئی۔

''کافی وقت گزر چکا ہے اگر زاہد دوبارہ بیمار ہو کر آیا ہوگا تو ضروری نہیں کہ ا

کمرے میں ہو جہاں پہلے تھا۔ ہوٹلوں اور ہسپتالوں کے کمرے بدلتے رہتے ہیں۔ کسی اور وارڈ میں ہوسکتا ہے۔'' شاہ جی نے کہا۔

''تو پھر ڈیوٹی روم سے معلوم کرتے ہیں۔'' شائلہ نے خیال ظاہر کیا اور دونوں ڈیوٹی روم میں چلے گئے، شاہ جی پیچھے پیچھے رہے اور شائلہ ہی آگے ہوکر ہر جگہ پوچھتی رہی۔ اس وقت ڈیوٹی روم میں ایک ڈیوٹی ڈاکٹر اور ایک سینئر نرس بیٹھی تھی۔ ''یہاں ایک پیشنٹ تھا ...... پروفیسر زاہد علی۔'' شائلہ نے علیک سلیک کے بعد نرس سے پوچھا اور نرس بے نیازی سے بولی۔ ''تھا یا ہے۔''

''یہی معلوم کرنا تھا۔ وہ پہلے کارڈیک وارڈ میں تھے۔ اسپیشل روم نمبر 7 ...... پروفیسر زاہد علی۔'' شائلہ نے بات دہرائی۔

''نہیں وہاں تو کوئی شیخ صاحب ہیں۔ شیخ احسان الٰہی۔ پروفیسر زاہد ...... پروفیسر زاہد ......'' اس نے اپنا ریکارڈ چیک کیا اور کہنے لگی ...... ''نہیں بی بی اس نام کا تو کوئی پیشنٹ ہسپتال میں نہیں ہے، ہوسکتا ہے ڈسچارج ہو گیا ہو...... یا ہوسکتا ہے......'' وہ رکی۔

''جی ......'' وہ چونکی۔ ''میرا مطلب ہے مجھے کچھ اطلاع نہیں۔'' نرس نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔

''یہاں ایک نرس ہوتی تھیں سسٹر انیسہ۔'' شائلہ نے نرس انیسہ کے بارے میں دریافت کیا کہ انیسہ سے شائلہ کی ٹھیک ٹھاک دوستی ہوگئی تھی، دونوں ایک دوسرے کی رازداں بھی تھیں اور انیسہ کی زاہد سے بھی بہت اٹیچ منٹ ہوگئی تھی اور اس نے زاہد کی خدمت بھی بے مثال کی تھی۔

''کچھ پتہ ہے انیسہ کہاں ہیں؟'' شائلہ نے پوچھا۔

''گل حسن انیسہ کہاں چلی گئی ہیں۔'' نرس نے وہیں سے آواز لگائی اور وارڈ مین سے پوچھا جو لیبارٹری میں کچھ کام کررہا تھا۔

''سسٹر انیسہ آٹھ نمبر میڈیکل وارڈ میں چلی گئی ہیں۔'' وارڈ مین وہیں سے بولا۔

''آٹھ نمبر میڈیکل وارڈ میں چلی جائیں۔'' نرس نے شائلہ سے کہا حالانکہ شائلہ نے وارڈ مین کی آواز سن لی تھی لیکن نرس مزید رہنمائی کرتے ہوئے بولی۔ ''باہر نکل کے برآمدے میں سیدھی جائیں، پھر دائیں مڑ جائیں، آگے ایک زینہ آئے گا، زینے سے اوپر جائیں، پہلی منزل پر آٹھ نمبر وارڈ ہے۔ وہاں دریافت کریں، انیسہ ادھر ہی ہے۔''

''تھینک یو۔'' شائلہ نے نرس کا شکریہ ادا کیا اور پھر شاہ جی کے کندھے کو چھو کر

بولی۔"آ جائیں۔" اور شاہ جی نرس کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق شمائلہ کے ساتھ ساتھ چل دیئے۔

شمائلہ شاہ جی سے لاہور ہی میں جان چھڑانا چاہتی تھی لیکن اب زاہد اور بچوں کو تلاش کرنے میں جو اسے پر پیچ راستہ اختیار کرنا پڑا تو اس راستے میں شاہ جی کے ہمراہ ہونے سے اسے بہت سپورٹ مل رہی تھی، وہ کافی نروس اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں جان ......" شاہ جی نے اس کا بازو تھاما اور ہمت بڑھاتے ہوئے بولے۔"انیسہ ملے گی تو زاہد کا پتہ بھی معلوم ہو جائے گا۔" وہ انشاء اللہ خیریت سے ہوگا۔"

"ان شاء اللہ ......" شمائلہ نے خود کو پھر حوصلہ دیا اور پھر تھوڑی دیر میں آٹھ نمبر میڈیکل وارڈ میں تھی جہاں نرس شمائلہ کے لئے اجنبی تھی لیکن وہ انیسہ کی ساتھی معلوم ہوتی تھی۔

"انیسہ جی تو دس دن کی چھٹی پر ہیں۔" آٹھ نمبر والی نرس نے کہا۔

"کچھ پتہ ہے شہر میں ہیں یا کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔" شمائلہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ہیں تو گھر پر ہی، میری کل ہی ملاقات ہوئی ہے۔" نرس نے کہا۔"ان کی امی کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لئے چھٹیاں لی ہیں۔ پرسوں ڈیوٹی پر آ جائیں گی۔" نرس نے بہت اپنائیت سے تفصیل بتائی۔"تھینک یو میں آج ہی ان کے گھر جا کے مل لوں گی۔" شمائلہ نے نرس کا شکریہ ادا کیا۔

"ایڈریس دے دوں گھر کا۔" نرس نے پوچھا۔"گھر بدلا تو نہیں ناں۔" شمائلہ نے کہا۔

"نہیں۔" نرس بولی۔

"تو پھر مجھے معلوم ہے۔" شمائلہ نرس کا شکریہ ادا کر کے پلٹی اور تقریباً مغرب کے وقت نرس انیسہ کے گھر شاہ جی کے ہمراہ پہنچ گئی۔

❁

انیسہ کا گھر اور خاندان صرف دو افراد پر مشتمل تھا۔ انیسہ نے اپنی ضعیف و بیمار ماں کی دکھ بھری کہانی جس طرح شمائلہ کو سنائی تھی اسی طرح شمائلہ بھی اپنے ساتھ بیتے جانے والے شب و روز کا احوال بتا چکی تھی۔ شمائلہ ایک آدھ مرتبہ انیسہ کے گھر بھی آئی تھی اور

انیسہ کی ماں سے بھی مل چکی تھی اور یوں انیسہ کا گھر شمائلہ کے لئے نیا نہیں تھا تاہم انیسہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ شمائلہ کسی دن اس طرح اچانک اس کے گھر آ جائے گی اور اسے کڑے امتحان میں ڈال دے گی جس سے سرخرو ہو کے گزرنا اس کے لئے بہت مشکل اور تکلیف دہ ہوگا۔

''شمائلہ تم ......'' جب اچانک ٹیکسی انیسہ کے گھر کے سامنے رکی تو انیسہ اسی وقت کسی کام سے گھر کے اندر سے باہر آئی تھی کہ اس کی نظر ٹیکسی پر پڑی۔ انیسہ نے شمائلہ اور شمائلہ نے انیسہ کو بیک وقت دیکھا۔ شمائلہ جلدی سے ٹیکسی سے نکلی اور انیسہ کی طرف لپکی، انیسہ شمائلہ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

اور پھر دونوں جیسے مقناطیسی کشش کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

اس دوران شاہ جی کو اندازہ ہوگیا کہ وہ صحیح جگہ پر آ گئے ہیں لہٰذا انہوں نے ٹیکسی والے کو پیسے دے کر فارغ کر دیا اور دھیرے دھیرے چلتے وہ بچھڑی ہوئی سہیلیوں کے ملنے کے اندازو کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے قریب آ ئے۔

''انیسہ یہ شاہ جی ہیں میرے......'' شمائلہ نے تعارف کرانا چاہا۔

''بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے کون ہیں؟'' انیسہ نے کہا اور پھر شاہ جی کی طرف مڑ کے سلام کیا اور دونوں کو اندر ڈرائنگ روم میں لے گئی جہاں تھوڑی دیر کے بعد انیسہ کی ماں بھی آ گئی۔

''ماں جی شمائلہ آئی ہیں۔'' انیسہ نے اماں کو بتایا۔ انیسہ کی ماں شمائلہ سے ملی تو ایک دو بار ہی تھی لیکن انیسہ سے اتنا اس کا تذکرہ سنا تھا کہ وہ بھی اسے بیٹیوں کی طرح لگتی تھی۔

''السلام علیکم ماں جی۔'' شمائلہ نے سلام کیا۔

''جیتی رہو بیٹی۔'' انیسہ کی ماں نے اسے دعا دی۔

''السلام علیکم......'' شاہ جی جو بیٹھ چکے تھے انہوں نے اٹھ کر مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم......'' ماں جی نے چادر سنبھال کر ایک اجنبی کو جیسے جواب دینا چاہئے ویسے جواب دیا۔

''ماں جی یہ شاہ جی ہیں شمائلہ کے......''

''اچھا اچھا......'' انیسہ کی ماں نے بھی انیسہ کو جملہ پورا نہیں کرنے دیا اور بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

''تم لوگ باتیں کرو میں چلتی ہوں۔'' ماں کمر پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔
''یہ بتاؤ پہلے کیا چلے گا چائے، ٹھنڈا یا کھانا۔'' انیسہ اٹھ کے کمرے سے جانے لگی۔
''بیٹھو انیسہ بیٹھو چائے بھی ہو جائے گی، ٹھنڈا بھی اور کھانا بھی لیکن فی الحال کچھ نہیں۔ تم ابھی بیٹھو، پہلے باتیں کر لیں۔ بیٹھو بیٹھو......'' شمائلہ نے انیسہ کا پلو تھام کر اسے بٹھا دیا۔
''اف خدایا......'' انیسہ بیٹھ تو گئی لیکن اندر ہی اندر کانپ گئی کیونکہ شمائلہ بہت خوشگوار موڈ میں لگ رہی تھی ایسے ہی جیسے کوئی لمبی مسافت طے کر کے آنے والا مسافر اپنی منزل یا منزل کے بہت قریب آ گیا ہو اور انیسہ جانتی تھی کہ شمائلہ کی اب کوئی منزل ہے ہی نہیں، صرف راستے ہی راستے ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شمائلہ اب جو کچھ سننا چاہتی ہے وہ اسے کیسے بتائے گی۔
''زاہد کہاں ہے...... اور بچے...... اور عابد صاحب...... اور سب......'' شمائلہ نے چھوٹتے ہی سوال کیا اور ایک سوال کے اندر کئی سوال تھے جن میں سے ایک کا جواب بھی انیسہ کے پاس نہیں تھا تاہم اس نے تمہید باندھی۔ ''زاہد کو جس طرح اسٹروکس لگتے رہے، ڈاکٹرز بھی حیران تھے کہ اتنے اسٹروکس کوئی آدمی کس طرح برداشت کر سکتا ہے لیکن زاہد صاحب نے ہر تکلیف کا جوانمردی سے مقابلہ کیا اور بیماری کو شکست دے کر ڈاکٹروں کو بھی حیران کر دیا۔
''زاہد ہے کہاں؟'' شمائلہ نے تڑپ کر پوچھا۔
''وہ ابھی میں بتاتی ہوں لیکن پہلے ایک خط پڑھو جو زاہد نے تمہارے لئے لکھا ہے۔'' انیسہ نے رازداری سے کہا۔
''خط......؟'' شمائلہ نہ سمجھی۔ ''کیسا خط......؟''
''تم پڑھو...... میں لاتی ہوں۔'' انیسہ نے کہا اور خط لانے کے لئے اندر چلی گئی۔ شمائلہ نے پرتجسس نظروں سے پاس بیٹھے شاہ جی کو دیکھا اور تشویش سے پوچھا۔ ''کیسا خط......!''
''پڑھو تو سہی...... اور حوصلہ رکھو۔ وہ خیریت سے ہے۔'' شاہ صاحب نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا، اتنے میں انیسہ خط لے کر آ گئی اور شمائلہ کے حوالے کر دیا۔ شمائلہ نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ خط کھولا اور نہایت اضطراب اور بے چینی سے خط پڑھنے لگی۔
خط اس طرح شروع تھا۔

''میری جان سے زیادہ عزیز شائلہ ...... خدا تمہیں سکھی رکھے اور مزید کوئی دکھ نہ دے۔ تم نے بہت سزا بھگتی ہے ان گناہوں کی جو میرے تھے جو تم سے سرزد نہیں ہوئے تھے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے کہ ایک کے گناہ کی سزا دوسرا بھگتتا ہے لیکن ایسا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تمہیں یاد ہے میں نے ایک بار ایک کتاب کا حوالہ دیا تھا جس میں مصنف نے لکھا تھا کہ انسان کی زندگی کے دو ڈائے گرام اور دو پروگرام ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان خود بناتا ہے اور ایک وہ جو انسان کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق اوپر ہی اوپر ساتھ ساتھ متوازی چلتا ہے، لیکن کبھی کبھی یہ دونوں سیدھی لائنیں آپس میں متصادم ہو جاتی ہیں جیسے سیدھے سپر ہائی وے پر ایک بہت ہی اسموتھ چلتی ہوئی کار کے سامنے اچانک جمپ آ جائے۔ گاڑی کہیں جا لگے عورت کہیں گرے، بچے کہیں اور جا پہنچیں اور پھر اس طرح بچھڑ جائیں سب کہ ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہ جائیں۔ جس طرح ہم سب بچھڑ گئے ہیں اور ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہ گئے ہیں۔ میرا مطلب خط کی شکل میں کوئی مضمون یا افسانہ لکھنا نہیں، صرف اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ میں نے تم پر بہت ظلم کیا ہے اور ظلم صرف تم پر ہی نہیں، میں نے اپنے اوپر، علی پر اور عینی کے اوپر بھی کیا ہے۔ تم اپنا حال نہیں بتا سکتی ہو کہ تم پر کیا بیتی۔ میں اپنا حال نہیں بتا سکتا لیکن یقین کرنا تمہارے جانے کے بعد میں نے ایک ایک پل تمہارے انتظار میں اور پچھتاوے میں گزارا ہے۔ میری جان میں نظر پر یقین نہیں رکھتا لیکن جس طرح میری اور تمہاری محبت بھری زندگی میں نفرت اور جدائی کی اچانک ایک دراڑ پڑی تو مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری زندگیوں کو نظر کھا گئی ہے ورنہ اس طرح تو نہیں ہو سکتا تھا لیکن یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا میں اس کے لئے کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا رہا ہوں، نہ تمہیں نہ کسی حادثے یا اتفاق کو۔ قصوروار تو میں ہوں جس نے اپنے غصے کی آگ میں اپنی خوشیوں کا خرمن جلا کے خاک کر دیا۔

شمو یہ میرا سبق اور میرا پیغام آنے والی نسلوں کو دے دو کہ اگر اچھی زندگی گزارنی ہے تو غصہ نہ کرو اور غصے والی ہر بات کو کڑوا گھونٹ سمجھ کے پی جاؤ کہ اسی میں سکھ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میں ایک مدرس ہوں، پوری زندگی دوسروں کو صبر و تحمل اور درگزر کا درس دیتا رہا۔ کاش درگزر کے اس درس پر میں نے خود بھی عمل کیا ہوتا تو آج ہم کتنے خوشحال ہوتے، نہ تم دربدر ہوتیں، نہ بچے اور نہ میں جان لیوا روگ لگا کے بستر پکڑ لیتا۔ میں اب بھی خودغرض ہوں کہ اپنی تین جانوں کو چھوڑ کے اپنی اکیلی جان لے کر جا رہا ہوں لیکن ایسا

ہونا تھا کیونکہ ہماری لکیر اور اوپر والی لکیر آپس میں ٹکرا گئی ہے اور اس دھماکے میں کسی نہ کسی نے تو اڑنا ہی تھا۔ سو غصے، نفرت اور انتقام کی آگ میں اپنے ہی وجود کے میں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور سنو تم نے اگر کبھی کوئی خطا کی تو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے لیکن استدعا ہے کہ تم میری خطا معاف کر دینا اور میرے بچوں سے بھی کہنا مجھے معاف کر دیں ...... زاہد۔''

''یہ کیا ہے ...... یہ کیا ہے؟'' خط پڑھنے کے بعد وہ پاگلوں کی طرح خود کلامی کرتے ہوئے چیخی اور پھر انیسہ کو پکڑ کر اسے جھنجوڑا اور کہنے لگی۔ ''اس خط کا مقصد کیا ہے اور زاہد کہاں ہے؟'' وہ پاگل ہو رہی تھی۔

''دیکھو شمائلہ میری بات سنو، سب کچھ بتاتی ہوں۔'' انیسہ نے شمائلہ کے کندھے پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھا دیا اور بہت اطمینان اور حوصلہ افزا لہجے میں بولی۔ ''یہ خط زاہد نے ہسپتال میں میرے سامنے ہی لکھا تھا۔''

''تو......؟'' شمائلہ پاگلوں کی طرح بولی۔ ''خط لکھ کر وہ خود کہاں گیا؟''

اس نے مجھے کہا تھا یہ خط میں تمہیں نہ دوں۔'' انیسہ نے بات کو قدرے طول دیتے ہوئے کہا۔

''پھر تم نے مجھے کیوں دیا یہ خط۔ یہ مہمل بے معنی خط۔'' شمائلہ نے انیسہ کے کندھے جھنجوڑ کر پوچھا۔

''اس لئے کہ زاہد نے یہ کہا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو خط پاس رکھنا لیکن اگر مر گیا تو خط دے دینا۔'' انیسہ بولی۔ ''تمہیں اب صبر کرنا ہوگا شمائلہ زاہد مر چکا ہے۔'' انیسہ نے صاف صاف الفاظ میں کہا۔ انیسہ کا خیال تھا کہ زاہد کی موت کی خبر سن کر شمائلہ چیخے گی۔ اپنے بال نوچے گی۔ سینہ کوبی کرے گی لیکن اس نے کچھ بھی نہیں کیا، اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور جسم بھی جیسے بے جان ہو گیا اور وہ غش کھا کے ایک طرف کو گر گئی۔

''او مائی گاڈ ......'' انیسہ کا کلیجہ دہل گیا۔

''او خدایا ...... شاہ جی آپ ذرا اس کا خیال رکھیں، میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔''

''یا اللہ۔'' شاہ جی گھبرا کر اٹھے۔ انیسہ جلدی سے اندر گئی بی پی آپریٹس لائی۔ شمائلہ کا بی پی دیکھا تو گھبرا گئی۔

''کتنا ہے بلڈ پریشر۔'' شاہ جی نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

''بہت زیادہ ...... اس کو کہیں برین ہیمرج نہ ہو جائے۔ میں ڈاکٹر کو دیکھتی ہوں۔''

انیسہ اندر فون کی طرف بھاگی۔ شاہ جی نے گھبراہٹ کے عالم میں شمائلہ کو سنبھالا۔ صوفے پر ہی سیدھا کر کے لٹا دیا۔ ڈاکٹر شاید انیسہ کے ہسپتال کا کوئی کولیگ تھا فوراً پہنچا۔ بی پی دوبارہ دیکھا۔ دوا دی، انجکشن لگایا اور اس وقت تک پاس بیٹھا رہا جب تک اس کا بی پی نارمل نہیں ہوا۔ پھر اس نے سانحے کی پوری تفصیل سننے کے بعد ایک سکون آور انجکشن شمائلہ کو لگا دیا اور کہنے لگا۔ ''اب یہ صبح تک سوئی رہیں گی۔ کوئی تشویش کی بات ہو تو بلاتکلف مجھے کسی بھی وقت رنگ کر دیں۔''

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' انیسہ نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور شاہ جی کی مدد سے شمائلہ کو اٹھا کے پلنگ پر ڈالا۔

شاہ جی نے سوئی ہوئی شمائلہ کو غور سے دیکھا اور پھر نرس سے کہنے لگے۔ ''یہ ان شاء اللہ صبح تک سوئی رہے گی اور ایسے صدمے کی کیفیت میں اس کا سویا رہنا ہی بہتر ہے۔''

''جی بالکل ......'' نرس نے اتفاق کیا۔

''میں ہوٹل میں ہوں گا۔ یہ میرے کمرے کا ٹیلیفون نمبر ہے۔'' شاہ جی نے ایک چٹ نرس انیسہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات ہو تو مجھے مہربانی کر کے فون کر دیں۔''

''جی ضرور ......'' نرس انیسہ نے شاہ جی کو رکنے کے لئے نہیں کہا کہ شاہ جی بھی جہاں دیدہ آدمی تھے اور اس بات کو سمجھتے تھے کہ ان کا رات کا ایک اجنبی کے گھر رہنا مناسب نہیں ہے۔''

''رب راکھا۔'' انہوں نے جاتے جاتے کہا۔

''خدا حافظ ......!'' انیسہ دروازے تک شاہ جی کو چھوڑنے گئی اور بولی۔ ''صبح آپ آ جایئے گا۔''

''ان شاء اللہ ......'' شاہ جی نے کہا۔ پھر وہ باہر نکلے اور اوجھل ہو گئے۔

انیسہ کچھ دیر شمائلہ کے پاس بیٹھی اس کی نگرانی کرتی رہی اور پھر جب اس نے محسوس کیا کہ وہ گہری نیند میں ہے تو اس کے پاس ہی قالین پر سو گئی اور رات بھر اس کے بارے میں فکرمند رہی لیکن شمائلہ کو نیند کا ایسا گہرا انجکشن دے دیا گیا تھا کہ وہ بلا کروٹ لئے صبح تک بے خبر سوتی رہی جبکہ انیسہ رات بھر بہت مضطرب رہی۔ وہ اٹھ اٹھ کے شمائلہ کو دیکھتی رہی اور اسے یہ پریشانی لاحق تھی کہ شمائلہ کو ابھی تک بچوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور جب وہ غنودگی سے باہر آئے گی تو پہلا سوال بچوں کے بارے میں کرے گی اور انیسہ

پاکستان ورچوئل لائبریری
www.pdfbooksfree.pk

کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا بتائے کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ شمائلہ اس ایک عظیم صدمے کے بعد دوسرا اتنا بڑا صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی اور انیسہ نے پوری رات اسی ادھیڑ بن میں گزار دی۔

❁

صبح چڑیوں کی چہکار نے شمائلہ کے اوپر تنی ہوئی خمار کی چادر کو دھیرے دھیرے ہٹایا اور اسی طرح اسنے بہت دھیرے دھیرے پلکیں کھولیں اور چھت کی طرف دیکھا۔ اس کا جسم ابھی تک ساکت اور بے حرکت تھا۔ وہ یوں چھت کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اپنے اوسان یکجا کر رہی ہو۔ لگتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہو گیا ہے۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور گردن کو دائیں بائیں گھمایا۔ اسے انیسہ پلنگ کے ایک طرف کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

انیسہ کافی صبح سویرے پو پھٹنے سے پہلے شمائلہ کے پاس آ گئی تھی اور کئی بار اسے دیکھا اور واپس چلی گئی تھی۔ اب جب اس نے شمائلہ کے جسم اور احساس میں تھوڑی جنبش دیکھی تو پاس کھڑی رہی۔ شمائلہ نے غور سے انیسہ کو دیکھا اسے انیسہ کے چہرے پر ہمدردی، دکھ اور درد کے گہرے اثرات نظر آئے۔ شمائلہ ابھی تک اپنے حواس کو اس طرح مجتمع نہیں کر پائی تھی کہ اندازہ لگا سکے کہ کیا ہوا ہے اور وہ کہاں ہے۔ انیسہ اسے دیکھ کر لبوں پر ایک ہلکی سی جبری مسکراہٹ لائی لیکن بولی کچھ نہیں۔

''افوہ......'' شمائلہ نے ایک لمبی سانس لی جیسے اندر کی آگ نکالنے کے لئے پھونک ماری ہو۔ پھر اچانک دھیرے دھیرے اسے کچھ یاد آیا، اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے انیسہ کو دیکھا اور اٹھ کے بیٹھ گئی اور ایک دم اسے جیسے جھٹکا سا لگا۔

''انیسہ......'' وہ پھٹ پڑی۔ ''یہ کیا ہو گیا ہے انیسہ......'' وہ اٹھنے لگی تو انیسہ نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور پھر جو آنسو شمائلہ کے رات کو تھم گئے تھے ان کا بند اچانک ٹوٹ گیا اور ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور انیسہ اسے دلاسہ دیتی رہی۔ اس نے صبر کرنے یا نہ رونے کی شمائلہ کو کوئی تلقین نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ صبر کی تلقین سے صبر نہیں آتا۔ صرف وقت صبر دیتا ہے اور انیسہ جانتی تھی کہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ شمائلہ خوب روئے کہ اس کے اندر آنسوؤں کا جو ایک سیلاب امڈا ہوا ہے وہ بہہ جائے۔

اتنے آنسو شمائلہ کے نکلے کہ انیسہ کا کندھا بھیگ گیا اور شمائلہ رو رو کے جب نڈھال ہو گئی تو پھر اس نے خود ہی سر واپس تکیے پر رکھ دیا۔ انیسہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اپنے پلو

ے شمائلہ کے آنسو پونچھے، اس کے بال درست کئے، انگلیوں سے کنگھی کی، سہلایا جیسے
یک بچے کو سنبھال رہی ہو۔ شمائلہ پر رورو کے نقاہت طاری ہو گئی تھی۔ انیسہ نے پاس ہی
ڑے جگ میں سے گلاس میں پانی لیا اور شمائلہ کی گردن کے نیچے ہاتھ رکھ کر پیار بھرے
لہجے میں بولی۔ ''پانی پی لو۔'' لیکن شمائلہ نے ہاتھ کے اشارے سے ہی منع کر دیا۔ انیسہ
نے پانی کا گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔

''انیسہ ......'' شمائلہ نے نقاہت سے ڈوبی ہوئی آواز میں دھیرے سے پکارا۔

''جی ......!'' انیسہ از راہ محبت اس کے چہرے پر جھک کر بولی۔ ''بولو...... کیا بات
ہے۔''

''انیسہ میرے بچے کہاں ہیں؟ میرا علی، میری عینی۔'' شمائلہ نے غمزدہ ڈوبی ہوئی
واز میں پوچھا۔

انیسہ کچھ نہ بولی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔

''بتاؤ ناں ......'' شمائلہ پھر بولی۔

''کیا؟'' انیسہ نے آہستہ سے پوچھا جیسے اس نے پہلے کچھ سنا نہ ہو۔

''میرے بچے کہاں ہیں؟'' اب شمائلہ زور سے بولی۔ ''میرا علی کہاں ہے، میری
ا کہاں ہے۔ کہاں ہیں میرے بچے؟''

''بچے تمہارے خیریت سے ہیں۔'' انیسہ نے کچھ سوچ کر، کچھ اٹک کر کنفیوژ ہو کے
ب دیا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی اس نے کچھ فیصلہ کیا تھا کہ وہ شمائلہ کو
ں کے بارے میں کیا بتائے گی۔

''لیکن ہیں کہاں؟'' وہ تقریباً چلا کر بولی۔

''محفوظ ہیں۔'' انیسہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''عابد صاحب ان کو اپنے ساتھ امریکہ
گئے ہیں۔'' یہ بات اس وقت اس نے تسلی کے لئے کہہ دی تھی۔

❀......□......❀

''اوہ ......!'' شمائلہ نے ایک لمبی سانس لی جس میں دکھ کے ساتھ کچھ اطمینان ا تھا کہ شاید اس کے بچے محفوظ ہاتھوں میں ہیں اور محفوظ جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں ان کی زند اور مستقبل بھی محفوظ ہوگا۔ کئی بار اس نے سوچا تھا کہ بچے جب تھوڑے بڑے ہو جائیں تو چاہے کچھ بھی کرنا پڑے، وہ علی اور عینی دونوں کو پڑھنے کے لئے امریکہ بھجوائے گی ا زاہد کی بھی یہی خواہش تھی کہ بچوں کو امریکہ بھجوائے اور وہ سوچا کرتی تھی کہ اس کے جب بڑے ہو جائیں گے اور امریکہ میں تعلیم حاصل کر کے لوٹیں گے تو اسی طرح منہ ٹیڑ کر کے انگریزی بولیں گے جس طرح امریکہ سے لوٹ کر آنے والے دوسروں کے ب بیٹیاں بولتے ہیں اور امریکہ سے لوٹ کر آنے کے بعد وہ حکومت کریں گے یا پھر بڑ بڑے اداروں میں کلیدی عہدے حاصل کریں گے جس طرح دوسروں کے امریکہ پل بچے حاصل کرتے ہیں۔

اس کی ایک دیرینہ خواہش تھی، اس کا خواب تھا کہ اس کے بچے امریکہ جائ وہیں پرورش پائیں، وہیں تعلیم حاصل کریں اور اس ملک سے باہر نکلیں لیکن ایسے تو نہ جیسے وہ گئے، ہر چیز کا ایک طریقہ ہوتا ہے اور وہ ایک طریقہ کار کے مطابق انہیں بھ چاہتی تھی، کسی نے اسے کچھ بتایا ہی نہیں اور امریکہ پہنچا دیا، وہ صرف زاہد کے ہی تو نہ اس کے بھی بچے تھے انہیں کوئی کیوں امریکہ لے گیا ہے۔

''عابد صاحب کو کیا حق پہنچتا تھا میرے بچوں کو امریکہ لے جانے کا ......'' وہ انتہ دکھ کے ساتھ بولی، جیسے اچانک زاہد کے ساتھ ساتھ بچوں کی جدائی کا تیر بھی اس کے میں کھب گیا ہو، رات کے رکے ہوئے بقایا آنسو پھر اس کی پلکوں سے ڈھلکنے لگے ''او ظلم ......'' ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے سر تکیے پر پٹخا اور انیسہ سے اس کا یہ دکھ دیکھا ن اور پھر انیسہ کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ بچوں کے حوالے سے کیا بولے، اس اچانک ایک ایسا جھوٹ بول دیا تھا جس کے لئے وہ تیار نہ تھی اور وہ جانتی تھی کہ اب شا اور بہت کچھ پوچھے گی اور اسے اس ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے معلوم نہیں کتنے جھو

اور گھڑنے پڑیں گے۔

''میں تمہارے لئے پانی لے آؤں۔'' انیسہ نے کہا اور پانی کا بہانہ کر کے کمرے سے باہر نکل گئی اور جس طرح شمائلہ نے ایک لمبا سانس لیا تھا، اس سے زیادہ لمبا سانس انیسہ نے باہر نکل کر لیا...... معاً دروازے پر شاہ جی کی ٹیکسی آن رکی اور شاہ جی تشویش کے عالم میں ٹیکسی سے باہر نکلے اور بے تابی کے ساتھ انیسہ سے پوچھا۔ ''کیسی طبیعت ہے اب اس کی......؟''

''اچھی ہے۔'' انیسہ نے مختصر جواب دیا۔

''رات......!'' شاہ جی نے ادھورے انداز میں استفسار کیا۔

''رات اچھی گزر گئی، سوئی رہی ہے رات کو، لیکن فکر اب صبح کی ہے شاہ جی......!'' انیسہ بہت سنجیدگی کے ساتھ از راہ تشویش بولی۔ ''وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔''

''کیوں خیریت......! کیا ہوا؟'' شاہ جی نے تشویش سے پوچھا۔ ''صبح کوئی نیا مسئلہ ہوا کیا؟''

''بہت الجھن میں پھنس گئی ہوں شاہ جی۔'' انیسہ نے بہت کشمکش کے عالم میں کہا اور بتانے لگی۔

''دیکھئے بات یہ ہے کہ زاہد کی موت کے صدمے کو شمائلہ نے کس طرح برداشت کیا، وہ آپ نے دیکھ لیا اور آگے کیا کرے گی، وہ مجھے معلوم نہیں لیکن اس وقت مجھے پریشانی یہ ہے کہ اسے بچوں کے بارے میں کیا بتاؤں؟''

''خیریت تو ہے ناں......؟'' شاہ جی پریشان ہو کر بولے۔ ''کیا ہوا بچوں......؟''

''بہت برا ہوا شاہ جی!'' انیسہ بہت دکھ اور کرب کے ساتھ بولی۔ ''ان کے بیٹے علی کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا جس کا اب تک کچھ پتہ نہیں چلا۔''

''یا میرے مولا......!'' شاہ جی نے ایک آہ بھری اور کہنے لگی۔ ''اور بیٹی......؟''

''ان کی بیٹی عینی کا کچھ پتہ نہیں، وہ اپنے تایا عابد علی کے پاس تھی اور تایا اس کا امریکہ چلا گیا ہے۔''

''اگر تایا امریکہ چلا گیا ہے تو اسے بھی ساتھ لے گیا ہوگا۔'' شاہ جی نے خیال ظاہر کیا۔

''یہی تو بات ہے ناں عینی شاہد نے بتایا کہ جب وہ امریکہ گئے عینی ان کے ساتھ نہیں تھی اور نہ کوئی اور بچہ تھا، ان کے اپنے بچے تو پہلے ہی چلے گئے تھے، اب شمائلہ کی بیٹی کا

نہ بیٹے کا کچھ پتہ ہے۔''
''یا پروردگار ......!'' شاہ جی پریشان ہو کر بولے۔''مجھے یقین ہے کہ عینی کو بھی انہوں نے امریکہ بھجوا دیا ہوگا۔'' شاہ جی نے انیسہ کو تسلی دی۔
''خدا کرے ایسا ہی ہو، شمائلہ کو میں نے یہی بتایا ہے کہ عابد صاحب دونوں بچوں کو ساتھ امریکہ لے گئے ہیں۔'' انیسہ نے تشویش ظاہر کی اور کہنے لگی۔''آپ کو معلوم ہے زاہد کو کیا ہوا؟''
''کیا ہوا؟'' شاہ جی نے تجسس سے پوچھا۔
''زاہد کو جب پتہ چلا کہ ان کا بیٹا اغوا ہو گیا ہے تو صدمہ برداشت نہ کر سکے اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔''
''اللہ مغفرت کرے۔'' شاہ جی نے دعا کی۔
''اب آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ شمائلہ کو بچوں کے بارے میں کچھ نہ بتایئے گا، اسے یہی تاثر ملنا چاہیے کہ اس کے بچے امریکہ میں بحفاظت ہیں۔''
''ایسا ہی ہوگا ...... آپ مطمئن رہیں۔'' شاہ جی نے تسلی دی۔
''آپ اندر بیٹھیں ناں ڈرائنگ روم میں، میں شمائلہ کو بتاتی ہوں جا کے۔'' انیسہ نے کہا اور شاہ جی نے ذرا سا وقت مانگا۔''ایک منٹ ......'' وہ کہہ کر ٹیکسی کی جانب مڑے اور ٹیکسی سے ایک درمیانے سائز کا سوٹ کیس نکال لائے اور کہنے لگے۔''یہ شمائلہ کا سوٹ کیس ہے۔'' معلوم نہیں وہ سوٹ کیس کیوں ساتھ لے آئے تھے۔
''آپ اسے یہیں رہنے دیں اور چل کے اندر بیٹھیں'' انیسہ نے شاہ جی کو عزت کے ساتھ اندر بٹھا دیا اور خود اندر شمائلہ کے پاس گئی۔ رو رو کے شمائلہ کے آنسو تھم چکے تھے اور کانوں کی لو کی طرف آنسوؤں کی لکیروں سے خطوط بن گئے تھے، انیسہ نے ٹشو پیپر لے کر بہت پیار سے دھیرے دھیرے اس کے گالوں سے سوکھے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں سے کھیلنے لگی۔
''وہ شاہ جی ......؟'' شمائلہ نے کچھ توقف کے بعد اپنے آپ کو سنبھالا اور اس کا دھیان شاہ جی کی طرف گیا، اس نے شاہ جی کے بارے میں نامکمل سا جملہ بول کے استفسار کیا۔
''شاہ جی باہر بیٹھے ہوئے ہیں، رات بھی انہوں نے دو بار ہوٹل سے فون کیا تھا اور تمہاری خیریت پوچھی تھی۔'' انیسہ نے اس کے جملے کا مطلب سمجھتے ہوئے مکمل جواب دیا۔

"آہ ......!" شمائلہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور حسرت سے کہنے لگی۔ "آج اگر ...زندہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا، جب میں اس کے سامنے شاہ جی سے طلاق لیتی۔"

"قسمت کی بات ہے، کیا ہوسکتا ہے...... اللہ کو یہی منظور تھا۔" انیسہ نے دکھ سے ...ا۔

"ہاں قسمت کی بات ہے۔ قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔" شمائلہ بھی دکھ ...ے انداز میں بولی اور پھر کہنے لگی۔ "آج میں شاہ جی سے چھٹکارا پا رہی ہوں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے، شاہ جی خود بتا رہے تھے۔" انیسہ نے کہا۔

"خود ہی کہہ رہے تھے تو اس کا مطلب ہے کوئی ہیچ پیدا نہیں کریں گے۔" شمائلہ ...کہا۔

"کوئی ہیچ پیدا کیوں کرے گا۔" انیسہ نے جواب دیا اور پھر فوراً ہی دوسرا جملہ ...لتے ہوئے کہنے لگی۔

"لیکن شمائلہ تم جاؤ گی کہاں، اب رہو گی کہاں ......؟" انیسہ کے منہ سے اچانک یہ ...ل نکلا۔ اس سوال کے لئے نہ وہ خود تیار تھی اور نہ شمائلہ...... انیسہ کی اس بات پر شمائلہ ...ت گئی۔

"انیسہ ......! تمہیں کیا تشویش پیدا ہوگئی ہے، میں تمہارے پاس تو نہیں رہوں ...۔" شمائلہ کے لہجے میں دکھ اور شکوہ تھا۔

"نہیں ...... نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا شمائلہ!" انیسہ قدرے شرمندہ سی ہو کے ...۔ "میرا مطلب تھا......"

"مطلب کچھ بھی ہو انیسہ ......!" شمائلہ، انیسہ کی بات کاٹ کر بولی۔ "لیکن دل کا ...ہ کبھی کبھی ہونٹوں سے پھسل جاتا ہے۔"

"اب میں کیا کہوں تم سے ......" انیسہ پریشانی میں بولی۔

"تم کچھ بھی نہ کہو میری جان! باہر جا کے شاہ جی سے جا کر کہو میں آ رہی ہوں۔" ...لہ نے کہا اور پھر اٹھ کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ......؟" انیسہ نے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

"ہاں طبیعت ٹھیک ہے۔" وہ پلنگ سے اتری۔

"تو پھر پہلے منہ ہاتھ دھو کے ناشتہ کرلو...... تم نے رات بھی کچھ نہیں کھایا۔" انیسہ ازراہ ہمدردی کہا۔

''کیا کھاؤں ...... زہر......!'' شمائلہ حسرت ویاس سے بولی۔''اب کچھ بھی کھ
کو جی نہیں چاہے گا۔''
''لیکن بھوکا رہنا بھی تو کسی دکھ کا علاج نہیں ہے، زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ
کھانا ہی پڑتا ہے۔'' انیسہ نے کہا۔
''کون زندہ رہنا چاہتا ہے۔'' شمائلہ نے ترت کہا۔
''تم ......!'' انیسہ نے بھی فوراً جواب دیا۔''تمہیں زندہ رہنا ہے، اپنے لـ
سہی، اپنے بچوں کیلئے۔''
''ہاں اپنے بچوں کیلئے۔'' اس نے ایک موہوم سی امید کے ساتھ کہا اور پھ
ہاتھ دھونے کیلئے چلی گئی۔
ناشتہ کیا کرنا تھا بس شمائلہ نے زہر مار کیا، باہر آ کر شاہ صاحب کے ساتھ ایک
چائے کی پی اور انیسہ کے بہت اصرار پر ایک چھوٹا سا بسکٹ منہ میں ڈالا لیکن فوراً نکال
کوئی بھی چیز حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اسے الٹی آ رہی تھی۔
''شاہ جی ......!'' وہ چائے زہر مار کر کے شاہ جی کی طرف مڑی اور کہنے لگی۔''
جی! جس کے سامنے آپ طلاق دینا چاہتے تھے وہ تو اس دنیا میں اب ہے نہیں، لہٰ
فرض اب آپ کو مرحوم کی موجودگی کے بغیر ہی ادا کرنا ہوگا ...... یہ بتائیے اب کیا
ہے؟'' شمائلہ نے پوچھا۔
''کوئی تامل نہیں۔'' شاہ جی نے جواب دیا۔
''تو پھر لکھئے تین حرف اور فارغ کر دیجئے مجھے۔'' شمائلہ بالکل مشینی اور مـ
انداز میں بولی۔
''جب کہو ...... یہ بتاؤ سادہ کاغذ پر لکھ دوں یا اپنے نام کے لیٹر پیڈ پر!'' شا
نے استفسار کیا۔
''جیسے آپ کی مرضی ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولی اور پھر کہنے لگی۔''لیٹر ہیڈ
دو تو بہتر ہے۔'' اور پھر مزید کہنے لگی۔''میرا سامان کہاں ہے؟''
''سوٹ کیس تو میں لے آیا ہوں لیکن اٹیچی اور کچھ دوسری چیزیں ہوٹل میر
ہیں۔'' شاہ جی نے کہا اور پھر مزید بولے۔''اگر ہوٹل چلی چلو تو سامان بھی لے لو اور
ہیڈ بھی وہیں رکھا ہے۔''
''ہوٹل لے جا کر دھوکا تو نہیں دو گے ناں۔'' شمائلہ نے خدشے کا اظہار کیا۔

''اوہو......کیسی بات کرتی ہو، کیاتمہاری کنڈیشن اس وقت ایسی ہے کہ تمہیں دھوکا
یا جائے، اگر تمہیں اعتبار نہ ہوتو انیسہ جی کو ساتھ لے لو یا کہو تو ابھی دو منٹ میں سادے
اغذ پر یہیں لکھ دوں۔'' انہوں نے بہت ہمدردی اور اعتبار سے کہا۔

''چلو ہوٹل ......'' شمائلہ کھڑی ہوگئی اور شاہ جی سوٹ کیس اٹھا کے باہر نکلتے ہوئے
لے۔ ''میں کوئی ٹیکسی روکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شاہ جی باہر نکل گئے اور شمائلہ چند لمحے
بڈبائی آنکھوں سے انیسہ اور انیسہ، شمائلہ کو دیکھتی رہی پھر دونوں گلے لگ گئیں اور دونوں
ی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، اتنے میں شاہ جی اندر آئے اور کہنے لگے۔ ''ٹیکسی آ
ئی ہے باہر......''

''میں آ رہی ہوں۔'' شمائلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور پھر انیسہ کی پیشانی پر
ہستہ سے بوسہ دے کر خدا حافظ کہا اور دروازے کی طرف گئی۔

''شمائلہ......!'' جب شمائلہ دروازے کے پاس پہنچی تو انیسہ نے آواز دے کر روکا،
ئلہ پیچھے مڑی، انیسہ کی جانب متجسس نظروں سے دیکھا۔

''میری کسی بات کا برا نہ منانا، یہ گھر تمہارا اپنا ہے، اگر یہاں آ کے رہ جاؤ گی تو
، خوشی ہوگی۔'' انیسہ نے بہت اپنائیت سے کہا۔

''تھینک یو انیسہ ......!'' وہ اظہار تشکر کے طور پر بولی۔ ''مجھے بہت ڈھارس ہوئی
اس بات سے، میں نے جب بھی ضروری سمجھا تو لوٹ کر تمہارے پاس آؤں گی ......
حافظ۔''

''خدا حافظ ......'' انیسہ نے جواب دیا اور شمائلہ کے ساتھ ساتھ گھر سے باہر نکلی،
ں تک شمائلہ کیساتھ رہی اور ٹیکسی کے اوجھل ہونے تک اسے دیکھتی رہی اور ہاتھ ہلاتی
۔

''یہاں سے کہاں جاؤ گی تم ......؟'' ہوٹل پہنچ کے جب شمائلہ نے اپنا تمام بکھرا ہوا
ن یکجا کر کے باندھا اور شاہ جی ایک لیٹر ہیڈ سامنے رکھ کر طلاق نامہ لکھنے لگے تو انہوں
لم کو حرکت دینے سے قبل یونہی بر سبیل تذکرہ پوچھا۔

''آپ کا کیا پروگرام ہے؟'' شمائلہ نے ان الٹا سوال کیا۔

''میرا تو یہاں اب کوئی کام نہیں، تمہیں فارغ کر کے شام کو ہی نکل جاؤں گا ......
ا ہے ریل کے ذریعے جاؤں۔''

''میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ یہاں سے کسی سستے ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤں اا
میں آئندہ کا پروگرام بناؤں گی۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''عین ممکن ہے میں کہیں جاب ا
لوں اور پھر بچوں کو تلاش کروں گی، عابد بھائی کے کچھ لنکس دیکھوں گی، کوئی نہ کوئی
ضرور ملے گا۔'' وہ آس بھرے لہجے میں بولی اور شاہ جی نے چند لمحے شمائلہ کے چہ
طرف بہت غور سے دیکھا اور قدرے توقف سے بولے۔
''ان شاء اللہ! تمہارے بچے تم کو ضرور ملیں گے۔ تمہاری نیت صاف ہے، تم
نیک دل اور اپنے شوہر کی وفادار اور اس سے محبت کرنے والی عورت ہو، تمہیں تمہاری
کا صلہ ضرور ملے گا۔''
''فی الحال تو تکلیفیں ہی مل رہی ہیں۔'' وہ بے ساختہ بولی۔ لکھیں، آپ جو لکھنا
چاہتے ہیں ...... وقت ضائع نہ کریں۔'' اور شاہ جی نے اپنے قلم کو لیٹر ہیڈ کے پیڈ پر
نب کو دو تین مرتبہ بلا وجہ کاغذ پر دبایا اور لکھا۔ ''باعث تحریر آنکہ'' یہ سرخی لکھ کر انہوں
پھر ایک نظر شمائلہ کو دیکھا اور بہت جذباتی انداز میں کہنے لگے۔ ''شمالو! میری زندگی
انگنت عورتیں آئی ہیں، اتنی عورتیں کہ میں واقعی اگر انہیں گننا چاہوں تو گن نہیں سکوں گا
''یہ آپ پہلے بھی بتا چکے ہیں۔'' شمائلہ نے بے ساختہ کہا۔
''اور شاید یہ بھی بتا چکا ہوں کہ اگر یاد کرنا چاہوں تو شاید ان میں سے
شکلیں بھی میرے ذہن میں نہیں آئیں گی۔'' شاہ جی فوراً بولے۔ ''اور نام بھی ......
''یہ بھی بتا چکے ہیں۔'' شمائلہ نے ترت جواب دیا۔
''لیکن تمہاری تصویر ایک ایسی پکی روشنائی سے میرے دل پر کندہ ہو گئی ہے
نہیں مٹ سکے گی۔'' شاہ جی نے کہا تو شمائلہ ترت بولی۔
''یہ بھی کہہ چکے ہیں آپ۔''
''اور ایک دفعہ پھر کہہ رہا ہوں کہ تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔'' شاہ جی نے کہا
یہ بات میں دل کی گہرائیوں سے بول رہا ہوں، فریب دینے کی اس لئے ضرورت
اب ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔'' وہ حسرت و یاس سے بولا۔
''مجھے یقین ہے آپ اس وقت فریب نہیں کر رہے ہیں۔'' شمائلہ نے جواب
''میں نے آپ کے ساتھ جو وقت گزارا ہے، اس میں اچھا وقت بھی تھا اور برا
میں اچھے اور برے دونوں وقتوں کو یاد رکھوں گی۔''
''اب جو بات میں تم سے کہہ رہا ہوں، تم اسے میری بدنیتی نہ سمجھنا، بچے

بول رہا ہوں۔'' شاہ جی نے تمہید باندھی۔ ''یقین کرنا جب لاہور سے چلا تھا، اس ارادے سے چلا تھا کہ کراچی پہنچ کر پہلے تو اس ہستی کو دیکھوں گا جس کے عشق میں تم اس طرح دیوانی ہو رہی ہو اور پھر اس کے سامنے ہی تمہیں طلاق دینے میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا۔''

''اور اب کیا سوچ رہے ہو؟'' شمائلہ نے بہت معنی خیز انداز میں سوال کیا اور اس کے سوال کرنے کے انداز سے شاہ جی جیسے ڈر سے گئے اور نہایت مصالحانہ انداز میں کہنے لگے۔ ''کچھ بھی نہیں، میری سوچ بدلی نہیں ہے، ابھی اسی وقت ایک منٹ میں طلاق لکھ کر دے دوں گا لیکن لکھنے سے پہلے ایک دو منٹ مجھے کچھ کہنے کی اجازت دے دو۔''

''بولو......!'' شمائلہ اس طرح بولی جیسے اس نے واقعی شاہ جی کو دو منٹ بولنے کو دیئے ہوں۔

''دیکھو شمائلہ......! یہ شہر، یہ سوسائٹی ہے تو مہذب......لیکن تم جیسی جوان، بے سہارا عورتوں کے لئے بھیڑیوں کا جنگل ہے اور تمہیں بھیڑیئے تر نوالہ سمجھتے ہوئے کھا جائیں گے، ایک بھیڑ کی طرح۔'' شاہ جی نے ایک انتباہ کی صورت میں کہا۔

''تو......!'' شمائلہ نے سوال کیا۔

''تو یہ کہ مت لو طلاق......تمہیں میری اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ایک سچے دل سے میری بیوی بن کر میرے ساتھ چلو۔'' شاہ جی نے جیسے اپیل کرنے کے انداز میں کہا۔

''تمہارا کیا ہے شاہ......اور تمہاری بیوی کی اوقات کیا ہے۔ تم تو پروفیشنل ہو، ابھی اور معلوم نہیں کتنی شادیاں کرو گے، مزید بچھڑے ہوئے جوڑے تمہارے انتظار میں ہوں گے۔'' وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔

''ہرگز نہیں......تم آخری بار میری بات کا یقین کر لو کہ تمہارے بعد میری زندگی میں کوئی دوسری عورت نہیں آئے گی۔ یہ میرا وعدہ میرا عہد ہے تم سے، تم جس قسم کی چاہو لے لو مجھ سے۔'' شاہ جی نے کہا۔

''نہیں......!'' شمائلہ نے تھوڑا سا تامل کیا اور پھر سوچ کر بولی۔ ''نہیں شاہ جی نہیں......! طلاق لکھ دو۔'' وہ بہت ٹھنڈے دھیمے لہجے میں بولی۔

''سوچ لو......'' شاہ جی نے کہا۔

''نہیں......نہیں، مجھے کنفیوژ نہ کرو اور لکھو جو کچھ لکھنا ہے۔''

''ایک دفعہ پھر سوچ لو...... اس لئے کہ اگر لکھ دیا تو پھر کچھ نہیں ہوگا پھر وہی تیر وا
بات ہوگی جو کمان سے نکل کر واپس نہیں آ سکتا...... بولو۔''

''نہیں شاہ جی! نہیں......'' اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آواز بولے بغیر
رندھ سی گئی۔ ''آپ لکھو۔ پلیز لکھو۔'' اس نے درخواست کی۔

''او کے......'' شاہ جی بادل نخواستہ بولے اور نظر اپنے رائٹنگ پیڈ پر ڈالی اور او
لکھی ہوئی سطر کو قدرے اونچی آواز میں پڑھا۔ ''باعث تحریر آنکہ'' اور پھر انہوں
طلاق نامہ لکھنے کی ابتداء کرتے ہوئے لکھے لفظوں کو ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

''میں مسمی شاہ......!''

''شاہ جی......!'' ابھی اتنا ہی انہوں نے لکھا تھا کہ شمائلہ کی بہت دھیمی سی آواز ا
کے کان میں گونجی اور شاہ جی کا قلم جس نے ابھی محض حرکت ہی کی تھی، رک گیا۔ شمائلہ شا
جی کے قریب آئی اور ان کا لکھنے والا ہاتھ اپنے سے روک دیا اور سر کو نفی میں دو تین دف
ہلایا۔ اور رو پڑی جس کا مطلب تھا کہ وہ طلاق نہیں لینا چاہتی۔ شاہ جی نے اس کے ہاتھ
چوما اور لیٹر پیڈ کا پہلا صفحہ جس پر ابھی محض ''باعث تحریر آنکہ'' ہی لکھا تھا، پھاڑ پھینکا اور پھ
اسی شام کو دونوں بذریعہ ٹرین واپس لاہور روانہ ہو گئے۔

''تم ہم کو کالٹو بولتا ناں، کوتا کا بچہ...... لیکن تمہارا کالٹو نے تمہاری کھوپڑی کا سب
گند صاف کر دیا۔ اس دن جب شمس اور کالٹو یعنی افریقہ کی ثریا شب مہتاب کے دورا
بادہ خوری کی وجہ سے مخمور تھے تو کالٹو دو چار جام کے بعد رنگ ترنگ میں آ کر بولی اور شم
کو بہت اپنائیت سے ''کوتا کا بچہ'' کہا۔

وہ اس وقت اپنے اپارٹمنٹ کے ٹیرس پر چودھویں رات کی چاندنی میں بیٹھے زندگ
کی لطافتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ شمس نے ایک بہت مہنگا اپارٹمنٹ کرایہ پر لے لیا ت
اور اسے بہت سلیقے اور انتہائی قیمتی چیزوں اور فرنیچر کے ساتھ سجایا تھا اور اب اس کے لئے
پیسہ خرچ کرنا کوئی اہم یا دشوار بات نہیں تھی، وہ کام تو بظاہر سنار کا کر رہا تھا لیکن چوٹیں
لوہار کی لگا رہا تھا۔ ثریا کالٹو کی دوستی میں معلوم نہیں کہاں کہاں سے ہیرے ڈھونڈ کے لا
تھا اور کالٹو بھی معلوم نہیں کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کر کے ان ہیروں کے بہت بڑے بڑے
کسٹمر ڈھونڈ لاتی اور بعض اوقات وہ کسی ہیرے کی ایسی انوکھی داستان اور پس منظر بیا
کرتی کہ گاہک عش عش کر اٹھتا اور اس کے گاہک بھی کون تھے، بہت گنے چنے اور یہ سب

کے سب ڈائمنڈز کے کالیکٹرز تھے اور ڈائمنڈ کا ایک ایک کالیکٹر سونے کی ایک کان کے برابر تھا اور شمس کو کالٹو کی شکل میں ترقی کی چوٹی کی طرف جانے کے لئے ایک زینہ مل گیا تھا اور وہ اس زینے کو خوب استعمال کرتے ہوئے ایک ایک اسٹیپ اوپر کی طرف چڑھتا جا رہا تھا۔ کالٹو بھی بہت خوش تھی کہ اس کی صلاحیت سمجھنے والا اور اس کی صلاحیت کو استعمال کرنے والا ایک شخص مل گیا ہے، ایسا شخص جس کی وہ پارٹنر بھی تھی اور دوست بھی، لیکن خوشی اسے اس بات کی تھی کہ وہ اس طرح کی دوست نہیں تھی جسے رکھنے والا ہر وقت اپنا قبضے رکھے، شمس نے اس پر قبضہ ضرور رکھا تھا لیکن قبضے کی ڈپلی کیٹ چابی اس نے کالٹو ہی کو دے رکھی تھی تا کہ وہ جب اور جس کو چاہے یہ چابی دے دے اور شمس کو معلوم تھا کہ وہ چابی کسی ایرے غیرے کو نہیں دیتی بلکہ جب بھی اس کے اختیار کی چابی کسی دوسرے کے پاس جاتی ہے تو تالا کھلنے پر اندر سے ایک موٹی مرغی ایک کالیکٹر کی صورت میں برآمد ہوتی ہے اور یہ کالیکٹر شمس کے بینک بیلنس میں ایک ہی رات کے اندر اضافہ کر دیتا ہے۔

وہ خوب کما رہا تھا اور خوب خرچ کر رہا تھا، اس کے اپارٹمنٹ پر ہر مہینے، ہر پندرھواڑے، ہر ہفتے اور کبھی کبھار ہر روز بڑی بڑی دعوتیں ہوتیں جن میں ٹیکس، ایکسائز اور پولیس کے لوگوں کے علاوہ بڑے چھوٹے بیوروکریٹ اور کبھی کبھار کسی وزیر، سفیر کو بھی مدعو کیا جاتا اور خوب دعوتیں اڑتیں اور یہ سب کچھ وہ کالٹو کے مشورے سے کرتا تھا کہ ایسے ٹیڑھے میڑھے کام کرنے والوں کو ایسے بڑے بڑے کارآمد لوگوں اور بگ شاٹس کو قبضے میں رکھنا چاہئے اور یہ سب لوگ شمس کے قبضے میں تھے اور شمس کالٹو کے قبضے میں اس طرح آ گیا تھا جیسے طوطا پنجرے میں بند ہو کر مالک یا مالکن کی بولی بولنے لگے اور اس سیاہ کالی بھجنگ عورت کالٹو نے شمس کو اپنی محبت کے پنجرے میں اس طرح بند کر دیا تھا کہ وہ طوطے کی طرح کالٹو کی زبان بولنے لگا تھا اور کالٹو کو اس بات پر بھی بہت فخر تھا کہ زندگی بھر عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا توے کی طرح کالی عورت کی گرفت میں پھنس گیا ہے اور اب کسی عورت کا نام نہیں لیتا اور خاص کر ناز کالٹو کو اس بات پر تھا کہ اس نے شمائلہ کا پاگل پن اس کے دماغ سے نکال دیا تھا اور حیرت انگیز خوشی اس بات کی تھی کہ شمس نے کالٹو سے اس کی ایک تصویر لی تھی جو اس نے ایک پینٹر کو پورٹریٹ بنانے کے لئے دے رکھی تھی اور وہ کالٹو کے ہمراہ کئی بار اس مصور کے پاس جا چکا تھا اور ایک بار کالٹو نے شمس کو مصور سے یہ کہتے سنا تھا کہ ''پینٹر صاحب! تصویر میں کالے رنگ کے سوا دوسرا کوئی رنگ نہ لگے۔'' اور مصور نے ایک بھرپور نگاہ سے کالٹو کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بہت معنی خیز انداز میں کہا تھا

کہ ''سر! صرف کالا رنگ لگے گا۔'' اور مصور نے شمس سے اس تصویر بنانے کے دس ہزا
روپے مانگے تھے اور شمس نے کہا تھا کہ ''میں گیارہ ہزار دوں گا لیکن تصویر اچھی بنے۔'' او
مصور نے ایک بار پھر کالٹو کو دیکھا اور کہا تھا۔

''اچھی سے بھی اچھی بنے گی سر۔''

کالٹو کو یہ بات زیادہ اچھی نہیں لگتی تھی کہ شمس ہر وقت اس کے کالے رنگ کی تشہ
کرتا ہے اور اسے ایکسپلائٹ کرتا ہے، وہ گھر کی حد تک تو شمس کی چھیڑ چھاڑ کو پسند کرتی تھ
لیکن ہر وقت اور ہر جگہ شمس کا تمسخر اڑانا اسے پسند نہیں آتا تھا تاہم جب شمس اس کی تصو
لے کر مصور کے پاس گیا اور کالے رنگ میں دس ہزار کی تصویر بنانے کا آرڈر دیا تو ا
دن کالٹو کو اپنے کالی ہونے پر فخر بھی ہوا اور اس نے کالے رنگ پر ناز بھی کیا کہ دنیا
عیاش ترین آدمی اس کی سیاہی پر فنا ہو گیا ہے۔

تصویر بن گئی تھی، اس کی ڈلیوری بھی شمس نے لے لی تھی لیکن کالٹو نے ابھی ا
تصویر کو دیکھا نہیں تھا حالانکہ شمس نے جو نیا اپارٹمنٹ لیا تھا، اس کی لابی اور ڈرائنگ رو
میں ملکی اور غیر ملکی بڑے بڑے مصوروں کی تصویریں بہت اچھے فریموں میں ماؤنٹ کر
اس نے دیواروں پر آویزاں کر رکھی تھیں اور گھر دیکھنے میں ایک طرح سے خوبصور
آرٹ گیلری لگتا تھا اور شمس کو حالانکہ تصویروں کا زیادہ شوق بھی نہیں تھا لیکن کالٹو نے ا
بتایا تھا کہ اس طرح کا شوق رکھنے والے کو ایک خوش مذاق آدمی سمجھا جاتا ہے اور پھر
بڑے لوگ یہاں آتے ہیں، وہ بھی تصویر کو دیکھ کر تصویر اور مالک تصویر متاثر ہوتے ہ
اور اسے باذوق سمجھتے ہیں۔ سو اس کا اپارٹمنٹ تصویروں سے جہاں سج گیا تھا، وہاں شمس
اوقات بھی بڑھ گئی تھی اور پھر اس دن جب اسے مصور سے یہ تصویر ملی تو وہ دونوں مسر
اور مخمور ہو کر بہت ترنگ میں آ گئے تھے۔ اس مخصور تصویر کو اس نے ایک الگ کمرے م
دیوار کے ساتھ آویزاں کر کے کمرہ مقفل کر دیا تھا اور کالٹو کو یہ تصویر اس نے ابھی نہ
دکھائی تھی حالانکہ کالٹو نے بہت اصرار کیا تھا تاہم وہ بہت خوش اور موڈ میں تھی۔

''تم ہم کو کالٹو بولتا ناں، کوتا کا بچہ لیکن تمہارا کالٹو نے تمہاری کھوپڑی کا سب م
صاف کر دیا ہے۔'' وہ بہک کر بولی اور شمس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''
کیسے......؟''

''وہ ایسے کہ ابھی تم ادھر ادھر عورت لوگ کی طرف نہیں جاتا۔'' کالٹو نے کہا۔

''کریکٹ ......'' شمس جھوم کر بولا۔ ''اور کیا کیا تم نے ہمارے واسطے......؟''

''اور یہ کیا کہ تم ایک کنگلا آدمی تھا، ہم تم کو بنگلہ بنا دیا۔'' کالٹو نے کہا۔
''ناں سینس! کیا فضول جوڑ ملایا ہے، کنگلا سے بنگلہ...... ہاہا...... چلو مان لیا اور کیا کیا تم نے ہمارے واسطے......؟''
''اور یہ کیا کہ تمہارے اندر جو فوٹو بنا تھا...... تمہارے دل پر......'' کالٹو بولتے بولتے اٹکی۔
''کس کا فوٹو......؟'' شمس نے ایک ہچکی لے کر پوچھا۔
''ارے کیا بولتا تھے اس عورت کو جس کے واسطے تم پاگل ہو گیا تھا؟''
''شمائلہ......؟'' شمس زور سے بولا۔
''ہاں! وہ شمائلہ......''
''کیا ہوا اسے؟'' شمس نے پوچھا۔
''ارے اس کا فوٹو ہم تمہارے دل سے نکال دیا۔'' کالٹو نے کہا اور شمس فوراً بولا۔
''چلو اچھا ہوا، خس کم جہاں پاک......''
''لیکن تم ہمارا پورٹریٹ ہم کو کیوں نہیں دکھاتا ہے...... لا کے لاک کر دیا۔'' کالٹو نے شکایت کی۔
''وہ ہم تم کو سرپرائز دینا چاہتا ہے۔'' شمس مزید بہک کر بولا۔ ''تمہارے برتھ ڈے پر......''
''ارے کوتا کا بچہ! کب دیگا، تم ہم کو سرپرائز...... دو مہینے میں ہم نے چار برتھ ڈے منایا اور آج بھی تو تم ہمارا برتھ ڈے سیلی بریٹ کر رہا ہے۔'' کالٹو نے کہا۔
''شیور......؟'' شمس نے سوال کیا۔ ''آج واقعی تمہارا برتھ ڈے ہے۔''
''او...... یس...... شیور......'' کالٹو کہنے لگی۔ ''ہم کو ہمارا تصویر دکھا کر ابھی آج ہی اسی وقت سرپرائز دو۔''
''شیور......؟'' شمس نے پوچھا۔
''تو پھر آ جاؤ نیچے روم میں، ابھی تم کو سرپرائز دیتا ہوں، کم آن......'' دونوں اٹھے اور ایک دوسرے کو سہارا دیتے ڈگمگاتے ہوئے ٹیرس سے نیچے آئے، لابی سے گزرے، ڈرائنگ روم عبور کیا، جہاں بڑے بڑے مصوروں کی تصویریں آویزاں تھیں اور پھر اس بند کمرے کے باہر رک گئے جہاں پورٹریٹ تھا اور جسے دکھا کر وہ کالٹو کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

''کھل جا سم سم ......'' شمس دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر بولا اور کہنے لگا۔''یہ تو نہیں کھلا۔''

''ایسے نہیں کھلے گا کوتا کا بچہ...... چابی سے کھولو۔'' کالٹو بولی۔

''اوہ چابی ......!'' وہ ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے ادھر ادھر جھانکنے لگا اور پھر دروازے کی ایک چابی نکال کے تالا کھولا اور دروازے کے پٹ وا کر کے اندر کی تمام ٹیوبس روشن کر دیں۔

''سرپرائز ......!'' اس نے باادب ہو کر سامنے دیوار پر لگی ہوئی قد آدم تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا جو مکمل طور پر کالے آئل پینٹ سے بنائی گئی تھی اور جس کا آئل بجلی کی روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ بہت فنکارانہ تصویر تھی، اس میں ایسی کشش تھی کہ وہ آدمی کو اپنی طرف کھینچتی نہیں بلکہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی اور کالٹو کی آنکھیں واقعی چکاچوند ہو گئی تھیں، قدم زمین میں گڑ گئے تھے اور سر پر جیسے کسی نے توپ کا ایک گولا پھاڑ دیا تھا، جس سے دھماکا ہوا اور کالٹو کا سر جیسے ریزہ ریزہ ہو کے فضا میں بکھر گیا کیونکہ یہ تصویر کالٹو کی نہیں بلکہ شمائلہ کی تھی، مصور نے چہرہ اور بال شمائلہ کے بنائے تھے لیکن دھڑ کچھ اس طرح بنایا تھا کہ کالٹو ہی سمجھ سکتی تھی کہ دھڑ اس کا ہے۔

''تم نے کہا تھا ناں کہ شمائلہ کو تم نے میرے دل کے اندر سے کھرچ دیا ہے، ٹھیک کہا تھا۔'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا۔''لیکن دل سے کھرچ کر میں اسے یہاں لے آیا ہوں اور دیوار کے اوپر...... ارے یہ کیا فضول بات ہوئی کہ

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

نان سینس، آج کے دور میں کس کو فرصت ہے دل میں جھانکنے کی، ارے تصویر یہاں سامنے لگا کے رکھو دیوار کے اوپر تا کہ نظر کے سامنے رہے۔'' شمس نشے میں بولتا چلا گیا۔

تصویر کو دیکھ کر کالٹو کا نشہ ہرن ہو گیا تھا اور وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

''دھت تیرے کی چلی گئی، بولتی ہے شمائلہ کو دل سے نکال دیا ہونہہ ......'' وہ بڑبڑانے لگا۔

''شمائلہ میری ہے اور ایک دن میری ہو کے رہے گی۔'' اس نے تصویر کے سامنے بڑ لگائی اور وہیں زمین پر گر گیا اور بے سدھ ہو گیا۔

ایک بہت خوبرو خاتون اور اس کے ساتھ ایک مرد شاہ جی کی بیٹھک میں بیٹھے شاہ جی سے گفتگو کر رہے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو طعنے تشنے دے رہے تھے۔ مرد کافی غمزدہ تھا اور خاتون کے چہرے پر اداسی اور گھمبیرتا تھی، وہ وقفے وقفے سے آنسو بھی پونچھ رہی تھی، اور مرد کو بات بات پر قصوروار بھی ٹھہرا رہی تھی اور طعنے دیئے جا رہی تھی۔

''تم نے نہیں سوچا کہ اس عمر میں آ کر اگر مجھے طلاق دو گے تو میرا کیا بنے گا، مجھے دفعہ کرو، تم نے بچوں کے بارے میں بھی نہیں سوچا کہ وہ کیا سوچیں گے کہ ہمارے ماں باپ، کیسے ہیں کہ اس عمر میں بھی ......'' وہ چپ ہو گئی۔

''تمہیں نہیں خیال آیا کہ اس عمر میں تم ......!''، مرد ایک دم سے پھٹ پڑا اور خاتون کی بات کو بیچ میں روک دیا۔

''کیا اس عمر میں ...... کیا کیا میں نے اس عمر میں، کیا کیا...... بولو اس عمر میں ......''

''بس رہنے دو، اب پھر تم نے گرمی کھانی شروع کر دی۔'' مرد ٹھنڈا ہو کر بولا۔

''تم جب اس طرح اول فول بکو گے تو میں کیا گرمی نہیں کھاؤں گی؟'' خاتون تڑپی۔

''یہ اول فول نہیں ہے، یہ پول ہے تمہاری جو میں ابھی شاہ صاحب کے سامنے کھول دوں گا۔'' مرد غصے میں آ گیا تھا۔

''تو پھر بولو شاہ صاحب کے سامنے ...... بولو میں بھی تمہاری ساری پول کھول کے رکھ دوں گی۔'' خاتون بھی لڑاکا عورتوں کی طرح بازو پھیلا کر بولی۔

''میں کہتا ہوں چپ کرو، غصہ نہ دلاؤ مجھے ورنہ ......!'' مرد خشم آلود لہجے میں بولا خاتون نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ورنہ کیا ...... کیا کرو گے ورنہ ...... طلاق تو تم پہلے ہی دے چکے ہو، اب اور کیا دو گے۔'' خاتون کی سانس پھولنے لگی تھی۔

''یار خدا کے واسطے چپ کر۔'' مرد نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور دھیمے لہجے میں عجز و انکساری سے بولا۔ ''شاہ جی کے پاس جس کام سے آئے ہیں، وہ کام کی بات کرو۔''

''معافی چاہتی ہوں شاہ جی ......!'' خاتون نے آنسو پونچھے اور معذرت بھرے انداز میں بولتے ہوئے شاہ جی سے مخاطب ہوئی۔ ''رمضان کی عادت ہے یہ پرانی، غصہ دلاتا ہے پہلے ...... پھر معافیاں مانگتا ہے اور پچھتاتا ہے۔''

''بس شاہ جی! غصہ آ جاتا ہے کیا کروں، اسی لئے تو غصے کو حرام کہتے ہیں، اسی کی وجہ سے تو میں نے اسے طلاق دے کر اپنے ہنستے بستے گھر کو برباد اور بچوں کو ویراا دیا۔'' مرد بھی ایک دم عاجز ہو کر انکساری سے بولا۔ ''یہ میرے چار بچوں کی ماں میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہے، مجھے جذبات پر قابو نہیں رہا اور میں نے اسے طلاق د دی۔''

''آپ کے جو حالات ہیں، انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ پھر اسے طلاق دے د گے۔'' شاہ جی نے ازراہ طنز کہا۔

''نہیں شاہ جی! ہرگز نہیں ...... اب خدانخواستہ اگر ایسی نوبت آئی تو میں طلا بولنے سے پہلے اپنی زبان کاٹ دوں گا ......بس آپ ہمارا یہ مرحلہ طے کروا دیں۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے ......؟'' شاہ جی نے سب کچھ جانتے ہوئے استفسار کیا۔

''آپ جانتے ہیں شاہ جی!'' مرد نے کہا۔ ٹیلیفون پر جب میں نے آپ سے وقت لیا تھا تو مدعا بھی بیان کر دیا تھا لیکن شاید کھل کر بات نہ کر سکا اور یہ بات ہی ایسی ہے کہ کوئی مرد کھل کر نہیں کہہ سکتا۔''

''میں جانتا ہوں کہ کوئی آدمی خوشدلی سے اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے حوالے نہیں کر سکتا لیکن میری زندگی کی ڈگر بدل گئی ہے۔ میں اب کوئی اور شادی نہیں کر سکتا۔'' شا جی نے معذرت چاہی۔

''لیکن شاہ جی کیوں؟ میں نے تو سنا تھا۔''

''بس ......!'' شاہ جی نے ہاتھ بلند کر کے مرد کو مزید بولنے سے روک دیا اور اتنے میں شمائلہ اندر آئی کیونکہ شاہ جی نے تھوڑی دیر پہلے شمائلہ کو پکارا تھا اور اندر بلایا تھا لیکن اس وقت وہ غسل خانے میں تھی اور اب وہ نہا دھو کے اجلے کپڑے پہنے اور گیلے گیلے بال سکھاتے ہوئے اندر آئی۔

''آؤ شمالو جی بیٹھو ......'' شاہ جی نے شمائلہ کو اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور شمائلہ کسی سے بات کئے بغیر شاہ جی کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اس عورت نے میری زندگی کا نقشہ بدل دیا ہے۔'' شاہ جی نے شمائلہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''میرے پاس حوروں کا نعم البدل عورتیں آئی ہیں، میں نے منع کر دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شمائلہ کے بعد میری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئے گی اور یہ میرا

ے۔‘‘

ں، شاہ جی کی بات اور لب و لہجہ سن کر اندر ہی اندر تڑپ گئی اور مایوسی کے
اس کے چہرے پر ہویدا ہو گئے۔

جی ......!‘‘ خاتون نے بہت ہمت کر کے زبان کھولنا چاہی۔

بی بی! آگے مت کچھ کہنا، میں تمہیں یا کسی اور کو اب اپنی منکوحہ نہیں بنا
واشگاف الفاظ میں بولے اور خاتون جرأت کر کے پھر بولی۔ ’’شاہ جی!
ہ رتبہ نہیں چاہتی جو ایک بیوی کو ملنا چاہیے، میں شمائلہ جی کی نوکرانی بن کے
ں گی، ان کے گھر کا کام کروں گی، ان کے پاؤں دھوؤں گی، جوتے
، آپ دونوں کی دل و جان سے خدمت کروں گی، میں چاہتی ہوں آپ
طرح ہمارا ٹوٹا ہوا گھر واپس جڑ جائے اور میں اپنے شوہر اور بچوں کے
‘‘

جی! ہمیں مایوس نہ کریں، بہت آس لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔‘‘

ں۔

ز نہیں۔ آپ لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، انسان ہوں میں۔ میرے
ہے۔‘‘ شاہ جی انتہائی جذباتی ہو کر بولے۔

و جاؤں گی۔‘‘ عورت نے ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا اور شمائلہ کے
گی۔ ’’بہن......!‘‘

......!‘‘ شمائلہ کا دل پسیج گیا، اس نے غالباً خاتون کی سفارش کرنا چاہی
بلند کر کے اسے بھی چپ کرا دیا۔

ہو جی!‘‘ وہ شمائلہ سے ڈانٹ پلانے کے انداز میں بولے اور پھر
طب ہو کر کہنے لگے۔ ’’اس کام کے لئے میں ہی ایک آدمی تو نہیں
خوبصورت عورت ہو جس سے کہو گی، وہ نکاح کرنے کے لئے تیار ہو
اور دیکھو۔‘‘

سے چھوڑے گا نہیں سرکار!‘‘ خاتون چپ رہی، مرد بیچ میں بول اٹھا۔
وچتے ناں ...... میں کیا کروں اور اب آپ لوگ جائیں یہاں ......‘‘
ت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور دونوں مایوس ہو کر کمرے سے نکل
جی کو دیکھنے لگی تو شاہ جی نے غور سے ایک نظر شمائلہ کو دیکھا، تھوڑا

پاکستان ورچوئل لائبریری
ڈائجسٹ اعظم

علی نے بہت زور زور سے عینی کا نام پکارا اور ڈرائیور سے بھی گاڑی روکنے کے لئے کہتا رہا لیکن نہ تو عینی نے علی کی آواز سنی اور نہ ڈرائیور نے گاڑی روکی اور عینی پلک جھپکتے ہی علی کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ علی تڑپ گیا اور اس نے عقبی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ڈرائیور کی پیٹھ پر مکا مارا اور انتہائی غصے میں بولا۔ ''ایڈیٹ۔'' لیکن ڈرائیور مسکرا دیا اور گاڑی کو اپنی معمول کی رفتار سے بھگاتا رہا۔ علی غصے میں آگ بگولا ہو گیا اور بڑبڑاتے ہوئے ڈرائیور کو برا بھلا کہنے لگا۔

''کیا ہو گیا چھوٹے صاحب۔'' ڈرائیور نے علی کی کسی بات کا برا منائے بغیر بہت پیار سے پوچھا۔

''گاڑی کیوں نہیں روکی؟'' علی بولا۔

''کس لئے روکوں۔'' ڈرائیور نے علی کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بے نیازی سے پوچھا۔

''مجھے میری بہن نظر آئی تھی۔''

''ارے نہیں صاحب...... کسی اور کو دیکھا ہوگا۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''صاحب نے تو کبھی مجھے آپ کی بہن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''تم کون ہوتے ہو؟'' علی برہمی سے بولا اور ڈرائیور انجان بن کر ہی ہی کر کے ہنسنے لگا لیکن ڈرائیور انجان نہیں تھا۔ ڈرائیور فرقان گلفام کی گینگ کے لڑکوں میں سے ایک اہم کارکن تھا اور گلفام کی کمین گاہ پر اس کا بہت اہم کردار تھا۔ وہ کئی ڈکیتیوں میں ملوث رہ چکا تھا اور اغوا برائے تاوان کی متعدد وارداتوں میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا اور واردات کے دوران گاڑی بھگانے میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔

گلفام کے بنگلے میں کام کرنے والے ملازمین میں ڈرائیور فرقان واحد آدمی تھا جو یہ جانتا تھا اور اسے علی کے تمام کوائف معلوم تھے کہ اس کے اغوا میں گاڑی کا ڈرائیور بھی وہی تھا اور اغوا کے وقت علی کی آنکھوں پر چونکہ پٹی بندھی تھی اور اسے بیہوش بھی کر دیا گیا

تھا، اس لئے علی نے اسے واردات کے وقت نہیں دیکھا تھا لیکن ڈرائیور فرقان نے علی کو اچھی طرح دیکھا تھا اور اسے معلوم تھا کہ علی کی ایک اور بہن اسی شہر میں ہے اور جب علی اپنی بہن کو دیکھ کر چیخا تھا تو اس وقت فرقان کے من میں بھی رحم کا ایک جذبہ لحہ بھر کو عود کر آیا تھا کہ وہ گاڑی روکے لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اگر علی کی بہن مل گئی تو یہ ''یک نہ شد دو شد'' والی بات ہو جائے گی۔ کیونکہ گلفام جب علی کو ایڈاپٹ کر رہا تھا تو اس وقت فرقان نے اس بارے میں سخت مخالفت کی تھی اور اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ علی آگے جا کے گینگ کے لئے مشکلات بھی پیدا کر سکتا ہے اور خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ دوسرے لڑکوں نے بھی میٹنگ کے دوران علی کے حوالے سے سخت مخالفت کی تھی اور اس اختلاف اور اتفاق کا حق بھی گلفام نے اپنے لڑکوں کو دے رکھا تھا جب بھی کوئی خاص بات ہوتی کوئی منصوبہ بنانا ہوتا کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو گلفام اپنی گینگ کے لڑکوں کے ساتھ بھرپور میٹنگ کرتا اور سب کی رائے لیتا لیکن آخری فیصلہ گلفام کا ہوتا۔ علی کو اپنانے کے سلسلے میں بھی اس نے گینگ کے لڑکوں کو اعتماد میں لینے کے لئے میٹنگ کی تھی لیکن کسی بھی لڑکے نے اس بات کی حمایت نہیں کی تھی کہ علی کو ایڈاپٹ کیا جائے۔ لیکن گلفام اور اس کی گینگ کے لڑکوں کی سوچ میں فرق تھا کہ لڑکے نوجوان اور سوسائٹی سے بیزار، ناراض اور متنفر تھے اور بیروزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر انہوں نے ایک غلط پیشہ اختیار کیا تھا جبکہ گلفام نے بھی زمانے کی ناانصافیاں اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کا نظام دیکھا تھا اور اس نے نظام سے مایوس اور دلبرداشتہ ہو کر انہی لڑکوں کی طرح ڈکیتی ڈالنے والے ایک گینگ میں شمولیت اختیار کی تھی لیکن اس کی گینگ کے لڑکوں نے اپنے خاندان پر گزرنے والے وہ دکھ اور مصائب نہیں دیکھے تھے جو گلفام نے جھیلے تھے اور اب جبکہ علی ان کے قبضے میں تھا اور اس کے تایا نے ایک معصوم بھتیجے کی زندگی کے مقابلے میں دولت کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے اس کو وقت کی آندھی کے آگے چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی تھی تو گلفام کا ضمیر یہ گوارا نہ کر سکا کہ وہ علی کو بے یار و مددگار راستے میں چھوڑ دے۔ ایسے راستے میں جہاں اس کی کوئی منزل اور کوئی تحفظ نہیں اور جبکہ وہ جانتا تھا کہ اس معصوم بچے کا پورا خاندان تتر بتر ہو گیا ہے اور علی کے خاندان کو تہس نہس کرنے میں اس کا بھی ہاتھ ہے اور گلفام کا ضمیر چونکہ ابھی تک اندر سے زندہ تھا اور شاید اندر سے زندہ اس لئے تھا کہ اس نے دولت تو بہت لوٹی تھی لیکن ابھی تک اس کے ہاتھ سے کسی کا خون نہیں ہوا تھا۔

لڑکوں کی تمام تر مخالفت کے باوجود اس نے اپنے ضمیر کی آواز سنی اور اس پر لبیک

کہا۔ اس نے لڑکوں کی بات سنی ضرور لیکن حتمی فیصلہ اپنا ہی کیا اور اپنی بیوی رانی کو اعتماد میں لیتے ہوئے علی کو بیٹا بنا کے بنگلے میں لے آیا۔

بنگلہ اور کمین گاہ دو الگ الگ مقام، الگ الگ محل وقوع اور الگ الگ سوسائٹیاں تھیں اور گلفام نے اپنی ایک سوسائٹی کو دوسری سوسائٹی سے بالکل الگ رکھا ہوا تھا۔ ۱۱ سوسائٹی کے جس پوش علاقے میں رہتا تھا وہاں اور لوگوں کی طرح ایک بگ شاٹ سمجھا جاتا تھا۔ سارا علاقہ بگ شاٹس کا تھا جن کے بنگلوں کے آگے مسلح گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔ یہ سب بڑے معزز اور دولت مند لوگوں کا علاقہ تھا جہاں اکثر رات کو دروازوں پر کتے بھونکتے تھے اور جو ایک دوسرے کو سرسری طور پر بھی نہیں جانتے تھے اور نہ جاننے کی کوشش کرتے تھے اور کسی کو کسی کے ذریعہ معاش کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔ گلفام کا بنگلہ بھی انہی بنگلوں میں سے ایک تھا۔ اس کے تعلقات آس پاس والوں سے نہیں بلکہ زیادہ تر ان لوگوں سے تھے جو طاقتور تھے اور جن کی طاقت کو گلفام اپنے پیسے سے خریدنے کی سکت رکھتا تھا۔ سو اس کی ایک الگ دنیا تھی اور اس کی رہائش ایک الگ دنیا تھی اور اس نے علی کو ایڈاپٹ کر کے جو غلطی کی تھی اس کا اسے احساس تھا لیکن تحت الشعور میں اس نے ایسا شاید اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے کیا تھا اور چونکہ اس کا دل ابھی پتھر نہیں ہوا تھا لہٰذا اس نے علی پر ترس کھایا تھا تاہم وہ مطمئن تھا کہ علی کے پیچھے کوئی ہے نہیں جو اس کا پیچھا کرے گا یا اس کو ڈھونڈنے کی تگ و دو کرے گا لیکن اس کے باوجود اس نے علی کی نشست و برخاست اور حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اور اپنی گینگ کے ڈرائیور فرقان کی ڈیوٹی بنگلے پر لگا دی تھی کہ وہ ہر وقت اور ہر طرح علی کا خیال رکھے اور خاص طور پر جب وہ اسکول جا رہا ہو اور اسکول سے آ رہا ہو تو اس کو گاڑی سے نیچے نہ اترنے دے۔ علی خود بھی کافی حد تک باتوں کو سمجھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دنیا اتھل پتھل ہو چکی ہے۔ باپ مر گیا ہے اور ماں بھی تقریباً مر چکی ہے۔ تایا تائی بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بہن کا کچھ پتہ نہیں اور جہاں اس کے خاندان کا ہر فرد گردش میں آ کے ختم ہو گیا ہے تو ایسے میں اس کے لئے بھی باہر خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اس کے لئے بہتری اب اسی بات میں ہے کہ وہ ڈیڈی گلفام کے پاس رہے اور اسی طرح کرے جس طرح ڈیڈی گلفام کہتے ہیں چاہتے ہیں اور یہ ڈیڈی کا لفظ بھی اسے گلفام ہی نے دیا تھا اور وہ گلفام کو ڈیڈی اور رانی کو رانی ماں کہنے لگا تھا اور وہ کسی حد تک خوش بھی تھا کہ اسے اس گھر میں وہ سب چیزیں میسر تھیں جو اس کے نزدیک ایک خواب کی طرح تھیں کہ اس کے تصور سے بڑا بنگلہ تھا اس کے

سونے کا الگ اور پڑھنے کا الگ کمرہ جبکہ اس کا تایا تائی اسے اور اس کی بہن کو اس چھوٹے سے بدبو دار کمرے میں سلاتے تھے جہاں گھر کے لوگوں کے جوتے رکھے ہوتے تھے اور یہاں سارا بنگلہ اس کے ڈسپوزل پر تھا کہ جو جی چاہے کرے جو جی چاہے کھائے پیے۔کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔خدمت کے لئے نوکر چاکر، گاڑی، ڈرائیور لہٰذا وہ اسی طرح کرنا چاہتا تھا جیسے گلفام چاہتا ہو۔لیکن اس دن اسکول سے واپسی پر اچانک جو اس نے اپنی بہن عینی کو دیکھا تو من میں کھلبلی مچ گئی۔ بہت چیخا چلایا لیکن نہ تو عینی نے اس کی آواز سنی اور نہ ہی ڈرائیور نے گاڑی روکی اور انجان بن کے گاڑی واپس بنگلے پر لے آیا۔گھر آ کے وہ بہت رویا اور گلفام سے ڈرائیور کی شکایت کی۔

''اس ڈرائیور کے بچے کی تو میں جان نکال لوں گا۔'' گلفام نے علی کے سامنے ڈرائیور کو جھاڑ پلائی اور علی کو پیار کر کے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔'' بیٹے تم فکر نہ کرو جس کو تم نے دیکھا اگر وہ عینی تھی تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''وہ عینی تھی۔'' علی اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

''تو پھر تم مطمئن ہو جاؤ اب اسے ڈھونڈنا میرا کام ہے۔'' گلفام نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا اور علی کو اطمینان ہو گیا کہ گلفام اب اسے ضرور ڈھونڈ لے گا اور گلفام نے کوشش بھی بہت کی۔ دو لڑکے اور ڈرائیور فرقان کے ساتھ لگا دیئے کہ وہ اس علاقے میں جا کے جاسوسی کریں جہاں علی نے عینی کو دیکھا تھا اور اس کا کھوج لگانے کی کوشش کریں۔لڑکوں نے اپنا جال پھیلا دیا۔خفیہ طریقے سے بہت چھان بین کی لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔

''ایسا لگتا ہے کہ لڑکی کسی کے گھر میں ملازمہ ہے۔'' ایک لڑکے نے رائے دی۔

''پاگل ہو گئے ہو تم۔ وہ ملازمت کرنے کی عمر میں نہیں ہے۔'' گلفام نے لڑکے کو ڈانٹا۔

''لیکن سر وہ لڑکی اس علاقے میں دیکھی ضرور گئی ہے ایک عورت کے ساتھ۔ پر آگے کچھ کھوج نہیں لگ رہی ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''میرا اندازہ ہے کہ لڑکی کو کسی این جی او نے کسی یتیم خانے میں داخل کر دیا ہے۔'' دوسرے لڑکے نے اظہار خیال کیا۔

''اندازے نہ لگاؤ یقینی بات کرو۔یتیم خانے شہر میں کونسے ہزاروں ہیں دو چار چھ ہی ہوں گے۔'' گلفام نے کہا۔''یتیم خانوں کی ٹوہ لو اور حتمی طور پر بتاؤ۔'' پھر لڑکے یتیم

خانیوں کی ٹوہ میں لگ گئے تاہم اس سلسلے میں علی کو کچھ نہیں بتایا گیا اسے یہی تاثر دیا گیا کہ عینی ضرور مل جائے گی۔

پھر دس سال پلک جھپکتے گزر گئے۔

''اب تمہیں اپنے بارے میں اور آگے کے بارے میں بہت کچھ سوچنا ہوگا شائلہ۔'' ایک دن جب رات کو بہت دیر سے شاہ جی گھر پہنچے تو پلنگ پر تھکے ہارے ڈھیر ہو کر بولے۔

شمائلہ شام سے ہی بے چینی کے ساتھ شاہ جی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جیسے تیسے دس برس شاہ جی کی زوجیت میں گزار دیئے تھے۔ اس دوران اس پر کئی عذاب گزرے، کئی دکھ آئے، کئی مصیبتیں اس نے جھیلیں۔ وہ اب ان چیزوں کی عادی ہو گئی تھی۔ اس کیلئے یہ کافی تھا کہ اسے زندگی گزارنے کے لئے شاہ صاحب کا تحفظ حاصل ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اپنا رویہ بدلا ایک نارمل انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی مقدور بھر کوشش کی اور شائلہ سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا کیا کہ وہ کوئی اور شادی نہیں کرے گا اور اس نے کوئی اور شادی نہیں کی حالانکہ کئی بچھڑے ہوئے جوڑے دوبارہ ملنے کے لئے شاہ صاحب کی خدمات حاصل کرنے کے لئے آتے رہے لیکن شاہ جی نے اپنے اندر قناعت کی ایک قوت پیدا کرنے کی کوشش کی تاہم ان کی صحت اب قابل رشک نہیں رہی تھی۔ وہ طب کے حوالے سے بہت درک رکھتے تھے اپنی صحت کو بحال رکھنے کے لئے کافی حد تک دوا دارو کرتے رہے، ورزش کا خیال رکھا۔ خوراک متوازن رکھی، دماغی قوت کیلئے خشخاش، مغز، بادام روغن اور دوسری ایسی ہی اشیاء کو استعمال میں لاتے رہے اور طاقت کے لئے جو بن پایا دوا دارو کرتے رہے لیکن بڑھتی ہوئی عمر میں ان مقوی اشیاء نے الٹا ہی اثر کیا آنکھ میں موتیا آ گیا تو آپریشن کرانا پڑا، سو ایک آنکھ کے موتیا کا آپریشن خراب ہو گیا دوسری آنکھ میں بھی نامکمل روشنی رہ گئی۔ گٹھیا کا درد ہڈی کے ہر جوڑ میں بیٹھ گیا۔ شہر کے بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کو بھاری فیس دے کر علاج کراتے رہے لیکن بڑھتی ہوئی عمر کو کم کرنے کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا اور شائلہ ہی نے غالب کا شعر ایک بار انہیں سنایا تھا جو بآسانی ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اور شاہ جی نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی زندگی کے سورج کی آب و تاب ختم ہو گئی ہے یا ختم ہو رہی ہے تاہم اس دوران انہیں اس بات سے بہت تقویت حاصل ہوئی کہ شمائلہ ان کی زوجیت میں ہے اور جس نے شاہ صاحب کی بیماری اور پیرانہ سالی کے حوالے سے خدمت کر کے حق زوجیت، حق سے زیادہ ہی ادا کر دیا تھا اور ادا کر رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے شمائلہ پیدا ہی خدمت کے لئے ہوئی ہے۔ اس نے شاہ جی کو بہت آرام دیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے اندر کے مرد سے شرمندہ نہ ہوں کیونکہ یہ وقت کا تقاضا ہے۔ نیز انہیں یہ بھی باور کرایا کہ اس کے اندر اب کوئی عورت نہیں بس رہی ہے کہ اس کے اندر کی عورت خود بخود مر گئی ہے اور جو تھوڑی بہت بچ گئی تھی اسے اس نے خود مار دیا ہے۔ اب صرف بچی کھچی زندگی اسے گزارنی ہے اور اس زندگی میں آس کی ایک ڈور ہے جس کو وہ کبھی نہ توڑے گی اور کبھی نہ ٹوٹنے دے گی کہ شاید زندگی کی گزرگاہ کے کسی موڑ پر اس کے علی اور عینی کی خبر مل جائے اور یہ آس وہ آخری سانس تک شاہ جی کی چھت کے نیچے قائم رکھنا چاہتی تھی لیکن جو تشویشناک بات شمائلہ کے لئے پیدا ہو گئی تھی وہ یہی تھی کہ شاہ صاحب کی حویلی کے در و دیوار اور چھت بھی اسے مخدوش دکھائی دینے لگی تھی کہ شاہ جی کا دبدبہ اور طمطراق تو ختم ہوتا جا رہا تھا۔ باہر کے انتظام پر گرفت بھی کمزور پڑ گئی تھی اور شمائلہ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ شاہ جی کی باہر کی دنیا میں کیسی توڑ پھوڑ ہو رہی ہے کیونکہ آستانہ پر جہاں ان کے مرید اور پیروکار آتے تھے، شاہ جی نے بند کر دیا تھا۔ گدی بھی اٹھ گئی تھی یا کسی اور نے قبضہ کر لیا تھا۔ شاہ جی کی زمینوں کا کامدار بھی اب کوئی مختلف آدمی تھا جس سے شاہ جی کا کوئی واسطہ نہیں لگتا تھا اور آڑھتیوں سے شاہ جی کا براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور ان تمام حالات نے مل کر شاہ جی کی داخلی صورتحال میں بھی کچھ ایسی خرابی پیدا کر دی تھی کہ ان کا ہاتھ تنگ دکھائی دیتا تھا اور وہ اکثر خرچ کے لئے شمائلہ سے روپے مانگ لیتے تھے کیونکہ پچھلے دس بارہ سال کے دوران جب ان کے پاس کھلا پیسہ تھا تو وہ کھلے دل سے شمائلہ کو کچھ رقم دیتے رہتے تھے، جب بھی ان کا موڈ اچھا ہوتا تو وہ شمائلہ کو پانچ دس ہزار دے دیتے اور ساتھ ہی اسے یہ رقم اپنے پاس محفوظ رکھنے کی تلقین کرتے۔ شمائلہ کا خرچ ہی کیا تھا نہ کہیں آنا نہ جانا ہر وقت گھر میں ہی رہنا لہٰذا پیسے ایک تجوری میں مقفل کر دیتی جب شاہ جی پاس ہوتے تو شاہ جی کو بھگتتی اور جب وہ گھر میں نہ ہوتے تو کتابیں پڑھ کر اپنا وقت گزار لیتی اور کتابیں شاہ جی کے پاس کافی تھیں۔ کچھ یونانی طب کے حوالے سے تھیں، کچھ تاریخی کتب تھیں، کچھ اسلامی تاریخ سے متعلق تھیں اور کچھ ایسا لٹریچر تھا جو شاہ جی

کو زیب نہیں دیتا تھا تاہم شاہ صاحب کی اکثر کتابیں شمائلہ کے زیرِ مطالعہ رہیں اور جب سے شمائلہ شاہ جی کی زوجیت میں آئی تھی تب سے شاہ جی نے شمائلہ کی دلچسپی کی ادبی کتب بھی جو زیادہ تر شاعری اور فکشن پر مشتمل تھیں گھر کے اندر رکھنی شروع کر دی تھیں لیکن اب یہ دور بھی گزر گیا تھا کہ شاہ جی کے لگاتار پریشان اور بیمار رہنے کی وجہ سے شمائلہ بھی بے سکون ہو گئی تھی اور شاہ جی کو پریشانی کے سبب چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ بہت غیر حاضر دماغ اور اکھڑے اکھڑے رہتے اور زمین پر چلتے ہوئے زمین کو ہلا دینے والا آدمی اب بمشکل لاٹھی کا سہارا لے کر صرف اتنا چل پاتا کہ صحن سے کھیت اور کھیت سے اگلی منڈھیروں تک جا پاتے اور کھیتوں میں اگے ہوئے پودوں، درختوں کے پتوں پھلوں اور پھولوں کو چھو کر ان کی خوشبو سونگھتے۔

پھر ایک دن اچانک اسے ایک ٹیلیفون آیا جسے سن کر وہ بہت پریشان ہو گیا اور شمائلہ نے اسے کسی سے گڑگڑا کر التجا کرتے ہوئے سنا، وہ کہہ رہا تھا ''نہیں نہیں تم اندر نہیں آنا میں باہر آ رہا ہوں تمہارے پاس۔'' اور پھر یہ کہہ کر اس نے موبائل فون بند کیا اور لاٹھی اٹھا کے جانے لگا۔

''کیا بات ہے کون تھا؟'' شمائلہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میں ذرا باہر جا رہا ہوں اگر رات لوٹنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہیں ہونا۔'' شاہ جی نے کہا۔

''مگر......، شمائلہ نے تشویش سے کچھ کہنا چاہا تو شاہ جی نے ہاتھ بلند کر کے اسے چپ کرا دیا۔

''سب کچھ بتا دوں گا۔'' انہوں نے جاتے جاتے کہا۔ شمائلہ آگے بڑھی اور بازو تھاما۔ ''میں سہارا دے کر سڑک تک چھوڑ آتی ہوں۔'' شمائلہ نے کہا۔

''نہیں نہیں جب تک چل سکتا ہوں جب تک سہارا نہ دو۔'' وہ لاٹھی ٹکاتے ہوئے باہر کھیت کی جانب چلے اور بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ابھی تو یہ کھیت میرے اپنے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر انہوں نے کیاری سے ایک پتا توڑا اور انگلیوں میں مسل کر انگلیوں کی پور سے اس کی خوشبو سونگھی۔ ''میں نہ بھی دیکھ سکوں جب بھی یہ راستے مجھے یاد ہیں۔'' وہ کیاری میں چلتے ہوئے بڑبڑائے اور سیدھا راستہ پکڑ کر پیدل چلے گئے۔

شمائلہ صحن میں کھڑی انہیں نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتی رہی۔ شاہ جی اس دن بہت مضمحل تھے اور بہت پراسرار طریقے سے گئے تھے اور شمائلہ نے بھی دن بہت

پریشانی میں گزارا تھا کہ اب شائلہ کیلئے جو کچھ بھی باقی رہ گیا تھا وہ شاہ جی ہی تھے۔ انہوں نے جب لوٹنے میں بہت دیر کر دی تو شائلہ نے شاہ جی کے موبائل پر فون کیا لیکن موبائل ہر بار بند ملا۔ دن گزارا، شام آئی، گئی۔ رات سر پہ کھڑی ہو گئی لیکن شاہ جی کا کچھ اتا پتا نہیں چلا، موبائل مسلسل بند چلا آ رہا تھا اور شائلہ کی پریشانی ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ حویلی میں تنہا تھی۔ وہ کبھی باہر جاتی، کبھی اندر آتی۔ کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے وہ سوچ رہی تھی کہ اس کو باہر حجرے وغیرہ کی طرف جا کر صورتحال معلوم کرنا چاہئے لیکن وہ حجرے کی طرف کبھی گئی نہیں تھی کہ شاہ صاحب کی جانب سے اجازت نہیں تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں سر پکڑ کے بیٹھی تھی اور رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی کہ اچانک کسی گاڑی کی لائٹیں حویلی پر پڑیں اور پھر گاڑی کے دروازے کے باہر رکنے کی آواز آئی۔ شائلہ تیزی سے باہر نکلی لیکن رکنے والی گاڑی کی لائٹیں بجھ چکی تھیں اور کار جس کا رنگ بھی سیاہ تھا، رات کے سیاہ رنگ میں تحلیل ہو گئی تھی۔

شاہ جی کار سے اتر کر لاٹھی ٹکاتے گھر کی طرف آئے شائلہ نے بازو پکڑ کر یونہی اشارۃً سہارا دیا، کار نے ریورس لیا اور تیزی سے مڑ کر نکل گئی۔ شائلہ کچھ نہ دیکھ سکی کہ کار میں کتنے لوگ اور کون تھے۔ وہ شاہ جی کا بازو تھام کر اندر لے آئی اور شاہ جی پلنگ پر گر جانے کے انداز سے ڈھیر ہو گئے اور بہت دکھ کے ساتھ شائلہ سے کہنے لگے۔ ''اب تمہیں اپنے بارے میں سوچنا ہوگا شالو۔'' وہ انتہائی شکست خوردہ لہجے اور تھکی ہوئی آواز میں بولے۔

''آخر مسئلہ کیا ہے؟ کئی دنوں سے آپ بہت پریشان ہیں اور مسلسل مجھ سے معاملات چھپا رہے ہیں۔ آخر میں آپ کی ......'' وہ بے اختیار کچھ کہنے لگی تھی شاید یہی کہنا چاہتی تھی کہ آخر میں آپ کی بیوی آپ کی شریک حیات ہوں لیکن اسے یوں لگا جیسے اچانک زاہد کی بھولی بسری تصویر کا خاکہ اس کے ذہن میں نمودار ہوا اور بات ہونٹوں سے پھسلتے پھسلتے رک گئی۔

''کیوں نہیں۔ اب تم ہی میری سب کچھ ہو۔ میری بیوی، میرے دکھ سکھ کی ساتھی، میری شریک حیات۔ شاہ نے وہ جملہ مکمل کیا جو شائلہ نے ادھورا چھوڑ دیا تھا اور پھر مزید کہنے لگے۔ ''آج میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔'' شاہ جی نے شائلہ سے پانی مانگا۔ پانی کا گلاس پیا تو کچھ تازگی آئی اور کہنے لگے۔

''دیکھو شمالو تم جانتی ہو کہ میں نے درجنوں شادیاں کیں اور جیسا کہ میں اکثر کہتا ہوں ان میں سے بیشتر کی شکلیں اور نام بھی مجھے یاد نہیں، تم واحد ایک ایسی عورت ہو جس میری زندگی میں داخل ہو کر میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ کے بعد میں نے شادی کا تصور بھی نہیں کیا۔''

''آگے چلیں ......'' جب وہ اتنا کہہ کر رکے تو شمائلہ نے لقمہ دیا۔

''ابھی پیچھے ہی رہنے دو مجھے کہ میں تھوڑی سی وضاحت کر دوں۔'' شاہ جی شمائلہ کو ٹوک کر کہا۔ ''تم سے شادی کرنے کے بعد اور وہ بھی اس وقت جب زاہد انتقال کی خبر سننے کے بعد تم نے اپنی مرضی سے میرے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا تو پھر معلوم ہوا کہ شادی کیا ہوتی ہے اور بیوی کیا ہوتی ہے۔ ورنہ وہ عورتیں بیچاری تو اسی ط آئی تھیں میرے پاس شادی کرنے جس طرح شروع میں تم آئی تھیں اپنی غلطیور پاداش کی سزا بھگتنے اپنے اجڑے ہوئے ویران گھروں کو جوڑنے اور آباد کرنے۔ میں کبھی کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔ ان کی مرضی کے مطابق انہیں نکاح میں رکھا اور ان مطالبے پر طلاق دے دی۔ ان میں سے بیشتر اب ہنسی خوشی دوبارہ اپنے گھروں میں ا شوہروں اور بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے انہیں یاد بھی نہ ہ شاہ جی نام کا کوئی آدمی کبھی ان کی زندگی میں آیا تھا کہ نہیں۔''

وہ بول کر رکے تو شمالہ نے پھر انہیں ٹوکا۔

''یہ سب کچھ تو میں جانتی ہوں، وہ بات بتائیں جو مجھے نہیں معلوم ہے۔'' ش تجسس سے بولی اور شاہ جی نے دکھ بھرا سانس لیا اور از راہ تاسف بولے۔ ''میں نے عورت کو دھوکا نہیں دیا۔ کسی عورت نے مجھے دھوکا نہیں دیا لیکن زینت سے شادی کرنا م بہت بڑی غلطی تھی۔''

''زینت ......!'' شمائلہ تجسس سے بولی۔

''ہاں زینت بھی اپنی مجبوری لے کر آئی تھی کہ میاں سے جھگڑا ہو گیا، غصے طلاق ہوگئی۔ اب دونوں پچھتا رہے ہیں۔ آپ ہم پر رحم کریں شادی کر لیں تا کہ آپ سے طلاق لے کر دوبارہ اپنا گھر آباد کروں۔ معلوم نہیں کیوں میرا جی نہیں چاہ لیکن دونوں میاں بیوی نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑانے لگے۔ لہٰذا میں نے عورت کو اپنے نکاح میں لے لیا۔'' شاہ جی بولتے بولتے چپ ہو گئے اور سوچ میں پڑ جیسے دماغی طور پر غیر حاضر ہو گئے ہوں۔

''پھر کیا ہوا؟'' شائلہ نے شاہ جی کی بات میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''پھر کچھ عرصے بعد میں نے اس سے کہا اب تم جاؤ میں طلاق دے دیتا ہوں۔ جا کے اپنے چھوڑے ہوئے شوہر کے ساتھ شادی کرلو۔ لیکن اس نے طلاق لینے میں تامل کیا۔''

''کیوں؟'' شائلہ نے پرتجسس انداز میں پوچھا اور شاہ جی کہنے لگے۔ ''اس نے ایک اور دردبھری کہانی سنادی۔ کہنے لگی شاہ جی میرے شوہر نے طلاق اس لئے دی تھی کہ ہمارے کوئی اولاد نہیں ہے اور میں چاہتی ہوں کہ۔''

''بس بس۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر سختی سے منع کیا اور کہا کہ میں اولاد نہیں پیدا کروں گا۔ اس پر وہ عورت زینت بہت روئی اور کہنے لگی کہ کیا فائدہ ہوگا وہ بغیر اولاد کے مجھے نہیں رکھے گا۔ دوبارہ طلاق دے دے گا۔ میں مر جاؤں گی آپ مجھ پر رحم کریں۔''

''تو......'' شاہ جی بولتے بولتے چپ ہوگئے تو شائلہ کا تجسس بڑھ گیا۔

''تو کیا۔ انسان غلطی کا پتلا ہے۔ میں نے پھر اسے جانے کے لئے نہیں کہا اور تین سال مزید رہی اور تین سال میں اس نے تین بیٹے پیدا کر لئے تو پھر مجھ سے طلاق مانگی میں نے طلاق دے دی۔ اور......''

''ہوا کیا؟'' شائلہ نے پوچھا۔ اس کا شوق اور تجسس بہت بڑھ گیا تھا۔

''ہوا یہ کہ وہ فراڈ تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس نے میرے بچے خاص منصوبے کے تحت پیدا کئے تھے۔ بچوں کو کاغذی ریکارڈ پر لے آئی اور پھر اپنے شوہر کے ساتھ مل کر وراثت کا دعویٰ کرتے ہوئے مجھے بلیک میل کرتی رہی۔ اب وہ تین بیٹے چھت سے لگتے ہیں اور تینوں بدمعاش ہیں اور چوتھا ان کا سوتیلا باپ۔ ان سب نے مل کر مجھے تباہ کر دیا۔ بس جب ایک مرتبہ تین دن کیلئے غائب ہوا تھا تو معلوم ہے کہاں گیا تھا۔'' شاہ جی نے پوچھا۔

''نہیں ......کہاں ...... آپ نے تو یہی کہا تھا کہ بہن سے ملنے گئے تھے۔'' شائلہ کشمکش میں بولی۔

''نہیں میری کوئی بہن نہیں کوئی بھائی نہیں۔ مجھے میرے بیٹوں نے زینت اور اس کے شوہر کے ساتھ مل کر اغوا کرلیا تھا۔'' شاہ جی نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ شائلہ لرزسی

گئی۔

''انہوں نے گن پوائنٹ پر مجھ سے سب کچھ لکھوا لیا۔ میرے کھیت، میری زمین، ہر چیز گن پوائنٹ پر اپنے نام لکھوا کے رجسٹر کرا دی یہاں تک کہ میرے بینک اکاؤنٹ کے خالی چیکوں پر دستخط کروا کے رقم نکلوا لی میرے پاس صرف یہ حویلی اور اس کے آس پاس کی زمین چھوڑی ہے۔ جیپ رہنے دی میرے پاس۔ لیکن ڈرائیور انہیں کا ہے۔''

بولتے بولتے شاہ جی کی سانس پھول گئی تھی اور شمائلہ کی حالت سنتے سنتے خراب ہو گئی اور شاہ جی کہنے لگے۔ ''یہ حویلی اور اس کے اطراف کھیت اور باغ انہوں نے مصلحتاً میرے لئے چھوڑے ہیں جن پر ظاہر ہے میرے مرنے کے بعد انہیں کا قبضہ ہو جائے گا۔ میں تمہیں اب نہ بتاتا لیکن پانی چونکہ سر سے اونچا ہو گیا ہے اس لئے اور نہیں چھپا سکتا تھا۔ آہ۔'' انہوں نے تھوڑا دم لیا اور پھر کہنے لگے۔ ''اسی لئے جب تم سے شادی ہوئی تھی تو معلوم نہیں کیوں میں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ایک بیٹا ہو جائے اگر ہو جاتا تو آج بارہ سال کا ہوتا وہ تمہارا سہارا بن سکتا تھا لیکن معلوم نہیں تم نے۔''

''نہیں شاہ جی نہیں۔'' شمائلہ شاہ جی کی بات کاٹ کے بولی۔ ''مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے کیا معلوم بیٹا اگر ہوتا تو وہ میرا سہارا بنتا یا میرے لئے ایک اور دکھ بن جاتا اور اگر بیٹی ہو جاتی تو پھر دکھوں کی پوٹلی مجھے مل جاتی۔ نہیں شاہ جی نہیں مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ کیا میں نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو جنم نہیں دیا تھا۔ پریوں کے دیس کا شہزادہ تھا میرا علی اور میری عینی ایک ننھی سی پری تھی۔ کہاں ہیں دونوں بہن بھائی آج اور معلوم نہیں ہیں بھی کہ نہیں۔ آپ نے کتنے عرصے کے بعد مجھے بتایا کہ میرے علی کو ڈاکو اٹھا کے لے گئے تھے۔ کیا قصور تھا اس کا۔ یہ سب قسمت کی بات ہے شاہ جی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے کسی اور دکھ جھیلنے والے یا دکھ جھیلنے والی کو جنم نہیں دیا۔'' شمائلہ بولتے بولتے بہت جذباتی ہو گئی اس کے آنسو تھم نہ سکے۔ ''میرے بچے بھی میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔''

اس کے اگلے پچھلے تمام دکھ اور دکھوں کی یادیں سمٹ سمٹا کے آنکھوں میں آ گئیں اور وہ چھم چھم رونے لگ گئی۔

''صبر...... تمہیں یہ سب کچھ بتانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تمہیں اور دکھی کروں۔'' شاہ جی نے شمائلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف تمہارے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوں مجھے ڈر ہے کہ یہ بدمعاش لوگ میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی نقصان نہ پہنچائیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی جان بچا کے یہاں

سے نکل جاؤ۔ کچھ پیسے تمہارے پاس ہوں گے اور ایک چیز میرے پاس ہے جو تمہارے کام آئے گی۔'' شاہ جی اٹھے اور اپنا ایک ذاتی کباٹ کھولا اور اس میں سے ایک بھاری بھر کم لفافہ نکال کے شمائلہ کے سامنے رکھا اور کہنے لگے۔ ''یہ اپنے قبضے میں کرلو اور اپنی رقم زیورات اور یہ لفافہ قبضے میں کر کے کل صبح ٹیکسی کے ذریعے یہاں سے نکل جاؤ۔ لاہور بھی نہیں رکنا سیدھی کراچی چلی جانا۔'' شاہ جی ایک لمبی تمہید باندھ کے چپ ہوئے تو شمائلہ بولی۔ ''وہ تو سب ٹھیک ہے شاہ جی لیکن اس لفافے میں کیا ہے؟''

''اس میں کچھ پرائز بانڈز ہیں۔ تمہارے کام آئیں گے۔'' شاہ جی نے کہا اور مزید بولے۔ ''تم صبح چلی جاؤ۔''

''نہیں ......'' شمائلہ نے انکار کیا۔ ''میں نہیں جاؤں گی۔''

''یہاں تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔ وہ لوگ تمہیں مارنا چاہتے ہیں۔''

''کیا آپ کی زندگی کو خطرہ نہیں۔'' شمائلہ نے دریافت کیا۔ ''میں آپ کو چھوڑ کر اب نہیں جاؤں گی۔''

''تو پھر مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے پہلے وہ تمہیں ماردیں گے۔''

''کیوں ......؟''

''انہیں اندیشہ ہے کہ تم بعد میں دعویدار نہ بن جاؤ۔''

''میں ان کو یقین دلا دوں گی کہ میں کوئی دعویٰ نہیں کروں گی۔'' شمائلہ ایک عزم کے ساتھ بولی۔ ''لیکن میں آپ کو اس حالت میں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' شمائلہ کے اس عزم اور یگانگت کے جذبے سے شاہ جی کا دل موم ہو گیا اور وہ کسی بچے کی طرح ہچکیاں لینے لگے اور پھر بولے۔ ''اچھا یہ لفافہ تو اپنے پاس رکھ لو۔'' شمائلہ نے لفافہ اٹھا کے رکھ دیا۔ پھر شاہ جی کا سر دبایا اور شاہ جی ہچکیاں لیتے لیتے صوفے ہی پر سو گئے۔

شمائلہ نے آہستہ سے ان کا سر اپنی گود سے اٹھایا اور ایک گدی ان کے سر کے نیچے رکھ دی اور خود جا کے اپنے کمرے میں سو گئی۔

رات چونکہ کافی گزر گئی تھی اور شمائلہ بھی جسمانی طور پر اور ذہنی طور پر زیادہ تھک گئی تھی اس لئے پلنگ پر پڑتے ہی بے خبر سو گئی اور پھر اسے کچھ معلوم نہیں رات کا کونسا پہر تھا جب گولیوں کی آواز اس کے کانوں میں گونج گئی اور فائرنگ اتنی شدید تھی کہ حویلی کے آس پاس درختوں پر سوئے ہوئے کوے، چیلیں اور دوسرے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔

شمائلہ حواس باختہ ہو کر اٹھی۔ اسے حویلی کے اندر کچھ بوٹوں کی آوازیں آئی جیسے کچھ لوگ اندر سے باہر کی طرف دوڑے ہوں۔ پھر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ کار کی روشنیاں کچھ دیر کے لئے کھیتوں پر لہرائیں اور ژوں سے گاڑی حویلی کا احاطہ عبور کر کے نکل گئی۔

''شاہ جی ......'' شمائلہ چیخی اسے شاہ جی کے کراہنے کی آواز ڈرائنگ روم سے آ رہی تھی۔ وہ بے تحاشا ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی تو دیکھا شاہ جی کی لاش خون میں لت پت صوفے سے نیچے گری ہوئی تھی۔ شمائلہ ایک چیخ مار کر شاہ جی سے لپٹ گئی۔

''دیکھا ...... میں نہ کہتا تھا۔'' شاہ جی بمشکل بولے۔ ان کی سانس ابھی تک چل رہی تھی۔

''اب کل یہاں بہت ہجوم ہوگا۔ لیکن تم نہیں رکنا اگر صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے نہیں تو شام کا سورج غروب ہونے سے پہلے اپنا مال متاع لے کر یہاں سے نکل جانا، یہ میری وصیت ہے۔'' شاہ جی نے بمشکل یہ الفاظ ادا کئے اور شمائلہ کے بازوؤں میں جان دے دی۔

شمائلہ نے شاہ جی کی وصیت پر عمل کیا لیکن اس طرح نہیں جس طرح شاہ جی نے کہا تھا۔ پولیس کو شمائلہ نے اسی وقت فون کر دیا تھا۔ زیادہ وقت نہیں لگا جب پولیس کی جماعت آن پہنچی۔ شمائلہ نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ پولیس صبح تک موجود رہی۔ لاش کو قبضے میں کر کے شہر کے ہسپتال میں پوسٹمارٹم کے لئے لے جایا گیا اور دن بھر لوگ آتے رہے اور حجرے میں اور حجرے کے اطراف شاہ جی کے احباب، دور پرے کے رشتے دار، برادری کے لوگ گاؤں والے شاہ جی کے مرید اور معتقد ان کے علاوہ ان کے ساتھ کاروبار کرنے والے لوگ جمع ہو گئے۔ شام تک لاش بھی پوسٹمارٹم کے بعد واپس آ گئی۔ شاہ جی کے گھر کی میزبانی اور تدفین وغیرہ کا انتظام شاہ جی کے انہیں تینوں بیٹوں نے کیا جو زینت کے بطن سے تھے اور شمائلہ نے پہلی مرتبہ شاہ جی کے ان تین بیٹوں کو دیکھا تھا۔ بہت سی خواتین بھی تعزیت کے لئے آئی تھیں جنہیں شمائلہ نہیں جانتی تھی۔ تاہم ان خواتین میں شاہ جی کے تین بیٹوں کی ماں زینت موجود تھی جو خود آ کے شمائلہ سے ملی تھی اور شاہ کی موت پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔

گزشتہ رات شاہ جی کی گفتگو کے بعد شمائلہ کے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قاتل کون ہیں مشکل نہ تھا۔ شاہ جی نے تو پہلے ہی قاتلوں کی نشاندہی کر دی تھی کہ زینت اور اس کے

ن بیٹے انہیں قتل کروا دیں گے۔ جبکہ شاہ جی کے یہی تین بیٹے اور ان کی ماں زینت
گوار دکھائی دے رہے تھے اور تعزیت کیلئے آنے والوں کی تعزیت بھی یہی لوگ وصول کر
ہے تھے۔ یعنی مقتول کا افسوس بھی قاتلوں سے کیا جا رہا تھا۔ تاہم شائلہ نے پولیس کے
گے کسی کی نشاندہی نہیں کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس طرح وہ یہاں پھنس کے رہ جائے گی
، ایک نئی دشمنی کو جنم دے گی۔ لہٰذا اس نے پولیس کو اتنا بتایا کہ وہ الگ سو رہی تھی اس
نے گولیوں کی آواز سنی تو جاگی اور دیکھا کچھ لوگ اندھیرے میں فرار ہو گئے اور شاہ جی کی
اش خون میں لت پت پڑی تھی۔ وہ اندھیرے میں بھاگنے والوں کے چہرے اور گاڑی کو
ہیں دیکھ سکی، اس کا یہ بیان قاتلوں کے لئے بہت حوصلہ افزا تھا۔ لہٰذا وہ تیسرے دن تک
گھر میں موجود رہی اور پولیس کے ساتھ کاغذی کارروائی شاہ جی کے بیٹوں کے ساتھ ہوتی
ہی۔ لہٰذا جب تین دن گزر گئے تو شاہ جی کا بڑا بیٹا جو تیس برس سے زیادہ عمر کا تھا ایک
ات شائلہ کے کمرے میں آیا، زینت اس کے ہمراہ تھی۔

''السلام علیکم چھوٹی ماں۔'' اس نے مؤدبانہ طریقے سے شائلہ کو سلام کیا اور ماں
کہہ کر پکارا اور قریب ہی بیٹھ گیا۔ زینت بھی چپ چاپ ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ شائلہ کو ایک
لمحے کے لئے خوف محسوس ہوا کہ وہ شاہ جی کے قاتلوں کے درمیان اکیلی ہے جبکہ شاہ جی
نے وارننگ بھی دی تھی کہ ماں بیٹے مل کر شائلہ کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن نوجوان کا رویہ
ت فرمانبرادرانہ تھا جبکہ زینت کا رویہ ظاہر ہی نہیں ہوا تھا۔ شائلہ نے نوجوان کے سلام کا
واب سر کی جنبش سے دیا۔

''میرا نام زبیر ہے ماں جی اور میں شاہ صاحب کے تین بیٹوں میں سب سے بڑا
ں اور اماں سے تو آپ مل ہی چکی ہیں۔'' زبیر نے اپنا تعارف کرایا۔ شائلہ نے سر اٹھایا
ر نظر گھما کے زبیر کو قدرے توجہ سے دیکھا۔ وہ اسے بہت ہوشیار، زیرک اور منصوبہ ساز
دمی معلوم ہوا۔

''شاہ جی کی موت ایک المیہ ہے آپ کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔ ایک
ین دکھ کی گھڑی، ایک ناقابل تلافی نقصان آپ کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔''
بر نے مزید تمہید باندھی اور شائلہ نے سوچا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا کہ وہ ایک بہت
لاک اور زیرک آدمی ہے۔

''بے شک جو کچھ ہوا وہ بہت برا ہوا لیکن جو کچھ ہوا اس کو اسی طرح ہونا تھا کیونکہ
طرح لکھا تھا۔'' زبیر نے کہا اور پھر قدرے توقف کر کے کہنے لگا۔ ''لیکن شاہ جی کی

موت کے بعد یہاں کے حالات بہت بدل گئے ہیں اور آگے مزید بدلیں گے اس لئے ......'' وہ کہتے کہتے ذرا سا رکا اور شمائلہ کے چہرے کا جائزہ لیا۔ شمائلہ نے بھی نظر اٹھا کے زبیر کے چہرے کی طرف دیکھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ لڑکا آگے کیا کہنے والا ہے۔'' اس لئے آپ کو یہ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ یہاں سے چلی جائیں۔ آپ کا اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ آپ کو کچھ روپیہ پیسہ چاہئے تو وہ بھی مل سکتا ہے۔'' زبیر نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی جبکہ شمائلہ جانتی تھی کہ اس فیصلے کو زینت کی حمایت حاصل ہے۔

''روپے پیسے کی ضرورت نہیں مجھے میرے پاس اپنا پیسہ ہے اگر تم لے جانے دو گے تو میرے لئے کافی ہے۔'' شمائلہ نے بہت دھیرے دھیرے لہجے میں اظہار خیال کیا۔

''کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ ماں ہیں آپ ہماری بھلا ہم آپ کو آپ کا پیسہ کیوں نہیں لے جانے دیں گے۔'' زبیر بہت فرمانبرداری سے بولا۔

''لیکن شاہ جی کا قتل ہوا ہے اور پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ پولیس کو خانہ پری کیلئے میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' شمائلہ نے کہا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' زبیر بولا۔ ''ہم مر گئے ہیں کہ ہماری ماں پولیس کو ہینڈل کرے گی ہم کاہے کے لئے ہیں ہم جانیں اور پولیس۔ بس آپ اپنی تیاری کریں۔'' زبیر نے کہا اور پھر پوچھا۔ ''کب جائیں گی؟''

''کل صبح۔'' شمائلہ نے کہا وہ بھی جلد از جلد ایسی چار دیواری سے باہر نکلنا چاہتی تھی جہاں ہر طرف اس کو خطرہ ہی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

''سو بسم اللہ۔'' زبیر نے کہا۔ ''صبح ڈرائیور آپ کو لاہور پہنچا دے گا۔''

شمائلہ نے رات اپنا سامان باندھا۔ روپیہ پیسہ زیورات اور شاہ جی کے دیئے ہوئے پرائز بانڈز محفوظ کئے اور صبح سویرے حویلی سے لاہور ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہو گئی اور لاہور سے کراچی کیلئے جو پہلی فلائٹ دستیاب تھی اس کے ذریعے کراچی آ گئی۔

جہاز میں اسے ایک بہت اچھی اور مطلب کی ہمسفر مل گئی تھی۔

بہت کم مسافر تھے شاید ...... نائٹ کوچ ہونے کی وجہ سے مسافر کم تھے اور لوگ اپنی سیٹوں کے نمبروں کا خیال کئے بغیر دور دور اور فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شمائلہ بھی جہاز کی

کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے برابر والی دونوں سیٹیں خالی تھیں اور یہ خالی سیٹیں شمائلہ کو اچھی لگ رہی تھیں۔ حالانکہ بیٹھنا تو اس نے ایک ہی سیٹ پر تھا لیکن پھر بھی ایک نفسیاتی اثر تھا کہ وہ کھلی ہو کے بیٹھی ہے کیونکہ دس برس میں اس کی جسمانی ساخت کافی بدل چکی تھی۔ شاہ جی کی زوجیت میں اس نے جو دس بارہ برس گزارے تھے۔ وہ ذہنی طور پر کیسے ہی صبر آزما کیوں نہ رہے ہوں، جسمانی طور پر اس کے لئے بہت نامناسب تھے۔ اس کا یہ پورا عشرہ حویلی کی چاردیواری کے اندر گزر گیا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لئے شاہ جی کے پاس کام کرنے والی مزارعوں اور مریدنیوں کی کمی نہیں تھی۔ گھر کے کام کے لئے جتنی بھی عورتوں کی ضرورت پڑتی وہ آ جاتیں۔ گھر کی جھاڑ پونچھ، درودیوار کی لیپا پوتی، کھانا پکانا، سینا پرونا، ٹھنڈے گرم پانی کا بندوبست کرنا، یہ سب نوکرانیوں کے سپرد تھا جو شمائلہ کو کوئی کام نہ کرنے دیتی تھیں۔

زینو شاہ جی کے کسی مزارع کی ماں تھی اور کبھی کبھار دائی کا کام بھی کرتی تھی۔ زینت سے شاہ جی کے تینوں بیٹے زینو ہی کے ہاتھوں سے ہوئے تھے۔ اس زینو کو شاہ جی نے شمائلہ کی خدمت پر مامور کر دیا تھا اور وہ ہر روز شمائلہ کی طرف چکر لگاتی اور شمائلہ کا سر سے پاؤں تک اس کا خوب مساج کرتی، معلوم نہیں مساج کیلئے وہ کونسا تیل استعمال کرتی تھی کہ شمائلہ کے جسم کی ایک ایک رگ پرسکون ہو جاتی تھی اور یوں شمائلہ کا جسم بہت نرم اور ملائم رہا لیکن بہت زیادہ آرام طلبی نے اسے خاصا فربہ کر دیا تھا اور اس کی گردن کے نیچے بھی چربی کی ایک تھوڑی سی تہہ بن گئی تھی۔ کھانا سونا اور شاہ صاحب کی خدمت کرنا بس یہی اس کا کام رہ گیا تھا اور انتہائی خوبصورت اور مناسب جسم رکھنے والی شمائلہ کا جسم بے ڈھب ہو گیا تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ بڑھاپے کی دہلیز پر اس نے دستک ضرور دی ہے، لیکن اس کا شمار ابھی بوڑھی عورتوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنا حسن، جوانی اور کشش کھونے کے باوجود بہت کچھ اس کے پاس باقی رہ گیا تھا اور سب سے جو اہم چیز اس کی شخصیت میں تھی وہ گریس اور وقار تھا جو اگر موٹا جسم رکھنے والے کے پاس بھی ہو تو چہرہ پروقار لگتا ہے۔ لہٰذا غموں کی اتنی طویل مسافت طے کر کے آنے کے باوجود اس کے چہرے پر ابھی جھریاں نہیں آئی تھیں اور وہ بہت پرکشش لگ رہی تھی تاہم سوچ کی لکیریں اس کی پیشانی پر ضرور ہویدا تھیں۔ اور وہ اپنے خیالات میں گم تھی اور جیسا کہ شاہ جی نے مرنے سے پہلے اس سے کہا تھا کہ ''تم اب آگے کی سوچو۔'' اور شمائلہ اپنی نشست پر تنہا بیٹھی خیالوں میں گم آگے کی سوچ رہی تھی اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ تقدیر کا یہ ریلا اب اسے آگے کہاں اور

کس طرف لے جائے گا۔

ہر چند کہ جہاز کی کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرا تھا لیکن پھر بھی وہ کھڑکی سے باہر اس طرح ٹکٹکی باندھے اندھیرے میں دیکھ رہی تھی جیسے باہر کوئی منظر اسے دکھائی دے رہا ہو جس میں بہت گہری دلچسپی ہو۔

معاً شمائلہ کے کان میں ایک میٹھی سی نسوانی آواز گونجی اور اس کے خیالوں کا تسلسل منتشر ہوا۔

''ایکسکیوزمی۔'' ایک خاتون بیچ والی رو میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی، جو عمر میں تقریباً شمائلہ ہی کی عمر کی پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہو گی لیکن تھی چست اور سمارٹ اور لباس بھی فیشن ایبل تھا اور کچھ مختلف قسم کا تھا یعنی نیم زنانہ نیم مردانہ تھا، شرٹ کے اوپر اس نے بوریاں بنانے والے اعلیٰ قسم کے جوٹ کی ایک صدری پہن رکھی تھی۔ ہر چند کہ شکل صورت غیر معمولی نہیں تھی لیکن معمولی بھی نہیں تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے اور آنکھیں بیٹری سیل سے چلنے والے بٹنوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ وہ کافی دیر سے اپنی نشست پر بیٹھی شمائلہ کو دیکھ رہی تھی ایک دو بار شمائلہ سے اس کی آنکھیں بھی ملیں لیکن کچھ زیادہ نگاہوں کا ٹکراؤ نہیں ہوا آخرکار خاتون اپنی جگہ سے اپنا پرس اور بیگ وغیرہ لے کر اٹھی اور شمائلہ کے پاس آن کھڑی ہوئی اور جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں لگنے والے کنکر سے پانی کی سطح ہلتی ہے اس طرح خاتون نے شمائلہ کی سوچ کے سمندر میں ایک ارتعاش پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''ایکسکیوزمی۔'' شمائلہ کی سوچ کا دھارا ٹوٹا تو وہ خاتون بولی۔ ''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں کیا؟'' خاتون کے چہرے پر ایک مانوس مسکراہٹ اور مہذب التجا شمائلہ نے محسوس کی۔

''ضرور ضرور......'' شمائلہ نے خندہ پیشانی سے کہا اور برابر والی سیٹ پر رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

''اٹس اوکے۔'' خاتون نے کہا۔ ''میں ادھر بیٹھ جاؤں گی۔'' اور پھر وہ بیچ والی سیٹ خالی چھوڑ کر بیٹھ گئی۔

''تھینک یو۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے شمائلہ کا اس طرح شکریہ ادا کیا جیسے وہ سیٹ شمائلہ کی ملکیت ہو۔ جواب میں شمائلہ نے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بکھیر دی۔ خاتون نے اپنا پرس اور بیگ بھی بیچ والی سیٹ پر رکھ دیا جس پر شمائلہ کا مختصر سا سامان پہلے ہی رکھا تھا۔

''یہ اب ہماری کامن سیٹ ہو گئی ہے۔'' خاتون نے از راہ مذاق مسکراتے ہوئے

کہا۔
''شیور۔'' شمائلہ نے بھی خندہ پیشانی سے کہا لیکن وہ اپنا موڈ ہلکا پھلکا نہیں کر سکی کہ وہ ابھی تک اپنی سوچ اور فکر کا دھارا مکمل طور پر نہیں توڑ سکی تھی کہ اس کے خیال کے تانے بانے ماضی، حال اور مستقبل کے جال میں الجھے ہوئے تھے۔
دونوں میں لمحے بھر کے لئے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور پھر چند لمحوں کی سنجیدہ خاموشی چھا گئی۔ خاتون کے شمائلہ کی طرف دیکھنے کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ شمائلہ سے بات چیت کرنے کے موڈ میں ہے لیکن شمائلہ کے دل و دماغ پر تنی ہوئی سوچ کی سنجیدہ چادر میں کوئی نرمی یا لچک نہیں آئی۔
''میرا نام شاناں ہے شاناں تاجکی۔'' خاتون نے اپنا تعارف کرایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شمائلہ کو اس کے تعارف سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ''میں ایک فری لانس جرنلسٹ ہوں۔'' تاجکی نے اپنے تعارف میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''اچھا اچھا۔'' شمائلہ نے دلچسپی لی اور مسکرا کر اس کے تعارف کو قبول کیا لیکن اپنا تعارف نہیں کرایا۔ کچھ دیر پھر دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور شاناں نے ایک ناقدانہ نگاہ سے شمائلہ کو دیکھا اور پھر کہنے لگی۔ ''آئی تھنک یو ہیو گین اے لاٹ آف ویٹ۔'' تاجکی کی یہ بات اتنی اچانک تھی کہ شمائلہ کچھ سمجھ نہ سکی۔
''جی۔'' شمائلہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی چونکی۔
''آپ نے اپنا وزن کافی بڑھا نہیں لیا ہے۔'' یہ خاتون کا اگلا جملہ تھا اور شمائلہ اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکی۔
''جی۔'' شمائلہ پھر چونکی اس لئے یہ بہت عجیب بات تھی کہ ایک اجنبی عورت اس سے اچانک کہے کہ وہ موٹی ہوگئی ہے۔
''عمر بڑھنے سے تھوڑا بہت وزن تو بڑھتا ہی ہے۔ خود میں نے کچھ ویٹ پٹ اپ کیا ہے۔ حالانکہ میں ڈائٹ اور ایکسر سائز کا بہت خیال رکھتی ہوں اور پھر میری اور آپ کی تقریباً ایک ہی عمر ہوگی لیکن آپ پہلے کے مقابلے میں کچھ فربہ ہوگئی ہیں۔'' خاتون نے ایک اور بات کہہ کر شمائلہ کو مزید اچنبھے میں ڈال دیا۔
''کیا آپ نے پہلے کبھی مجھے دیکھا ہے؟'' شمائلہ نے تجسس سے پوچھا۔
''آپ کو تو نہیں آپ کی تصویر دیکھی ہے۔'' خاتون نے کہا اور شمائلہ کی سوچ کے تمام تانے بانے بکھر گئے اور وہ پوری طرح خاتون کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میری تصویر؟'' شمائلہ حیرت زدہ ہو گئی تھی کہ خاتون جیسے اس سے پہیلیاں بجھوانے یا کسوٹی کھیلنے لگی ہو۔

''میں دراصل ایک فری لانس جرنسلٹ ہوں اور اخبارات کے میگزین سیکشن میں عورتوں کے مسائل کے حوالے سے باتصویر فیچر چھاپتی ہوں۔'' خاتون نے کہا اور شمائلہ مزید الجھ گئی۔

''تو ......'' شمائلہ نے مزید حیرت زدہ ہو کر کہا۔''آپ کی ان باتوں سے میرا کیا تعلق؟''

''تعلق ہے ناں۔'' خاتون نے جواب دیا۔

''کیا تعلق؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''میں نے آپ کے بارے میں ایک تصویری فیچر شائع کیا تھا۔'' خاتون نے کہا اور شمائلہ دہل سی گئی۔

''میرے بارے میں فیچر ...... لیکن۔'' شمائلہ کچھ نہ بول پائی جیسے اس کے ہوش اڑ گئے ہوں۔

پاکستانی ویب سائٹ ڈاٹ کام

شمائلہ دم بخود ہوگئی اور حیرت زدہ انداز میں شاناں تاجکی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

یہ فیچر جو آپ نے چھاپا تھا...... شمائلہ کچھ ادھورا سا سوال کر کے چپ ہوگئی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ آخر فیچر کیسے شائع ہوا۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس نے دل میں سوچا مگر بولی کچھ نہیں۔

''میں بتاتی ہوں یہ فیچر کیسے شائع ہوا۔'' تاجکی نے کہا۔''میری ایک دوست ہے زرینہ وہ سر زاہد کی اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے۔ آج کل ایک بینک میں کام کرتی ہے۔ بہت عزت کرتی تھی زاہد صاحب کی...... وہ تھے بھی بہت نفیس آدمی...... ویل آئی ایم سوری اباؤٹ مسٹر زاہد......'' وہ بولتے بولتے اچانک رکی اور زاہد کی موت کے بارے میں افسوس کیا اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔''آپ کو اطلاع مل چکی ہوگی۔''

''جی......'' شمائلہ دکھ بھرے لہجے میں آہستہ سے بولی اور خاتون کہنے لگی۔

''آئی ایم رئیلی سوری ہی واز کوائٹ اے جنٹلمین اینڈ ویری لرنیڈ مین۔ انٹرویو کے سلسلے میں ان سے ہوسپٹل میں میری دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ بہت محبت کرتے تھے آپ سے اور آپ کا نام لیتے ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی تھیں اور بہت ریگریٹ کرتے تھے اپنے فیصلے پر۔''

''انٹرویو انہوں نے کیوں دیا؟ کیا وہ اس کیس کی شہرت چاہتے تھے۔'' شمائلہ نے سوال کیا وہ اس بات سے بہت ڈسٹرب ہوگئی تھی کہ زاہد نے نجی داستان کو اخباروں میں اچھال دیا تھا۔

''اوہ نو نو ناٹ ایٹ آل...... وہ بالکل نہیں چاہتے تھے۔'' تاجکی نے کہا۔''میری دوست زرینہ کو جب زاہد صاحب کی بیماری کا علم ہوا تو وہ کہنے لگی سر کو دیکھنے ہوسپٹل جانا ہے۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئی۔ راستے میں زرینہ نے مجھے ساری کہانی سنائی۔''

''اوہ گاڈ......'' شمائلہ دہل گئی۔

''مجھے آپ دونوں کی کہانی سن کر بہت دکھ ہوا۔ یہ ایک ایسی کہانی تھی جس میں دو درد بھرے دل تڑپ رہے تھے اور دونوں میں سے قصور کسی کا نہیں تھا۔'' تاجکی بولتے بولتے چپ ہوگئی کیونکہ اس نے دیکھا کہ شمائلہ کی پلکوں سے موتی گرنے لگے تھے۔ تاہم تاجکی نے اپنی گفتگو کو ختم نہیں کیا نہ ہی موضوع بدلا وہ بولی۔ ''کہانی سن کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ اس قدر پیار کرنے والے دو میاں بیوی اک ذرا سی بات پر ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔'' تاجکی نے کہا اور پھر کہنے لگی۔ ''آپ کو پتہ ہے مجھے کس چیز نے فیچر لکھنے پر راغب کیا اور میں نے کس بات پر زور دیا؟'' تاجکی نے سوالیہ انداز میں پوچھا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ شمائلہ نے گردن گھما کر غور سے متجسس نظروں سے تاجکی کو دیکھا تب تاجکی نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے فیچر میں زور اس بات پر دیا کہ آدمی کو غصے سے بچنا چاہئے اور یہ بتایا ہے کہ جلد بازی اور غصے میں کئے ہوئے فیصلوں کے نتائج کیسے اذیت ناک ہوتے ہیں اور معصوم زندگیوں کو ایک غلط فیصلے کی وجہ سے عمر بھر پچھتانا پڑتا ہے۔ پھر میں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ مرد کو تین بار طلاق دینے سے پہلے تین بار سوچنا چاہئے۔'' تاجکی نے بہت معنی خیز انداز میں کہا اور ان کی گفتگو میں اچانک اس وقت خلل پیدا ہوا جب ایک روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی ایئر ہوسٹس نے ''ایکسکیوزمی'' کہا اور دونوں کے سامنے سیٹوں میں لگی ٹیبلز ان فولڈ کیں اور ریفرشمنٹ کی ٹرے دونوں کی میز پر مشینی انداز سے رکھ کر ٹرالی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

کچھ دیر کے لئے شمائلہ اور تاجکی دونوں چپ رہیں۔ تاجکی نے پیپر نیپکن نکال کے اپنے گھٹنوں پر رکھا اور جوس کے گلاس کا ایک سپ لے کر شمائلہ کی طرف دیکھا جو اپنے سامنے رکھے ریفرشمنٹ سے بے نیاز لگتی تھی۔

''آپ لیں کچھ......'' تاجکی نے کہا لیکن شمائلہ ابھی تک کھانے کی ٹرے سے بے خبر خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اور انہیں خیالوں میں کھوئے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''اس فیچر کی کاپی مجھے مل سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں......'' تاجکی اعتماد کے ساتھ بولی۔ ''آپ مجھے اپنا کانٹیکٹ کرا دیں میں دے دینا میں پہنچا دوں گی۔''

''کانٹیکٹ!'' شمائلہ نے کچھ سوچ کر سوالیہ انداز میں کہا۔ ''دیکھوں گی۔'' اور پھر سوچ میں پڑ گئی۔

ویسے کراچی میں کہاں رہائش ہے۔'' تاجکی نے پوچھا۔

''فی الحال تو کہیں نہیں، کراچی پہنچ کر کچھ سوچوں گی۔'' شمائلہ نے جواب دیا اور پھر تاجکی سے پوچھا۔''آپ کی رہائش کہاں ہے...... کراچی میں؟''

تاجکی نے ایک ٹھنڈی لمبی سانس لی اور معنی خیز انداز میں کہا۔''بس کچھ نہ پوچھئے عورتوں کے ایک ریذیڈینشل کلب میں رہتی ہوں، بورڈنگ ہاؤس کہہ لیں۔''

''اکیلی......؟'' شمائلہ نے تجسس سے پوچھا اور اس دوران باتوں باتوں میں دونوں نے کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔

''ظاہر ہے...... کلب یا ہوٹل میں مستقل رہنے والی عورت اکیلی ہی ہوتی ہے۔'' تاجکی نے جواب دیا اور پھر خود ہی کہنے لگی۔''لیکن میں اکیلی ہوتے ہوئے بھی اکیلی نہیں ہوں، بورڈنگ ہاؤس میں اس وقت مجھ سمیت تقریباً سترہ عورتیں ہیں۔''

''کیا اٹھارہ ہوسکتی ہیں؟'' شمائلہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''اوہ وائی ناٹ......'' تاجکی حوصلہ افزاء لہجے میں بولی اور پوچھنے لگی۔''کیا آپ رہنا چاہتی ہیں وہاں؟''

''ہاں، کیونکہ میرا اب کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور مجھے کوئی نہ کوئی جگہ ڈھونڈنی ہے جہاں رہ کر میں اپنے کھوئے ہوئے بچوں کو تلاش کر سکوں۔''

''اور ئیلی آئی ایم ویری سوری اباؤٹ یور چلڈرن......'' تاجکی نے کہا اور پھر کہنے لگی۔''مجھے بچوں کا نہیں معلوم تھا اور اس وقت شاید یہ واردات ہوئی بھی نہیں تھی۔ زرینہ نے مجھے بعد میں بتایا۔ زاہد صاحب کے انتقال کے بعد......'' تاجکی نے کہا اور پھر فوراً اسے خیال آیا کہ شمائلہ ایک بار پھر دکھی ہوگئی ہے اور اسے بار بار زاہد کا تذکرہ نہیں کرنا چاہئے...... نہ ہی بچوں کی کوئی بات۔

''آپ بورڈنگ میں رہنا چاہتی ہیں۔'' تاجکی نے کہا اور پھر خود ہی بولی۔''بہت محفوظ جگہ ہے۔ پہرہ ہے گارڈز کا۔ کوئی مرد اندر نہیں آ سکتا۔ کسی عورت کا کوئی ملاقاتی آ بھی جائے تو میڈم کی اجازت سے ویٹنگ روم میں ملاقات ہوسکتی ہے۔''

''کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''کھانا پینا اپنا...... لیکن باہر کینٹین ہے اور کسی کو کچھ منگوانا ہو تو کلب کی ماسی ہے وہ سب کچھ لا دیتی ہے باہر سے۔''

''کرایہ کتنا ہے کمرے کا۔'' شمائلہ نے پوچھا۔

''پندرہ سو روپیہ......'' تاجکی نے جواب دیا۔

''پندرہ سو؟؟'' شمائلہ چونکی اور تاجکی شمائلہ کی حیرت دور کرتے ہوئے کہنے لگی۔
''مہینہ ...... پندرہ سو مہینہ۔'' وہ مہینے پر زور دے کر بولی اور اس پر شمائلہ بھی خوب ہنسی اور دونوں کا موڈ ایسا خوشگوار ہو گیا جیسے سہیلیاں ہوں دونوں۔
''کیا سب کو مل سکتا ہے کمرہ......'' شمائلہ نے کچھ تامل کے ساتھ پوچھا۔
''سب کو نہیں صرف عورت کو ......'' تاجکی نے از راہ مذاق کہا اور دونوں ہنس پڑیں۔
''آئی مین ہر عورت کو...... اگر میں چاہوں تو ......'' شمائلہ نے خواہش ظاہر کی۔
''کیوں نہیں ......'' تاجکی اعتماد کے ساتھ بولی اور پھر قدرے رک کر کہنے لگی۔
''لیکن کوئی ریفرنس چاہتی ہے مینجمنٹ ......''
''ریفرنس ......!!'' شمائلہ سوچ میں پڑ گئی تو تاجکی نے اس کو ڈھارس دی۔''نو پرابلم ...... میں آپ کو ریفر کروں گی میرے حوالے سے بھی آپ رہ سکتی ہیں۔''
''او تھینک یوں ویری مچ ...... مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔ خدا نے کیسا سبب بنایا کہ آپ جہاز میں مل گئی ہیں۔''
''اوپر والے نے ملوانا تھا آپ سے، اسی لئے تو اسے مسبب الاسباب بھی کہتے ہیں۔''
''یقیناً......'' شمائلہ نے اتفاق کیا۔
''تھوڑی ہی دیر میں ہم کراچی کے قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ......'' معاً جہاز کے مائیکروفون پر ایک نقرئی نسوانی آواز گونجی۔ دونوں الرٹ ہو کے بیٹھ گئیں۔
''ڈونٹ وری ......'' تاجکی نے کہا۔''میں سیدھی آپ کو بورڈنگ میں لے چلتی ہوں۔ آپ بہت آرام سے رہیں گی وہاں۔''
''تھینک یو ویری مچ ......'' شمائلہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

❁

''فیچر پڑھنے کے بعد زاہد کا ری ایکشن کیا تھا؟'' شمائلہ نے تاجکی سے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔
رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے دکھ سکھ کی باتیں کرتی رہیں۔ تاجکی نے اسے اپنی زندگی کے کئی حیران کن واقعات سنائے

جنہیں سن کر شمائلہ کو بہت دکھ اور درد محسوس ہوا۔ وہ دونوں اب بورڈنگ کے ایک ہی کمرے میں رہتی تھیں۔ جس دن وہ کراچی پہنچی تھی تو تاجکی اسے سیدھی اپنے ساتھ بورڈنگ ہاؤس لے آئی تھی۔ بورڈنگ کی میڈم نے کسی حوالے کے بغیر شمائلہ کو جگہ دینے میں ابتدا میں تھوڑا سا پس وپیش کیا لیکن تاجکی نے شمائلہ کا پس منظر بتایا اور پروفیسر زاہد کا حوالہ دیا تو پرنسپل بھی بہت متاثر ہوئی اور پھر تاجکی نے اپنی ضمانت بھی پیش کی تھی اور شمائلہ تاجکی کے اس رویے سے بہت متاثر ہوئی کہ ذاتی تعارف اور ملاقات کے بغیر تاجکی نے اس کی ضمانت قبول کی اور یوں اس رات بورڈنگ ہاؤس میں خالی کمرہ نہ ہونے کے باوجود شمائلہ کو روم میٹ کی حیثیت سے داخلہ دے دیا اور ویسے بھی دو خواتین کو مل کر ایک کمرے میں رہنے کی اجازت تھی اور اکثر خواتین کمرہ شیئر کر کے ہی رہتی تھیں۔ اس سے ایک عورت پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا تھا اور کرایہ دونوں مل کر آدھا آدھا برداشت کر لیتی تھیں، سو ایک ہی کمرے میں ہونے سے دونوں کو ایک تو یہ فائدہ ہوا کہ کمرے کے کرائے کا بوجھ نصف ہو گیا اور پھر دونوں کو کمپنی بھی مل گئی۔

تاجکی کمرے میں اکیلی ہی رہ رہی تھی اور خاصی بوریت محسوس کرتی تھی۔ ایک دو خواتین بیچ میں وقتی طور پر اس کے ساتھ رہی بھی تھیں لیکن وہ تاجکی سے کوئی ذہنی ہم آہنگی نہیں رکھتی تھیں۔ تاجکی ان سے اکتا گئی تھی اور وہ بھی چند روز تاجکی کے ساتھ گزار کے چلی گئیں یا کمرہ بدل لیا۔ اب جو شمائلہ دس دن سے تاجکی کے ساتھ تھی تو تاجکی بہت اچھا محسوس کر رہی تھی اور دس ہی روز میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں اور اسی طرح دونوں میں بہت جلد دوستی اور ہم آہنگی ہو گئی تھی۔

جس دن تاجکی کی اگلے دن چھٹی ہوتی تو اس رات کو وہ باتیں کرتی ہوئیں صبح کر دیتیں۔ اس دوران شمائلہ کو بہت تجسس رہا کہ وہ اپنے بارے میں لکھا ہوا تاجکی کا فیچر پڑھے، وہ ہر روز اس سے مطالبہ کرتی تھی لیکن تاجکی کے پاس اپنے اخبارات کی کوئی باقاعدہ کٹنگ محفوظ نہیں تھی لہٰذا دفتر سے اخبار کی کاپی لاتے لاتے تاجکی نے دس دن گزار دیئے اور پھر اس رات کو تاجکی جب فیچر والے میگزین کا صفحہ لے کر آئی تو شمائلہ اخبار پر جھپٹ سی پڑی اور جب تک تاجکی کپڑے تبدیل کر کے سکون کے ساتھ شمائلہ کے پاس آ نہ بیٹھی، اس وقت شمائلہ جانے کتنی بار اس فیچر کو پڑھ چکی تھی جس میں شمائلہ اور زاہد کی ایک شادی کا گروپ فوٹو بھی چھپا تھا۔ ایک زاہد کی الگ سے تصویر تھی۔ ایک شمائلہ کی عنفوان شباب کی انتہائی دلفریب اور پرکشش تصویر تھی۔ ایک اور تصویر زاہد کی تھی جس میں زاہد

ہسپتال کے بیڈ پر بہت نحیف اور لاغر بیٹھا ہے اور ایک نرس اس کا ٹمپریچر لے رہی ہے۔ یہ تصویر تاجکی نے اپنے اسٹاف فوٹو گرافر سے بنوائی تھی اور اس تصویر کے ساتھ سرخی تھی۔

''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ...... اور شمائلہ تیسری بار اس فیچر کو پڑھنے کے بعد آنسوؤں کے ساتھ رو پڑی تھی اس نے اخبار لپیٹ کے الگ ایک طرف رکھا اور پاس بیٹھی تاجکی کو دیکھا جو پہلے ہی سے اس کے چہرے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور اس کے دل کی کیفیت اس کے چہرے سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تاجکی نے محسوس کیا کہ فیچر پڑھتے ہوئے شمائلہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور ہاتھوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ اس کے سارے جسم پر کپکپی طاری ہے۔

''فیچر پڑھنے کے بعد زاہد کا ری ایکشن کیا تھا؟'' شمائلہ نے اخبار لپیٹا اور کپکپاتی لرزتی ہوئی آواز میں تاجکی سے پوچھا۔

''آہ......'' تاجکی نے بس ایک ٹھنڈی سانس لی اور کچھ نہ بولی۔

''بولو ناں ......! زاہد نے کیسے محسوس کیا فیچر کو......'' شمائلہ نے دوبارہ پوچھا تو تاجکی نے اپنی خاموشی توڑی اور کہنے لگی۔

''زاہد صاحب نے فیچر پڑھا ہی نہیں......'' تاجکی کی آواز میں دکھ تھا۔

''کیوں......'' شمائلہ نے تجسس سے پوچھا۔

''بات یہ ہے شمائلہ جی ...... یہ فیچر زاہد صاحب کی موت کے بعد شائع ہوا۔'' تاجکی نے کہا۔ ''تم جانتی ہو اخبارات کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ فیچر لائن اپ کئے جاتے ہیں جو اپنی باری پر چھپتے ہیں۔ انہوں نے ایک دو بار ہسپتال سے مجھے فون بھی کیا کہ فیچر کب چھپ رہا ہے۔ انہیں بھی اس کے شائع ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ موت انہیں مہلت نہیں دے گی ......تو میں اسے ان کی زندگی میں ہی چھاپ دیتی۔''

''آہ......'' اب کے شمائلہ نے ایک لمبی سانس لی اور پھر بولی۔ ''معلوم ہے زاہد کی موت کیسے ہوئی؟''

''وہ تو سب کو معلوم ہے دل کے مریض تھے۔''

''وہ تو تھے......'' شمائلہ نے دکھ کے ساتھ کہا۔

''کہتے ہیں جب انہیں علی کے اغواء کی خبر ملی تو صدمہ برداشت نہ کر سکے۔''

''ہائے میرا علی اور میری عینی۔ گناہ اگر میں نے کیا تھا تو سزا میرے بچوں کو کیوں ملی ہے...... اف میرے خدایا......'' شمائلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''کہاں ہوں گے

میرے بچے۔''

''بس ...... ہمت سے کام لو ...... جہاں اتنا حوصلہ کیا ہے وہاں مزید صبر کرو۔''
تاجکی نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

''اور کتنا حوصلہ کروں، زندگی گزر گئی حوصلہ کرتے ہوئے۔'' شمائلہ نے اپنے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

تاجکی نے پوچھا۔''دس بارہ سال ہو گئے کیا اتنے طویل عرصے میں تم نے بچے ......؟''

''اس طویل عرصے میں میں ایک قید میں تھی۔''

شمائلہ تاجکی کی بات کا مفہوم سمجھ کر بات کاٹتے ہوئے بولی اور کہنے لگی۔''یہ بارہ سال میں نے ایک طرح سے کالا پانی میں کاٹے ہیں۔ کالا پانی کہتے ہیں ایک جزیرے کو ...... جبکہ میں خشکی میں تھی۔ جہاں میں نے شاہ جی کے ساتھ بارہ برس گزارے ہیں، وہ ایک قید تنہائی تھی جہاں میرا دور دور تک آبادی اور انسانوں سے رشتہ اور رابطہ کٹا ہوا تھا۔ میں بچوں کو کہاں ڈھونڈتی، رو سکتی تھی، روتی رہی ہوں۔ میں نے ایک ایک پل بچوں کی جدائی میں رو کے گزارا ہے۔'' وہ بولتے بولتے یوں رک گئی کہ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''اب تمہیں صبر کرنا پڑے گا شمائلہ ......'' تاجکی نے دوبارہ حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

''صبر نہیں تاجکی، اب مجھے انہیں ڈھونڈنا ہے۔ زاہد مر گیا ہے۔ میں نے رو پیٹ کے تسلی کر لی ہے۔ مرنے والوں پر آدمی صبر کر لیتا ہے لیکن میرے بچے ...... خدا میرے نصیب انہیں نہ دے لیکن میری زندگی انہیں دے، وہ تو زندہ ہیں۔ میں کیسے رو پیٹ کے صبر کر لوں۔ تم اخبار والی ہو۔ اخبار والے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ تم ڈھونڈ سکتی ہو میرے بچوں کو ...... تم انہیں ڈھونڈنے میں میری مدد کرو تاجکی۔'' وہ تاجکی کے آگے گڑگڑانے لگی۔

''مجھ سے جو بن پایا میں کروں گی۔ اب تم چپ ہو جاؤ ...... شاباش ......'' تاجکی نے اسے گلے لگایا۔''میں چائے بناتی ہوں تمہیں اچھی سی چائے پلاؤں گی۔'' تاجکی نے باتیں کرتے ہوئے چائے کے دو کپ بنائے اور دونوں نے چائے پی اور پھر چائے پیتے ہوئے تاجکی نے سنجیدگی کو ختم کرنے کے لئے ایک واہیات سا لطیفہ شمائلہ کو سنایا جس پر شمائلہ واقعی ماحول کی گھمبیرتا بھول کر اس طرح کھلکھلا کر ہنسی کہ ہنسی رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

''تم بہت واہیات ہو تاجکی ......'' اس نے ہنسی روکتے ہوئے تاجکی سے کہا۔
''وہ تو میں ہوں۔'' تاجکی نے اپنی ہنسی روک کر کہا اور یوں دونوں کی باتوں کا موضوع بدل گیا۔
''کتنے مرد آئے ہیں تمہاری زندگی میں......'' شمائلہ نے اچانک پوچھا۔
''مرد......توبہ کرو...... میں تو خود مرد ہوں۔'' تاجکی نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''اور مجھے نفرت ہے مردوں سے......''
''یعنی اپنے آپ سے......'' شمائلہ نے برجستہ کہا۔
''بالکل اپنے آپ سے، یہ بھی کوئی زندگی ہے جو ہم گزار رہے ہیں۔ یہ دنیا جو ہے ناں صرف مردوں کی دنیا ہے، اس لئے میں مرد بن گئی ہوں۔''
''یہ تمہاری نفرت کا ردعمل ہے۔ سب مرد برے نہیں ہوتے۔ فرید بھائی جیسے لوگ بھی تو ہیں مرد۔'' شمائلہ نے کہا۔
''اور شمس جیسے بھی تو ہیں مرد......'' تاجکی ترت بولی اور کہنے لگی۔ ''جس کی وجہ سے آج تم اور تمہارا سارا خاندان خوار ہے۔'' تاجکی کی نفرت اچانک بیدار ہو گئی تھی اور شمائلہ شمس کا نام سننے کے بعد اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے لاشعور میں بھی مرد کے حوالے سے جو نفرت کی چنگاری مصلحتوں کی منوں مٹی کے نیچے دبی ہوئی تھی، اس چنگاری کو بھی ہوا ملنے لگی تھی۔ لہٰذا شمائلہ نے موضوع کو طول نہیں دیا، ویسے بھی رات بہت بیت چکی تھی اور اس پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا تھا اور باہر تیز اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ جس کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔
''مجھے نیند آ رہی ہے تاجکی ......'' شمائلہ نے ایک جمائی لیتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔ ''میں سونے لگی ہوں۔''
''سو جاؤ......'' تاجکی دھیرے سے بولی لیکن اس کے من میں عجیب سا جوار بھاٹا پیدا ہو گیا تھا۔
''تم بھی سو جاؤ......'' شمائلہ نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا اور معاً روشنیوں کو ایک جھٹکا سا لگا اور اندر باہر گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ''یہ کیا......'' شمائلہ جس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور کھل رہی تھیں، اندھیرے سے گھبرا گئی۔
''اندھیرا...... جو ہمارا نصیب ہے، لائٹ چلی گئی۔'' تاجکی جل بھن کر بولی۔
''سو جاؤ......'' شمائلہ نے مخمور آواز میں کہا اور تھوڑی ہی دیر میں سو گئی۔

ابھی وہ کچی کچی نیند میں تھی کہ اس نے اپنے بیڈ پر کسی کا وجود محسوس کیا، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول لیں۔ ''کون ......؟''

''میں ہوں شمو، تاجکی ......'' تاجکی نے اس کے کمبل میں دبکتے ہوئے کہا۔

''یہاں کیوں آئی ہو؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔'' تاجکی بولی۔

''تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ ہمارا نصیب ہے اندھیرا ...... جاؤ اپنی جگہ پر ...... میں کسی کے پاس نہیں سو سکتی۔ شاباش اٹھو جاؤ اپنے بیڈ پر ...... پلیز تاجکی ......'' اس نے تاجکی کو دھکیل کر بیڈ سے اتار دیا۔ تاجکی اپنی جگہ پر چلی گئی لیکن دونوں کی نیند خراب ہو گئی تھی۔ گھپ اندھیرے کمرے میں سناٹا تھا اور شمائلہ نے محسوس کیا کہ تاجکی کی ہچکیوں کی آواز کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ شمائلہ نے محسوس کیا کہ تاجکی جو مردوں سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور خود کو مرد بھی کہتی ہے اور جو بظاہر بہت مضبوط اعصاب کی عورت دکھائی دیتی تھی اور جو شمائلہ کے لئے ایک حوصلہ بن گئی تھی لیکن اس وقت کسی معصوم بچے کی طرح رو رہی تھی۔ تب شمائلہ اسے سنبھالنے کے لئے اس کے پاس چلی گئی۔

❁

معروف اور مخبوط الحواس نفسیاتی ڈاکٹر ضامن جب اپنے کلینک میں داخل ہونے لگا دو پرائیویٹ سیکورٹی کے گن مین اور ایک پولیس کا مسلح سپاہی اس کے کلینک کے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ ڈاکٹر اپنی دھن میں مگن جب کلینک میں داخل ہونے لگا ایک گن مین نے اسے روکا۔

''ہاں بابا جی شناخت کروایئے اپنی ......'' ایک گن مین نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

''کیا ......؟ کون ہو تم؟'' ڈاکٹر نے سر اٹھایا، اپنی عینک اتاری صاف کی پھر لگائی اور چندھی آنکھوں سے گن مین کو دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں ...... کہاں سے آئے ہیں۔'' اب کے دوسرے گن مین نے پوچھا تو سائیکی ڈاکٹر کا غصے سے پارہ چڑھ گیا۔ ''اوہ مائی گاڈ۔ ہو دی ہیل یو پیپل آر ......'' ڈاکٹر نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کیسے کھڑے ہو ...... میرے کلینک کے دروازے پر اور مجھے روک رہے ہو۔ گیٹ لاسٹ ......''

ڈاکٹر کی آواز سن کر ان کا پی اے اندر سے بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ ''ارے بھئی

کیا کرتے ہیں آپ، یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔'' اس نے پہرے داروں کو آگاہ کیا۔
''سوری سر......؟'' اب کے پولیس کا آدمی آگے بڑھا اور معذرت چاہی۔
''دراصل یہ لوگ اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے ہیں...... کیونکہ سیکورٹی کا مسئلہ ہے۔''
''ڈیوٹی...... سیکورٹی......'' ڈاکٹر صاحب چونکے اور پوچھنے لگے۔ ''کیسی ڈیوٹی...... کیسی سیکورٹی...... میں نے کسی سیکورٹی کے لئے نہیں کہا اور نہ میری جان کو خطرہ ہے...... آپ لوگ کیسے۔''
''سر وہ ایک پیشنٹ ہیں اندر، یہ ان کی سیکورٹی ہے۔'' پی اے نے مداخلت کرتے ہوئے اپنے ڈاکٹر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
''لاحول ولاقوۃ......'' ڈاکٹر بڑبڑایا۔ ''اتنا جان کو خطرہ ہے کہ تین تین گن مین رکھے ہوئے ہیں۔ اتنے کمزور آدمی کو میں کیسے بچا سکتا ہوں ہونہہ......'' ڈاکٹر صاحب بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔
ویٹنگ روم میں کافی مریض منتظر تھے جن کی تعداد بارہ چودہ سے کم نہیں تھی لیکن جیسا کہ بڑے ڈاکٹروں کا طریقہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلینک میں داخل ہوتے ہوئے کسی مریض کے چہرے کی طرف نہیں دیکھتے، نہ کسی کو سلام کرتے ہیں اور نہ سلام کا ٹھیک سے جواب دیتے ہیں۔ سو اسی طرح ڈاکٹر صاحب بھی ویٹنگ روم سے گزر کر اپنے آفس کی طرف گئے۔ دو چار لوگوں کی طرف سے انہیں سلام کرنے کی آواز یا اشارہ دکھائی دیا لیکن وہ سخت غصے میں بڑبڑا رہے تھے۔ کسی کی طرف دیکھا، نہ کسی کے سلام کا جواب دیا اور آفس میں داخل ہو گئے اور داخل ہوتے ہی نہایت برہمی سے کال بیل کا بٹن دبایا۔ گھنٹی اتنی تیز تھی کہ پی اے نے ایک لمحہ بھی نہیں لگایا اور ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اندر داخل ہوا اور بہت مسکین طریقے سے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ ''سر......''
''ان کو نکالو باہر......'' ڈاکٹر نے خشم آلود لہجے میں کہا اور انگلی سے باہر کا راستہ دکھایا۔
''کن کو سر......؟'' پی اے نے عجز سے پوچھا۔
''یہ جو گن مین کھڑے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے تحکمانہ کہا۔
''وہ تو باہر ہی ہیں سر اندر ان کا پیشنٹ ہے جس کی وجہ سے وہ کھڑے ہیں۔'' پی اے بہت محتاط لہجے میں بولا کیونکہ وہ ڈاکٹر کے مزاج سے واقف تھا کہ وہ تھے تو ماہر نفسیات، لیکن آدھے سے زیادہ خود نفسیاتی مریض تھے اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ کس جواب پر

اکڑ جائیں۔
''اس پیشنٹ کو بھی باہر نکال دو۔'' وہ تحکمانہ بولے۔
''سر وہ اپائنٹمنٹ لے کر آیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا بہت پرانا پیشنٹ ہے۔'' پی اے نے وضاحت کی۔
''اچھا تو سب سے پہلے اسے اندر بھیجو، میں دیکھوں تو سہی کہ اس کے سر پر کتنے ہنگ ہیں اور کتنے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ بھیجو بھیجو بھیجو۔'' ڈاکٹر نے تیز تیز تین ار کہا۔ پی اے باہر نکلا اور فوراً ہی شمس اندر داخل ہوا۔
''السلام علیکم سر!'' شمس نے سلام کیا تو ڈاکٹر نے سر اٹھا کے شمس کی طرف دیکھا۔ لس بہت عرصے کے بعد آج ڈاکٹر کے پاس آیا تھا اس کے چہرے کے خط و خال میں ؛ھتی ہوئی عمر کی وجہ سے کچھ تبدیلی آ گئی تھی۔ سر کے بار کھچڑی ہو گئے تھے اور قلمیں بالکل لید ہو گئی تھی یا پھر اس نے فیشن کے طور پر انہیں سفید کر لیا تھا، آنکھوں پر ایک نئے فیشن کا لر کا چشمہ تھا۔ اس کی فرنچ کٹ داڑھی کے تمام بال سفید تھے اور شمس کے نزدیک چونکہ سفیدی بھی فیشن میں شامل تھی، اس لئے اس نے انہیں بھی ڈائی نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر نے ب دو مرتبہ اپنا چشمہ اتارا۔ شیشے منہ سے بھاپ دے کر رومال سے صاف کئے۔ بہت غور ے شمس کو دیکھا اور غصے سے منہ کو لمبا کر کے بولا۔ ''یووو......'' وہ کوئی گالی دینا چاہتے لیکن پتہ نہیں کس مصلحت نے انہیں روک دیا۔
سر بیٹھنے کے لئے نہیں کہیں گے، میں پیشنٹ ہوں آپ کا۔'' شمس بہت نرمی سے ا۔
''بیٹھو ...... لیکن اپنے ان بندروں کو میرے گیٹ سے ہٹا دو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور ں ایک کرسی کو تھوڑا سا آگے پیچھے کر کے بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ''سر یہ میرے گارڈ ہیں۔''
''ذرا انہیں میں آپ کو گھما کے دیکھوں۔'' ڈاکٹر نے طنزاً کہا اور شمس کچھ نہ سمجھ کر ۔ ''جی؟''
''میں دیکھنا چاہتا ہوں آپ کو کیا لگ گیا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔
''یعنی ......؟'' شمس پھر کچھ نہ سمجھا اور سوال کیا۔
''یعنی یہ کہ سرخاب کے پر لگ گئے ہیں کہ آپ تین تین گن مین ساتھ لے کر متے ہیں۔ پہلے تو آپ کے پاس چھرا بھی نہیں تھا۔'' ڈاکٹر نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔
''پہلے اور بات تھی۔'' شمس نے کہا۔

''پہلے کی کیا بات تھی اور اب کیا بات ہو گئی ہے۔'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ''یہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''پہلے کی یہ بات تھی کہ پہلے میں ایک عام آدمی تھا۔'' شمس نے جواب دیا اور ڈاکٹر فوراً بولا۔

''اور اب کیا آپ خاص آدمی ہو گئے ہیں؟''

''جی ہاں ......'' شمس نے بھی ترت جواب دیا۔ ''گن مین عام آدمی کے ساتھ نہیں، خاص آدمی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اب میرے پاس پاور بھی ہے اور پیسہ بھی۔ میں جب سے ہیروں کی اسمگلنگ شروع کی ہے جب سے ملٹی ملینئر آدمی بن گیا ہوں۔''

''تو میں کیا کروں، پولیس کو اطلاع دوں کہ میرے پاس ایک اسمگلر بیٹھا ہے۔'' ڈاکٹر انتہائی بے نیازی سے بولا تو شمس نے فوراً کہا۔ ''نہیں سر اس زحمت کی ضرورت نہیں، پولیس تو میرے ساتھ ہے اور میری حفاظت کر رہی ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں۔ میرے پاس کیوں آئے ہو؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''سر آپ کو میرا کیس یاد ہے۔'' شمس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں یاد ہے۔'' ڈاکٹر فوراً بولا۔ ''میں اپنے پیشنٹس کا کیس بھولتا نہیں ہوں، ایک عورت جس کا نام کیا ہے......'' وہ بولتے ہوئے رکے جیسے نام یاد کر رہے ہوں۔

''شمائلہ......'' شمس نے نام بتایا۔

''ہاں شمائلہ...... وہ آپ کے یہاں بیٹھ گئی ہے، دماغ میں ...... یہی ناں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''جی ہاں یہی بتانے آیا ہوں کہ اب آپ اسے بھول جائیں۔'' شمس نے کہا اور ڈاکٹر طیش میں آ گیا۔ ''کیا کہا میں بھول جاؤں ...... پاگل اس نے آپ کو کر رکھا ہے اور بھول میں جاؤں۔''

''میں اسے بھول گیا ہوں سر۔'' شمس نے کہا۔

''تو پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔'' ڈاکٹر بولا۔

''آپ کو بتانے آیا ہوں۔ اب میرے پاس دولت کا انبار ہے۔'' شمس نے کہا۔

''تو میں کیا کروں؟'' ڈاکٹر برہمی سے بولا۔

''عورتوں کا ایک جم غفیر میرے اطراف ہے، راجہ اندر بنا ہوا ہوں۔ ایک کو بلاتا ہوں تو دس آ جاتی ہیں۔'' شمس ڈاکٹر کی بات ان سنی کر کے ترنگ میں بولا۔

''تو میں کیا کروں۔'' ڈاکٹر نے چڑچڑے پن سے لفظ ''کروں'' پر زور دے کر کہا۔

''صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ایک دو ٹکے کی عورت تھی، اس کے ساتھ انوالو ہونا میرا واقعی پاگل پن تھا اور اب میں نے اسے اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر نکال دیا ہے۔'' شمس نے بات کو طول دے کر کہا۔

''لیکن میرے پاس کس لئے آئے ہو؟'' ڈاکٹر جھنجھلا کر بولا۔

''آپ کو یہی بتانے آیا ہوں کہ اب میں آپ کے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔''

''تم پھر آؤ گے۔'' ڈاکٹر نے وثوق کے ساتھ کہا۔

''سر میں صرف یہی کہنے آیا تھا کہ اب وہ میرے لئے ایک مکھی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ میں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دولت، شہرت، عزت، طاقت اور عورت ......'' وہ نخوت سے بولا۔

''لیکن شائلہ کو ابھی تک حاصل نہیں کر سکے۔'' ڈاکٹر نے ترت جواب دیا۔ ''جسے تم مکھی سمجھتے ہو اس مکھی سے محروم ہو اب تک۔''

''مکھی ایک غلیظ چیز ہے سر...... اس کو ختم کیا جاتا ہے' حاصل نہیں کیا جاتا اور اب تو وہ ویسے ہی بڈھی ہو چکی ہو گی، اسے کیا اماں بنانا ہے میں نے۔'' شمس کے لہجے میں شدید قسم کی محرومی تھی۔

''تم نفسیات کے ایک بہت کرانک پیشنٹ ہو گئے ہو۔ جب تک شائلہ کو تم حاصل نہیں کر لو گے، اس وقت تک تمہارے دماغ کا فتور نہیں جائے گا۔''

''نیور سر نیور ...... میں آپ کو صرف یہی بتانے آیا تھا کہ اب میں اس حوالے سے کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔'' شمس پھر بہت ڈھٹائی سے بولا اور ڈاکٹر نے پوچھا۔

''بتا دیا ہے؟''

''جی سر۔'' شمس نے جواب دیا۔ ''بتا دیا ہے۔''

''تو پھر اب جاؤ ...... اور اپنے ان نمائشی گارڈز کو بھی میرے دروازے سے ہٹاؤ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''میرے بہت سیریس پیشنٹس باہر انتظار کر رہے ہیں۔ جائیے آپ، کبھی واپس نہ آنے کے لئے جائیے۔''

''ٹھیک ہے جا رہا ہوں اور آپ یہ یقین کر لیں کہ وہ میرے دماغ سے نکل گئی ہے۔'' شمس نے اٹھتے اٹھتے کہا۔

''میں نے یقین کرلیا ہے کہ اب وہ تمہاری موت کا باعث بنے گی۔'' ڈاکٹر نے چ کر کہا۔

''آپ کو معلوم ہے آپ اس وقت کس سے بات کر رہے ہیں۔'' شمس پلٹ کر غصے سے بولا۔ ''واٹ سارٹ آف ڈاکٹر یو آر......''

''آؤٹ ......'' ڈاکٹر نے تحکمانہ انداز میں کہا اور کال بیل بجا کر بولا۔ ''نیکسٹ ......'' شمس بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

❁

''بیٹے جس طرح تم ڈرائیونگ کرتے ہو ناں یہ مجھے پسند نہیں۔'' اس دن جب گلفام، علی کے ساتھ شہر سے واپس آیا تو اس نے کوٹھی پر پہنچ کے علی سے کہا۔ گلفام کو ہمیشہ علی کی ڈرائیونگ سے تشویش رہتی تھی وہ ژوں کر کے کوٹھی کے ڈرائیووے سے گاڑی باہر نکالتا اور جب واپس آتا تو دور ہی سے ہارن دے دیتا اور چوکیدار افراتفری میں پورا گیٹ کھول دیتا اور علی اس طرح گاڑی اندر اسپیڈ کے ساتھ لاتا کہ لگتا کسی دیوار سے ٹکرا جائے گی۔ پھر وہ اسکریچنگ کیساتھ بریک لگا کے گاڑی ادھر ہی چھوڑ دیتا اور ڈرائیور آن کے اسے سنبھالتا اور کہیں شیڈ یا گیرج میں لگا دیتا۔

علی اب فرسٹ ایئر میڈیکل میں داخل ہو گیا تھا اور گلفام کی یہ ایک آرزو تھی کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ پھر گلفام اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر برطانیہ یا امریکہ بھجوانا چاہتا تھا تاکہ وہ میڈیکل کے کسی خاص شعبے میں مہارت حاصل کر لے اور یہ چوائس اس نے علی پر چھوڑ رکھی تھی۔ ویسے گلفام کی رائے یہ تھی کہ علی کینسر میں اسپیشلائز کرے اور ایک اچھا سرجن بنے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کینسر اب ایک ایسا مرض ہے جسے لا علاج نہیں کہا جا سکتا۔ ہر چند کہ ملیریا اور ٹی بی کی بیماریوں کی طرح اس کے خاتمے کے لئے کوئی حتمی علاج کی گولیاں دریافت نہیں ہوئی ہیں لیکن پھر بھی انسان کے عزم اور اس کی قوت کے سامنے یہ مرض پسپا ہو رہا ہے اور میڈیکل سائنس اس پر دھیرے دھیرے قابو پا رہی ہے۔ بہت سے کیسوں میں اگر ابتدائی مراحل میں اسے پکڑ لیا جائے تو یہ بیماری مکمل طور پر ختم کی جا سکتی ہے اور پھر ایک ریڈیکل سرجری تو بعض اوقات سو فیصد مکمل علاج ثابت ہوتی ہے اور اسے علی سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں کہ جب وہ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ہاؤس جاب سے فارغ ہو کر باہر جائے گا تو اپنے کام سے اپنا اور اپنے باپ کا نام روشن کرے گا۔

اور علی کے باپ کے نام کے تصور سے وہ کبھی کبھی آزردہ بھی ہو جاتا تھا کیونکہ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ علی ایک بہت ہی لائق اور ہونہار لڑکا ہے اور جس طرح کا اس کے اسکول اور کالج کا ریکارڈ رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آگے جا کر وہ مزید بڑا نام پیدا کرے گا۔ کیونکہ کالج کا ہر امتحان اس نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا اور جب پری میڈیکل سے میڈیکل کالج میں جانے کا وقت آیا تو اس وقت گلفام کو سخت پریشانی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ میڈیکل کالج میں بڑے بڑے وزیروں اور گورنروں کی سفارش بھی نہیں چل پاتی کہ سارا کام میرٹ پر ہوتا ہے اور اگر میرٹ سے ہٹ کر ایک نمبر کے فرق سے بھی کسی کو داخلہ دے دیا جائے تو دوسرا امیدوار عدالت میں رٹ دائر کر دیتا ہے لہٰذا گلفام نے ارادہ کر رکھا تھا کہ چاہے اسے لاکھوں روپے ہی کیوں نہ صرف کرنے پڑیں چاہے اتنا ڈونیشن دینا پڑے جو پہلے کبھی کسی نے نہ دیا ہو، دے کر علی کو میڈیکل میں داخل ضرور کروائے گا لیکن یہ سب کچھ اسے کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کہ جب علی نے داخلے کے لئے ٹیسٹ دیا تو تحریری اور زبانی امتحان میں اس نے ٹاپ کیا، نہ صرف یہ کہ کسی سفارش کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ اس کا اسکالرشپ بھی جاری کر دیا گیا اور اس وقت گلفام کو یقین ہو گیا کہ علی ضرور ایک دن اپنے باپ کا نام روشن کرے گا اور جب باپ کا نام روشن کرنے کا تصور آتا تو لمحہ بھر کے لئے مغموم ہو جاتا کیونکہ ویسے تو سب کو معلوم تھا کہ علی گلفام کا بیٹا ہے لیکن جب وہ کوئی بڑا کام کرے گا، کوئی بڑا آپریشن کرے گا، کوئی بڑی ریسرچ اور کوئی بڑی ایجاد کرے گا تو اس وقت یقیناً زاہد کے بیٹے کے طور پر ہی یاد کیا جائے گا لیکن چند ہی لمحوں کے تصور کے بعد وہ اس طرح کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک کر دماغ کے اسکرین سے بالکل صاف کر دیتا اور دعا کرتا کہ علی اپنا نام روشن کرے۔ چاہے وہ زاہد ہی کے بیٹے سے کیوں نہ پکارا جائے کیونکہ اب اس کی زندگی کا مشن صرف اس کی کامیابی تھی۔ اس کے من میں ایک خواہش یہ بھی تھی کہ علی کو ملک سے باہر رہنے کا ہی مشورہ دے اور جب علی ڈگری حاصل کر لے تو کسی غریب ایشیائی افریقی ملک میں جا کے کوئی ہسپتال قائم کرے جہاں وہ پاکستانیوں کا مفت علاج کرے کیونکہ پاکستان کے اندر اس نے دولت، ڈکیتیوں اور تاوانوں سے کمائی تھی اور اب بھی اس کا یہی پیشہ تھا اور ہر چند کہ اس کے اس پیشے سے علی کا کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن خطرے کی ایک تلوار وہ اپنے ساتھ ساتھ علی کے سر پر بھی محسوس کرتا تھا اور اسے ہمیشہ یہ خوف رہتا تھا کہ اس کا حال، علی کا ماضی بن کر کہیں علی کے تعاقب میں نہ لگ جائے۔ وہ اپنی آمدنی کے گوشواروں کو سو

طریقے سے گھما پھرا کے داخل کرتا تھا لیکن علی اس معاملے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ باپ کا کاروبار کس نوعیت کا ہے اور اس کے ذہن میں ماضی کا ایک ہیولا سا تھا کہ جب گلفام اسے اغوا کر کے لایا تھا لیکن اس وقت علی کی زندگی اپنے تایا کے گھر میں اس طرح گزر رہی تھی جیسے وہ ایک جہنم میں جی رہا ہو اور وہ اس بات کو بھی گلفام کا ایک احسان سمجھتا تھا کہ اس نے اس کو ایک جہنم سے نجات دلائی تھی اور پھر اس کے بعد گلفام نے علی کو جو پیار دیا اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔

رانی ماں بھی ماں کی طرح اسے چاہتی تھی لیکن ایک اندوہناک حادثے میں جب رانی ہلاک ہوگئی تو اس کے بعد گلفام کا پیار اور بھی بڑھ گیا کہ اس نے باپ کے ساتھ ساتھ علی کو ماں کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دی اور علی یہ بھی جانتا تھا کہ گلفام نے محض اس لئے رانی ماں کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی کہ دوسری ماں شاید علی کو وہ پیار نہ دے سکے جو رانی ماں نے اسے دیا تھا اور پھر رانی نے تو علی کو اسکے حالات جاننے کے بعد قبول کیا تھا۔ دوسری آنے والی کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہوگی، کیسی ہوگی اس کا علی کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا اور گلفام کے حالات جاننے کے بعد گلفام کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گی لہٰذا گلفام نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گا اور اپنی ساری توانائی علی کی تعلیم و تربیت پر صرف کرے گا اور اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیج کر اسے کہیں ادھر ہی سیٹل ہونے کا مشورہ دے گا تا کہ گلفام کے کاروبار کے منحوس سائے اس تک نہ پہنچ سکیں۔

گلفام نے جس طرح سارا گھر اور دولت کے تمام ذرائع علی کے سپرد کر رکھے تھے تو اس کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا تھا کہ علی ایک بگڑا ہوا امیر لڑکا بن جاتا اور عیش و عشرت میں تباہ و برباد ہو جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ہمہ تن اپنی تعلیم میں مگن رہا۔ کالج میں سکالرشپ وصول کیا اور پھر میڈیکل کالج میں بھی اسکالرشپ کا حقدار ٹھہرا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکا تھا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ کے قریب اس کا قد تھا۔ گوری رنگت، آنکھوں میں کشش اور چمک تھی۔ خوش شکل، خوش لباس اور خوش گفتار تھا اور لڑکیوں کے لئے اس کی شخصیت میں بہت کشش تھی اور جن لڑکیوں سے لڑکے بات کرنے کو ترستے تھے، وہ لڑکیاں لٹو کی طرح علی کے گرد گھومتی تھیں۔ وہ بھی کوئی شرمیلا یا لڑکیوں سے بھاگنے والا لڑکا نہیں تھا۔ لڑکیوں کی کمپنی پسند کرتا تھا۔ ان کے ساتھ خوش گپیاں کرتا، کینٹین میں جا کے چائے اور مشروب وغیرہ پیتا لیکن اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ اس سے آگے اس کا سارا دھیان اپنی اسٹڈیز پر تھا اور پڑھنے میں لائق ہونے کی بدولت ٹیچرز کا منظور نظر بھی ہو گیا تھا اور

اسٹوڈنٹس میں بھی مقبول تھا کہ امتحانات کے دنوں میں وہ ہم جماعتوں کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس کی گاڑی کو ڈرائیور چلاتا تھا اور ہمہ وقت ڈرائیور اس کے ساتھ رہتا تھا لیکن علی کو یہ پابندی نہ اپنے لئے اور نہ ہی ڈرائیور کے نقطہ نظر سے پسند آئی لہٰذا اس نے ڈرائیور کو بنگلے پر بٹھا دیا اور خود گاڑی سنبھال لی اور اب وہ اپنی گاڑی خود ہی چلاتا تھا لیکن اس کی ڈرائیونگ گلفام کو پسند نہیں تھی اور وہ علی کی کار چلانے کی رفتار سے بہت خوفزدہ تھا اور ایک دن جب گلفام علی کے ساتھ بیٹھا تو اس دن تو بہت ہی پریشان ہوا اور خوفزدہ ہو گیا کہ اس نے محسوس کیا کہ گلفام کی گاڑی روڈ پر چل نہیں رہی ہے بلکہ ہوا میں اڑ رہی ہے۔

''بیٹے جس طرح تم ڈرائیونگ کرتے ہو یہ مجھے پسند نہیں۔'' اس دن جب گلفام علی کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر آیا تو گھر پہنچ کر اس نے علی سے کہا۔

''کیوں ڈیڈ...... کیوں پسند نہیں۔'' علی نے دریافت کیا۔

''بیٹے میں سارے راستے کلمہ پڑھتا ہوا آیا ہوں۔'' گلفام نے کانوں کو چھو کر کہا۔

''ڈیڈ یہ تو اچھی بات ہے ناں...... ہر مسلمان کو کلمہ پڑھنا چاہئے۔'' علی نے باپ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''یار ٹیک اٹ سیریس لی مائی سن۔ یہ اتنی تیز رفتاری خطرناک ہوتی ہے۔'' گلفام نے سمجھایا۔

''اونہیں ڈیڈی...... خطرے کا رفتار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' علی بات کو مذاق میں لیتے ہوئے بولا اور کہنے لگا۔ ''اب اسپیس میں جانے والے راکٹ کو لے لو...... کتنے راکٹس جاتے ہیں خلا میں...... کبھی کوئی برائے نام حادثہ ہو جائے تو ہو جائے۔ کار کی رفتار کوئی راکٹ کی رفتار سے زیادہ تو نہیں۔''

''تو پھر۔'' گلفام نے علی کی بات کو نہ سمجھ کر پوچھا۔

''تو پھر کیا......'' علی کہنے لگا۔ ''بات تیز رفتاری کی نہیں، بات احتیاط کی ہے۔ احتیاط سے گاڑی نہ چلانے والے کچھوے کی رفتار میں بھی ایکسیڈنٹ کر دیتے ہیں اور محتاط ڈرائیور جہاز چلائے یا راکٹ، حادثہ نہیں ہوتا۔ میرا کوئی حادثہ نہیں ہوا ڈیڈ۔''

''خدا نہ کرے حادثہ ہو۔'' گلفام حادثے کے نام سے کانپ کر بولا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا حادثہ ہونے والا ہے اور یہ حادثہ کار کے حادثے سے خطرناک ہوگا۔

اس دن گلفام کی گینگ نے گلفام کی نگرانی میں بہت بڑی ڈکیتی ڈالی تھی۔ گلفام اب خود ذاتی طور پر کسی واردات میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے گینگ کے لڑکے ٹھیک ٹھاک کام کر رہے تھے اور جو مال لوٹتے وہ لے کر سیدھے کمین گاہ میں پہنچ جاتے یہاں پہنچ کر گینگ کا انچارج کئی حصے بناتا اور پہلے اوپر والوں کو اور علاقے والوں کو ان کے حصے پہنچائے جاتے پھر گلفام کا حصہ نکلتا۔ پھر گینگ کے لڑکے اپنا اپنا حصہ وصول کر لیتے اور یہ سارا کاروبار نہایت اعتماد اور اعتبار کے ساتھ چل رہا تھا۔

گلفام کو اپنے لڑکوں پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ کبھی مال کی تقسیم میں ڈنڈی نہیں ماریں گے اور وہ ''بے ایمانی'' کبھی کرتے بھی نہیں پھر ''علاقے'' والوں کے علم میں بھی ہوتا تھا کہ کہاں سے کتنا مال لوٹا گیا ہے اور کتنا تقسیم ہوا۔ گلفام کی حیثیت اپنے علاقے میں ایک مافیا کی سی ہوگئی تھی جو خود پیچھے رہ کر تمام وارداتیں کراتا تھا۔ وہ منصوبہ بندی کرتا۔ لڑکوں کو نقشے بنا کر دیتا۔ انہیں واردات کا طریقہ کار بتاتا، کوئی پھنس جاتا تو اسے بچانے میں اہم کردار ادا کرتا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ گینگ کو تحفظ دینے والے گلفام کے زیر اثر تھے اور ملی بھگت کا کام گلفام ہی سرانجام دیتا تھا۔

پھر اچانک انتظامی ڈھانچے میں ردوبدل ہوا تو ایک نہایت ہی سخت گیر افسر گلفام کے علاقے میں تعینات ہوگیا۔ جس نے جرائم کو جڑ سے ختم کرنے کا تہیہ کرلیا اور اس نے جرائم میں ملوث افسران اور سپاہیوں کے علاقے سے تبادلے کر دیئے اور ایک ایکشن پلان بنا کے دھڑا دھڑ جرائم کے اڈوں پر چھاپے مارے اور نہ صرف مجرموں کو بلکہ جرائم میں ملوث مشتبہ افراد کو پکڑ کر بند کر دیا اور اگر کسی نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو اپنے جوانوں کو شوٹ ایٹ سائٹ کا آرڈر دے دیا۔ معلوم نہیں گلفام کی ناقص منصوبہ بندی تھی یا اس کی شامت آئی تھی کہ اس کے لڑکے بینک کی ایک وین کو لوٹ کر جو بھاگے تو پولیس کی ایک موبائل نے پیچھا کیا۔ لڑکے سمجھدار تھے۔ انہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ پولیس نے کمین گاہ کی نشاندہی کر لینی ہے لہٰذا وہ پولیس کو جل دے کر گاڑی کو کسی اور طرف لے گئے لیکن ایک لڑکا جو ہیلمٹ پہنے بائیک پر تھا وہ نظروں میں آ گیا اس پر پولیس نے جو فائر کیا تو اس کی بائیک گر گئی اور وہ اٹھ کے دوڑ پڑا۔ وہ جب بھاگ رہا تھا تو پولیس کے ایک سپاہی نے اس کی ٹانگ پر گولی ماری اور وہ لہولہان ہو کر گر پڑا۔ اس وقت تک وہ گلفام کی کوٹھی تک آ چکا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے لنگڑاتا ہوا دیوار سے کودا اور کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا۔

اس وقت گلفام بھی گھر پر تھا اور علی بھی۔ پولیس کی پوری نفری بھی وہاں پہنچ گئی اور

انہوں نے گلفام کی کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ زخمی ڈاکو بھاگتے ہوئے اپنے جسم سے رستے خون کی لکیر گلیوں میں چھوڑتا ہوا آ رہا تھا اور پولیس اسی خون کی لکیر کا تعاقب کرتے ہوئے گلفام کے بنگلے تک پہنچ گئی تھی۔

''سر مجھے بچا لو اور اپنا بھی بچاؤ کرو۔ پولیس تعاقب میں ہے۔'' زخمی ڈاکو نے گلفام کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ ٹریپ ہو گئے ہیں۔''

''الو کے بچے ......'' گلفام نے اسے ایک اور ٹھوکر ماری۔ ''یہاں کیوں آئے؟''

''یہ محض اتفاق ہے۔''

''تمہارا اتفاق اب بیڑہ غرق کر دے گا۔ اف میرے خدایا۔'' گلفام اضطراب میں بولا۔ اسے کوٹھی کے باہر پولیس موبائل اور کچھ نقل و حرکت محسوس ہوئی۔

''علی علی ......'' گلفام چلایا۔ ''بیٹے تم اوپر کی منزل پر چلے جاؤ۔'' اس نے بیٹے کو ہدایت دی اور انٹرکام اٹھا کے گیٹ پر گارڈ کو فون کیا۔

''ہیلو ...... گارڈ گیٹ سے اندر کسی کو نہ آنے دینا اور کوئی اگر زبردستی کرے تو بے دھڑک فائر کھول دینا۔'' گلفام بہت جلدی جلدی اضطرابی کیفیت میں بولا لیکن گارڈ نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا اور گلفام نے دوبارہ پکارا۔

''ہیلو گارڈ ......''

''اب گارڈ نہیں تم گاڈ کو یاد کرو گلفام ......'' دوسری طرف سے انٹرکام پر آواز آئی۔ ''میں پولیس آفیسر بول رہا ہوں ...... تمہارے گارڈز کو ہم نے قابو کر لیا ہے اور پوری کوٹھی گھیرے میں ہے۔ کسی کو اوپر نیچے فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہاری ساری لائنیں ہم نے کاٹ دی ہیں اور موبائل فون بلاک کر دیا ہے۔ تمہارے دن گنے جا چکے ہیں اور اب میں دس تک گنتی گن رہا ہوں۔ گنتی ختم ہونے تک اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ برے نتیجے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

''گلفام کی ایسی حالت ہو گئی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔''

❀......□......❀

گلفام کے لئے ایک قیامت کا سماں پیدا ہو گیا تھا، اس کی زندگی کے طویل ریکارا میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی کوٹھی کو پولیس نے گھیر لیا ہو، اس کے اڈے پر کئی مرتبہ چھاپے پڑے تھے لیکن وہ چھاپے محض ایک معمول کی کارروائی کا حصہ تھے، کبھی محض خانہ پُری کے لئے کوئی چھاپہ پڑ گیا اور چھاپہ پڑنے سے پہلے چھاپہ مارنے والے ہی اسے اطلاع کر دیتے تھے کہ چھاپہ پڑنے والا ہے، گلفام پہلے سے تیاری کر کے رکھتا اور اپنی گینگ کے لڑکوں کو چوکس کر دیتا، بعض اوقات ایک دو لڑکے پروگرام کے تحت گرفتار بھی ہو جاتے جنہیں وہ اگلے ہی دن چھڑوا لیتا لیکن ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ بڑے منظم طریقے سے پولیس نے اس کے بنگلے کے اطراف گھیرا ڈالا تھا۔

وہ کئی دنوں سے سن رہا تھا کہ جابر نام کا ایک سینئر پولیس افسر آیا ہوا ہے جس نے نہ صرف محکمے کی تطہیر کا کام شروع کر رکھا ہے بلکہ شہر کے اندر جرائم کے حلقوں میں اس نے تباہی مچا رکھی ہے نیز یہ کہ جابر اپنے نام کی طرح سخت اور زبردست آدمی ہے جسے آسانی سے قابو نہیں کیا جا سکتا لیکن گلفام زیادہ خوفزدہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے کیریئر میں اس طرح کے کئی افسروں کو دیکھا تھا جو بڑے کروفر سے آئے اور اس طرح گئے جیسے غبارے سے ہوا جاتی ہے۔

گلفام کا خیال تھا کسی دن اگر جابر کسی فنکشن یا کسی ڈنر میں ٹکرا گیا تو ہیلو ہائے کے بعد اس کے ساتھ ایک میٹنگ رکھ لے گا، اسے قابو کرنا مشکل ضرور ہو سکتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہے کہ اس کے پاس بے شمار پیسہ ہے اور وہ مشکل سے مشکل انسان کو راضی کر کے آسان سوال کی طرح اپنے پیسے کے فارمولے سے حل کرنا جانتا ہے۔

گلفام اپنے تجربے اور مشاہدے کی بناء پر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس ملک میں ہر کام مشکل اور ہر کام آسان ہے، اسے وہ وقت یاد تھا جب ایک وقت کی روٹی کے لئے اُس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے اور پھر وہ وقت آیا کہ سونے کا نوالہ کھا سکتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اپنے ملک میں بلاامتیاز ہر شے کی طرح ہر انسان کی بھی اس کی صلاحیت اور

اہمیت کے مطابق قیمت ہوتی ہے، کسی کی کم اور کسی کی زیادہ قیمت ہوتی ہے لیکن ایسا کوئی نہیں ہے جس کی کوئی قیمت نہ ہو، ایسا کوئی نہیں ہے جو بکاؤ نہ ہو، ایسا کوئی نہیں ہے جس کے عزم اور ضمیر کا استحکام ہمالیہ پہاڑ کی طرح بلند اور مضبوط ہو جسے اپنی جگہ سے ہلایا نہ جا سکتا ہو۔ لہٰذا جابر کا جب اس نے نام سنا اور اس کے کارناموں کی گونج اس کے کانوں تک پہنچی تو گلفام نے یہی محسوس کیا کہ جابر اپنی قیمت میں اضافہ کرنے کے لئے سخت گیر بن رہا ہے اور گلفام نے سوچا تھا کہ وہ کسی وقت جابر سے مل کر اس کی مرضی کے مطابق اس کے دام چکا دے گا اور گلفام نے اس سے ملنے میں تاخیر محض اس لئے کی تھی کہ وہ جابر کے منصب کو بظاہر کوئی اہمیت نہ دینے کا تاثر قائم کرنا چاہتا تھا لیکن یہ تاخیر گلفام کو آج بہت مہنگی پڑ رہی تھی کہ گلفام کے پاس اب بات چیت کرنے کا وقت نہیں بچا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ اعتماد کی وجہ سے آج گھر گیا ہے۔

''گلفام! میں صرف تمہیں پانچ منٹ دیتا ہوں ...... اپنے گارڈز کو غیر مسلح کر کے گرفتاری دے دو اس میں تمہاری بھلائی ہے۔'' گلفام سوچوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک باہر میگافون پر پولیس افسر جابر کی آواز گونجی جو گلفام کے لئے ایک وارننگ اور الٹی میٹم تھا۔ گلفام تیزی کے ساتھ اندر والا زینہ طے کر کے بنگلے کی اوپر والی منزل میں پہنچا جہاں علی کو اس نے پہلے ہی بھیج دیا تھا، بالائی منزل کی محفوظ گیلری میں جا کے اس نے باہر کا جائزہ لیا، بنگلے کی چار دیواری خاصی مضبوط اور بلند تھی اور اس دیوار کو پھلانگا تو جا سکتا تھا لیکن آسانی سے نہیں پھر اس نے لوہے کے گیٹ کا جائزہ لیا جو خاصا مضبوط اور اندر سے مقفل تھا، اس نے غور سے بنگلے کے اطراف والی سڑکوں کو دیکھا جہاں اِکا دُکا گاڑیاں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں، کچھ فاصلے پر ایک پولیس موبائل بھی کھڑی تھی لیکن پولیس کے لوگ شاید سایہ دیوار میں تھے، سامنے نظر نہیں آ رہے تھے۔

''سر! کیا کروں......؟'' اچانک گلفام کا ایک مسلح گارڈ جو بنگلے کے اندر کی طرف حفاظت پر مامور تھا، ہانپتا ہوا اوپر آیا۔

''تم کتنے لوگ ہو اندر؟'' گلفام نے پوچھا۔

''اندر ہم تین ہیں اور ...... اور باہر کے دونوں گارڈز کو پولیس نے ہینڈز اپ کرا دیا ہے۔'' گارڈ نے اضطراب کی کیفیت میں کہا۔

''تم تینوں چاروں طرف اندر مورچے سنبھال لو اور فائر کے جواب میں فائر کرنا اور جب تک میں حکم نہ دوں، ہتھیار نہ ڈالنا۔'' گلفام نے احکامات جاری کرتے ہوئے

کہا۔

''ایسا ہی ہوگا سر!'' گارڈ اٹینشن ہو کے نیچے اتر گیا۔

''تمہاری ٹانگ کیسی ہے......؟'' گارڈ سے فارغ ہو کر گلفام نے پاس کھڑے گینگسٹر سے پوچھا جو اپنی زخمی ٹانگ لے کر بنگلے کے اندر کودا تھا اور جس کے تعاقب میں پولیس بھی بنگلے کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''بلیڈنگ رک گئی ہے سر! میں نے پٹی باندھ دی لیکن گولی اندر ہے جو سخت تکلیف دے رہی ہے۔'' گینگسٹر نے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا، اس وقت تم عقبی گیلری میں جا کے مورچہ سنبھال لو اور اگر کوئی بھی کمپاؤنڈ وال سے اندر کودنے کی کوشش کرے تو فائر کھول دو۔''

''ایسا ہی ہوگا سر......!'' گینگسٹر حکم کی تعمیل میں بولا اور عقبی گیلری کی طرف چلا گیا۔

علی ابھی تک باپ کے پاس سہما کھڑا تمام کارروائی کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہا تھا۔

''وٹ از آل دس ڈیڈ!'' علی نے نہایت حیرت و استعجاب سے گلفام کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹے! کچھ باتیں شاید تم جانتے ہو لیکن بہت سی باتیں تمہارے علم میں نہیں ہیں۔'' اس نے علی کو اپنے قریب کرتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بہت شفقت کے ساتھ کہنے لگا۔ ''تمہارے بچپن کے حافظے کو تیز کرنے کے لئے میں بتا رہا ہوں کہ میں ایک معزز ڈاکو ہوں، اگر تمہارا دھیان پیچھے ماضی کی طرف جائے گا تو تمہاری یادداشت تمہیں بتا دے گی کہ تمہیں ایک ڈاکو نے اٹھایا تھا اور وہ میں تھا یعنی میں جس کو تم ڈیڈی کہتے ہو۔''

''نو ڈیڈی!'' علی، گلفام کے کے ساتھ لپٹ گیا۔

''یس علی مائی سن! تم پروفیسر زاہد علی کے گھر میں پیدا ہوئے اور گلفام ڈاکو کے گھر میں پرورش پائی لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو کہ کوئی بھی آدمی پیدائشی طور پر ڈاکو نہیں ہوتا۔'' گلفام نے علی کو مزید قریب کرتے ہوئے شدت جذبات کے ساتھ فلفسیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''جیسا کہ میرے نام سے ظاہر ہے، میرے والدین نے بہت پیار اور محبت سے میرا نام گلفام رکھا تھا یعنی پھول کی شکل کا ...... یہ کسی ڈاکو کا نام نہیں ہو سکتا لیکن وقت اور حالات نے مجھے ڈاکو بنایا۔ میں عزت سے رزق حلال کما کے زندہ رہنا چاہتا تھا

لیکن وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے مجھے رزق حرام کی کھائی میں دھکیل دیا۔''
''یہ سب کچھ آج آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟'' علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔
''میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ آج میرا آخری وقت آ گیا ہے۔'' گلفام نے دلبرداشتہ ہو کر کہا پھر مزید کہنے لگا۔ ''لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ تم ایک ڈاکو کے بیٹے ہو۔ تم ایک بہت پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، تمہارا باپ پروفیسر زاہد علی، علم کا ایک روشن مینار تھا جو زندگی بھر علم بانٹتا رہا اور تمہاری ماں سنا ہے بہت اچھی خاتون تھی لیکن دونوں کے درمیان ناچاقی ......''
''یہ سب مجھے یاد ہے ڈیڈ......!''
''وہ سب ٹھیک ہے علی......!'' گلفام نے پھر علی کی بات کاٹی اور کہنے لگا۔ ''وہ سب ٹھیک ہے لیکن اگر مجھے کچھ ہو گیا ناں تو تم مجھے ڈس اون کر دینا، انکار کر دینا مجھے اپنانے سے اور صاف کہہ دینا کہ میں تمہارا باپ نہیں، میں نے تمہیں اغوا کیا تھا۔''
''نہیں ڈیڈ! نہیں ...... آپ نے مجھے بہت محبت دی ہے۔'' علی لپٹ گیا گلفام سے۔
''گلفام تمہاری مہلت ختم ہو چکی ہے ...... اب میرے جوان ریڈ کر دیں گے ...... ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔'' باہر میگا فون پر پھر ایک بار آواز گونجی اور گلفام کے کان کھڑے ہو گئے۔
''تم ہٹ جاؤ یہاں سے اندر جاؤ۔'' اب کے گلفام نے سختی سے علی کو پرے دھکیلا ور انٹر کام کی گھنٹی بجائی۔
''ہیلو......!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔
''کیا آپ جابر علی ہیں؟'' گلفام نے بہت نروس لہجے میں پوچھا۔
''ہاں......'' جابر علی نے مختصر جواب دیا۔
''جابر علی! میں تم سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔'' گلفام نے مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں گلفام! اب بات تمہاری گرفتاری کے بعد ہی ہو سکتی ہے پہلے نہیں......'' انٹر کام کے دوسری طرف کی آواز تھی۔
''مجھے گرفتار کرنے کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے تمہارے پاس......'' گلفام نے کہا۔
''کیوں نہیں ...... ایک ڈاکو ڈاکا ڈال کر تمہارے پاس پناہ لئے ہوئے ہے۔'' جابر

پاکستان ورچوئل لائبریری

علی کا جواب تھا۔

”یہ کوئی جواز نہیں ہے ...... میرے بنگلے میں تو کوئی بھی شخص پولیس سے جان بچانے کے لئے کود سکتا تھا لہٰذا یہ محض اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی پناہ لینے کے لئے میرے بنگلے کے اندر کودا ہے۔“

”یہ محض اتفاق نہیں گلفام! اس واقعے سے پہلے بھی تمہارا بنگلہ میرے ٹارگٹ میں تھا، ڈاکو نے یہاں پناہ لے کر مجھے وہ موقع فراہم کر دیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ بہتر ہے تم گرفتاری دے دو ورنہ پانچ کاؤنٹ کرنے کے بعد میں فائر کھول دوں گا۔“ جابر علی نے حتمی لہجے میں کہا اور کہنے لگا۔ ”ایک ...... دو ...... تین ......“

”میری بات سنو ...... ہیلو ...... ہیلو ہیلو ......“ گلفام نے انٹر کام زور سے کھڑکھڑایا لیکن وہ بند ہو چکا تھا اور جابر علی میگا فون پر گنتی گن رہا تھا۔

”ایک ...... دو ...... تین ...... چار ...... پانچ۔“

اور پھر پانچ کے بعد خاموشی چھا گئی، چند لمحے خاموشی طاری رہی اور پھر گلفام نے دیکھا کہ پولیس کا ایک نوجوان دیوار پھلانگنے کی کوشش کر رہا ہے اور پھر گلفام کے دیکھتے دیکھتے گلفام کے کسی گارڈ نے اندر سے فائر کیا اور پولیس مین ایک چیخ کے ساتھ دھڑام سے دیوار سے باہر کی طرف نیچے گیا۔ بس پھر کیا تھا کہ تابڑ توڑ دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ گلفام کے زخمی ساتھی نے چھت پر مورچہ سنبھال لیا اور کلاشنکوف کا برسٹ کھول دیا۔ بنگلے کے اندر موجود گارڈز نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ باہر پولیس کی طرف سے بھی بارود کی بوچھاڑ آنے لی۔ گلفام نے بھی آٹومیٹک گن کے ساتھ پلر کی اوٹ میں رہ کر نشانہ باندھ لیا اور چن چن کے فائر داغنے لگا۔

بنگلے کی پوری فضا میں چاروں طرف تڑاخ تڑاخ گولیوں کی آواز گونجنے لگی، آس پاس کے مکینوں نے پہلے تو کھڑکیاں، دروازے کھول کر باہر کا جائزہ لیا اور پھر جب دھڑا دھڑ گولیاں چلتی دیکھیں تو سب دروازے، کھڑکیاں بند کر کے اندر چھپ گئے اور سڑکوں پر آنے والی اکا دکا گاڑیوں نے راستے بدل لئے، پولیس نے مورچے سنبھال لئے تھے اور دیکھتے دیکھتے مقابلہ عروج پر پہنچ گیا۔

ابتداً گلفام نے فائر کرنے میں بہت احتیاط برتی لیکن جب اس کے گارڈز یکے بعد دیگرے گرنے لگے، اس کا زخمی ساتھی بھی چھلنی ہو گیا تو پھر گلفام جیسے ایک جنونی کیفیت میں مبتلا ہو گیا، وہ مشین گن کے ساتھ خود بھی جیسے ایک مشین بن گیا اور مشینی طریقے سے

تابڑتوڑ فائر کرنے لگا۔
''ڈیڈی! پلیز کام ڈاؤن......'' علی، گلفام کی کیفیت دیکھ کر بہت پریشان ہوا اور
اس نے بہت تشویش سے کہا۔
''بیٹے تم اپنی جان بچاؤ۔'' گلفام گھبراہٹ میں بولا۔ ''کسی طرح یہاں سے نکل
جاؤ۔''
''نہیں ڈیڈی! میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' علی تڑپ سا گیا۔ چلتی گولیوں
کی بوچھاڑ میں معاً ایک گولی آئی جو سیدھی گلفام کے سینے میں لگی، گلفام کی ایک ہائے نکلی،
وہ لہولہان ہوکر دل تھام کے زمین پر گرا۔
''ڈیڈی......!'' علی چلایا اور گلفام سے لپٹ گیا۔ معاً دونوں طرف سے گولیاں
چلنے کی رفتار اور تیز ہو گئی، کچھ سپاہی باہر گرے، کچھ گلفام کے گارڈز اندر گرے اور گولیاں
چلتی رہیں جبکہ گلفام کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔
''میں نے کہا تھا کہ آخری وقت آ گیا ہے۔'' گلفام سکرات کے عالم میں علی سے
مخاطب ہوا۔
''نہیں ڈیڈی! آپ مجھے اس طرح راستے میں چھوڑ کر نہیں مریں گے۔'' علی رقت
بھرے لہجے میں بولا۔
''اب بیٹے تمہیں اپنا راستہ خود بنانا ہوگا اور تم اپنی ماں کو تلاش کرنا...... تمہیں پتہ
ہے ناں تمہاری ماں کا نام شمائلہ تھا...... وہ ضرور زندہ ہوگی۔'' وہ دم توڑتے توڑتے بولا۔
''لیکن میں اسے کہاں تلاش کروں گا۔...... اگر ملنا ہوتا تو اب تک مل چکی ہوتی۔''
علی، گلفام کے خون آلود جسم سے لپٹ کر رونے لگا۔
''مجھے خوشی ہے کہ تم رو رہے ہو، کم از کم میں نے پیچھے ایک ایسا بیٹا چھوڑا ہے جو
میرے لئے رو رہا ہے۔'' گلفام نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا اور پھر اس کی آخری ہچکی کے
ساتھ اس کی آخری سانس اس کے جسم سے پرواز کر گئی۔
''ڈیڈی......!'' علی دھاڑنے کے انداز میں چلایا اور ڈیڈی کی مشین گن اٹھالی اور
کسی زاویے اور نشانے کے ہوا میں فائر کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ان کو چھوڑوں گا نہیں،
مار دوں گا سب کو۔''
''نہیں بیٹے! ایسے نہیں......'' اچانک علی کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا اور گن
چھین لی۔ علی پلٹا تو دیکھا ایک پولیس افسر تھا اور یہ جابر علی تھا، نیچے گارڈز ٹھنڈے ہو گئے

تھے اور پولیس کی نفری اندر بنگلے میں گھس آئی تھی۔

''گرفتار کرلو اسے......'' جابر علی نے علی کو قابو میں کر کے پولیس کے جوانوں کے حصار میں دے دیا جنہوں نے فوراً علی کو ہتھکڑی لگا کے گرفتار کرلیا۔

علی مخبوط الحواس ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو گیا ہے، پولیس نے گلفام کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیج دی اور علی کو پولیس کی گاڑی میں ڈال کے تھانے لے گئے۔

''مائی! تمہیں سر نے بلایا ہے۔'' ایک چپڑاسی نے شمائلہ سے کہا اور شمائلہ چوکس ہو گئی، وہ ابھی تھکی ہاری بمشکل اسٹول پر آن بیٹھی تھی۔ یہ ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک فرنچائز فیکٹری تھی جس میں شمائلہ گزشتہ ایک ماہ اور چار دن سے کام کر رہی تھی اور اس فیکٹری کے اندر اسے مائی کے نام سے ہی پکارا جاتا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ جب تک تاجکی ہاسٹل میں شمائلہ کی روم میٹ تھی، اس وقت تک شمائلہ کا وقت برا نہیں گزر رہا تھا، تاجکی دن کے وقت اخبار کے دفتر چلی جاتی اور شمائلہ ہاسٹل سے نکل پڑتی اور ٹیکسی لے کر مختلف اداروں اور این جی اوز کے دفاتر میں چکر لگاتی کہ شاید کہیں علی اور عینی کا سراغ مل جائے، کبھی کبھار یونہی کسی جگہ بازار یا گلی کے نکڑ پر رک کر اٹھارہ، انیس، بیس برس کے لڑکوں، لڑکیوں کو غور سے دیکھتی اور سوچتی کہ اس کا علی اور عینی اس وقت اتنے ہی بڑے ہو گئے ہوں گے۔ شمائلہ کا تقریباً سارا دن اس بے مقصد کھوج میں گزر جاتا اور شام کو جب تاجکی دفتر سے آ جاتی تو دونوں مل بیٹھتیں، کبھی تاجکی اس کا دل بہلانے کے لئے کسی ریستوران میں بیٹھ کے دونوں چائے، کافی پیتیں یا کہیں پارک میں ٹھنڈی تازہ ہوا کھاتیں اور پھر رات بہت دیر تک بیٹھ کے دکھ سکھ کی باتیں کرتیں اور جس دن تاجکی کا اگلا دن چھٹی کا ہوتا، وہ تمام رات باتیں کرتے صبح کر دیتیں۔

پھر اچانک تاجکی بچھڑ گئی، اس کی ایک دوست امریکہ میں مقیم تھی جو بہت عرصے سے تاجکی کو بلانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی پھر آخر کار ایک جاب اسے مل گئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر پاکستان چھوڑ گئی اور وہ رات جو تاجکی کی پاکستان میں آخری رات تھی، وہ شمائلہ کی زندگی کی جیسے ایک مشکل اور بھاری رات تھی۔

''کیوں تاجکی ......! میں تم سے یہ نہیں کہوں گی کہ تم کیوں جا رہی ہو، سب کو اپنا نفع نقصان دیکھنے کا حق ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ میں جس سے محبت کرتی

ہوں یا کوئی مجھ سے محبت کرے، وہ ایک دن بچھڑ جاتا ہے یا بچھڑ جاتی ہے ...... کیوں تاجکی! ایسا میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔'' اس الوداعی رات کو شمائلہ نے بہت دکھ بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

''نہیں شمائلہ! دل میلا نہ کرو۔ یہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوتا، یہ قانون قدرت ہے کہ آدمی ملتا ہی بچھڑنے کے لئے ہے۔'' تاجکی نے شمائلہ کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں عجیب قانون ہے، بچھڑ کے تو کبھی ملا نہیں کوئی آج تک، مل کے کیوں بچھڑ جاتے ہیں لوگ......'' شمائلہ نے بات کو ایک اجتماعی رنگ دے کر مایوسی سے کہا اور اس اجتماعی رنگ میں اس کا اپنا دکھ درد نمایاں تھا اور پھر وہ رات دونوں نے جاگ کر گزار دی تھی، صبح پو پھٹنے سے پہلے تاجکی نے ٹیکسی پکڑی اور ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہو گئی اور شمائلہ ذہنی طور پر اتنی تھک گئی تھی کہ شام تک کمرہ بند کر کے کچھ کھائے پیئے بغیر سوئی رہی۔ شمائلہ کے پاس کوئی کام دھندا تو تھا نہیں، کچھ اپنے پیسے تھے، کچھ شاہ جی نے دیئے تھے، وہی خرچ کرتی رہی لیکن جمع شدہ پونجی میں اگر آمدنی کا اضافہ نہ ہو تو پونجی ساتھ چھوڑ جاتی ہے، ایک ایک ڈول اگر کنویں سے نکالا جائے اور کنویں میں مزید پانی نہ آ رہا ہو تو کنواں تو کیا دریا بھی خالی ہو جاتا ہے لہٰذا شمائلہ کے تمام پیسے خرچ ہو گئے اور تاجکی کے جانے کے بعد ایک مسئلہ اس کے لئے اور پیدا ہو گیا کہ پہلے وہ کمرے کا نصف کرایہ دیتی تھی، اب پورا کرایہ دینا پڑا، کچھ عرصے تک تو دیتی رہی، سونے کی چوڑیاں شاہ جی نے بنوا کے دی تھیں، وہ بیچیں، گلے کا ہار بلکہ انگوٹھی تک بیچ ڈالی اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ کھانے کے پیسے نہیں رہے لہٰذا اپنے پیٹ پر تو پتھر باندھ سکتی تھی لیکن ہاسٹل کی میڈم کے پیٹ پر پتھر باندھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ میڈم نے پہلے تو دھیمے لہجے میں تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہاسٹل کا کرایہ طلب کیا لیکن جب شمائلہ کرایہ ادا نہیں کر سکی تو مالکن نے بہت سخت رویہ اختیار کیا اور ہاسٹل سے نکال دینے کی نہ صرف دھمکی بلکہ الٹی میٹم دے دیا لہٰذا شمائلہ نے ملازمت تلاش کرنے کی کوشش تیز کر دی تاہم وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب وہ پہلے والی شمائلہ تو ہے نہیں جسے مرد شاعری کی زبان میں زہد شکن اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ اب نہ اس کی صورت پہلے جیسی رہی تھی، نہ اس کا جسم پہلے جیسا رہا تھا، بالوں کو وہ لاکھ ڈائی کرتی لیکن کوئی نہ کوئی سفید تار اپنا پتہ دے ہی دیتا تھا، ویسے ہی وہ ایک دکھ بھری زندگی گزار کر آئی تھی، اوپر سے وقت کی آندھی نے بارہ چودہ برسوں کا ملبہ اس پر گرا دیا تھا۔ اس لئے کچھ تبدیلی تو آنی ہی تھی اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف کچھ نہیں بہت کچھ تبدیلی

اس کے اندر رونما ہو چکی ہے، اس کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کوئی اس کی جانب بھٹکی ہوئی نظروں سے دیکھے، وہ تو صرف نوکری کرنا چاہتی تھی تاکہ خاموشی کے ساتھ باقی زندگی اپنے بچوں سے ملنے کی آس میں گزار دے، عزت سے دو وقت کی نہیں تو ایک وقت کی روٹی کھاتی رہے اور ہاسٹل کا کرایہ اور بقایاجات ادا کر سکے، اس کے اندر اب وہ اعتماد بھی نہیں رہا تھا کہ کوئی اچھی ڈیسک جاب پکڑ سکے، کہیں ٹیچر لگ جائے، کسی بڑے آدمی کی سیکرٹری ہی بن جائے، اس قسم کی کوئی امید کی کرن اب اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اس کی مایوسی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ سڑک پر جھاڑو لگانے کے لئے بھی خود کو آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی دوران کسی حوالے سے اسے ایک بہت بڑی گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت مل گئی چونکہ فیکٹری میں ورکرز کی بڑی تعداد خواتین پر مشتمل تھی، اس لئے شائلہ کو دفتر کی ایک خدمت گار کے طور پر آسانی سے جاب مل گئی، کام کی نوعیت کچھ اس طرح ہی کی تھی جیسے کسی ہسپتال کے اندر آیا کی ہوتی ہے، چیزوں کو اِدھر اُدھر کرنا، فیکٹری کی کوئی ورکر اگر چائے وغیرہ منگوانا چاہے تو کینٹین میں جا کے چائے بول آنا یا موقع ملے تو خود ہی لے آنا۔ کینٹین، فیکٹری کی بیسمنٹ میں تھی اور اسے دن میں کئی بار کینٹین جانا پڑتا اور بعض اوقات لفٹ میں مرد زیادہ دیکھ کر وہ بغیر لفٹ کے ہی زینہ چڑھ کے جاتی اور زینہ اتر کے آتی، اس کے علاوہ فیکٹری کا باس بھی مہمانوں کے آنے پر کئی بار چائے منگواتا، ایسے میں وہ کینٹین کی چائے کو باس کے لئے رکھی ہوئی الگ پیالیوں میں ڈال کے پیش کرتی اور کبھی کبھار جب باس کا خود چائے پینے کا موڈ ہوتا تو وہ کینٹین سے منگوانے کی بجائے اپنے دفتر میں ہی کیٹل کے اندر پانی کھولا کے چائے کے دو بیگ ڈال کے پیتے، انہیں دودھ، پتی وغیرہ کے مقابلے میں اس طرح تازہ اور مہکتی ہوئی چائے زیادہ اچھی لگتی۔ معلوم نہیں پہلے یہ چائے کون بناتا تھا لیکن جب سے شائلہ اس فیکٹری میں آئی تھی تو یہ فرض اب شائلہ ہی انجام دیتی تھی اور باس کو شائلہ کے ہاتھ کی چائے بہت اچھی لگنے لگی تھی اور جب بھی وہ تنہ یا فرصت میں بیٹھے ہوتے اور ان کا چائے کا موڈ ہوتا تو وہ شائلہ کو اندر بلوا لیتے اور شائل کچھ دن سے محسوس کرنے لگی تھی باس کی نظروں میں اس کے لئے ایک خاص قسم کی کیفیت ہے جس کو وہ پسندیدگی کا نام دے سکتی تھی تاہم وہ سوچتی تھی کہ باس ایک پکی عمر کا آدمی ہے لیکن وہ خود ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیتی تھی کہ پکی عمر کا آدمی کیا مرد نہیں ہوتا، و نوجوان کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی مرد ہوتا ہے اور وہ اب مردوں کے اس کھیل کی گین

نہیں بننا چاہتی تھی، وہ بن بھی نہیں سکتی تھی اور اس کے اندر اب کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جو مرد کے لئے کشش کا باعث بنے، وہ جب آئینے میں اپنی صورت دیکھتی تو اکثر اسے اپنی جوانی یاد آ جاتی جسے زاہد، دنیا کی سب سے خوبصورت عورت کہتا تھا، جس پر شمس ڈاکہ مارنا چاہتا تھا، رجب جس پر دیوانہ ہو گیا تھا، جس جوانی نے شاہ جی کو ایک پاگل شاعر بنا دیا تھا، جسے دیکھ کر اکثر لوگ اپنی چال بھول جاتے تھے، وہی جوانی اب ایک عجیب شے بن گئی تھی، باس جو ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، بہت عالیشان بنگلے میں رہتا تھا اور شمائلہ کسی کام سے ڈرائیور کے ساتھ دو تین مرتبہ اس کے گھر بھی جا چکی تھی۔ اس کی بیوی ہے، جوان بیٹے، بیٹیاں ہیں، اس کی بیوی بالکل ہی ہڈیوں کا پنجرہ ہے شاید بڑھتی عمر کو روکنے کے لئے اس نے اپنے وزن کو کنٹرول کیا ہوا تھا لیکن وہ زیادہ ہیبت ناک ہو گئی تھی لیکن جیسی بھی تھی، باس کی بیوی ہے اور باس کا علاقے میں ایک نام ہے، عزت ہے اور نام تو باس کا لمبا چوڑا ہے، آگے پیچھے کچھ ڈگریاں وغیرہ بھی لگی ہوئی ہیں لیکن آسمانی صاحب کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی پسندیدہ چیزوں میں شمائلہ کے ہاتھ کی چائے بھی تھی۔

''مائی! تمہیں سر نے بلایا ہے۔'' شمائلہ کچھ بکھرا ہوا سامان سمیٹ کر ابھی بیٹھی ہی تھی کہ ایک چپڑاسی نے نوید دی اور شمائلہ سمجھ گئی کہ باس کا چائے پینے کا موڈ ہو گا کیونکہ شہر میں کسی ہنگامے کی وجہ سے آج فیکٹری میں بہت کم ورکرز آئی تھیں اور باس صبح سے فرصت میں بیٹھے تھے۔

''جی سر......! چائے بناؤں......'' شمائلہ نے اندر جاتے ہی کسی باندی کی طرح پوچھا۔

''بیٹھو......'' باس نے چشمے کے فریم کے اوپر سے دیکھ کر شمائلہ کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جی؟'' وہ کسمسائی، اسے باس کے سامنے بیٹھنے میں تامل ہو رہا تھا۔

''ہاں ہاں بیٹھو......'' انہوں نے اصرار کیا۔ ''میرے ساتھ بیٹھ جانے سے نہ تو می اچھوت بن جاؤں گا نہ تم......بیٹھو۔'' انہوں نے دوبارہ کہا اور شمائلہ سمٹ سمٹا کر بے آرام ی ہو کر بیٹھ گئی۔ آسمانی صاحب کے کمرے میں بغیر اجازت کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی شمائلہ کے اندر ایک چھپا سا خوف پیدا ہوا کہ باس کے ساتھ اگر کسی نے سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تو معلوم نہیں کیا سوچے گا۔ اس نے اس خوف کے تحت ہی بے ارادہ پلٹ کے جو دروازے کی طرف دیکھا تو دروازے میں ہلکی سی کڑک کی آواز آئی، باس نے

ریموٹ کے ذریعے دروازہ مقفل کر دیا تھا تاکہ شمائلہ کا خوف دور ہو جائے لیکن دروازے کے قفل کی یہ ہلکی سی ''کڑک'' جیسے بجلی کا ایک کڑکا بن کر گونجی، وہ بے خوف ہونے کی بجائے مزید خوف زدہ ہو گئی۔

''چائے۔'' شمائلہ نے ایک نوکرانی کی طرح ادھوری سی بات کہی یعنی وہ باس کے لئے چائے بنانے کے لئے اٹھے۔

''چائے میں نے آج خود ہی بنالی ہے اور تم بھی پیو میرے ساتھ......'' باس نے کہا اور شمائلہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چائے کے دو کپ باس کے سامنے رکھے تھے جن میں چائے کے دو دو بیگ پڑے تھے اور پیالیوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

باس نے دو پیالیوں میں سے ایک کپ شمائلہ کی طرف کھسکایا۔

''تم نے محسوس کیا ہوگا کہ مجھے اکیلے چائے پینے کی عادت نہیں ہے لیکن آج اتفاق سے کوئی چائے پینے والا وزیٹر نہیں آیا، اس لئے میں نے تم کو ساتھ دینے کے لئے بلالیا ہے، پیو......'' باس نے چھوٹی سی تمہید باندھی اور شمائلہ نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے کپ کو چھونے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ مزید کانپ گیا۔

''آرام سے ......گھبراؤ نہیں......'' باس نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور اس کی لرزتی کلائی کی لرزش روکنے کے لئے ذرا اپنا ہاتھ آگے جو بڑھایا تو شمائلہ نے فوراً اپنے ہاتھ کی لرزش روک دی اور اس سے پیشتر کہ باس حوصلہ افزائی کے لئے اس کی کلائی تھامتا، شمائلہ نے جرأت کر کے کپ جلدی سے اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کے ایک سپ چائے کا لے لیا جس سے اس کی زبان تھوڑی سی جل گئی لیکن اس نے سسکی نہیں لی۔

''کیسی ہے ...... میں نے پہلی دفعہ بنائی ہے۔'' باس نے چائے پر شمائلہ کی رائے پوچھی۔

''اچھی ہے سر......! بہت اچھی۔'' شمائلہ یونہی تک میں بولی۔ وہ چائے کے ذائقے کا تو کچھ اندازہ ہی نہیں کر رہی تھی، وہ تو باس کے بالکل ہی نئے روپ پر حیران تھی۔

''لیکن تم بہت اچھی چائے بناتی ہو...... ویسی نہیں بن سکتی۔'' باس نے بے اختیار جواب دیا۔

''یا اللہ......!'' وہ اندر ہی اندر چونکی۔ ''کیا اب بھی......'' اس کے من ہی من میں ایک سوال ابھرا لیکن وہ بولی کچھ نہیں صرف اتنا کہا۔ ''سر! اس میں میرا کیا کمال ہے، میں تو کھولتے ہوئے پانی میں صرف ٹی بیگ ڈال دیتی ہوں۔''

"تو پھر تمہارے ہاتھ کا کمال ہوگا۔" باس نے پھر بے ساختہ کہا اور کہنے لگا۔ "ہاتھ کی بھی تو ایک خوشبو ہوتی ہے ناں کہ نہیں......" باس نے نظریں شمائلہ کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"سر! کچھ کام ہوتو......" شمائلہ نے جلدی جلدی چائے کے دو چار گھونٹ پیئے اور ہڑبڑا کر اٹھنے لگی۔

"بیٹھی رہو، بیٹھی رہو، کام تمہارا ہی ہے۔" باس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھے رہنے کو کہا اور وہ اٹھتے اٹھتے پھر کرسی کے اندر دھنس سی گئی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آسمانی صاحب کوئی آسمانی بلا کی شکل میں نازل ہو رہے ہیں یا کوئی زمینی مسئلہ ہے کیونکہ وہ آج بالکل مختلف اور ایک ایسے چہرے کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے جو شمائلہ نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آسمانی صاحب نے فائل کھولی اور اوپر رکھا ہوا ایک کاغذ نکال کے سامنے رکھا۔

"یہ تمہاری اپلی کیشن ہے لون کے لئے......" انہوں نے کاغذ دکھا کر کہا۔

"جی جی......!" وہ گھبرائی۔

کوئی ہفتہ بھر پہلے اس نے اکاؤنٹ آفیسر کو قرض کے لئے ایک درخواست دی تھی، فیکٹری میں ہی کام کرنے والی ایک خاتون ساجدہ سے شمائلہ کی ٹھیک ٹھاک سلام دعا ہو گئی تھی، شمائلہ نے ساجدہ سے اپنا دکھ بیان کیا اور مشکلات بتائی تھیں اور کہا تھا اگر قرض نہ ملا تو میڈم ہاسٹل میں رہنے نہیں دے گی، اس نے سامان باہر پھینک دینے کی دھمکی دے رکھی ہے۔ ساجدہ کو اس نے اپنی دکھ بھری داستان بھی مختصراً بتا دی اور خاص طور پر شمائلہ کے پیسے شاندار بیک گراؤنڈ کے بارے میں جان کر ساجدہ بہت متاثر ہوئی تھی اور ساجدہ کی اکاؤنٹ آفیسر سے ٹھیک ٹھاک سلام دعا تھی، اس نے اکاؤنٹ افسر سے شمائلہ کے قرض کے لئے سفارش کی، اکاؤنٹ افسر بھی شمائلہ کے حالات جان کر متاثر ہوا اور یہ جاننے کے باوجود کہ صرف ایک سوا ماہ کی ملازمت کی بنیاد پر شمائلہ کو قرض نہیں مل سکتا، اس نے پھر بھی شمائلہ سے درخواست مانگی اور پُرزور سفارش کے ساتھ آگے بڑھا دی جو حتمی فیصلے اور منظوری کے لئے باس کے پاس پہنچ گئی اور قرض کی اس درخواست کے بارے میں شمائلہ کے علاوہ صرف ساجدہ اور اکاؤنٹ افسر کو معلوم تھا اور اب یہ باس کے نوٹس میں آئی تھی۔

"ایسی اشد ضرورت کیا آن پڑی ہے۔" باس نے سوال کیا اور پھر فوراً ہی اچانک اپنے سوال کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "معاف کرنا تمہارے ذاتی معاملات کے

بارے میں مجھے جاننے کا حق تو نہیں ہے، شمائلہ بیگم! لیکن......'' وہ درخواست پڑھتے ہوئے بول رہے تھے اور شمائلہ کا نام لے کر فوراً رک کے اور اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔''میں نے تمہیں آج مائی کہہ کر نہیں پکارا ہے کیونکہ درخواست پڑھتے ہوئے اچانک تمہارے اصلی نام پر نظر پڑ گئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اس کے اصل نام سے ہی پکارا جانا چاہئے، آخر نام رکھا بھی اسی لئے جاتا ہے کہ نام انسان کی پہچان ہوتی ہے، یہ کیا ہوا مائی، آیا، نرس، ڈرائیور، دھوبی، نائی، درزی...... نان سینس ہے یہ سب...... اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہیں آئندہ تمہارے نام سے پکاروں، کیوں شمائلہ!''

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے سر! یہ تو میرے لئے خوشی اور عزت کی بات ہے کہ میں مائی کہلانے کی بجائے اپنے نام سے پکاری جاؤں۔'' شمائلہ حوصلے سے بولی۔

''گڈ......'' باس نے فائل بند کی اور دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر ملتے ہوئے شمائلہ کی طرف غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔''اب میں تمہیں بلاتکلف شمائلہ کہہ سکتا ہوں......تو یہ بتا شمائلہ میں اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ ایسی اشد ضرورت کیا آن پڑی ہے یعنی چار ہزار تمہاری تنخواہ ہے اور دس ہزار تم نے قرض مانگا ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ تمہاری ملازمت کو ابھی صرف ایک مہینہ چار دن ہوئے ہیں، تم کیا سمجھتی ہو کہ ایک مہینے کی ملازمت پر کوئی کمپنی دس ہزار قرض دے سکتی ہے؟''

''میں جانتی ہوں سر! کہ میں نے اپنے حق سے آگے بڑھ کر مانگا ہے قرض...... لیکن میں اس کے لئے تیار ہوں کہ آئندہ مجھے بے شک صرف ایک ہزار روپے مہینہ دیا جائے اور تین ہزار ہر ماہ میری تنخواہ سے کاٹ لئے جائیں، اس طرح تین ماہ کے اندر میرا قرض ادا ہو جائے گا سر!'' وہ التجا بھرے انداز میں بولی۔

''لگتا ہے تم بہت ضرورت مند ہو۔'' باس نے از راہِ ہمدردی کہا اور پھر بلا ارادہ فائل کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔''اکاؤنٹینٹ نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے، تم ایک ہاسٹل میں رہتی ہو اور اس کا بہت زیادہ کرایہ تم پر چڑھ گیا ہے۔''

''جی سر! اور میڈم نے مجھے الٹی میٹم دیا ہے کہ اگر دس دن میں ڈیوز کلیئر نہ کئے تو وہ میرا سامان اٹھا کے باہر پھینک دے گی۔'' شمائلہ نے باس کے رویے میں ہمدردی دیکھ کر اپنی زبان کھولی اور اپنی مجبوری بتائی۔

''دیکھو شمائلہ......!'' باس نے پھر فائل کھولی، بند کی اور عقاب جیسے چڑیا کو دیکھتا

ہے، ایسی تیز نظریں شائلہ کے چہرے پر گاڑ کے بولا۔ ''ہیرا اگر کچرے میں پڑا ہو ناں تو لوگ اسے کچرے کے ساتھ اٹھا کے پھینک دیتے ہیں لیکن وہی ہیرا جب تراش خراش کے بعد جوہری کے شوکیس میں آ جائے یا نگینہ بن کر انگوٹھی میں جڑ جائے تو ہزاروں لاکھوں کا ہو جاتا ہے، سمجھی ہو کہ نہیں......''

''نہیں سر! میں نہیں سمجھی۔'' شائلہ بہت کنفیوژ ہو گئی تھی اور پریشان بھی۔

''اٹس ویری سمپل......'' وہ کھٹ سے بولا اور پھر اپنی انگریزی کا ترجمہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرا مطلب ہے یہ بہت سادہ سی بات ہے......اپنے آپ کو مینٹین کرو۔ میں نے جیسا کہا ناں ہیرے کی قدر جوہری کے پاس ہوتی ہے، تم نے اپنے وجود کو نفی کر کے ہتھیار پھینک دیئے ہیں لیکن تم شاید نہیں جانتی ہو کہ تم ایک بہت گریس فل عورت ہو۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور غور سے دم بخود اور حیران پریشان شائلہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں شائلہ......!''

''میرا خیال ہے سر! آپ کسی اور موضوع پر بات کریں۔'' شائلہ ذہنی طور پر الجھ کر بولی۔ وہ ان تمام باتوں کو سننے کے لئے تیار نہیں تھی جو اس وقت باس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔

''میں نے تم کو آج اسی موضوع پر بات کرنے کے لئے بلایا ہے کیونکہ آج فیکٹری میں سکون ہے اور فرصت سے بات ہو سکتی ہے، اپنی قدر کو جانو تم ...... یہ پانچ دس ہزار روپے کا قرض لینا اور قسطوں میں کٹوانا تمہاری سطح سے نیچے کی بات ہے، تمہارے پاس تو بھی بہت سارا سرمایہ ہے جو تم نے چھپا رکھا ہے، اسے اوپن کرو۔ یہ جو عورتیں ہیں ناں خواتین اور میڈم بنی پھرتی ہیں اور اپنی ادائیں دکھاتی ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں، ان کی بیوٹی ہے وہ بیوٹی پارلرز کی محتاج ہے، بیوٹی پارلرز کے اندر یہ عورتیں بے بے بنکے جاتی ہیں بے بی بن کے نکلتی ہیں، یہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے پیدا ہونے والی چہرے کی جھریاں ختم کروانے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ چہرے کی دلکشی برقرار رہے، تمہیں تو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں، تم تو......''

''پلیز سر! آپ اپنی یہ بکواس بند کریں۔'' وہ غصے میں بے قابو اور بے اختیار ہو کر جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جس کو کھولنے کا کنٹرول باس کے پاس تھا۔

''آرام سے بات کرو۔ کوئی زبردستی نہیں ہے، جو بات آرام سے ہو سکتی ہے،

اسے غصے میں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔'' باس نے بہت ٹھنڈے اور دھیمے لہجے میں کہا۔
اس کے موبائل فون پر ہلکی سی وائبریشن ہوئی، اس نے نمبر دیکھا اور چہرے پر کوئی تاثر پیدا کئے بغیر لائن کاٹ دی۔

شائلہ کے ساتھ گفتگو کے دوران اس نے غالباً اپنی میز پر پڑے ٹیلیفون بند کر رکھے تھے لیکن موبائل فون پر کئی مرتبہ لرزش ہوئی لیکن ہر بار اس نے ایک نظر نمبر کو دیکھا اور بند کر دیا، کسی سے بات نہیں کی، وہ پوری توجہ شائلہ پر صرف کرنا چاہتا تھا، وہ ٹھنڈے لہجے میں بات کرتا رہا اور شائلہ نے اس کی گفتگو کو جب بکواس کا نام دیا اس پر بھی کسی برہمی یا ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

''آرام سے بات کرو، کوئی زبردستی نہیں ہے، جو بات آرام سے ہو سکتی ہے اسے غصے میں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو ابھی تمہیں کوئی پیشکش نہیں کی ہے، جب کروں گا تو پھر غصہ دکھانا یا نرمی...... ابھی تو کچھ نہیں کہا میں نے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ...... کھل کے بات کریں۔'' شائلہ نے کھڑے کھڑے بہت جھنجلاہٹ اور اعتماد کے ساتھ پوچھا اور پھر کہنے لگی۔ ''آپ پر یہ بھی واضح کر دوں کہ میں کوئی نوجوان الہڑ لڑکی نہیں، دو دفعہ بیوہ بن چکی ہوں اور اب......''

''اس سے کیا ہوتا ہے۔'' باس اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''پھول جب باغ سے کٹ کر گلدان میں آتا ہے تو اس کٹ فلاور کی قدر باغ کے پھول سے زیادہ ہو جاتی ہے ...... بیوہ یا بیوی ہونے سے کیا ہوتا ہے، کیا ہیلن آف ٹرائے کسی کی بیوی نہیں تھی، ہاؤ ٹنڈ آئی ٹیل یو ہوشی واز...... آئی ایم سوری میں انگریزی بول گیا ہوں۔''

''نو پرابلم، آئی کین ٹیل یو ہوشی واز......'' شائلہ کے اندر کی پرانی پڑھی لکھی ایک عالم فاضل دانشور کی بیوی بیدار ہو گئی اور وہ غصے اور تمکنت سے تن کر بولی۔ "Helen was the wife of menelaus, famous for her beauty according to legend, her abduction by paris, provoked the trojan war" ''لیکن تم کیا جانو ٹروجن وار کیا تھی، ریڈی میڈ گارمنٹ فیکٹری کے مالک۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''اوہ گاڈ......!'' باس، شائلہ کے منہ سے ایسی ثقیل انگریزی سن کر چونکا بھی اور دم بخود بھی رہ گیا۔

''یو آر ورتھ ٹن تھاؤزنڈ ...... مجھے کمپنی دو، دس ہزار کچھ بھی نہیں ہیں ...... یہ میری آفر ہے۔''

شمائلہ غصے سے تھرتھر کانپنے لگی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا، میز پر پڑی ہوئی اپنے قرض کی درخواست اٹھائی اور درخواست ہاتھ میں تھام کر خشم آلود لہجے میں بولی۔ ''اگر تمہاری ماں، بہن یا بیٹی میری جگہ ہوتی اور کوئی انہیں ایسی ہی آفر دیتا تو پھر تمہارا ری ایکشن کیا ہوتا؟'' یہ کہہ کر شمائلہ نے کاغذ پھاڑا اور اسے گول کر کے باس کے منہ پر دے مارا اور ساتھ ہی ''آخ تھو'' کر کے اس کے منہ پر تھوکا، باس نے کوئی غصہ نہیں کیا۔

''اگر ہاسٹل کی میڈم تمہارا سامان کبھی نکال کے کمرے سے باہر پھینک دے اور کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آئے تو میرے پاس چوبیس گھنٹوں میں کبھی کسی بھی وقت بلاتکلف آ سکتی ہو، میری آفر موجود رہے گی۔'' باس بہت ڈھٹائی اور نارمل طریقے سے تھوک نیپکن کے ساتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''اپنے اکاؤنٹس والوں سے کہہ دینا، میرے چار دن کا حساب کر دیں۔'' شمائلہ نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف پلٹی۔ باس نے ریموٹ اٹھایا، چہرے پر ایک ڈھیٹ مسکراہٹ بکھیری اور کڑک کی آواز کے ساتھ دروازہ غیر مقفل کر دیا۔

شمائلہ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئی۔

وہ فیکٹری سے نکل تو آئی لیکن آگے اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ کدھر جائے، وہ نوکری پر تھی تو ایک پک اپ پوائنٹ سے فیکٹری کی بس پکڑتی تھی اور واپسی پر بھی بس اسے پک اپ پوائنٹ پر ڈراپ کر دیتی تھی، فیکٹری کی بس یا کوسٹر میں فیکٹری کی لڑکیاں اور خواتین بھی ہوتی تھیں اور بس کو شہر کے اندر اور باہر ہر ایک کو اتارنے بٹھانے کے لئے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا لیکن کچھ بھی سہی وہ بسوں کے دھکے کھانے سے بچ جاتی تھی لیکن یہ سہولت بھی اسے نوکری کے ساتھ میسر تھی اور آج وہ نوکری کو بھی ٹھوکر مار آئی تھی۔ فیکٹری شہر سے میلوں دور تھی اور اسے بسوں کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کون سی بس کہاں سے چلتی اور کہاں پہنچاتی ہے۔ تاہم وہ فیکٹری سے بہت دور تک پیدل چلتی گئی اور کافی چلنے کے بعد اسے شہر کی طرف جانے والی ایک بس کھڑی دکھائی دی، وہ لپک کر بس میں بیٹھ گئی، اس بس نے اسے تقریباً دو گھنٹے کے بعد شہر پہنچا تو دیا لیکن اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ شہر کا کون سا حصہ ہے۔

''چلو بھئی بس آگے نہیں جائے گی۔'' کنڈیکٹر نے ایک لمبی آواز جب لگائی تو وہ ڈرتی ڈرتی... جھک کر بس سے نیچے اتری، پھر اس نے وہاں سے دوسری اور دوسری سے تیسری بس

پکڑی اور پھر تقریباً ایک میل پیدل چل کر ہاسٹل پہنچی۔ شمائلہ جب ہاسٹل پہنچی تو اس وقت اس کے وجود پر، اس کے دل و دماغ پر اتنا بوجھ، اتنی تھکاوٹ اور نیند طاری تھی کہ ایک قدم مزید آگے چلنے کی ہمت نہیں تھی تاہم وہ گرتی پڑتی ہاسٹل کے دروازے پر تقریباً بارہ بجے رات پہنچی، دروازہ کھٹکھٹایا تو چوکیدار گیٹ پر آیا اور شمائلہ نے محسوس کیا کہ چوکیدار اسے آج مشتبہ اور مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے تاہم اس نے گیٹ کھول دیا، شمائلہ جلدی سے صحن طے کر کے جب کوریڈور سے اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھنے لگی تو اچانک اسے برآمدے کے دروازے پر سامان کا ایک ڈھیر نظر آیا۔

''ہائیں۔'' وہ دہل گئی، یہ تو اس کا اپنا سامان تھا۔

''یہ میرا سامان کس نے پھینکا ہے یہاں؟'' وہ زور سے چلائی تو میڈم جس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں، اپنے کمرے سے آنکھیں ملتی ہوئی نکلی اور بولی۔ ''چلاؤ مت ......سامان میں نے نکلوایا ہے اور کمرے پر میں نے دوسرا تالا لگوا دیا ہے۔''

''لیکن کیوں......؟'' شمائلہ مزید چلائی۔

''تمہیں پتہ ہے کیوں...... میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر دس دن میں پیسے نہ آئے تو میں تمہارا سامان باہر پھنکوا دوں گی، آج گیارواں دن ہو گیا ہے، اندر نہیں جا سکتی ہو تم......''

''پلیز میڈم جی......! یہ ظلم نہ کریں، میں آپ کی ایک ایک پائی چکا دوں گی۔'' شمائلہ نے میڈم کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ارے ہٹو، کہاں سے چکاؤ گی، بہت ہو گئی، جاؤ پیسے لے کر آؤ ورنہ اندر نہیں جانا۔'' میڈم نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔

''دیکھو اتنا ظلم نہ کرو۔'' شمائلہ گڑگڑائی۔

''ارے کون سا ظلم کیا ہے میں نے تم پر، چھ مہینے سے پیسے نہیں دیئے تم نے، آج کل کر رہی ہو، یہ ہاسٹل ہے، دھرم شالہ تو نہیں اور پھر ہاسٹل میرے باپ کا تو نہیں، مجھے بھی آگے حساب دینا پڑتا ہے، جاؤ یہاں سے پریشان نہ کرو، آدھی رات کے وقت۔ جاؤ ...... جاؤ ...... جاؤ......'' اس نے یہ کہہ کر ساتھ ہی دھکے بھی دیئے اور گیٹ سے باہر نکال دیا۔

❁

سنسان ویران سڑک پر حواس باختہ اور وحشت زدہ شمائلہ چلی جا رہی تھی، اسے کچھ

پتہ نہیں تھا، وہ کہاں اور کس طرف جا رہی ہے، دور کسی جگہ اسی کی طرح کا کوئی وحشت زدہ مجذوب آدمی درد بھری آواز میں گا رہا تھا

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
جی میں آتا ہے کہ بڑھ کر چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مجذوب کی آواز دھیرے دھیرے قریب آتی ہوئی دور ہوگئی اور پھر کہیں ہوا کے دوش پر تحلیل ہوگئی۔ شمائلہ کا سر بھی گھوم رہا تھا اور وہ خود بھی گھوم رہی تھی اور قدم ڈگمگاتے ہوئے کسی خطرناک کھائی کی جانب بڑھ رہے تھے، کچھ ہی دیر بعد وہ گھپ اندھیری رات میں ڈوبے باس کے بنگلے کے گیٹ پر موجود تھی اور چوکیدار سے کہہ رہی تھی کہ باس کو جگا کے باہر بھیجو۔

''اس وقت؟'' چوکیدار نے حیرت سے کہا۔

''ہاں اس وقت......'' وہ وحشت سے تحکمانہ انداز میں بولی۔ تھوڑی دیر کے بعد باس شب خوابی کے لباس میں اندر سے گیٹ پر آیا اور معنی خیز سوالیہ نظروں سے شمائلہ کو دیکھنے لگا۔

''ہاسٹل کی میڈم نے میرا سامان کمرے سے نکال کے باہر پھینک دیا ہے اور میں آ گئی ہوں۔'' شمائلہ رندھی ہوئی آواز میں شکست خوردگی کے انداز میں بولی جیسے وہ اس کی طرف سے دی ہوئی پیشکش یاد دلا رہی ہو۔

''پچھلی گلی میں اندر چلی جاؤ، میں گاڑی لے کر آ رہا ہوں۔'' باس نے دھیمے رازدارانہ لہجے میں کہا اور شمائلہ دبے پاؤں پچھلی گلی میں چلی گئی۔

......□......

دور افق پر اندھیرے میں روشنی کی کوئی دراڑ ابھی نہیں پڑی تھی لیکن مرغِ سحری کی تسلسل کے ساتھ آوازیں صبح کی آمد کی اطلاع دے رہی تھیں۔ ہر چند کہ مسجد سے اذان ابھی سنائی نہیں دی تھی لیکن فجر کی نماز کے اِکا دُکا بوڑھے نمازی مسجد کی طرف دھیرے دھیرے جا رہے تھے۔ سبزی منڈی سے آنے والے سبزی اور فروٹ کے بھاری بھر کم ٹرک دندناتے ہوئے مارکیٹوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ پرندوں نے پروں کو پھڑ پھڑا کر رات کے ختم ہونے کی خبر دینی شروع کر دی تھی۔ ستارے ڈوب رہے تھے جو اس بات کی نوید تھے کہ سورج چڑھنے میں زیادہ وقت نہیں۔ پھر اچانک ایک گاڑی ایک ویران سی جگہ سڑک پر متحرک سائے کی طرح آن رکی جو شائلہ کے باس کی گاڑی تھی اور شائلہ باس کے برابر والی سیٹ پر پژمردہ اور نڈھال بیٹھی تھی۔ اس کا وجود بے جان اور دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

گاڑی ایک سنسان جگہ پر پُراسرار طریقے سے رکی اور باس نے پرس سے نوٹ نکال کے گنے اور شائلہ کے ہاتھ میں دینے کی بجائے اس کے گریبان میں ڈال دیئے۔

''اتر جاؤ......'' باس نے اندر سے دروازہ کھولا اور مشینی طریقے سے بولا۔ شائلہ پتھر کے بت کی طرح بے جان، بے حس اور بے حرکت تھی جیسے سرد خانے میں رکھے رکھے منجمد ہو گئی ہو۔ ٹھنڈی برف کی سل کی طرح اس کے سر کے بال کسی پاگل عورت کے سر کے بالوں کی طرح بکھرے اور الجھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ بھی ہاتھ بڑھا کر اپنے بالوں کو سیدھا یا درست نہیں کیا اور اس کا حلیہ اس وقت اس شعر کی غمازی کر رہا تھا کہ

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ جسم بھی پتھرایا ہوا تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی جیسے اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ گاڑی رک گئی ہے جیسے اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ باس نے نوٹوں کی چھوٹی سی گڈی اسے دے دی ہے۔ اسے

علوم ہی نہیں ہوا تھا کہ باس نے اس سے کچھ کہا ہے جیسے اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ س مرد کے برابر وہ بیٹھی ہے وہ کون ہے۔ اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ کار کا دروازہ کھل گیا ہے۔

''اترو نیچے......'' باس نے دوبارہ کہا۔

''ہاں......'' وہ چونکی، جیسے منوں ملبے کے نیچے سے دبی ہوئی نکلی ہو اور کوئی اس سے کچھ کہہ رہا ہو۔

''میں نے کہا نیچے اترو......'' اب کے باس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

''نہیں مجھے یہاں نہ اتارو۔'' شائلہ نے سر کو جھٹک کر کہا۔ وہ جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔ ''مجھے یہاں نہ اتارو، مجھے وہاں لے چلو ہوسٹل کے پاس...... میرا سامان باہر پڑا ہو گا۔''

''میں نے پیسے دے دیئے ہیں، جا کے کرایہ چکاؤ اور سامان اندر رکھواؤ۔'' باس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور اسے باہر کھلے دروازے کی طرف تھوڑا سا دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''دیر نہ کرو اتر جاؤ۔''

''یہاں نہیں...... یہ جگہ ہوسٹل سے بہت دور ہے۔'' شائلہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ لگتا تھا وہ مکمل ہوش و حواس میں آ گئی ہے۔ اس نے ونڈ اسکرین اور کھلے دروازے سے باہر سڑک کا ایک جائزہ لیا۔

''پلیز مجھے یہاں نہ اتارو...... یہ بہت تنہا جگہ ہے۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''تنہا جگہ ہے تو تمہارا کوئی کیا بگاڑ لے گا، اترو۔'' باس نے درشت لہجے میں کہا اور شائلہ کو زور سے دھکا دیا تو وہ سڑک پر جا گری اور وہ ابھی سنبھلنے نہ پائی تھی کہ گاڑی ٹائروں کی آواز کے ساتھ ہوا کی طرح نکل گئی۔

''اف خدایا......'' وہ کراہتی ہوئی اٹھی۔ آسمان کی طرف دیکھا ستارے سو گئے تھے۔ افق سے کرنیں نمودار ہو رہی تھیں۔ قریب کی مسجد میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہو رہی تھی اور وہ اندازہ نہ کر سکی کہ وہ شہر کی کون سی جگہ پر کھڑی ہے۔ اس نے گریبان سے نوٹوں کی گڈی نکالی جنہیں پکڑ کر اس نے مٹھی میں دبایا، گھمایا اور گیند کی طرح گول کر دیا۔

''یہی نوٹ تو تھے جنہوں نے آج رات اس کی پوری زندگی کی عزت کو لوٹ لیا۔ اس کی عزت، عصمت، وقار اور آبرو کا سارا اثاثہ سمٹ کر مٹھی بھر نوٹوں میں آ گیا تھا۔'' شائلہ نے سوچا اور پھر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان نوٹوں کا کیا کرے۔

''ارے ہاں......'' اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ تو اس نے ہوسٹل کا کرایہ ادا کرنے کے لئے کیا ہے جہاں اس کا سامان باہر بکھرا پڑا ہے۔

''لیکن ہوسٹل ہے کہاں؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کے سوچا اور نوٹ مٹھی میں بھینچ کے ایک دم تیزی کے ساتھ جو سڑک عبور کرنے کی کوشش کی تو سامان سے لدا ہوا ایک تیز رفتار ٹرک اچانک اس کے سر پر آ گیا۔ ایمرجنسی بریکوں کی کرخت چیخوں نے صبح کے سناٹے میں دراڑیں ڈال دیں اور شمائلہ اچھلتی ہوئی دور فٹ پاتھ پر جا گری۔ نوٹ سڑک پر بکھر کے سوکھے پتوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگے اور شمائلہ بے سدھ اور بے ہوش ہو گئی۔ ٹرک والا موقع پا کر بھاگ گیا۔ فوراً کسی خدا ترس کی گاڑی رکی کچھ اکا دکا راہگیر بھی جمع ہوئے۔ کسی نے موبائل پر فون کیا۔ فوراً ایک ایمبولینس آ گئی اور شمائلہ کو ایک قریبی ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

''اڑتالیس گھنٹے اس کے لئے بہت اہم ہیں۔ اگر اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر ہوش میں آ گئی تو پھر زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔'' ہسپتال کا ڈاکٹر زرینہ سے کہہ رہا تھا۔

زرینہ شمائلہ کی روم میٹ تاجکی کی دوست تھی، یہ وہی زرینہ تھی جو ایک بینک میں افسر تھی اور جو شمائلہ کے شوہر پروفیسر زاہد علی کی اسٹوڈنٹ بھی رہ چکی تھی اور زرینہ کو جب زاہد صاحب کی بیماری اور ان پر گزرنے والے واقعات کا علم ہوا تھا تو وہ زاہد صاحب سے ملنے اور عیادت کرنے ہسپتال گئی تھی اور پھر زاہد کی زندگی کے آخری دور میں تسلسل کے ساتھ جاتی رہی تھی اور زرینہ ہی کے کہنے سے تاجکی بھی زاہد سے ملی تھی اور زاہد پر ایک بہت تفصیلی فیچر انٹرویو کی شکل میں شائع کیا تھا اور پھر یہی فیچر شمائلہ اور تاجکی کے درمیان ملاقات اور دوستی کا باعث بنا اور جب تاجکی اور شمائلہ ہوسٹل کے اندر اکٹھی رہتی تھیں تو زرینہ کا بھی ہوسٹل میں آنا جانا رہتا تھا اور پھر زرینہ اور تاجکی میں بھی دوستی ہو گئی تھی اور جب کبھی زرینہ آتے جاتے ہوسٹل میں جھانکتی اور تاجکی سے ملاقات نہ ہوتی تو وہ شمائلہ سے ہی تھوڑی بہت گپ شپ کر لیتی لہٰذا شمائلہ کو جب جائے حادثہ سے اٹھا کر لایا گیا تو اس وقت اس کی مٹھی میں بھینچے کرنسی نوٹ تو کہیں ہوا کے دوش پر اڑ گئے تھے یا پھر کسی نے لوٹ لئے ہوں گے تاہم شمائلہ کا پرس سڑک پر پڑا ہوا مل گیا تھا اور شاید اس لئے مل گیا تھا کہ اس کے اندر پیسے نہیں تھے۔ کچھ شمائلہ کی دوائیں تھیں میک اپ کا مختصر سا سامان کچھ پرائیویٹ اشیاء اور ایک کاغذ پر کچھ ٹیلیفون نمبر تھے جن میں ہوسٹل کے علاوہ

زرینہ کا نمبر بھی درج تھا۔ پولیس کارروائی کے لئے ہسپتال پہنچ گئی تھی۔ زخمی کر کے بھاگ جانے والے ٹرک کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ شمائلہ کے ہوسٹل میں ٹیلیفون کیا گیا تو بمشکل میڈم لائن پر آئی اور جب اسے صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو اس نے شمائلہ کی کسی قسم کی ذمے داری لینے سے انکار کر دیا اور صاف بتا دیا کہ اسے ہوسٹل سے نکال دیا گیا ہے تاہم جب زرینہ کو ٹیلیفون کیا گیا تو زرینہ نے بہت ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچی، بہت دکھ کے ساتھ، آئی سی یوٗ میں پڑی بے ہوش شمائلہ کو دیکھا اور تقریباً روپڑی اور اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر کے ڈاکٹروں اور نرسوں سے رابطہ کیا۔ تاجکی کے حوالے سے اخبار والوں سے بھی زرینہ کی دوستی تھی۔ انہیں بھی حادثے کی اطلاع دی۔ اخبارات کے لوگ بھی ہسپتال میں جمع ہو گئے۔ پھر زرینہ کے حوالے سے ہسپتال والوں کو شمائلہ کے پس منظر کا پتہ چلا کہ ایک پڑھی لکھی معزز خاتون اور ایک پڑھے لکھے مرحوم اسکالر کی بیوی ہے تو پھر ہسپتال کے لوگوں نے بھی شمائلہ کے کیس پر توجہ دی اور اس کے ہوش میں آنے کو ضروری قرار دیا۔

زرینہ اس کے پاس ہی رہی۔ پولیس کا عملہ بھی شمائلہ کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا کہ وہ ہوش میں آئے تو پولیس ضابطے کی کارروائی شروع کرے لیکن شمائلہ مکمل بے ہوش تھی۔ بظاہر اس کے جسم پر ہلکی سی خراشوں اور کپڑوں کے پھٹ جانے کے سوا اور کوئی ضرب نظر نہیں آئی تھی لیکن بے ہوشی کی وجہ ڈاکٹرز یہی بتا رہے تھے کہ سر میں کوئی اندرونی چوٹ آئی ہے اور جب تک شمائلہ ہوش میں نہیں آ جاتی، جان کو خطرہ لاحق رہے گا۔

''اڑتالیس گھنٹے کے اندر ان کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نے زرینہ سے کہا اور مزید ہدایت دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''انہیں پکارتی رہئے تاکہ آواز ان کے کان میں پڑے اور رسپانڈ کر سکیں۔'' اور پھر زرینہ نے بھی کمال ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ وہ آفس میں بھی نہیں گئی اور شمائلہ کے سرہانے کھڑے اسے وقفے وقفے سے پکارتی رہی۔ ''شمائلہ...... شمائلہ جی......''

دوپہر کے بعد زرینہ شمائلہ کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھی اور شمائلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اسے آہستہ سے پکارا۔ ''شمائلہ...... شمائلہ جی......''

''جی......'' شمائلہ کے ہونٹ غیر محسوس انداز میں ہلے اور جیسے پھول کی پنکھڑیوں کے اندر سے ہلکی سی آواز نکلی۔ اس نے زرینہ کو باقاعدہ جواب دیا تھا۔

''تھینک گاڈ شی ہیز کم بیک۔'' پاس کھڑے ڈاکٹر نے خوشی سے چہک کر کہا اور پھر

وہ زرینہ سے مزید کہنے لگا۔ ''آپ انہیں پکارتی رہیں اور سونے نہ دیں۔'' زرینہ نے وہی کیا اور شائلہ کو وقفے وقفے سے پکارتی رہی اور ہلکے سے نم آلود ٹشو کے ساتھ اس کے چہرے کو بھی نمی پہنچاتی رہی۔ سہ پہر کا وقت ہو گا جب شائلہ نے اس طرح دھیرے دھیرے پلکیں اٹھائیں اور آنکھیں کھولیں جیسے کوئی بہت گہری نیند کے بعد بمشکل بیدار ہوتا ہو۔ اس نے آنکھوں کو دو تین دفعہ کھولا بند کیا ایک دھندلی سی تصویر اسے اپنے سامنے نظر آئی۔ کسی عورت کا چہرہ تھا۔ تصویر واضح ہوتی گئی اور دھند چھٹ گئی تو زرینہ کا دھندلایا ہوا چہرہ شائلہ کو صاف نظر آیا۔

''اوہ زرینہ تم......'' شائلہ نے تھکی ہوئی سانس لے کر کہا۔ ''ہاں شائلہ میں......'' زرینہ خوشی سے چہک کر بولی۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے چھت کی طرف دیکھ کر زرینہ سے پوچھا۔

''آپ ہسپتال میں ہیں، شائلہ آپ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ آپ کو ایمبولینس یہاں لائی ہے۔'' زرینہ نے اس کے اوپر جھک کر کہا۔

''اوہ......؟'' شائلہ نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اسے جیسے سب کچھ یاد آ گیا تھا اس نے اپنے اوپر جھکی ہوئی زرینہ کے گلے میں ہاتھ ڈالے اور اسے اپنے ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ڈاکٹر بہت خوش ہوا۔

''شی از او کے......'' ڈاکٹر نے زرینہ کو ایک اچھی خبر دینے کے انداز میں کہا اور ڈیوٹی روم کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''شام تک ان کو وارڈ میں شفٹ کر دیں گے۔'' اور شام سے پہلے پہلے ہسپتال والوں نے شائلہ کو وارڈ میں شفٹ کر دیا تھا اور یہ حادثے کا دوسرا دن تھا جب شائلہ ہوش میں آئی تھی۔

❁

شائلہ جب وارڈ میں شفٹ ہوئی تو زرینہ کو بہت اطمینان ہو گیا تھا۔ اس نے ہمدردی اور ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے تقریباً پورا دن شائلہ کے پاس گزارا تھا۔ رات کے لئے اس نے ایک نرس کو اجرت پر رات کے لئے مامور کر دیا تھا کہ شائلہ کی دیکھ بھال کرے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن زرینہ بہت زیادہ مہربان ہو رہی تھی اور اس نے معاملے کی گھمبیرتا کو کچھ کچھ سمجھ تو لیا تھا لیکن شائلہ سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی کہ وہ شائلہ کو زیادہ سے زیادہ سکون اور آرام میں دیکھنا چاہتی تھی اور چاہتی تھی حادثے کی چھان بین پولیس خود ہی کرے۔

شام تک شمائلہ پولیس کو بیان دینے کے قابل ہوگئی تھی۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ وہ سڑک کراس کررہی تھی کہ ٹرک کی زد میں آ گئی۔ اگلے دن مزید چھان بین ہوئی پولیس نے اپنی ضابطے کی کارروائی کی لیکن شمائلہ کے گول مول بیان سے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی کہ وہ کہاں سے آ رہی تھی۔

رات گزر گئی۔ اگلے دن اس کے جسم کی خراشوں کا ڈاکٹروں نے معائنہ کیا جس میں کوئی سنجیدہ چوٹ نہیں تھی۔ سر کا بھی ایکسرے لیا گیا۔ وہ معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ البتہ چوٹ لگنے اور سڑک پر گرنے کی وجہ سے اس کے جسم کا ایک ایک انگ درد کررہا تھا۔

''اے خدا ایسے شدید ایکسیڈنٹ میں بھی کیوں بچالیا۔'' اس نے پہلی بار دل سے خدا سے مخاطب ہوکر شکوہ کیا۔ شام تک زرینہ بھی آفس سے فارغ ہوکر آ گئی تھی۔ اس نے بھی ڈاکٹروں سے بات کی تھی اور خود بھی شمائلہ کو دیکھ کر کہا۔ ''ماشاء اللہ جسم پہ کوئی داغ نہیں ہے۔'' اور شمائلہ زرینہ کی اس بات سے ہی آبدیدہ ہوگئی اور اسے بے اختیار ایک مصرع یاد تھا کہ

ہر داغ ہے اس جسم پہ بجز داغ ندامت

اور وہ سوچنے لگی تھی کہ اس کے جسم پر کوئی داغ نہیں ہے اور اگر کوئی ہے بھی تو دھل جائے گا لیکن ایک داغ جو اس کے جسم پر لگ گیا 'داغ ندامت' وہ بے شک ڈاکٹروں کو دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ داغ ایسی پکی سیاہی سے لگایا گیا ہے کہ جسے سات سمندر مل کر بھی نہیں دھو سکتے اور یہ داغ لے کر وہ قبر میں جائے گی اور اللہ میاں تو سب دیکھ رہا ہے، اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں لیکن اس دنیا میں پہنچ کر زاہد کے سامنے شمائلہ کو ضرور وضاحت کرنی پڑے گی اور معلوم نہیں وہ اسے معاف کرے گا یا نہیں اور معاف نہیں کرے گا تب بھی پچاس فیصد کا ذمے دار وہ خود ہوگا اور دونوں ذمے داری ففٹی ففٹی بانٹ لیں گے۔ البتہ اس دنیا کے اندر وہ اس گناہ کی ذمہ داری کس پر ڈالے۔

''باس پر......؟'' ''نہیں......'' شمائلہ نے خود ہی جواب دیا کہ وہ تو ایک عیاش شخص ہے اور اپنے گناہوں کا حساب وہ اپنی قبر میں خود ہی دے گا البتہ اس نے اپنی تباہی ور بربادی کا حساب اس شیطان شمس سے ضرور لینا ہے اور وہ بڑا کام یہی ہوسکتا ہے کہ شمائلہ اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچائے جو اس کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار ہے۔

''لیکن کہاں؟ وہ اسے کب اور کہاں ملے گا۔ نصف سے زیادہ زندگی تو گزر گئی ہے۔'' شمائلہ اس اُدھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ شام سے پہلے زرینہ بھی آ گئی۔ زرینہ کے

ساتھ اس کی خوب باتیں ہوئیں۔ اپنی تمام پرانی آپ بیتی شاہ جی کے ساتھ شادی سے لے کر ہوسٹل سے نکالے جانے تک سب سنا دی لیکن باس کے ساتھ گزاری جانے والی گناہ کی رات کا راز اس نے اپنے سینے میں ہی رکھا اور جسے سینے میں لے کر ہی اس دنیا سے جانا چاہتی تھی البتہ اس نے اپنی اس مشکل کا ذکر اس نے شدت کے ساتھ زرینہ سے کیا کہ ہوسٹل سے وہ مالی پریشانی کی وجہ سے نکالی جا چکی ہے اور اب اس کے پاس رہنے اور گزر بسر کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

''تم بالکل فکر نہ کرو۔'' زرینہ نے اسے تسلی دی۔ ''میں ایک دن میں ہی تمہارے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دوں گی اور تم ٹھیک ہو کے ہسپتال سے ڈسچارج ہو جاؤ تو جاب کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ میں کل ہی ایک این جی او سے بات کرلوں گی۔'' زرینہ نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا اور یہ اس کے لئے کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا کہ وہ شہر کی ایک بہت نامور اور اچھی این جی او کے اندر رضاکارانہ طور پر کام کرتی تھی لہٰذا شمائلہ کے کوائف کے پیش نظر کسی چیریٹی ہاؤس میں اس کی رہائش کا بندوبست کرنا مشکل نہیں تھا تاہم وہ چاہتی تھی کہ فی الحال شمائلہ کم از کم ایک ہفتہ اور ہسپتال میں رہ جائے اور یہ بھی کوئی مشکل نہیں تھا کہ پرائیویٹ ہسپتالوں اور ہوٹلوں میں زیادہ فرق نہیں ہے کہ دونوں جگہ رقم ادا کرنی پڑتی ہے اور زرینہ نے روپیہ پیسہ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی اور کچھ ایڈوانس بھی ہسپتال میں جمع کرا دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس دوران وہ شمائلہ کے لئے کسی نئے ہوسٹل کا اور عارضی طور پر کسی ملازمت کا بندوبست بھی کر لے تا کہ ہسپتال سے خارج ہونے کے بعد اسے پھر مشکلات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

آج شمائلہ کو ہسپتال کے اندر ساتواں دن تھا اس کے سر کے اور سینے کے کئی ایکسریز لئے گئے تھے اور دوسرے ٹیسٹس بھی ہوئے تھے۔ وہ مکمل طور پر صحت یاب تھی۔ ہسپتال والے اسے پہلے ہی فارغ کر دیتے لیکن زرینہ نے اسے چند روز مزید ہسپتال میں ہی رکوا دیا تھا یہی سوچ کر کہ ہوسٹل میں نہ سہی ہسپتال میں ہی چند روز رہ جائے گی کیونکہ زرینہ اس قسم کی خاتون تھی نہیں کہ وہ شمائلہ سے اجنبی بن کر الگ ہو جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ ہسپتال سے نکلنے کے بعد یہ زرینہ ہی کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کے قیام و طعام کا بندوبست کرے اس لئے اس نے شمائلہ کو ہسپتال میں ہی روک دیا تھا۔ اس دوران اس نے شمائلہ کی جاب کے حوالے سے بھی ایک اخبار میں پروف ریڈر کی اسامی کے لئے بات

کر لی تھی اور دارالامان کی طرز پر قائم ہونے والے ایک ادارے میں رہنے سہنے کی بات بھی کر لی تھی۔

اس دوران شمائلہ کی ہسپتال کے اندر زنانہ وارڈ میں مریض عورتوں کے ساتھ ٹھیک ٹھاک ایڈجسٹمنٹ ہو گئی تھی اور اندر سے دکھوں کے داغوں سے چھلنی ہونے کے باوجود باہر سے بظاہر بہت صحت منداور فریش لگنے لگی تھی۔

اس دن اس نے دیکھا کہ صبح ہی صبح ہسپتال کے اندر اچانک اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو گئی ہے، عملہ چوکس ہو گیا ہے، خاکروبوں نے کونے کھدروں سے معمول سے ہٹ کر صفائی کی۔ گرد و غبار مکمل طور پر جھاڑا گیا، جالے اتارے گئے، دیواروں میں لگے ہوئے بلڈ پریشر کے آلوں کو چیک کیا گیا کہ آیا وہ ٹھیک سے کام بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ وارڈ میں لگے ہوئے ٹی وی سیٹ کو ایک مکینک نے چلا کے اور ہلا جلا کے دیکھا اور تسلی کر لی کہ ٹی وی ٹھیک چل رہا ہے۔ ہسپتال کا ایڈمنسٹریٹر جو بہت کم وارڈ میں آتا تھا اس دن دو چکر لگا کے گیا اور مریضوں سے الگ الگ بات کی اور وارڈ کا معائنہ کیا۔

''سسٹر کیا معاملہ ہے آج؟'' شمائلہ نے ایک نرس سے پوچھا۔ ''یہ اتنی صفائی ستھرائی کیوں ہو رہی ہے۔''

''کوئی وی آئی پی ہسپتال کے دورے پر آ رہا ہے۔'' نرس نے جواب دیا۔

''لیکن اس قدر اہتمام......'' شمائلہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ اس ہسپتال کے لئے سب سے بڑا ڈونیشن اسی بڑے آدمی نے دیا ہے بلکہ یہ ہسپتال چل ہی رہا ہے ان کے خرچے سے......'' نرس نے اظہارِ عقیدت کے طور پر کہا۔

''کیا وزیر ہے کوئی؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''ایک منٹ......'' نرس شمائلہ کو جواب دینے کی بجائے وارڈ کے مین گیٹ کی طرف مڑی اور کہنے لگی۔ ''آ گئے ہیں شاید......''

پولیس کے کچھ سپاہی اور کچھ مسلح گن مین اندر آ گئے تھے۔ معاً چیک سوٹ اور سرخ ٹائی پہنے ہوئے ایک خوش پوش لیکن قدرے ادھیڑ عمر آدمی پولیس اور گارڈز کے علاوہ ہسپتال کے ڈاکٹرز اور نرسوں کے جلو میں گھرا ہوا اندر آیا اور اندر آتے ہی واڈر کی پہلی خاتون پیشنٹ کی طرف مڑ گیا اور اس سے کچھ بات چیت کی اور حالات جاننے لگا۔

''لیٹ جاؤ بیڈ پر......'' نرس نے شمائلہ سے آہستگی کے ساتھ کہا کیونکہ شمائلہ اس

وقت بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کھٹ سے لیٹ گئی اور معائنہ کار، وی آئی پی شخص ایک ایک مریض سے بات کرتا ہوا شمائلہ کے بیڈ کی طرف بڑھ رہا تھا پھر کیا ہوا کہ اچانک ایک مردانہ آواز شمائلہ کے کان میں گونجی۔ ''کیسی ہیں آپ، کیا حال ہے آپ کا؟''

''یااللہ یہ آواز کس کی ہے؟'' شمائلہ نے سوچا اسے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی۔ وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''تم......'' شمائلہ حواس باختہ ہوگئی۔ وہ ایسے وی آئی پی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''آپ......؟'' وی آئی پی کا منہ کھلا اور کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ وی آئی پی شمس تھا جس کے چہرے پر ایک لمحے میں کئی رنگ آئے اور گئے۔ وہ دم بخود شمائلہ کو دیکھتا رہ گیا۔ شمائلہ کا بلڈ پریشر غصے اور انتقام کی آگ سے بے قابو ہو گیا تھا قہر و غضب سے اس کے جسم پر ایک کپکپی طاری ہوگئی۔

''یااللہ......'' اس نے اندر ہی اندر اپنے رب کو پکارا۔ ''یااللہ کیا کروں؟'' وہ لمحہ جس کی تلاش میں تھی وہ لمحہ خود بخود اس کے سامنے آ گیا تھا تاہم وہ کچھ بولی نہیں، کچھ کر نہیں سکی، دم بخود دیکھتی رہ گئی۔ شمس بھی دیکھتا رہ گیا۔ دونوں دم بخود تھے۔

''یہ سمپل کیس ہے سر! ہٹ اینڈ رن کا۔ کوئی ٹرک والا مار کے انہیں بھاگ گیا ہے۔ بٹ شی از پرفیکٹلی آل رائٹ۔'' ساتھ چلنے والے ڈاکٹر نے شمس کو بتایا۔

''ہونہہ......'' شمس اپنی حواس باختگی کو چھپاتے ہوئے آگے اگلی مریضہ کی طرف بڑھ گیا۔ ساتھ ہی میڈیکل اور پیرا میڈیکل اسٹاف بھی آگے بڑھا۔ شمس کے گن مین بھی آگے کو سرکے اور ایک مسلح گارڈ شمائلہ کے بیڈ کے بالکل قریب آ گیا۔ اس کا منہ شمس کی طرف تھا لیکن ہولسٹر میں لگی ہوئی گن بالکل شمائلہ کے منہ کے پاس تھی۔ اچانک جیسے ایک طوفان شمائلہ کے اندر اٹھا اور اس کے پورے وجود کو اس طرح ہلا دیا جیسے سمندر کے اندر کسی ناؤ کو شارک مچھلی نے اپنے سر پہ اٹھا کے ناؤ کو ہلکورے دینے شروع کر دیئے ہوں۔

گارڈ کی گن دیکھ کر اس کا خیال جست لگا کے بارہ برس پیچھے چلا گیا جب شمس نے اس کے وجود کو عقب سے دونوں بازوؤں میں حائل کر کے اسے گن چلانا، سکھانے کی کوشش کی تھی تو اس نے کھیل ہی کھیل میں گن کا پوائنٹ شمس کی طرف کر کے لبلبی دبائی تو وہ چلی نہیں تھی۔

''ایسے تھوڑی چلے گی۔'' شمس نے اسے گن چلانے کا طریقہ بتاتے ہوئے کہا

ئا۔ ''یہ تو لاک ہے اسے چلانے سے پہلے اَن لاک کرنا پڑتا ہے یوں اس طرح۔'' شمس نے گن کو ان لاک کر کے بتایا تھا اور جب شمائلہ نے گن اس سے لے کر ٹریگر دبایا تو گولی ل گئی تھی۔ اس وقت شمائلہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی اس تصور سے کہ اگر گولی شمس کو ئ جاتی تو پھر پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔

اور اب ایک لمحے میں وہ سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا اور وہ و چنے لگی تھی کہ کاش اس دن وہ گولی اگر اسے لگ گئی ہوتی تو آج کہانی ہی دوسری ہوتی لین پھر اسے خیال آیا کہ بزرگ کہا کرتے تھے کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ وہ ت شمس کو گولی مارنے کا شاید نہیں تھا۔ آج صحیح وقت ہے۔

شمائلہ کے اندر ایک لمحے میں ایک بجلی سی کوندی اور اسی بجلی کی سرعت کے ساتھ اس نے اپنے وجود کو جھٹکا دیا اور پلک جھپکنے میں گارڈ کے ہولسٹر سے گن نکال لی۔

''شمس......'' شمائلہ نے للکارا۔ شمس جو پہلے ہی شمائلہ کو دیکھ کے حواس باختہ ہو گیا اور جلد از جلد وارڈ سے باہر نکل جانا چاہتا تھا، للکار سن کے دہل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ئلہ کے ہاتھ میں گن تھی اور اس نے 'کڑک' کی آواز کے ساتھ گن کو ان لاک کیا۔

گارڈ شمائلہ سے گن چھیننے کے لئے جھپٹنے لگا تو شمائلہ نے بہت پھرتی کے ساتھ ت کی طرف ایک ہوائی فائر کیا اور چھت میں لگی بجلی کی ٹیوب کی کرچیاں وارڈ میں بکھر ئیں۔

''خبردار جو کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو...... گولی مار دوں گی۔'' شمائلہ شست ھ کے چوکس ہو کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پلنگ کے اوپر اور پیچھے ہٹ گئی اور پیٹھ دیوار کا سہارا دے دیا۔ ہسپتال کا سارا عملہ پولیس اور گارڈز خوفزدہ ہو گئے۔ کسی کی سمجھ ں ہی نہیں آ رہا تھا کہ شمائلہ کو کیا ہو گیا ہے۔

''پلیز سات نمبر...... یہ کیا کر رہی ہو تم۔'' ڈاکٹر شمائلہ کے ساتھ ملتجیانہ انداز میں لب ہوا۔

''ڈاکٹر مجھے نمبر سے نہیں پکارو، میرا نام کیا ہے، یہ تم اپنے اس وی آئی پی سے و۔ یہ آستین کا سانپ تمہیں بتائے گا کہ میں شمائلہ ہوں۔''

''لیکن یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' ڈاکٹر نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

''وہی جو مجھے کرنا چاہئے اور یہی کرنے کے لئے میں آج کے دن کا زندگی بھر ار کرتی رہی ہوں۔'' وہ ترت بولی پھر کہنے لگی۔ ''یہ شخص جو تم لوگوں کو ہسپتال چلانے

کے لئے پیسے دیتا ہے۔ یہ ایک فراڈ ایک بہروپیا اور گناہوں کی ایک پوٹ ہے اور اس کا وجود اس پاک سرزمین پر غلاظت کا ایک بوجھ ہے اور آج میں زمین کا یہ بوجھ ہلکا کر رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دفعہ پھر شمس کو پکارا۔ "شمس ......" اور شمس تھر تھر کانپنے لگا۔

"نہیں شمائلہ نہیں ...... مجھے معاف کر دو پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے کے لئے آگے بڑھا۔

"خبردار آگے نہیں بڑھنا۔ سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔" شمائلہ نے دوسری گولی چھت کی طرف چلا کر مزید شیشے توڑتے ہوئے کہا اور شمس تھرتھراتا ہوا سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"مجھے افسوس ہے میں تمہیں موت سے زیادہ کوئی سزا نہیں دے سکتی لیکن موت کوئی سزا نہیں کہ مرنا تو سب کو ہوتا ہے۔ اصل سزا ذلت کی موت مرنا ہے اور آج میں تمہیں ان سب کے سامنے ذلت کی موت مار رہی ہوں جو تمہیں اس ہسپتال میں عزت دینا چاہتے تھے۔" شمائلہ نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور شمس کے سینے پر شست باندھی۔

"شمائلہ ...... پلیز شمائلہ ......" شمس گڑگڑایا لیکن شمائلہ پر ایک جنون اور خون سوار ہو چکا تھا۔

"تڑاخ سے فائر ہوا اور گولی سیدھی شمس کے سینے میں جا لگی۔ وہ دل پکڑ کے تڑپا۔

"تڑاخ ......" دوسرا فائر ہوا۔

"تڑاخ ......" تیسرا فائر ہوا۔

"تڑاخ ......" چوتھا فائر ہوا، پانچویں دفعہ جو شمائلہ نے ٹریگر دبایا تو گولیاں ختم ہو چکی تھیں لیکن چلنے والی چار کی چار گولیاں شمس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ شمائلہ پر ایک جنون طاری تھا وہ مسلسل ٹریگر دباتی چلی جا رہی تھی۔ شمس خون میں لت پت زمین پر ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ گولیوں کی آواز نے سارے وارڈ کے اندر ایک کھلبلی مچا دی تھی۔ مریض عورتیں ایک دوسرے پر گرتی پڑتی وارڈ سے باہر بھاگ رہی تھیں لیکن شمائلہ اپنے بیڈ پر اطمینان سے بیٹھی تھی۔

"انسپکٹر ......؟" اب کے شمائلہ نے پولیس افسر کو پکارا۔ انسپکٹر گھبرایا کہ شاید فائر کرنے لگی ہے اس نے اپنی گن کی شست باندھی۔

"گولی چلانے کی ضرورت نہیں ہے انسپکٹر ...... یہ لو۔" شمائلہ نے کسی گیند کی طرح اپنی گن انسپکٹر کی طرف پھینکی جو انسپکٹر نے کیچ کر لی۔

"اس کی لاش ہی نہیں، آج میرا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔" شمائلہ نے کہا اور اپنے

دنوں ہاتھ ہتھکڑیوں کے لئے بلند کر دیئے۔ پولیس کے لوگوں نے جلدی سے اپنی راست میں لے لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ تھانے کی سلاخوں کے پیچھے تھی۔

شمائلہ کے تھانے پہنچتے پہنچتے اخبارات کے ٹیلی پرنٹر کھڑک گئے۔ فیکس مشینیں سرائیں، ٹیلیفون کی گھنٹیاں بول اٹھیں۔ دن دہاڑے ایک بڑے آدمی کے وحشیانہ قتل کی بجلی کے کرنٹ کی طرح شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی۔ شام کے اخبارات میں شہ سرخیاں لگ گئیں۔ شمس کی تصویریں شمائلہ کی تصویریں پس منظر پیش منظر، چہ میگوئیاں، اپنے اپنے خیال، اندازے، قیافے لگے اور جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں۔

''یہ کیا کیا تم نے شمائلہ...... '' شام کو زرینہ تھانے پہنچی اور حوالات میں بند شمائلہ سے ملاقات کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے دن دہاڑے دس آدمیوں کے سامنے ایک قتل کر دیا۔'' وہ تشویش سے بولی۔

''اسی دن کا تو مجھے انتظار تھا زرینہ جی...... آج میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔'' وہ اطمینان کا سانس لے کر بولی۔

''پاگل نہ بنو...... بلکہ پاگل بن جاؤ۔'' زرینہ فوراً اپنے جملے کو گھماتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب......؟'' شمائلہ نے پوچھا۔'' وہ بہت پرسکون اور مطمئن تھی۔

''پولیس کے آگے کیا بیان دیا ہے تم نے......'' زرینہ نے رازداری سے پوچھا۔

''کیا بیان دینا تھا جو کچھ ہوا پولیس کے سامنے ہی ہوا ہے۔'' شمائلہ تن کر بولی اور کف افسوس ملتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں نے پولیس سے کہا کہ افسوس صرف چار گولیاں ہی ریوالور میں رہ گئی تھیں اگر سو ہوتیں تو میں سو کی سو اس کے سینے میں اتار دیتی۔''

''یہ اپنی بکواس بند کرو اور اب پولیس کے سامنے کچھ نہیں کہنا...... وکیل بات کرے گا۔'' زرینہ نے پھر رازداری سے کہا۔

''مطلب کیا ہے آپ کا زرینہ جی......'' شمائلہ تجسس سے بولی۔

''مطلب یہ ہے کہ تم پاگل ہو؟'' زرینہ اب کے سنجیدگی سے بولی۔ ''تم نے پاگل پن میں مارا ہے شمس کو۔''

''کیا تم یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟'' اب کے شمائلہ نے بھی سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

''ہاں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔'' زرینہ نے کہا۔ ''تھوڑا بہت قانون میں بھی جانتی ہوں اور میں یہ بات جانتی ہوں کہ قانون پاگل کو سزائے موت نہیں دیتا۔''

''نو، نو زرینہ جی......'' شمائلہ برہم ہوکر بولی۔ ''میں یہ بات کبھی نہیں بولوں گی۔ میں نے اسے بقائمی ہوش وحواس مارا ہے اور کتے کی موت مارنا میری زندگی کا مشن تھا۔''

''پاگل نہ بنو شمائلہ!'' زرینہ نے بہت دھیمے لہجے میں اسے ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا۔

''کیا بات کرتی ہو تم، ایک بات کہو، پاگل نہ بنو۔ کبھی کہتی ہو پاگل بن جاؤ۔'' شمائلہ بات کو مذاق میں اڑاتے ہوئے بولی۔

''اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔'' زرینہ ذہنی طور پر الجھ کر بولی اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ''دیکھو شمائلہ اس طرح کی باتوں سے تم اپنا کیس کمزور کر دو گی، میں تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔''

''اور میں بچنا نہیں چاہتی۔'' شمائلہ ترت بولی۔ ''مجھے تمہاری باتوں سے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم مجھے پاگل قرار دے کر موت کے پھندے سے بچانا چاہتی ہو......تم تھانے میں بھی الٹا سیدھا بیان لگوا دو گی۔ کسی ڈاکٹر سے بھی سرٹیفکیٹ لے لو گی کہ میں اس کے پاس ذہنی مریضہ کی حیثیت سے علاج کرواتی رہی ہوں لیکن اس طرح میرا کیس کمزور ہو جائے گا۔'' شمائلہ نے کہا۔

''کیسے کمزور ہو جائے گا؟'' زرینہ اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''اس طرح کمزور ہو جائے گا کہ پھر یہ تاثر پیدا ہو گا کہ اسے میں نے نہیں، میرے پاگل پن نے مارا ہے۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اسے میں نے ہوش وحواس میں مارا ہے۔ میں نے اسے انتقام کی آگ میں بارود سے جلایا ہے۔ میں کیسے کہوں کہ میں نے اسے نہیں مارا ہے۔''

''اچھا میری ایک درخواست قبول کرو۔''

زرینہ التجا کرتے ہوئے بولی۔

''کیا......؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''تم خاموش تو رہ سکتی ہو ناں ...... میں شام تک وکیل کا بندوبست کر دوں گی۔ تم وکیل کے آنے تک کوئی بیان نہیں دینا۔'' زرینہ نے درخواست کرنے کے لہجے میں کہا۔

''اگر ان لوگوں نے پوچھا تو کیا کہوں۔ میری زبان میں درد ہے اور میں نہیں بول

سکتی ہوں۔'' وہ غیر سنجیدہ ہو کر بولی۔
''اب تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا دماغ واقعی چل گیا ہے۔'' زرینہ زچ ہو کر بولی اور واپس چلی گئی۔

❁

شمائلہ نے جب شمس کا قتل کیا تھا تو واردات کے وقت گولیوں کی آواز سے پورے وارڈ اور پھر پورے ہسپتال میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کیا ڈاکٹرز، کیا نرسیں سب وارڈ سے بھاگے۔ مریض بھی دبک کے اِدھر اُدھر ہو کر کونوں کھدروں میں چھپ گئے۔ پولیس کے لوگ اپنی جان بچاتے ہوئے اِدھر اُدھر تو ہوئے لیکن جب شمائلہ نے پستول پھینک کر رضا کارانہ طور پر سرنڈر کیا تو پولیس اور شمس کے ذاتی محافظ اس وقت شمس کی خون میں لتھڑی لاش کے پاس جمع ہو گئے۔ شمائلہ بہت پرسکون طور پر پولیس کی حراست میں آ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں علاقے کے تھانے سے بھی پولیس آ گئی جو شمائلہ کو ہتھکڑی لگا کے تھانے لے گئی اور شمس کی لاش کافی دیر تک وارڈ میں اپنی جگہ پر پڑی رہی۔ پوری فضا پر ایک خوف و ہراس طاری تھا۔ قانون کے محافظ بھی لاش کے پاس جمع تو ہو گئے تھے لیکن کوئی چھو نہیں رہا تھا۔ پھر پولیس کی ایک خصوصی ٹیم آئی جنہوں نے موقع پر موجود اسٹاف کے بیانات قلمبند کئے اور ایک ایمبولینس پولیس کی نگرانی میں شمس کی خون آلود اور گولیوں سے چھلنی ڈیڈ باڈی کی پوسٹ مارٹم کے لئے سرکاری ہسپتال میں لے گئی اور باڈی جانے کے بعد ہسپتال کے اسٹاف کے مابین چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔
''بہت بڑا آدمی تھا؟'' ایک نرس نے دوسری نرس سے کہا۔
''کس اعتبار سے بڑا آدمی تھا۔'' دوسری نرس نے پوچھا۔
''تمہیں نہیں معلوم کیا؟'' پہلی نرس بولی۔
''مجھے تو بہت کچھ معلوم ہے اس کے بارے میں۔'' دوسری نرس بولی۔
''کیا معلوم ہے۔'' پہلی نے پوچھا۔
''انجان مت بنو روبینہ...... تم جاتی رہی ہو اس کے بنگلے پر۔'' پہلی نے رازدارانہ انداز میں کہا۔
''تم بھی تو گئی ہو۔'' دوسری کھٹ سے جواباً بولی۔
''وہ مجھے تو...... کام پڑ گیا تھا۔'' اس نے وضاحت کی۔
''مجھے بھی کام پڑ گیا تھا۔'' دوسری نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ''اس ہسپتال

کی کم و بیش تمام نرسوں کو اس سے کوئی نہ کوئی کام پڑا ہے اور سب کے کام اس نے کئے ہیں۔ ساحرہ، زبیدہ، فاخرہ، لیڈی ڈاکٹر حسنہ، لیڈی ڈاکٹر ثمینہ، نرس ساجدہ، رخسانہ کس کس کو اس سے کام نہیں پڑا اور سب کے کام اس نے کئے ہیں۔'' دوسری نرس نے کہا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہسپتال کی تمام نرسیں جمع ہو گئیں اور سب کے ہونٹ ہلنے لگے۔ ایسا لگا جیسے سب عورتیں ایک ہی کشتی پر سوار تھیں اور یوں لگا جیسے شمس ہسپتال کے اندر بے انتہا پیسہ اسی لئے خرچ کرتا تھا کہ وہ نرسوں اور لیڈی ڈاکٹروں میں مقبول ہو جائے اور سب کے مسائل حل کرے۔

''یار بہت برا آدمی تھا۔'' ایک نرس جو چپ چاپ کھڑی سب کی باتیں سن رہی تھی اچانک بولی۔ ''غریب عورتوں کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتا تھا اگر میں اس کی بدمعاشی کے قصے بیان کروں تو تم لوگوں کو یقین نہیں آئے گا۔ پرلے درجے کا بے ایمان فراڈ اور وحشی شخص تھا۔ شمائلہ نے جو مارا ہے اسے تو کچھ سوچ سمجھ کے مارا ہے۔''

''ثواب کا کام کیا؟'' ایک نے کہا۔

''میرا تو کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔'' دوسری بولی اور پھر شام تک سارے ہسپتال میں اسی دہشت گردی کے چرچے ہونے لگے اور شام تک یہ خبر شمس کے خبطی نفسیاتی ڈاکٹر تک بھی پہنچ چکی تھی اور وہ شمس کے قتل ہونے پر افسوس کی بجائے واردات کو انجوائے کر رہا تھا۔

''ہا ہا ہا ہا...... میاں مزہ آ گیا۔'' اس نے شام کے ایک اخبار میں خبر پڑھنے کے بعد خصوصی طور پر اپنے پی اے کو اندر بلایا اور لطف لینے کے انداز میں اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ ''سچ بتاؤ میرے پروفیشن کی ہسٹری میں ایسا کیس دیکھا ہے کبھی......''

''نہیں سر! بہت ٹپی کل کیس تھا۔'' پی اے نے جواب دیا۔

''ٹپی کل، پاگل، سائیکو، کریک، ابنارمل، سیڈسٹ اور محروم...... ہا ہا ہا ہا اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ وہ عورت بھی کمال کی تھی۔ کیا نام تھا...... وہ نام لیا کرتا تھا اس کا......''

''شمائلہ......'' پی اے نے لقمہ دیا۔

''ہاں شمائلہ...... ہا ہا ہا ہا بھئی اس سے ملنے کی ہمیں بھی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔ کتنے مریض ہیں باہر......'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''فی الحال دو ہی ہیں سر!'' پی اے نے جواب دیا۔

''ایک کو تو اندر بھیجو۔'' ڈاکٹر بولے اور پی اے باہر گیا تو ہنستے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ ''شمائلہ...... ہا ہا ہا ہا شمائلہ......''

❁

''دیکھو شمائلہ اگر کوئی انسان دلدل میں ڈوب رہا ہو اور دوسرا اسے بچانا چاہے تو وہ اس وقت تک اسے کبھی دلدل سے باہر نہیں نکال سکتا جب تک کہ ڈوبنے والا تعاون نہ کرے۔'' اس شام زرینہ نے حوالات کے اندر شمائلہ سے ملاقات کے وقت بہت سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پولیس کا ریمانڈ ختم ہو چکا تھا اور اگلے دن شمائلہ کی عدالت میں پیشی تھی اور زرینہ سرتوڑ کوشش کر رہی تھی کہ اس طرح کا مؤقف اختیار کیا جائے کہ شمائلہ کسی طرح عمداً قتل کے الزام سے بچ جائے اور اس مؤقف کی بنیاد وہ تھانے میں اختیار کئے گئے مؤقف پر قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں اس کی تھانہ انچارج سے بھی بات ہوئی تھی اور پولیس کو زرینہ نے کافی حد تک اپنی طرف جھکا دیا تھا لیکن شمائلہ بالکل تعاون نہیں کر رہی تھی۔ وہ زرینہ کے بے حد اصرار کے باوجود کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

''دیکھو شمائلہ! اگر کوئی دلدل میں ڈوب رہا ہو تو دوسرا اس وقت اسے نہیں بچا سکتا جب تک کہ ڈوبنے والا بچانے والے کے ساتھ تعاون نہ کرے۔'' اس شام بہت سی باتیں کرنے کے بعد زرینہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور بہت پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا لیکن شمائلہ نے مؤقف نہیں بدلا۔

''ڈوبنے والا بچنا چاہے تو جب ناں، میں تو زندہ ہی اس کو مارنے کے لئے تھی۔ خس کم جہاں پاک ...... میرا مشن ختم۔'' شمائلہ نے خوشی اور اطمینان کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا اور زرینہ مایوس ہو کر واپس چلی گئی۔

اگلے دن شمائلہ کو عدالت میں پیش کیا گیا اور استغاثہ نے حالات اور واقعات کے مطابق واردات کی تفصیل بتاتے ہوئے فردِ جرم عائد کر دی۔

''تم نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔'' فردِ جرم عائد ہونے کے بعد جج نے شمائلہ سے پوچھا۔

''نہیں جناب والا......'' شمائلہ عدالت کے کٹہرے میں آئی اور سینہ تان کر بہت خوشی اور اطمینان کے ساتھ بولتے ہوئے کہنے لگی۔ ''نہیں جناب والا! مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ایک شیطان کو مارا ہے اور شیطان کو مارنا جرم نہیں نیکی ہے۔ میں نے یہ قتل بقائمی ہوش و حواس اور عمداً کیا ہے۔ میرے ریوالور میں صرف چار گولیاں تھیں جو میں نے اسے ماری ہیں اگر چار سو

گولیاں ہوتیں تو میں سب کی سب اس کے جسم میں اتار دیتی۔ مجھے اس قتل پر کوئی افسوس اور کوئی ندامت نہیں اگر یہ شیطان سو بار زندہ ہو جائے تو میں سو بار اسے مارنے میں فخر محسوس کروں گی۔ دیٹ از آل مائی لارڈ۔'' وہ ایک ہی سانس میں بول کر چپ ہو گئی۔

''جج نے اگلی سماعت تک شمائلہ کو جیل منتقل کرنے کے احکامات دیئے اور سماعت کے بعد شمائلہ کو جیل کی وین میں بٹھا کر عورتوں کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام وقار عظیم

شمائلہ کے جیل جانے سے پہلے علی کو جیل ہو گئی تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر تھے، علی کے کیس میں تو کوئی جان نہیں تھی لیکن گلفام کی پولیس مقابلے میں موت کے بعد علی کی مدد کرنے والے لاتعلق ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ گلفام ایک باعزت رہائشی سوسائٹی میں بہت باعزت زندگی گزار رہا تھا لیکن جب پولیس مقابلے میں مارا گیا تو پھر سنسنی خیز کہانیاں اخبارات میں چھپنے لگیں۔ گلفام کا جو حلقہ تھا، وہ گلفام کے پس منظر سے واقف تھا اور ویسے بھی وہ انڈر ورلڈ کے لوگ تھے جن کا طبقۂ اشرافیہ سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن گلفام کے دوست احباب کے لئے گلفام کی زندگی سے متعلق چونکا دینے والے انکشافات حیرت انگیز تھے کیونکہ گلفام باعزت لوگوں کی سوسائٹی میں بہت مقبول تھا اور اس کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ اس کی رسائی بہت اوپر تک ہے اور یہ تاثر غلط بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر میں جب بھی کوئی ڈنر پارٹی ہوتی تو گلفام کے گھر کی گلی بڑی بڑی خوبصورت کاروں سے پٹ جاتی اور پارکنگ کی جگہ ملنا مشکل ہو جاتی اور ان پارٹیوں میں شریک ہونے والے بگ شاٹس بھی ہوتے جو اپنے اپنے شعبوں میں اقتدار اور طاقت کے الک ہوتے اور ان پارٹیوں میں بہت پرکشش اور دلآویز خواتین بھی شامل ہوتیں جن کے ارے میں وثوق سے یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ آنے والے مردوں کی بیویاں ہیں یا دوست۔

ان میں اکثر شو بزنس کی بڑی بڑی نامور اداکارائیں بھی دکھائی دیتیں جو اسکرین ر کم اور ایسی محفلوں میں زیادہ نظر آتیں اور بنگلے کے چاروں طرف بالکونیوں، گیلریوں، آمدوں اور راہداریوں کی مدھم اور ملگجی روشنی میں جوڑوں کی شکل میں کئی سائے ایک وسرے سے قریب دکھائی دیتے اور آس پاس کے مکینوں کو کبھی ان جڑتے سمٹتے اور کھرتے سایوں پر اعتراض نہ ہوتا بلکہ وہ مطمئن ہوتے کہ ''طاقت کا سرچشمہ'' ان کے ھروں کے قریب بہتا ہے اور دن کے اجالے میں جب بھی گلفام کے پڑوسیوں، ستوں یا جاننے والوں میں سے کسی کی گوٹ پھنستی یا سرکاری مشنری کے سرخ فیتے کے ل میں کوئی الجھتا، کسی کی بجلی کا بل ہوش اڑا دینے والا آتا، کسی کا ٹیکس اس کی استطاعت

سے باہر ہو جاتا یا پولیس کا کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو انہیں مسئلے کے حل کی کنجی گلفام ہی کے پاس دکھائی دیتی اور وہ اپنی اپنی درخواستیں لے کر گلفام کے پاس اس طرح آتے جیسے اس نے لوگوں کے مسائل کے حل کا ٹھیکہ لے رکھا ہو اور بات بھی درست تھی، وہ ان مسئلوں کے حل کے لئے مشکل کشا ثابت ہوتا اور حتی الامکان سب کے مسائل حل کرواتا یا حل کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ پولیس کو وہ ایک طرح سے اپنے ماتحت سمجھتا جیسے وہ علاقے کا انچارج ہو اور اپنی اس طاقت اور اختیار کی بحالی کے لئے اس نے اپنی تجوری کا منہ کھلا رکھا تھا لہٰذا جب جابر علی نام کا ایک بڑا اور ہیبت ناک پولیس افسر آیا تو گلفام نے اسے محض اس لئے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کہ جابر علی کے اعلیٰ افسران اس کے دوست تھے لیکن جابر علی ایک سرپھرا افسر تھا جو اپنے مشن کے تحت کام کرتے ہوئے اپنے مقاصد میں آگے بڑھ رہا تھا، اس نے تمام افسران بالا کے احکامات اور ہدایات کو بائی پاس کرتے ہوئے جرائم کے سمندر میں بڑے بڑے مگرمچھوں پر ہاتھ ڈالا اور گلفام کو اس کی طاقت کا اندازہ اس وقت ہوا جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا، وہ جب 'ان کاؤنٹر' میں مارا گیا تو اس کے حلقوں میں سنسنی پھیل گئی، اس کے متعلق جب کہانیاں اخبارات میں آئیں تو گلفام کے جاننے والوں کو یہ کہانیاں پریوں اور جنوں کی لگتی تھیں اور یہ بات حرف آخر کے طور پر پکی روشنائی سے جیسے کندہ ہو گئی کہ گلفام انڈر ورلڈ کا آدمی تھا جس کا پیشہ اغوا برائے تاوان اور ڈکیتیاں ڈالنا تھا اور اسی حوالے سے گلفام یا زاہد کے بیٹے علی کا نام بھی اخبارات کی زینت بنا اور علی کی صحیح عمر کا چونکہ کسی کو اندازہ نہیں تھا اس لئے ایک دو پولیس ریمانڈ کے بعد عدالت نے اسے بچوں کی یعنی اٹھارہ سال سے کم عمر کی جیل میں بھجوا دیا۔ گلفام بے شمار پیسہ پیچھے چھوڑ کر مرا تھا، علی کے نام پر ذاتی اکاؤنٹ تھا، بچت سرٹیفکیٹس تھے، علی کے پاس روپیہ پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن گرفتاری کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گیا تھا، گلفام کے نام کے ساتھ ساتھ علی کا نام بھی ذیلی سطروں کے درمیان اخبارات میں آنے لگا، زاہد کا حوالہ بھی آیا، ایک آدھ اخبار میں شمائلہ کے کردار پر بھی بات ہوئی، جہاں گلفام کے پس منظر نے گلفام کے حلقے میں لوگوں کو چونکا دیا، وہاں گلفام کی حیثیت بھی بہت مشکوک اور پراسرار ہو گئی، لوگوں نے گلفام کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے لاتعلقی ظاہر کی کہ کہیں ان کو بھی انڈر ورلڈ کے ساتھ ملوث نہ کر دیا جائے اور اسی خوف کی وجہ سے گلفام کے حلقوں کی علی کے ساتھ بھی دوری پیدا ہو گئی اور علی ان گناہوں کی سزا بھگتنے لگا جو اس نے نہیں کئے تھے۔

بچوں کی جیل میں سب کم عمر قیدی تھے، کچھ علی کے عمر کے لڑکے اور کچھ علی سے چھوٹے تھے، علی پر کئی وارداتیں گزری تھیں جو اس کی یادداشت کی اسکرین پر کہیں بہت واضح اور کہیں دھندلی تھیں لیکن وہ اتنا پریشان اور ایسا ڈپریشن کا شکار کبھی نہیں ہوا تھا، وہ کافی چھوٹا تھا جب اس کی ماں ایک اسکینڈل میں مبتلا ہوگئی تھی اور اس کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی اور ماں دونوں بہن، بھائیوں کو چھوڑ کر ایک اور آدمی کے ساتھ چلی گئی تھی، یہ واقعہ اس کے بچپن کی یادوں میں محفوظ تھا۔ اسے اس وقت بے انتہا تکلیف پہنچی تھی لیکن اس کا باپ اسے تسلی دینے کے لئے موجود تھا اور پھر وہ اپنی بہن عینی کے گلے لگ کر جب روتا تھا تو اس کے دل کا بہت سارا غبار چھٹ جاتا تھا اور پھر وہ جب محلے یا اسکول کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگ جاتا تو وہ سب کچھ بھول جاتا تھا پھر اسے نایا کے گھر جا کے رہنا پڑا تھا اور تائی کا سوتیلا اور بے رحمانہ سلوک بھی اسے یاد تھا لیکن یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اس نے حالات کا تقاضا سمجھ کے اس صورت حال کو قبول کر لیا تھا اور اس وقت بھی دکھ بانٹنے والی اس کی بہن عینی اس کے ساتھ موجود تھی پھر اس دن جب وہ اغوا ہوا تھا، اس کے دماغ میں، دل میں اور جسم و جاں میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا تھا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت اس دھماکے کے ملبے کے نیچے دب گئی تھی، اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا اور کس نے کیا ہے لیکن پھر اغوا کرانے والے گلفام ہی نے اس دھماکے سے پیدا شدہ ملبے کو اپنے پیار، محبت اور شفقت کے ہاتھوں سے صاف کر کے علی کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ سب دکھ بھول گیا تھا، اسی دکھ کی کیفیت کے دوران اسے باپ کی موت کی خبر بھی گلفام نے سنائی تھی اور باپ کی موت سے لگنے والے زخم پر گلفام ہی کی شفقت نے مرہم کا کام دیا تھا پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ماضی کی یادوں کی تلخیاں بھی پیچھے رہ جانے والے دھندلکوں میں اوجھل ہوگئی تھیں اور اس نے مستقبل کی روشن اور خوشنما راہوں پر زندگی کا نیا سفر شروع کر دیا تھا۔ پری میڈیکل میں داخلہ لینے کے بعد وہ خود کو ایک کامیاب سرجن کے روپ میں دیکھ رہا تھا، وہ دل کا ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور دل کا سرجن بننا چاہتا تھا اور یہ خلش اور یہ خواہش بھی اس کے دل میں ایک تجسس پیدا کر رہی تھی، جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا، اس کا جسم نئی نئی کروٹیں بھی لے رہا تھا اور ان کروٹوں کے ساتھ اس کا دل بھی دھڑکتا تھا اور وہ دل کی اس دھڑکن کے سمجھنا چاہتا تھا اور ایک تجسس اس کے اندر پیدا ہو رہا تھا کہ آخر ''یہ دل ہے کیا؟'' اور بری طرح فرح پر کیوں آ گیا ہے اور وہ سوچتا تھا کہ یہ دل آ جانا کیا چیز ہوتی ہے اور

اس کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا کہ جو شے فرح پر آ گئی، جو شے فرح پر چھا گئی ہے یا جو شے فرح کو پسند کرنے لگی ہے، وہ دل ہے یا دماغ......؟ دل اور دماغ کے درمیان جو نظر نہ آنے والا ایک پل ہے، وہ اس پل سے گزر کر فرح کو پا لینے کی جستجو رکھتا تھا اور اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ فرح کے اندر بھی اسی طرح کی کوئی ہلچل ہے کہ نہیں۔

فرح اس کے پڑوسی کی بیٹی تھی، دونوں کے گھر آپس میں شیر و شکر تھے۔ علی، فرح کے ساتھ کھیلنے کے لئے برابر والوں کے بنگلے میں چلا جاتا اور کبھی فرح، علی کے بنگلے میں آ جاتی، دونوں کے گھر بڑے بڑے تھے، گارڈن میں پھل دار اور پھول دار درخت تھے، جھولے اور دوسری کھیل کی چیزیں بھی دونوں گھروں کے اندر موجود تھیں اور سب سے جو دلچسپی کی چیز تھی وہ سوئمنگ پولز تھے۔ کبھی علی، فرح کے سوئمنگ پول میں فرح کے ساتھ سوئمنگ کرتا اور کبھی فرح، علی کے سوئمنگ پول میں آ جاتی۔ دونوں مل کر کھیلتے، مل کر لڑتے جھگڑتے، روٹھتے، من جاتے، اکٹھے تیرتے، اکثر ایک دوسرے کے گھر میں کچھ کھا پی بھی لیتے، علی کی ماں، رانی ماں اور فرح کی ماں کے درمیان بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ اس طرح فرح کے باپ مرزا صاحب اور گلفام میں ٹھیک ٹھاک جگاڑ تھا، روز ملنا جلنا، گپ شپ کرنا، حالاتِ حاضرہ پر تبصرے، شطرنج کی بازی لگانا، عورتوں کی باتیں، سیاست پر تبصرے اور پھر دونوں میں ایک خاص قدر مشترک تھی، اکٹھے پینا پلانا۔

اور یوں بڑوں کے درمیان جو دوستی تھی، اس نے علی اور فرح کو اور بھی قریب کر دیا تھا، دونوں بدلتے ہوئے موسموں کے ساتھ بڑے ہوتے گئے اور پھر علی نے دیکھا کہ اس کے بنگلے کے گارڈن میں لگے ہوئے نئے پیڑوں میں سال بہ سال رفتہ رفتہ تبدیلی آ رہی ہے کہ پیڑ بڑے ہونے لگے، ان کی چھال مضبوط ہوتی ہوئی نظر آئی پھر چھال میں ایک چمک اور دلکشی پیدا ہونے لگی، پیڑ ابھرے ابھرے سے نظر آنے لگے، نوخیز پیڑوں کے پتے سائز میں بڑے ہوئے پھول جو پہلے نہیں لگتے تھے، اب کھلنے اور مہکنے لگے۔ پھر بور آیا، خوشے نکلے اور ٹہنیاں پھلوں سے لد گئیں۔ بالکل اسی طرح وہ خود بھی بڑا ہو رہا تھا اور اسی طرح اس نے فرح کو بھی بڑا ہوتے، پھلتے پھولتے اور ابھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ فرح کے چہرے میں بھی ایک تمازت پیدا ہو گئی، فرح کو دیکھ کے اب ایک ہلچل سی پیدا ہوتی جو پہلے نہیں تھی۔ فرح کے اندر بھی جذبات کی ایک نئی لہر تھی جو پہلے نہیں تھی۔

وہ بچپن سے اکٹھے کھیلتے کودتے آئے تھے اور ایک ساتھ پول میں تیرتے بھی تھے لیکن پھر یہ کیا ہوا کہ اچانک رانی ماں اور فرح کی امی نے بھی دونوں کو منع کر دیا کہ وہ اب

اکٹھے سوئمنگ نہ کیا کریں اور انہوں نے اکٹھے سوئمنگ چھوڑ دی تھی۔

''چھوڑ دو میرا ہاتھ پلیز......!'' ایک دن جب علی نے اچانک فرح کی کس کے کلائی پکڑی تو وہ کسمسا کر بولی۔

''کیوں......؟'' علی نے پوچھا تھا۔

''نہیں ناں! اچھا نہیں لگتا ہے۔'' فرح نے جھجکتے ہوئے کہا لیکن کلائی چھڑائی نہیں ور علی کلائی چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا تاہم اس نے کلائی چھوڑ دی۔

''تمہارا دل دھڑکتا ہے؟'' ایک دن باغ میں بیٹھے بیٹھے علی نے فرح سے پوچھا اور ہ دھک دھک کرتے ہوئے دل کے ساتھ بولی۔ ''ہاں۔''

اور پھر علی سے پوچھنے لگی۔ ''تمہارا دل دھڑکتا ہے؟''

''ہاں......'' علی نے اثبات میں جواب دیا۔ اور پھر فرح کا ہاتھ تھام کے اپنے سینے ر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو۔''

فرح نے ہاتھ علی کے سینے پر رکھا تو چونک کر بولی۔ ''اُف اللہ! علی یہ تو بہت زور سے دھڑک رہا ہے۔''

''آؤ تمہارا دل دیکھوں۔'' علی نے اپنا ہاتھ فرح کی طرف بڑھایا تو فرح نے علی کا تھ آہستہ سے روک دیا۔ ''نہیں پلیز......!''

''آخر یہ کیا ہے؟'' علی نے سوچا تھا کہ آخر ہم اکٹھے کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں ض اوقات کھیلتے کھیلتے گتھم گتھا ہو جاتے تھے لیکن کبھی کوئی ہلچل نہیں پیدا ہوئی تھی اور اب ک دوسرے کو چھونے سے بھی جوار بھاٹا آجاتا تھا تو یہ سب کیا ہے اور پھر اس نے سوچا ا کہ بور آئے درختوں کی طرح جسم بھی جوان ہوتے ہیں اور دل بھی اور طرح سے ڑکنے لگتے ہیں اور پھر اس نے محسوس کیا تھا کہ صرف وہی فرح کی طرف راغب نہیں ہے، فرح بھی اس کے لئے بے چین اور بے قرار رہتی ہے، ساتھ ساتھ کوٹھیاں ہونے کے جود گھنٹوں ٹیلیفون پر بات کرتی ہے، اس نے پری میڈیکل میں ایڈمیشن لیا تو ایک سال بعد وہ بھی پری میڈیکل میں آگئی اور جب علی میڈیکل فرسٹ ایئر میں پہنچا تو فرح کا ی میڈیکل سیکنڈ ایئر تھا اور وہ علی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور اس نے بھی ڈاکٹر بننے کی ن لی تھی اور ایک دن دونوں جب کوٹھی کے ٹیرس پر بیٹھے بہت پُرفضا ماحول میں شام کے ت باتیں کر رہے تھے تو فرح ہی کے منہ سے بے اختیار ایک بات نکل گئی تھی۔ کہنے ا۔ ''پتہ ہے جب تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ گے اور میں بھی ڈاکٹر بن جاؤں گی ناں تو ہم

دونوں مل کر ایک ہسپتال کھولیں گے۔''

''کیا ہم دونوں شادی کر لیں گے؟'' علی نے بے ساختہ پوچھا تھا اور فرح جھینپ گئی تھی اور قوس وقزح کی طرح ایک ساتھ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے جو ایک ساتھ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

''چل میں نہیں بولتی ......'' فرح جھوٹ موٹ روٹھ کر دوسری طرف مڑ گئی تھی اور علی نے اس کی ٹھوڑی کو بہت نزاکت سے اپنی انگلیوں کے پوروں کے اشارے سے اپنی طرف موڑا جیسے پھول کی پنکھڑیوں کو چھوتے ہیں۔

''اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے چندا......!'' علی نے دل کی گہرائیوں سے جذبات میں ڈوبے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور پہلی دفعہ اسے ''چندا'' کہہ کر پکارا اور فرح کو پہلی مرتبہ علی کا یہ انداز بہت اچھا لگا اور دونوں ایک دوسرے کو بھرپور نظروں سے دیکھنے لگے۔

''تم نے کیا کہا...... چندا؟'' فرح نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''ہاں چندا......! تم چندا ہی تو ہو بلکہ چاند سے زیادہ خوبصورت ہو۔'' اس نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تم اس طرح مجھے نہ دیکھو علی!'' وہ بہت معصومیت سے بولی جیسے سراسیمہ ہو گئی ہو۔

''کیوں......؟'' علی نے پوچھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ سہمی ہوئی سی بولی۔

''مجھ سے......!'' علی نے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ بولی۔

''میری آنکھوں سے......'' علی نے استفسار کیا۔

''ہاں...... نہیں......'' فرح بولی۔

''تو......؟'' علی نے تجسس سے دریافت کیا۔

''پتہ نہیں......!'' وہ ہڑبڑا گئی۔

''ایک بات کہوں فرحی......!'' علی نے بہت آہستہ سے فرح کی مخروطی انگلیوں کو چھوا۔

''ہونہہ......!'' وہ نشیلی سی رس بھری آواز میں دھیرے سے بولی۔

"آؤ شادی کرلیں۔" علی اچانک بولا۔
"علی......!" فرح چونکی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو علی!"
"ابھی نہیں......" علی بہت نارمل طریقے سے بولا۔ "جب تم ڈاکٹر بن جاؤ گی،
ب میں ڈاکٹر بن جاؤں گا اور جب ہم دونوں مل کر ہسپتال کھول لیں گے۔"
"ہاں، علی! ہاں......" وہ سر ہلا کے بہت گہری سوچ کے ساتھ جذباتی انداز میں
لی جیسے ایک بہت خوبصورت خواب کی تعبیر دیکھ رہی ہو اور پھر سنجیدہ ہو کے پوچھنے لگی۔
تم دل کے ڈاکٹر بنو گے ناں علی!"
"ہاں......!" علی نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اور میں دماغ کی ڈاکٹر بنوں گی۔" وہ بے ساختہ بولی۔
"کیوں......؟" علی نے تجسس سے پوچھا۔
"تمہی تو کہتے ہو ناں دل اور دماغ میں بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے، اس لئے۔" وہ
سنجیدگی کے ساتھ بولی اور پھر دونوں اپنے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے پڑھائی میں لگ گئے
کہ دیکھتے دیکھتے ایک قیامت جیسے علی پر برپا ہو گئی، اس کا باپ گلفام پولیس مقابلے میں مارا
گیا اور دیکھتے دیکھتے شہر کا ایک معزز امیر آدمی مافیا اور انڈر ورلڈ کا بندہ بن گیا۔ دیکھتے
یکھتے ساری عزت و آبرو خاک میں مل گئی اور دیکھتے دیکھتے علی کے اندر کا ڈاکٹر مر گیا اور
یک مشکوک اور مشتبہ قاتل سامنے آ گیا اور اب وہ کالج کی عالیشان اور پُر وقار یونیفارم
ں نہیں، جیل کی چارخانوں والی وردی پہنے بچوں کی جیل کے اندر تھا۔
"اب یہ ہے تمہاری جگہ تم یہاں رہو گے۔" ایک پولیس والا جیل کے رجسٹر میں
ں کی انٹری کروانے کے بعد اندر لے کر آیا اور ایک کوٹھری میں بند کرتے ہوئے کہا،
اں پہلے سے ہی اس کی عمر یا کچھ تھوڑا سا چھوٹا لڑکا محمد جان جیل کے کپڑوں میں گوری
ت، لیکن مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ موجود تھا۔

❁

"تم نے کیا کیا تھا......؟" علی نے محمد جان سے پوچھا۔
"قتل......!" محمد جان نے بے ساختہ جواب دیا۔ محمد جان کی فیملی شہر میں کسی
ماندہ بستی میں رہتی تھی اور محمد جان چھ جماعتیں پڑھنے کے بعد اپنی بستی ہی کے ایک
ئے خانے میں ٹیبل والے یا باہر والے کا کام کرتا تھا، اس کا باپ رکشا ڈرائیور تھا، علی
شتہ دو دن سے محمد جان کی کوٹھری میں تھا۔ پہلی رات کو تو دونوں میں کوئی خاص بات

چیت نہیں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات کئے بغیر منہ موڑ کے سو گئے لیـ
جب صبح انہیں ناشتہ ملا تو اس وقت دونوں میں تھوڑی سی شناسائی ہوئی، ناشتہ بانٹنے
قیدی پرانی سڑی ہوئی ٹرے میں دو دو پاپے اور ایک مگ چائے کا دونوں کو دے گیا تھا
جان چائے کے کپ کو غور سے دیکھنے لگا اور پھر ہنس کر بولا۔

''میں چائے کے ہوٹل میں کام کرتا تھا، باہر والا تھا۔''

''اچھا......!''علی نے دلچسپی ظاہر کی۔

''بہت کڑک چائے ہوتی تھی ہمارے ہوٹل کی۔'' محمد جان نے کہا۔

''یہ تو چائے لگتی ہی نہیں ہے۔''علی نے اپنے کپ کے اندر چائے کی رنگت دیکھ
کہا۔

''اس کو کون چائے بولتا ہے، یہ تو گٹر کا پانی ہے۔'' محمد جان نے کہا۔

''کیا کریں، اب تو یہی پینی پڑے گی۔'' علی آبدیدہ ہو گیا۔ اسے اپنے گھر کا صبح
ناشتہ یاد آ گیا کہ اپنی ماں شمائلہ کی ممتا تو اسے ٹھیک سے یاد نہیں رہی تھی، اگر یاد بھی تھی
گلفام اور رانی ماں کے گھر کی محبت اور لاڈ پیار کے سائے اتنے ٹھنڈے اور گہرے تھے
اس کے اپنے گھر کی محبتوں کی یادیں دب گئی تھیں اور گلفام اور رانی ماں کا پیار یاد رہ
تھا۔ ایک بیرا خانساماں اس کے سامنے مؤدب کھڑا رہتا تھا اس کے باوجود رانی ماں جب
تک زندہ رہی، اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کے کھلاتی تھی۔ اس کے ناشتے میں صبح تا
پھلوں کا رس، پورج فوڈ، کورن فلیکس، دو ہاف فرائی یا بوائل انڈے، دودھ کا ایک گلاس
چائے یا کافی اور سرخ کئے ہوئے بٹر توسٹ ہوتے تھے لیکن وہ اتنی ساری چیزوں میں
ایک بٹا چار ناشتہ بھی نہیں کرتا تھا اور بس ناشتے کو چھو کر ٹیبل سے اٹھ جاتا تھا اور اب جو
نے دو باسی پاپے اور بقول محمد جان گٹر کے پانی کے رنگ کی چائے دیکھی تو اس کی آنکھیں
ڈبڈبا گئیں لیکن وہ جوان لڑکا تھا اور گزشتہ دن سے بھوکا تھا، وہ جلدی سے دونوں پا
چائے میں ڈبو ڈبو کے کھا گیا، محمد جان تو جیل میں پہلے ہی سے تھا اور جیل کے کھانوں
عادی ہو چکا تھا اس نے بھی معمول کے مطابق ناشتہ کیا اور پھر وارڈن نے ان کی طلب
کے مطابق الگ الگ وقتوں میں دونوں کو گلی کے اندر ایک مشترکہ لیٹرین میں جانے
اجازت دی، لیٹرین دیکھ کر علی کو پھر اپنے گھر کے باتھ روم یاد آ گئے جہاں ہر کمرے میں
ایک اٹیچ باتھ روم تھا اور ہر باتھ روم میں وافر پانی، پرفیوم، ایئر فریشنر اور پھر آئینے لگے
ہوئے تھے جن میں علی اپنے چہرے اور سراپے کو مختلف زاویوں سے دیکھتا تھا۔ وہ ایک اچھ

قامت رکھنے والا پرکشش لڑکا تو تھا ہی، اس کی اپنی ماں شمائلہ بچپن میں اکثر اس کی نظر اتارا کرتی تھی اور پھر گلفام کا بیٹا بننے کے بعد رانی ماں نے بھی اس ریت اور روایت کو جاری رکھا اور مرتے مرتے گلفام سے کہہ گئی تھی کہ علی کی نظر اتارتے رہا کرنا اور گلفام نے بھی رانی کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس ریت کو جاری رکھا اور اگر روز نہیں تو ہفتے میں ایک دو بار علی کی نظر اتارنے کا فرض ضرور ادا کرتا تھا اور مرتے دم تک وہ بھی علی کی ابھرتی مردانہ وجاہت کی حفاظت نظر اتارنے سے کرتا رہا اور علی آئینے کے سامنے خاص طور پر جب باتھ روم میں جاتا تو آمنے سامنے لگے ہوئے آئینوں میں کافی دیر تک اپنے بانکپن کا جائزہ لیتا اور سوچتا کہ آخر ایسی کیا چیز اس کے اندر ہے جس کی اتنی حفاظت کی جاتی ہے اور اب جب وہ جیل کے باتھ روم یا لیٹرین میں گیا تو بھنبھناتی مکھیوں کی ایک یلغار اس پر حملہ آور ہوئی کیونکہ اس سے پہلے معلوم نہیں جیل کے کتنے لڑکے رفع حاجت سے فارغ ہو چکے تھے، وہ گھبرا کے پیچھے ہٹا لیکن اس کی ضرورت نے ہر حال میں اس لیٹرین کو استعمال کرنے پر مجبور کیا اور اسے اپنی کوٹھی کے باتھ روم آج بری طرح یاد آئے لیکن پھر اس نے فوراً ہی صبر سے کام لیتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ یہ سوچ کر کہ جو کچھ ماضی میں اس کے اپس تھا، وہ اب اس کا نہیں رہا اس کے پاس جو کچھ حال میں ہے وہی اس کا ہے اور اسے اگر اب جیل میں رہنا ہے تو جیل کے حالات کے مطابق ہی رہنا ہے کیونکہ اسے باہر کی کوئی خبر نہیں تھی کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور باہر اب اس کا کون ہے کہ اسے باہر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی امی کا تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا، باپ مر گیا تھا، بہن گم ہو گئی تھی، ڈیڈی کو پولیس نے مار دیا، رانی ماں پہلے ہی مر گئی تھی، فرح کا کچھ پتہ ہی نہیں اور فرح کی اسے اب آس بھی نہیں رکھنی چاہئے کہ اب علی ایک ڈاکو اور ایک ڈاکو کے بیٹے کے نام سے مشہور ہو چکا تھا • لہٰذا اس نے ایک دو دن کے اندر ہی جیل کے حالات کے مطابق خود کو ڈھال دیا۔

''تم نے کیا کیا تھا؟'' اس دن رات دال، روٹی کھا کر جب وہ دونوں فارغ ہوئے اور وارڈن نے لڑکوں کو سو جانے کی آواز لگا کر بتیاں گل کیں تو علی اور محمد جان نے بھی اپنے اپنے بدبودار کمبل تان لئے اور وہ ایک دوسرے سے دور دور رہنے کی بجائے آج قریب ہو گئے تھے، اس وقت باہر برآمدے میں ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی کچھ کچھ اس طرح اندر آ رہی تھی کہ اندر مکمل تاریکی اور سایہ نہیں تھا بلکہ سوئے ہوئے لڑکے سایوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ باہر کے جنرل وارڈ میں کئی لڑکے تھے جو کھانس کھونس

رہے تھے اور کچھ کمبلوں کے اندر سرسرا رہے تھے اور کہیں کھسر پھسر بھی ہو رہی تھی اور علی اور محمد جان بات چیت کے موڈ میں تھے کہ نیند دونوں کی آنکھوں سے غائب تھی۔

''تم نے کیا کیا تھا۔'' علی نے اچانک سوال کیا۔

''قتل......'' محمد جان بے ساختہ بولا۔ ''جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ علی غور سے باہر آنے والی روشنی میں محمد جان کے معصوم چہرے کو دیکھنے لگا کہ جو قاتل کا چہرہ نہیں لگ رہا تھا۔

''کیوں......؟'' علی نے دوسرا سوال پوچھا۔

''خراب آدمی تھا۔'' محمد جان نے اس سوال کا بھی بے ساختہ جواب دیا۔

''محمد جان خراب تو بہت لوگ ہیں۔'' علی نے کہا۔

''وہ تو ہے ...... پر امارا سب خراب لوگوں سے واسطہ نہیں، امارا واسطہ دلی محمد سے ہے۔'' محمد جان آزردہ ہو کر بولا۔

''کیا کیا اس نے......؟'' علی پوری بات سننے کے موڈ میں تھا اور جواب میں محمد جان نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا۔ ''بات شرم کی ہے علی بھائی، پر کیا کرے جب شرم ایک بار ہٹ گیا تو ہٹ گیا۔ جب کورٹ میں سب کھلا بولا، تھانے میں بولا تو ابھی تیرے سے کیا چھپانا۔'' اس نے کروٹ لی اور ہلکی ہلکی روشنی مین علی کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں بچا کر چھت کو گھورتے ہوئے تسلسل کے ساتھ بولتا چلا گیا۔

''بولتے ہیں ماں بہت اچھی چیز ہے، جنت ہے اس کے قدموں میں۔ پر خراب ہو جائے تو بیٹا کیا کرے۔ میرا باپ قاسم رکشا چلاتا تھا، میں ایک ہوٹل میں باہر والے کا کام کرتا تھا، میرا باپ صبح صبح رکشا لے کر نکل جاتا تھا اور ماں گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ میرے باپ کا ایک دوست تھا، ولی محمد۔ اس کو میں نے دن کے وقت دو تین دفعہ اپنی جھگی میں جاتے دیکھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے بولا جب باپ گھر میں نہیں ہے تو یہ گھر میں کیوں آتا ہے؟''

''تمہارے باپ کو پتہ تھا وہ گھر میں آتا ہے؟'' علی نے اس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

''باپ سے تو اس کا دوستی تھا لیکن وہ آتا اس وقت تھا جب باپ گھر میں نہیں ہوتا۔ ماں کے ساتھ اس کا بول بچپن میرے کو اچھا نہیں لگا۔ میں نے ماں کو بولا۔ یہ کیوں آتا ہے۔ آگے سے ماں نے میرے کو ڈانٹا پھر ایک دن جب میں گھر آیا میرے یار تو میں نے

جس طرح ماں کو دیکھا اس طرح کوئی بیٹا اپنی ماں کو نہیں دیکھ سکتا۔نہیں برداشت کر سکتا۔ ان لوگوں نے میرے کو نہیں دیکھا، نہ ماں نے، نہ ولی محمد نے۔ میں چپ چاپ باہر آیا، باہر بیلچہ پڑا تھا، میرے کو جنون چڑھ گیا۔ میں نے ولی محمد کی گردن پر پیچھے سے بیلچہ مارا۔ بیلچے نے تلوار کی طرح اس کی گردن کو کاٹ دیا۔ میرے کو خون چڑھ گیا تھا۔ میں نے ادھر ہی دو تین بیلچے اور مارے اور اس کی گردن الگ ہوگئی۔ بس پھر لوگ جمع ہو گئے۔ پولیس آ گئی میرا بیان لیا۔ میں نے جو دیکھا تھا بتا دیا۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا اور پھر اس کی آواز رندھ گئی اور اس نے روتے ہوئے اپنا ماتھا کوٹا اور پھر کہنے لگا۔''ہم برباد ہو گئے یارا!''

''صبر کرو دوست......!'' علی نے اسے ڈھارس دی اور پوچھا۔''تمہارا باپ کہاں ہے اب؟''

''کیا بتاؤں ...... باپ کو جب پتہ چلا تو اس نے ماں کو مار دیا اور اس کو پھانسی کی سزا ہوگئی ہے۔ میرے کو نہیں معلوم کہ وہ کون سی جیل میں ہے اور میرے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کو پھانسی لگ گئی ہے یا نہیں۔'' اور پھر محمد جان کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ کافی دیر تک ہچکیوں سے روتا رہا اور علی آہستہ آہستہ اس کے سر کو سہلاتے ہوئے تسلی دینے لگا اور پھر جب محمد جان چپ ہوا تو اس کی آنکھ سے نیند جاتی رہی تھی اور نیند علی کی بھی اڑ گئی تھی اور ویسے بھی دو راتوں سے سویا کم اور مچھر زیادہ مارتا رہا تھا۔ کچھ دیر دونوں چپ رہے اور پھر محمد جان نے اپنے آنسو خشک کر کے علی سے کہا۔''معلوم ہوا ہے تم بہت امیر آدمی ہے۔''

''ارے نہیں محمد جان! جیل میں امیر غریب کوئی نہیں ہوتا، سب برابر ہوتے ہیں۔'' علی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''یہ بات تو ہے۔'' محمد جان نے جواب دا۔''اب دیکھو ناں تم اور میں برابر ہے دھر۔'' اور اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے اور باہر برآمدے سے وارڈن کی ایک گرجدار آواز بلند ہوئی۔

''یہ کون باتیں کر رہا ہے ادھر۔ چپ ہو کے سو جاؤ نہیں تو پھر پتہ ہے ناں......''
وارڈن کی یہ دھمکی سن کر وارڈ کے اندر کھسر پھسر کرنے والے تمام لڑکے چپ ہو گئے علی اور محمد جان بھی وقتی طور پر کمبل میں دبک گئے اور جب وارڈن کے قدموں کی آواز چلی گئی اور خطرہ ٹل گیا تو محمد جان نے کمبل سے منہ نکال کر آہستہ دھیمے لہجے میں علی سے پوچھا۔''تم نے کیا کیا ہے یار؟''

''یار میں نے کچھ بھی نہیں کیا'' علی اس طرح بولا جیسے عدالت میں اپنی صفائی پیش کر رہا ہو۔'' میرا باپ اپنی کوٹھی کے اندر پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی، وہ میں نے اٹھائی تو پولیس اندر آ گئی۔ مجھے پکڑ کے گرفتار کر لیا۔ مجھے پتہ نہیں اب کیا ہوگا؟'' اور پھر دکھ کے ساتھ مزید کہنے لگا۔''میرا باپ ایک دنیا کو پالتا تھا اور پانی کی طرح پیسہ سب کے اوپر خرچ کرتا تھا لیکن ابھی لوگ اتنے ڈر گئے ہیں کہ ایک مکھی بھی مجھے دیکھنے یا ملنے نہیں آئی۔''

''دنیا مطلب کی ہے یار!'' محمد جان نے کہا اور پھر پوچھا۔''کیا تیری پیشی ہوئی ہے۔''

''نہیں یار کچھ پتہ نہیں ...... ایک دن تھانے والوں نے عدالتمیں پیش کیا تھا۔ عدالت نے یہاں جیل بھیج دیا۔'' علی نے کہا اور پھر بہت مایوس لہجے میں بولا۔''اب کچھ پتہ نہیں آگے کیا ہوگا۔''

لیکن اگلے ہی دن اسے معلوم ہو گیا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ایک سپاہی نے دونوں کو دیکھا اور دور سے ہی پکار کر بولا۔''اوئے تم میں سے علی زاہد کون ہے؟''

''میں ہوں......'' علی نے کہا۔

''ادھر آ میرے ساتھ......'' سپاہی نے اس کا بازو تھاما اور کہنے لگا۔''تمہیں جیلر صاحب نے بلایا ہے۔'' اور سپاہی اسے کھینچتا ہوا جیلر کے آفس میں لے گیا۔

''او بچے ...... او تیری عمر غلط لکھا دی لوگوں نے۔'' جیلر نے علی کو دیکھتے ہی آواز لگائی اور ایک فائل کو اٹھا کر پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔''کیا بات ہے کوئی سی ایس پی کے امتحان میں بیٹھنا تھا کہ جعلی عمر لکھوائی ہے۔''

''مجھے نہیں پتہ سر! میں نے کچھ نہیں لکھوایا۔'' علی معصومیت سے بولا۔

''ہونہہ تجھے صرف پولیس مقابلوں کا پتہ ہے آں ...... خوش نصیب تھا بچے، بچ گیا ہے۔ پولیس مقابلے میں بڑے بڑے تیس مار خان مارے جاتے ہیں۔'' جیلر نے کہا اور علی نے اس کی بات کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی میں ہی مصلحت جانی۔

''او رحمت علی......'' پھر جیلر نے کسی سپاہی کو بلایا اور سپاہی نے اندر آ کے اٹن شن ہو کے سلیوٹ مارا۔''جی سر!''

''اوئے یہ فائل بھی لے جا کا کے کی اور سینٹرل جیل میں پہنچا دے۔ یہ اٹھارہ سال

سے اوپر ہو گیا ہے۔ اس کے برتھ سرٹیفکیٹ کی کاپی بھی اندر ہے۔ ایک لڑکا اور ہے جانی، وہ پانچ چھ سال سے ادھر ہی ہے پر اب اوور ایج ہو گیا ہے۔ اس کو بھی لے جا بڑوں میں اور اُدھر ان کی انٹری کرا دو دینا۔‘‘

’’جی سر......!‘‘ سنتری نے پھر ایک سلیوٹ مارا اور علی کو ایک اور لڑکے جانی کے ساتھ جیل کی گاڑی میں بٹھا کے بڑوں کی جیل میں لے گیا۔

سینٹرل جیل پہلے ہی دن اس کے لئے ایک تلخ اور خوشگوار تجربہ ثابت ہوئی۔ اسے صبح صبح جب سنتری نے جنرل وارڈ کا دروازہ کھول کے اندر دھکیلا تو سب قیدیوں نے بہت دلچسپی کے ساتھ اس کو دیکھا۔ ایک نظر دیکھنے میں اسے یہ عجیب و غریب قیدی نظر آئے۔ بوڑھے، جوان، ادھیڑ عمر لیکن علی کی عمر کا کوئی نوجوان قیدی نہیں تھا۔ غالباً اسی لئے وہ بچوں اور بڑوں کی جیل کے درمیان تقسیم ہو گیا تھا۔ ہر قیدی کے سر پر لمبے لمبے الجھے ہوئے میلے کچیلے بال تھے اور کم و بیش سب کی داڑھیاں یا شیو بڑھی ہوئی تھی اور وہ اس طرح اور ایسی نظروں سے علی کو دیکھنے لگے جیسے بھوکے بھیڑیے بھیڑ کو دیکھتے ہیں تاہم ایک آدمی علی کو بہت مختلف نظر آیا۔ اس کا نام مچھڑ تھا۔ مچھڑ اسے لمبی مونچھوں کی وجہ سے کہتے تھے جو گالوں کی دونوں طرف سے تنی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ کلین شیو لمبی مونچھیں، خونی اور خونی آنکھیں، مضبوط جسمانی ساخت، لحیم شحیم اور سر کے بال سرسوں کے تیل میں چپڑے ہوئے تھے اور بیچ میں مانگ نکلی ہوئی تھی۔ وہ ایک کونے میں اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا اور دو بدی اس کی ٹانگوں کو دبا رہے تھے۔ اس نے دور ہی سے ترچھی، تیز نگاہوں کے ساتھ علی کو ایسے دیکھا جیسے باز چڑیا کو یا چیتا ہرن کو دیکھتا ہے۔ اس نے پاؤں دبانے والے دونوں بدیوں کو بیک وقت ٹھڈا مارا وہ پرے جا گرے اور مچھڑ کھڑا ہو گیا۔

’’آ او...... کہاں سے آیا ہے اور کیا کر کے آیا ہے؟‘‘ مچھڑ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا آگے علی کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ’’مجھے جانتے ہو ناں، نہیں جانتے تو جان جاؤ گے۔ مجھے لوگ مچھڑ کہتے ہیں اور میں جگا ہوں یہاں کا، سمجھے۔‘‘ مچھڑ نے کہا اور دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر علی کے دونوں نرم و ملائم گال چٹکیوں میں بھر لئے۔ ’’یہاں جو بھی آتا ہے ناں، اسے یہاں رہنے کا جگا ٹیکس دینا پڑتا ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ہاں...... وارڈن، جیلر یا کسی اور افسر سے میری شکایت کا کبھی سوچنا بھی نہیں۔‘‘ مچھڑ نے علی کو وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

مچھڑ نے یہ صحیح کہا تھا کہ ان کی حرکتوں کی کسی کے آگے شکایت کرنا بیکار ہے اور یہ

بعد میں علی کو پتہ چلا کہ شکایت کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلا۔ ایک دفعہ ایک انسپکٹر نے مچھڑ کی سرزنش کی تو مچھڑ نے اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جا۔'' جس پر انسپکٹر نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔ ''کیا مجھے دھمکی دے رہے ہو۔'' اور مچھڑ نے چپکے سے کان میں جواب دیا تھا۔ ''دھمکی دے رہا ہوں لیکن گواہ کوئی نہیں ہے۔'' اور پھر وہی ہوا کہ ایک دن انسپکٹر کی سر بازار کسی نے پٹائی کر دی اور پھر پٹائی کرنے والے نے انسپکٹر کے کان میں کہا ''آئندہ مچھڑ سے پنگا نہیں لینا۔'' اور پھر اس نے مچھڑ سے پنگا نہیں لیا اور نہ اور ایک دن کسی نے جیلر کو سر بازار آن لیا اور پھر کان میں کہا۔ ''جیلر صاحب! مچھڑ سے پنگا نہیں لینا۔''

مچھڑ کا جیل کے باہر بھی بدمعاشوں کا نیٹ ورک پھیلا ہوا تھا اور جیل کے اندر بھی اس کی حکومت چلتی تھی۔ کوئی اس سے پنگا نہیں لیتا تھا اور وہ سب کے ساتھ پنگا کرتا تھا اور اس نے علی کے داخل ہوتے ہی علی سے پنگا لیتے ہوئے نہایت غیر مہذبانہ رویہ اختیار کیا۔

''سمجھ گئے ناں میں جگا ہوں اور یہاں تمہیں مجھے جگا ٹیکس دینا پڑے گا۔'' اس نے علی کے گال ابھی تک پکڑ رکھے تھے۔

''چھوڑ دو میرے گال۔'' علی نے غصے میں کہا۔

''بولو ہاں...... پھر چھوڑوں گا'' مچھڑ نے اسے اور مضبوطی سے پکڑا۔

''چھوڑ دو میں کہتا ہوں۔'' اب کے علی چلا اٹھا اور اس نے بہت زور سے مچھڑ کی چھاتی میں دو ہتھڑ مار کر گالوں کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔

''اوئے اوئے اوئے، ہم سے پنگا...... ہیں۔'' مچھڑ پیچھے ہٹ کے چوکس ہو گیا اور گھما کے ایک ہاتھ علی کو جو مارا لیکن اس کا وار خطا ہو گیا کیونکہ علی نے نہایت پھرتی کے ساتھ سر نیچے کر کے وار کو خالی کر دیا اور مچھڑ اپنے زور پر ہی لٹو کی طرح اپنی جگہ پر گھوم گیا۔

''اب میں رات کا انتظار نہیں کروں گا۔ دن میں ہی ٹیکس وصول کروں گا تم سے۔''

مچھڑ غصے سے چراغ پا ہو گیا تھا اور اس نے علی پر حملہ آور ہونے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اور دونوں ٹانگیں کھول دی تھیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ایک لمحے میں کئی خیال تیز چلتی ہوا کی طرح علی کے ذہن میں آئے اور دماغ کے کئی سوتوں کو ہلا گئے۔ علی سوچنے لگا کہ اب معلوم نہیں اسے کب تک یہاں رہنا ہے اور اس طرح کے معلوم نہیں کتنے مچھڑوں اور جگوں سے اس کا واسطہ پڑے گا اور وہ اسے دبا کے رکھیں گے اور من مانی کریں گے۔ اسے ڈیڈی گلفام کا بتایا ہوا محاورہ یاد آیا کہ گربہ کشتن روز اوّل۔ یعنی بلی کو پہلے ہی دن مار دو اور علی

نے سوچا کہ مچھڑ تو بلی بھی نہیں خطرناک جنگلی بلا ہے اور اسے پہلے ہی دن مار دینا ضروری ہے۔لہٰذا علی بھی اپنے ہاتھ سیدھے کر کے لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔

''واہ واہ لڑے گا بھی مجھ سے۔'' مچھڑ نے جب علی کو لڑنے کے لئے مستعد دیکھا تو ایک قہقہہ لگا کے بولا اور سارے قیدی جیسے اٹن شن ہو گئے۔

''بھئی مزا تو اب آئے گا...... آ جاؤ...... میں پہلا وار نہیں کروں گا آ جاؤ۔ مارو مجھے......'' مچھڑ نے ہاتھ سے علی کو اپنی طرف آنے کو کہا اور علی ایک دفعہ پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اس لحیم شحیم قوی ہیکل آدمی کو سیدھے طریقے سے پیٹنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ اگر اس سے لڑنا ہے تو جسمانی طاقت سے نہیں، دماغی طاقت سے لڑنا ہوگا یا جسم اور دماغ دونوں کو استعمال کرنا ہوگا۔

''آؤ آؤ مارو مجھے......'' مچھڑ نے ہاتھ پھیلائے اور مزید ٹانگیں کھول دیں اور پھر کیا ہوا کہ جیسے ایک بجلی کوندی، پلک جھپکتے میں علی نے ایک زوردار کک مچھڑ کی ناف کے نیچے لگا دی اور مچھڑ کا سارا وجود ہل گیا۔اس نے ایک دھاڑ ماری اور دونوں ٹانگوں کے بیچ میں دبا کے اس طرح ''چاؤں چاؤں'' کر کے وارڈ میں تڑپتے ہوئے، گھومنے لگا جیسے کتے کی دُم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا ہو۔

علی نے اسکول کالج کے پی ٹی اور ڈرل پریڈ میں جدید فائٹ اور کنگ فو کے کچھ طریقے بھی سیکھے تھے جس کو اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ بعدازاں ان طریقوں کو استعمال کرنے کے لئے آج اسے صحیح موقع ملا اور بہتر جگہ معلوم ہوئی ہے، اس نے آسرا نہیں کیا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ گھوما اور اسی جگہ پر ایک ٹانگ سے بیک کک لگائی اور مچھڑ کے ہاتھوں کا قفل توڑ کر دوبارہ گھوما اور دوسری ٹانگ سے دوسری بیک کک اسی مقام پر لگائی۔ مچھر کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ وہ کتے کی طرح زبان نکال کے وارڈ میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔علی نے پھر بھی آسرا نہیں کیا اور ایک بیک کک اچھل کر اس کے سر پر جو لگائی تو مچھڑ زمین پر ڈھیر ہو گیا اور اس کے نرخرے سے اس طرح آوازیں نکلنے لگیں جیسے ذبح کیا ہوا بکرا آخری سانسیں لے رہا ہو۔

سارے قیدی زمین پر مردار کی طرح پڑے ہوئے مچھڑ کو دیکھ رہے تھے اور خوش بھی تھے کہ مچھڑ کو چت کرنے والا بھی کوئی ہے اور حیران بھی تھے کہ ایسے کمسن لڑکے نے مچھڑ کو پلک جھپکتے میں اس طرح پچھاڑ دیا کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیا۔تھوڑی ہی دیر میں وارڈ کے اندر ہنگامہ اور شور شرابا سن کے ایک پولیس افسر وارڈن اور جیلر بھی اندر آ گئے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' جیلر نے اندر آتے ہی بآواز بلند پکارا۔''یہ کیسا مجمع لگا رکھا ہے؟''

''جیلر کی آواز سن کر قیدی پیچھے ہٹ گئے اور دیکھا مچھڑ زمین پر لیٹا تڑپ رہا ہے۔

''کیا ہوا اسے......؟'' جیلر نے پوچھا۔

''اس کی پٹائی ہوئی ہے جی......'' ایک قیدی نے جواب دیا۔

''کس نے پیٹا ہے؟'' جیلر نے از راہ حیرت کہا کیونکہ ابھی تک اس جیل میں ایسا کوئی آیا نہیں تھا جس نے مچھڑ کی پٹائی کی ہو۔

''اس لڑکے نے جی۔'' قیدی کے پاس کھڑے علی کی طرف اشارہ کیا جو چپ چاپ معصوم سا بنا سر جھکائے ہوئے تھا۔

''اس نے؟'' جیلر علی کو دیکھ کر چونکا اور خودکلامی کرتے ہوئے بولا۔''ویری اسٹرینج۔''

پھر ایک لمحے کے لئے اس نے علی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔علی نے بھی بھولی سی نگاہ جیلر کے چہرے پر ڈالی اور پھر جیلر نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تھوڑا سا وہ آگے بڑھا اور پوچھا۔''تم نئے آئے ہو ناں؟''

''جی سر!'' علی دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' جیلر نے پوچھا۔

''علی۔'' علی نے آہستہ سے نام بتایا۔جیلر نے پھر ایک نگاہ علی کے سراپے پر ڈالی اور پھر زمین پر پڑے ادھ مرے چھ فٹے مچھڑ کو دیکھا جو ابھی تک تڑپ اور کراہ رہا تھا اور پھر جیلر نے علی کا کندھا دبا کے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔''ویل ڈن علی!'' اور یہ کہہ کر جیلر اپنی ٹیم کے ساتھ چلا گیا۔

علی کی اسی وقت پورے وارڈ کے اندر دھاک بیٹھ گئی۔مچھڑ رات کو اس سے ٹیکس کیا وصول کرتا وہ شرم سے اپنا منہ چھپاتا رہا لیکن علی اندر سے خوش نہیں تھا۔وہ محسوس کر رہا تھا اب اسے ایک طویل جنگ کا سامنا کرنا ہوگا۔

❁

اگلے دن جب صبح صبح قیدی ناشتے پانی سے فارغ ہوئے اور وارڈن نے ان کو کچھ ہدایات دیں پھر ایک سنتری بھی آ گیا جو انہیں ریوڑ کی طرح ہانک کر باہر ایک سڑک کی کھدائی کے لئے لے جانا چاہتا تھا کہ اچانک جیل کے عملے کا ایک اور سنتری اندر آیا اور

س نے زور سے پکارا۔

''او علی کون ہے......علی زاہد......''

''میں ہوں۔'' علی چونکا۔

''آ جاؤ تمہاری ملاقات آئی ہے۔'' سنتری نے کہا۔

''کون ہے......؟'' علی نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم......خود چل کے دیکھ لو۔'' سنتری نے جواب دیا اور علی بہت تجسس ے ساتھ سنتری کے پیچھے پیچھے چل دیا کیونکہ کافی عرصہ اس نے بچوں کی جیل میں بھی گزارا ا اور یہاں آج اس کا دوسرا ہی دن تھا لیکن جب سے وہ جیل آیا تھا کوئی اس سے ملنے ںس آیا۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' علی سوچتا ہوا ملاقات کے لئے روانہ ہو گیا۔

پاکستانی وقار عظیم ڈائریکٹ ڈاٹ کام

ملاقات کے کمرے میں آ کر علی ششدر رہ گیا۔
''فرح تم......!'' وہ چونکا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ فرح جیسی معصوم نرم و نازک لڑکی اُس جیسے لڑکے سے ملنے کے لئے جیل آئے گی جو ایک انتہائی خطرناک گروہ کے ہمراہ پولیس مقابلے میں پکڑا گیا ہو، وہ دم بخود ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

فرح کی آنکھیں نم تھیں اور وہ فرطِ محبت سے علی کو دیکھتی جا رہی تھی۔ علی کا جی چاہا کہ وہ ایک برقی قوت کی طرح فرح کے دل و دماغ سے گزر جائے اور اپنے وجود کے اتھاہ سمندر میں اسے بھی ڈبو دے۔ وہ یہ سوچ کر ذرا سا آگے بڑھا لیکن پھر ایک دم رک گیا جیسے اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہوں، اس نے ایک نظر فرح کے خوبصورت دلکش لباس پر ڈالی اور پھر اپنی قیدیوں والی یونیفارم کو دیکھنے لگا جس پر اس کا نمبر لکھا تھا اور جس سے پسینے اور میل کی بدبو آ رہی تھی اور جس لباس کو معلوم نہیں کتنے لوگوں نے پہنا ہو گا اور ایک لمحے میں علی نے سوچا کہ یہ لباس اس قابل نہیں ہے کہ فرح کے لباس کو چھو کر بھی گزرے۔ لہٰذا اس کے قدم فرح سے کچھ فاصلے پر رک گئے۔

''فرح! تم...... کب آئی ہو، تم کیسے پہنچی ہو یہاں تک...... کیا اکیلی؟''

''نہیں بیٹے اکیلی نہیں...... میں اس کے ساتھ ہوں۔'' اب کے فرح کا ڈیڈی ارمغان گیٹ کی اوٹ سے سامنے آ کر بولا۔ ''بیٹے میں تھا نہیں یہاں، دبئی گیا ہوا تھا۔ پھر وہاں سے آگے نکل گیا، دوسری ریاستوں کی طرف اور پرسوں کوئی دو مہینے کے بعد واپس لوٹا تو مجھے اس ساری واردات کا پتہ چلا۔'' فرح کے ڈیڈی نے ایک ہی سانس میں کہا اور ہاتھ آگے بڑھا کر بہت شفقت کے ساتھ علی کے سر پر رکھا اور مزید کہنے لگا۔

''گلفام کی موت کا مجھے بہت دکھ ہے بیٹے! میں نے اس کے بارے میں ان دنوں بہت سی اسٹوریاں سنی ہیں لیکن مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا تھا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ میرا یار اور یاروں کا یار تھا۔'' فرح کے ڈیڈی کے ان بولوں سے علی کے اندر کا موم پگھلا اور وہ

آبدیدہ ہو گیا۔

اس نے دیکھا کہ فرح کی آنکھ میں بھی آنسو تھے۔

''فرح بہت بے چین تھی تم سے ملنے کے لئے۔'' فرح کے ڈیڈی کہنے لگے۔

''لیکن اسے کون لاتا۔ میں آیا ہوں پرسوں تو ساری صورت حال کا پتہ چلا۔ کل میں نے ایک بہت بڑے وکیل سے بات کی تو اسی نے ملاقات کا وقت لے کر دیا اور اس نے بہت تسلی دی ہے کہ تم رہا ہو جاؤ گے۔ اس لئے کہ تمہارا کوئی دوش نہیں۔ تم سارے معاملے میں اسی طرح بے خبر تھے جیسے میں فرح یا فرح کی ممی یا کوئی اور۔ تم گھبرانا نہیں میرے بیٹے!''

''تھینک یو انکل تھینک یو! میں سمجھا تھا کہ شاید اب میرے پیچھے کوئی نہیں ہے۔''

''کیا ہم مر گئے تھے کہ تم ایسا سوچنے لگے؟'' فرح کے ڈیڈی نے کہا اور ایک بار پھر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

''چلو بھئی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔'' وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ پولیس والے نے آواز لگائی۔

''ہم چلتے ہیں، بیٹے وکیل صاحب نے بتایا ہے کہ ایک دو دن میں تمہاری پیشی ہے اور ان شاء اللہ یہی آخری پیشی ہو گی۔'' فرح کے ڈیڈی نے اسے ڈھارس دی اور مڑا۔

فرح اور علی نے ابھی آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

''او کے علی ٹیک کیئر۔'' فرح علی کے قریب آئی اور جذبات میں ڈوبے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

''تم بھی اپنا خیال رکھنا۔'' علی نے بھی آہستہ سے کہا اور پھر رخصت ہوتے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ سختی سے تھام لیا۔

''بائے۔'' فرح نے پھر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کی۔

''بائے۔'' علی نے بھی ہاتھ چھوڑا اور نظروں سے اوجھل ہونے تک فرح اسے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔

''جناب والا! یہ لڑکا علی زاہد تو ایک بہت ہی مظلوم لڑکا ہے۔ اس کو ابھی تک یہ بھی صحیح طور پر نہیں معلوم کہ یہ علی زاہد ہے یا علی گلفام۔'' پیشی والے دن علی کا وکیل پی یو نقشبندی وکیل استغاثہ کے جواب میں علی کا دفاع کر رہا تھا۔ نقشبندی ایک بہت نامور اور بہت مہنگے وکیل تھے جن کی خدمات حاصل کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں تھا لیکن فرح کے

ڈیڈی فاضل نعمان ارمغانی نے نقشبندی صاحب کی خدمات بھاری معاوضے کے عوض حاصل کی تھیں۔

نقشبندی کا ایک نام اور مقام تھا جو مقدمہ وہ لڑتے تھے، مقدمہ اہم ہو یا نہ ہو نقشبندی کی بدولت اہمیت اختیار کر جاتا تھا۔ سو پیشی کے دن جب استغاثہ نے گلفام کو گرفتار کرنے کی وجوہ بتائیں اور الزامات لگائے تو نقشبندی ان کی صفائی پیش کر رہے تھے۔

''جناب والا! یہ لڑکا علی زاہد ایک معصوم اور مظلوم لڑکا ہے اس کو ابھی تک صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ علی زاہد ہے یا علی گلفام۔ آج سے تیرہ برس پہلے کا پولیس ریکارڈ میں ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا ہوں جبکہ اس بچے کو گلفام نے تاوان کے لئے اغوا کر لیا تھا۔ اس وقت یہ بچہ اپنے تایا عابد علی کی کفالت میں تھا کیونکہ اس کا باپ زاہد علی ہسپتال میں شدید بیمار تھا اور اس کی ماں شمائلہ......''

یہاں تک بولتے بولتے وکیل چپ ہوا پھر کہنے لگا۔ ''جناب والا! شمائلہ کی داستان ایک الگ قصہ ہے اور میں اس خاتون کے معاملے کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، اتنا عرض کروں گا کہ شمائلہ زاہد علی کو چھوڑ چکی تھی اور زاہد علی ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا اور علی کو اس کے تایا عابد علی کے پاس پرورش پانے کے لئے چھوڑا گیا تھا جبکہ گلفام نے اسے عابد علی کا بیٹا سمجھ کر اغوا کر لیا اور رہائی کے بدلے میں بھاری تاوان طلب کیا۔ عابد علی ایک راشی افسر تھا، اس کے پاس پیسہ تو بہت تھا لیکن دل نہیں تھا، وہ نہ تو پولیس کے پاس گیا اور نہ اس نے تاوان ادا کیا اور اپنی جان اور پیسہ بچا کے راتوں رات ملک سے فرار ہو گیا اور علی کو گلفام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ گلفام علی کو موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور چونکہ اب علی کی نگہداشت کرنے والا اور کوئی نہیں رہا تھا اس لئے گلفام نے رحم کھا کر اسے بیٹا بنا کے پرورش کی اور بڑا کیا۔ جناب والا! گلفام کا دہشت گردوں سے تعلق یا گلفام کا خفیہ اور ناجائز کاروبار پولیس کا معاملہ ہے۔ وہ زندگی بھر بھتے کھلا کے دو نمبر کام کرتا رہا لیکن جس طرح اسکے خفیہ کاروبار سے اور لوگ ناواقف تھے اسی طرح علی بھی بے خبر تھا۔ علی ایک معصوم لڑکا ہے اس کی تعلیم کا ایک بہت اچھا ریکارڈ ہے۔ وہ پری میڈیکل تک امتیازی نمبروں سے پاس ہو کے اسکالرشپ لیتا رہا جس کے ثبوت موجود ہیں۔ وقوعہ کے روز جو کچھ ہوا وہ علی کے لئے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ وہ اس وقت دم توڑتے گلفام کو تسلی دے رہا تھا اور رو رہا تھا جب پولیس نے اسے گرفتار کیا

وہ بے گناہ ہے۔ اس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا، کبھی گولی نہیں چلائی۔ کبھی کسی کی جان نہیں لی۔ ایک ایسا لڑکا جس کا باپ مرگیا ہو، ماں غائب ہوگئی ہو، تایا بے یار و مددگار چھوڑ کے فرار ہوگیا ہو، اس کے باوجود وہ لڑکا اپنی قابلیت کی بنیاد پر امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس ہوکر اسکالرشپ لے رہا ہو اور جو ایک ڈاکٹر بن کے انسانیت کی خدمت کا جذبہ اور عہد اپنے اندر رکھتا ہو ایسے لڑکے کے جسم سے کالج کی یونیفارم اتار کے اسے قیدیوں کے کپڑے پہنا کر جیل بھیج دینا انصاف اور انسانیت کا خون ہے۔ جناب والا! لہٰذا میری اس عدالت سے درخواست ہے کہ علی زاہد کو عزت کے ساتھ بری کیا جائے۔''

اس کے بعد مزید کچھ بحث مباحثہ ہوا اور پھر عدالت نے فیصلہ محفوظ کرنے کے بعد اگلی پیشی پر علی کو عزت کے ساتھ بری کر دیا۔ یہ علی کی زندگی میں خوشی کا دن بھی تھا اور ایک حیرت انگیز تجربہ بھی، اسے حاصل ہوا تھا۔

''آؤ علی شاپنگ کو چلتے ہیں۔'' اس دن اچانک شام کو فرح اوپر علی کے کمرے میں آ کر بولی۔ یہ کالج کی چھٹیوں کے دن تھے اور علی اور فرح سارا دن تقریباً گھر پر ہی گزارتے رہتے تھے۔

''کم از کم ناک تو کیا کرو۔'' علی جو اس وقت آرام سے بنیان پہنے پلنگ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، ایک دم اٹھ بیٹھا اور ہنس کر ہینگر سے قمیض اتار کر پہننے لگا۔

''اوہ ناراض ہو گئے ہو۔'' فرح منہ بنا کر بولی اور کمرے سے چلی گئی پھر دوبارہ دروازہ پر ہلکی سی دستک دے کر اندر آئی اور ازراہ مذاق کہنے لگی۔ ''لو اب تو ناک کر کے آئی ہوں۔'' اور پھر دونوں خوب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

جیل سے رہائی کے بعد علی فرح ہی کے گھر میں رہنے لگا تھا۔ اس دن جب عدالت سے وہ رہا ہو کر فرح کے ڈیڈی کے ہمراہ ان کے گھر آیا تو گھر کی طرف سے بہت اپ سیٹ تھا کیونکہ گھر پر ابھی پولیس کا پہرہ تھا اور مرکزی دروازے پر علاقے کے تھانے کی طرف سے ایک بڑا تالا لگا دیا گیا تھا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' فرح کے ڈیڈی نعمان ارمغانی نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ نقشبندی صاحب نے کہا ہے کہ بنگلے کو چند روز پولیس کے قبضے میں رہنے دیں وہ کوئی اپنی کاغذی کارروائی پوری کر رہے ہیں اور اس کے بعد عدالت سے احکامات لے کر بنگلہ واگزار کرا لیں گے۔''

''لیکن انکل......'' علی نے کچھ کہنا چاہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری پریشانی۔'' ارمغانی صاحب نے علی کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔تم جب تک ہمارے ساتھ رہو گے۔ میرا، فرح کی ممی اور فرح تینوں کا خیال یہی ہے کہ تم اکیلے اپنے گھر میں رہنے کی بجائے ہمارے بنگلے میں رہو۔''

علی کو عجیب سا لگا کہ جیسے ایک دفعہ پھر اسے ہجرت کرنی پڑ گئی ہو حالانکہ بنگلے کے ساتھ بنگلے کی دیواریں ملی ہوئی تھیں اور وہ واردات سے پہلے اس گھر کے اندر اپنے گھر کی طرح آتا تھا اور جب وہ اور فرح چھوٹے تھے تو ایک ساتھ گھر کے تالاب میں سوئمنگ کرتے تھے۔ وہ فرح کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور فرح اس کے گھر میں اس کے ساتھ کھاتی پیتی تھی لیکن اب اپنے گھر مقفل ہونے کے بعد جیل اور جیل کے بعد فرح کے گھر میں رہنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

''دیکھو اس گھر کو تم اب اپنا ہی گھر سمجھو اور سچ پوچھو تو یہ ہے ہی تمہارا۔'' فرح کے ڈیڈی نے معنی خیز انداز میں کہا اور پھر فرح کو پاس سے ہٹا دیا اور علی کے کان میں رازداری سے کہنے لگے۔''دیکھو علی میں کیوں کہہ رہا ہوں کہ یہ تمہارا ہی گھر ہے ایک راز کی بات تمہیں بتاؤں۔ تمہارا باپ گلفام میرا جگری دوست تھا اور تھا بھی بہت دل اور جگر والا۔ ایسے بادشاہ لوگ اور دوست میں نے نہ دیکھے اور نہ کتابوں میں پڑھے۔'' ارمغانی ایک ہی سانس میں کہہ گیا لیکن جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ ابھی تک نہیں کہی تھی۔''جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرا بنگلہ بینک کے لون کی وجہ سے قرق ہونے لگا تھا اس کی نیلامی ہو جاتی اگر اچانک گلفام نے رقم ادا نہ کر دی ہوتی۔ یہ بنگلہ آج گلفام کی وجہ سے میرے پاس ہے۔''

علی نے حیرت سے جب فرح کے ڈیڈی ارمغانی کو دیکھا تو وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اور تصدیق کرتے ہوئے بولے۔''ہاں علی گلفام نے بینک کا قرض چکانے میں دومنٹ نہیں لگائے۔'' اور پھر بولے۔''قرض تو میں نے اسی لاکھ لیا تھا لیکن سود ملا کہ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ بن گیا تھا۔'' ارمغانی صاحب کہتے جا رہے تھے اور علی دم بخود سنتا جا رہا تھا۔''اور خاص بات کا پتہ ہے؟ اس شیر کے بچے نے مڑ کے وہ رقم مجھ سے نہیں مانگی نہ اس کا تذکرہ کرنے دیا۔''

''لیکن انکل! یہ سب کچھ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟'' محو حیرت علی نے پوچھا۔

''تم نے ٹھیک کہا کہ اس رقم کا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے، جبکہ نہ تو اس

کا کوئی کاغذی ثبوت ہے، نہ کوئی گواہ لیکن میرا ضمیر اندر سے زندہ ہے اس لئے میں تمہیں گواہ بنا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس گھر میں اپنے گھر کی طرح رہو کہ یہ گھر میرا نہیں تمہارے باپ کا مرہونِ منت ہے۔ تمہارا ہے بیٹے! میں مقروض ہوں تمہارا۔'' وہ نہایت دیانتداری سے بولا۔

''پلیز انکل! ایسا نہ کہیں۔'' علی وفور جذبات سے بولا اور ارمغانی صاحب کے ساتھ لپٹ گیا۔

''تم آرام سے رہو بیٹے!'' ارمغانی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر فرح سے مخاطب ہوئے۔ ''فرح علی کو اوپر اپنا کمرہ دکھاؤ۔'' اور فرح نے علی کے آنے سے پہلے ہی اس کا اوپر والا کمرہ سیٹ کر دیا تھا۔ اس نے علی کا ہاتھ تھاما اور بولی۔ ''آ جاؤ علی۔'' اور پھر علی اسی گھر میں رہنے لگا اور اسی گھر سے دونوں صبح ایک ساتھ کالج ایک ہی گاڑی میں جاتے۔ ڈرائیور دونوں کو کالج میں اتار کر واپس آ جاتا اور پھر چھٹی کے وقت لینے کے لئے چلا جاتا۔ کالج جاتے ہوئے وہ گاڑی میں بہت سی باتیں کرتے، بغیر اس بات کا احساس کئے کہ ڈرائیور گاڑی چلا رہا ہے اس کے بھی کان ہیں اور ڈرائیور چیز ہی ایسی ہوئی ہے کہ جس کی آنکھیں تو آگے ہوتی ہیں لیکن کان پیچھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ دونوں راستے میں اپنے اپنے کالج اپنے اپنے ٹیچرز کی باتیں کرتے اپنے اپنے دوستوں کا تذکرہ کرتے لیکن جب کوئی جذباتی بات ہوتی یعنی علی اگر فرح کا ہاتھ تھام لیتا تو اچانک دونوں کی نظریں شیشے پر پڑتیں اور انہیں محسوس ہوتا کہ ڈرائیور کسی شکرے کی طرح نظریں دونوں پر گاڑے ہوئے ہے۔ ایک دن علی تھوڑا سا رومانٹک ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو۔'' تو اس کے جواب میں فرح کے چہرے پر سرخی تو آئی لیکن ساتھ ہی اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کر کے علی کا ہاتھ دبا دیا اب وہ دونوں محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے درمیان محبت اور جذبات کا ایک ایسا رشتہ ضرور پیدا ہو گیا ہے جس کا اظہار وہ ڈرائیور کے سامنے کرتے ہوئے گریز کرتے ہیں بس اتنی سی ہی بات تھی دونوں کے درمیان اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایک ان دیکھا جذبہ، ایک ان دیکھی محبت، کچھ عمر کے کچے جذبے لیکن بے پناہ کشش رکھنے والے۔

''آؤ علی شاپنگ کو چلتے ہیں۔'' اس دن اچانک ایک شام فرح اوپر علی کے کمرے میں آئی اور علی کا ہاتھ تھام کے اسے اٹھایا۔ کئی دنوں سے کالج بند تھے اور دونوں گھر میں بیٹھے بیٹھے بور سے ہو گئے تھے بس صبح والدین کے ساتھ ناشتہ کرنا۔ دوپہر کا کھانا، رات کا

کھانا۔ پھر علی اپنے کمرے میں چلا جاتا اور فرح اپنے کمرے میں چلی جاتی اور کبھی کبھی دونوں اتنے بور ہو جاتے کہ ایک گھر میں اپنے کمروں سے ایک دوسرے کے ساتھ گھنٹوں ٹیلیفون پر گفتگو کرتے رہتے اور یہ ساری گفتگو کالج اور کالج کے ٹیچرز کے بارے میں ہوتی یا دوستوں کا تذکرہ ہوتا یا موسم کی بات ہوتی۔ گفتگو میں اس طرح کوئی بات نہیں ہوتی کہ میں ''تم سے محبت کرتا ہوں'' یا وہ جواب میں کہتی کہ ''آئی لو یو'' لیکن اس طرح گفتگو نہ کرنے کے باوجود محبت کی ایک چنگاری دونوں طرف موجود تھی جو ہوا کی ایک جنبش سے شعلہ بن سکتی تھی لیکن دونوں نے اس جھونکے کو روک رکھا تھا جو محبت کی مٹی کے نیچے دبی چنگاری کو شعلہ بنا دیتی۔ ویسے فرح چپکے چپکے اپنے والدین کی باتیں سنتی رہتی تھی جس میں فرح اور علی کی شادی کا ذکر ہوتا اور یہ ساری باتیں وہ علی کو بتا دیتی تھی اور علی فرح کے ساتھ شادی کی بات سے بہت پر جوش ہو جاتا۔

فرح کے والد ارمغانی کا اس وقت سے علی کو اپنا داماد بنانے کا ارادہ تھا جب گلفام زندہ تھا اور علی اور فرح ابھی چھوٹے تھے اور اب جبکہ دونوں بڑے ہو گئے تھے تو ارمغانی صاحب کا یہ ارادہ بہت پختہ ہو گیا تھا کیونکہ فرح کی شادی بہرحال انہیں ایک نہ ایک دن کرنی تھی اور انہیں علی جیسا لائق اور قابل لڑکا کہاں مل سکتا تھا اور پھر وہ ان کے دوست گلفام کا بیٹا تھا جس کے وہ بہت ممنون احسان تھے اور اب جتنی پراپرٹی گلفام چھوڑ گیا تھا اس کا علی بلا شرکت غیرے مالک تھا اور اس سے بھی ہٹ کر جو اہم بات تھی وہ یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے حالانکہ علی کا بنگلہ پولیس کی کسٹڈی سے واگزار کرا لیا گیا تھا لیکن علی ابھی تک وہاں شفٹ نہیں ہوا تھا اور فرح ہی کے اس گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا۔

''آؤ علی! شاپنگ کو چلتے ہیں۔'' اس شام کو دستک دیئے بغیر فرح اچانک علی کے کمرے میں آ گئی اور علی کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ علی اس وقت بنیان پہنے پلنگ پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا۔ ''کم از کم اندر آنے سے پہلے ناک تو کر دیا کرو۔'' فرح از راہ مذاق فوراً باہر نکلی دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر آ کر بولی۔ ''لو ناک کر دیا ہے چلو تیار ہو جاؤ۔''

''چلنا کہاں ہے؟'' علی نے دریافت کیا۔

''شاپنگ فیسٹول لگا ہوا ہے، کچھ پیسے میں لے چلتی ہوں کچھ تم لے چلو۔ کوئی چیز اچھی لگی تو خرید لیں گے، نہیں تو گھوم پھر کے اور آئس کریم کھا کے واپس آ جائیں گے۔'' فرح بہت ادا سے بولی۔

''کون ......کون چلے گا؟'' علی نے پوچھا۔
''صرف تم اور میں اور کوئی نہیں۔'' فرح بولی۔
''مما ڈیڈی نہیں چلیں گے۔'' علی نے دریافت کیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''نہیں ان کا ارادہ تھا لیکن میں نے کہا آپ نہیں چلو گے صرف میں اور علی جائیں گے۔''
''تو کیا بولے؟'' علی نے پوچھا۔
''کیا بولتے، بولنے لگے جاؤ تم پر ٹرسٹ ہے۔'' فرح اترا کر بولی۔
''ہونہہ......'' علی ہونہہ کر کے رہ گیا اور فرح بہت معصومیت سے پوچھنے لگی۔ ''علی یہ ٹرسٹ کیا ہوتا ہے۔''
''تمہیں نہیں معلوم ٹرسٹ کیا ہوتا ہے۔ ٹرسٹ یعنی ٹرسٹ ...... بھروسہ کرتے ہیں تم پر۔'' علی نے وضاحت کی۔
''کیسا بھروسہ؟'' فرح بولی۔
''یہی کہ تم کوئی غلط کام نہیں کرو گی۔'' علی نے جواب دیا پھر بولا۔ ''تم بیٹھو میں تیار ہو کے آتا ہوں۔''
اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ تیار ہو گیا۔
''گاڑی تم خود ڈرائیو کرو گے، نو ڈرائیور۔'' فرح نے کہا اور علی ترت تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''نو ڈرائیور۔'' اور پھر کہنے لگا۔ ''پتہ ہے جب تم اور میں کہیں جا رہے ہوتے ہیں نا تو مجھے بھی ڈرائیور کی موجودگی اچھی نہیں لگتی۔''
''ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' فرح نے پوچھا۔
''ایسا اس وقت ہوتا ہے جب دونوں کے من میں کچھ کچھ ہوتا ہے۔'' علی نے فوراً جواب دیا اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور زور سے ہنسنے لگے۔
آج انہوں نے خوب گاڑی دوڑائی۔ علی بہت دنوں کے بعد خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ ایک کھلی سپر ہائی وے پر لانگ ڈرائیو کو نکل گئے تھے۔ فرح اس کے برابر بیٹھی بہت لطف اندوز ہو رہی تھی۔ علی نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھام رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ گیئر پر تھا اور فرح علی کے ہاتھ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ علی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
''ٹرسٹ ٹرسٹ۔'' علی نے چھیڑنے کے انداز میں فرح سے کہا اور فرح نے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ ہٹا دیا اور دونوں خوب ہنسے۔

پاکستان ورچوئل لائبریری
وقار عظیم

''ارے یار! ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' گاڑی جب بہت دور نکل گئی تو فرح نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ پتہ نہیں۔'' علی بے نیازی سے بولا۔

''ارے ہم نے تو شاپنگ کے لئے جانا تھا فیسٹول میں۔'' فرح نے یاددہانی کرائی اور کہنے لگی ''گاڑی موڑو۔'' کچھ دور فاصلے پر جا کے علی کو سڑک کا ایک کٹ نظر آیا جہاں سے گاڑی موڑ کر وہ واپسی کے ٹریک پر آ گیا اور پھر وہ ایک بہت بڑے شاپنگ سینٹر کے باہر گاڑی پارک کر کے اندر شاپنگ کے لئے چلے گئے جہاں علی نے ایک نئی دنیا دیکھی۔

شاپنگ سینٹر کے اندر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھومتے رہے۔ سب سے پہلے دونوں ایک پرفیوم کی دکان پر گئے جہاں علی نے ایک بہت مہنگا لیڈیز پرفیوم فرح کیلئے خریدا اور فرح نے اس سے بھی زیادہ قیمتی مردانہ پرفیوم علی کے لئے خریدا اور پھر دونوں نے دکان کے اندر ہی ایک دوسرے کو گفٹ کر دیا اور علی نے گفٹ کرتے ہوئے بہت پیار سے کہا۔ ''ہیپی برتھ ڈے۔''

''کس کا برتھ ڈے ہے۔'' فرح نے پوچھا۔

''تمہارا۔'' علی شرارت سے بولا۔

''میرا برتھ ڈے تو نہیں ہے آج۔'' فرح معصومیت سے بولی۔

''کہنے میں کیا ہرج ہے۔'' علی نے بھی اسی معصومیت سے جواب دیا اور پھر دونوں خوب کھلکھلا کر ہنسے اور پھر وہاں سے نکل کر اس طرح شاپنگ سینٹر میں گھومنے لگے جیسے کوئی پہلی دفعہ میلہ دیکھنے آیا ہو۔

''آؤ علی یہاں دیکھیں یہ پاکستانی دستکاری کا بوتیک ہے، یہاں بہت اچھے ڈریسز نظر آ رہے ہیں۔'' فرح نے ایک اسٹال کے باہر اسٹال کی دلکشی اور چمک دمک دیکھ کر کہا۔

''لیکن یہاں سب لڑکیوں کے لباس ہیں میرے کام کی کوئی چیز نہیں۔'' علی نے تامل کیا۔

''تمہارے کام کی ہیں ناں پیچھے وہ دیکھو جینز ہیں۔'' اس نے اندر کی طرف ہینگروں میں لگی کچھ جینز کی طرف اشارہ کیا اور علی کا ہاتھ تھاما اور دونوں اندر اسٹال میں چلے گئے۔

اندر بوتیک میں جا کے علی اشیاء کی طرف کم اور ایک لڑکی کی طرف زیادہ توجہ سے

دیکھنے لگا جو بوتیک کی مالک یا سیلز گرل تھی اور کم وبیش فرح کی عمر ہی کی تھی۔ فرح سے زیادہ خوبصورت اور دلنشین تھی لیکن دونوں میں جوفرق تھا وہ یہ کہ فرح بہت زیادہ موڈ گرل تھی جبکہ موڈ گرل تو وہ لڑکی بھی تھی لیکن اس کے جسم پر جولباس تھا وہ پاکستانی ثقافت کی عکاسی کرتا تھا۔ وہ لڑکی بھی اسی انداز میں علی کو دیکھ رہی تھی اور فرح کو ان دونوں کا ایک دوسرے کو اس طرح دیکھنا ایک آنکھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔ فرح جل بھن رہی تھی۔

اسٹال میں اس وقت صرف دو ہی خواتین تھیں ایک تو وہ لڑکی جس نے علی کے ہوش اڑا دیئے تھے اور ایک عمر رسیدہ خاتون جو اس لڑکی کی ماں تھی یا پھر مالکن تھی اور لڑکی کو اس نے بحیثیت سیلز گرل کے رکھا ہوا تھا۔

''میں مدد کر سکتی ہوں۔'' جب فرح چپ چاپ کچھ دیر دکان میں کھڑی رہی تو خاتون اپنی کرسی سے اٹھ کر فرح کے پاس آئی۔ ''میں دیکھ رہی ہوں مجھے وہ ڈریس ذرا اچھا لگا۔'' فرح نے کہا۔

''میں دکھاتی ہوں۔'' خاتون نے ایک اسٹک سے بلندی کی طرف ہینگر میں لگا ہوا ڈریس اتارا جس پر بہت اچھی کڑھائی کی گئی تھی اور شیشوں کا کام بہت صفائی سے کیا گیا تھا۔

''یہ ساری دستکاری ہم نے دیہات کے اندر گھروں میں کام کرنے والی بلوچی خواتین سے کرائی ہے۔'' خاتون نے ڈریس کو فرح کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا لیکن فرح نے ڈریس میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے ہوئے نظریں علی اور اس لڑکی پر ہی رکھی تھیں جو ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور فرح کے اندر جیسے جیلسی اور رقابت کی ایک آگ بھڑک اٹھی وہ پچھتائی کہ علی کو وہ شاپنگ کے لئے لے کر ہی کیوں آئی تھی اور آئی تھی تو اس نے خود ہی اس بوتیک کے اندر آنے کا ارادہ ظاہر کیوں کیا تھا جبکہ فرح نے دیکھ لیا تھا کہ بوتیک کے اندر اسی کی عمر کی ایک نوجوان لڑکی موجود ہے لیکن یہ بھی کوئی بات نہیں تھی کہ کالج میں فرح کی عمر کی ایک سے ایک لڑکی موجود ہے جن میں اکثر فرح سے زیادہ دلکش ہیں اور علی میں دلچسپی لیتی ہیں لیکن علی نے کبھی کسی میں دلچسپی ظاہر نہیں کی لیکن اس لڑکی پر تو جیسے علی فریفتہ ہو کے رہ گیا تھا۔ فرح اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور اسے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ رقابت اور حسد کیا چیز ہوتی ہے اور اسے پہلی دفعہ علی کے ساتھ اس کی شدید محبت کا احساس ہوا کہ اسے علی کی محبت میں کسی کا حصے دار بننا ہرگز قبول نہیں اور اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ اب جوان ہو چکی ہے کیونکہ اس لڑکی کی طرف علی کے متوجہ

ہونے سے فرح کے اندر جذبات کی جو ایک کشمکش پیدا ہوئی تھی وہ پہلے کبھی نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ علی اور اس لڑکی کے درمیان جا کے کھڑی ہو جائے اور علی کو دھکیلتی ہوئی اسٹال سے باہر نکال دے، اس وقت بوتیک کی مالکن نے بھی غور سے علی اور لڑکی کو دیکھا اور اسے بھی دال میں کچھ کالا نظر آیا تاہم یہ اس کے لئے کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی کہ لڑکی اس کی حسین اور جوان تھی اور اس کے اسٹال میں آنے والے اکثر مردوں اور لڑکوں کی نگاہیں لڑکی پر پڑتی تھیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح علی کھو گیا تھا یا وہ لڑکی کھو گئی تھی تاہم خاتون نے اس بات کو مسئلہ بنائے بغیر فرح کو یکے بعد دیگرے ڈریس دکھائے اور ان ڈریسز کی خوبیاں بھی بتانے لگی اور فرح نے بھی جذبات پر کنٹرول کیا اور علی کو کنکھیوں سے دیکھتی اور اس کا جائزہ لیتی رہی۔

''اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں آپ مجھے؟'' جب علی کھو جانے کے انداز میں مسلسل لڑکی کو دیکھتا رہا تو لڑکی نے ازراہ تجسس پوچھا۔

''آپ کیوں دیکھ رہی ہیں مجھے۔'' علی نے بھی فوراً استفسار کیا۔

''پتہ نہیں۔'' وہ گردن ہلا کے سوچ میں پڑ گئی اور مزید کہنے لگی۔ ''میں نے پہلے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' علی نے کہا۔ اتنے میں فرح سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا وہ کپڑے وغیرہ چھوڑ کے علی کے پاس آئی اور علی اور لڑکی کے درمیان کھڑی ہو کر ناراضگی کے لہجے میں بولی۔ ''علی کم آن لیٹس گو۔''

اس نے علی کا بازو تھام کر کھینچا۔ لڑکی علی کا نام سن کر چونکی۔ علی جانے کے لئے پلٹا تو لڑکی جیسے پھٹ پڑی۔ ''علی'' اس نے دل کی گہرائیوں سے سے پکارا ''علی...... '' تم علی ہو کیا؟''

''عینی۔'' علی تڑپ کر بولا جو کافی دیر سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہاں میں عینی ہوں علی......'' لڑکی جذبات کا ایک ابلتا ہوا لاوا بن گئی اور اس نے دور سے ہی مالکن کو پکارا۔ ''مما مما مما...... دیکھو مجھے میرا علی مل گیا ہے۔'' وہ رقت بھرے لہجے میں بولی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

علی بھی بے اختیار رو پڑا اور دونوں بہن بھائی اس طرح لپٹ گئے جیسے اتنے برسوں کے بچھڑے ہوؤں کو لپٹنا چاہئے۔ خاتون کی آنکھ میں بھی آنسو آ گئے اور فرح جو کچھ دیر پہلے حسد اور رقابت سے جل رہی تھی اب آنسوؤں سے رونے لگی۔

عینی کی کہانی الگ چل رہی تھی۔ ماں باپ کی علیحدگی اور باپ کی بیماری کے بعد اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ باپ نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا ہے اور وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کی ماں نے کوئی اچھی بات نہیں کی اور وہ اتنا جانتی تھی کہ گڑبڑ کے پیچھے اس آدمی کا ہاتھ ہے جس کو عینی شمس انکل کہتی تھی اور پھر تایا جی کے گھر میں بھی اسی لئے منتقل ہوئی تھی کہ باپ کے ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد ان کا پُرسان حال کوئی نہیں تھا اور پھر اس دن اس کی ننھی سی جان پر ایک پہاڑ گر گیا تھا جب اسے پتہ چلا کہ اس کے بھائی علی کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے ہیں اور دوسرا پہاڑ اس پر اس دن گر گیا تھا جب باپ کی موت کی خبر اسے ملی اور پھر اس ننھی سی جان پر ایک کے بعد ایک مصیبت چلی آ رہی تھی اور اسے بہت چھوٹی سی عمر میں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ آدمی شاید پیدا ہی دکھ اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کے لئے ہوتا ہے۔

علی کے اغوا کے بعد وہ تایا کے گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ تایا اور تائی کا رویہ بھی عجیب سا ہو گیا تھا۔ وہ عینی سے چھپا کے خفیہ طور پر کچھ پروگرام بنا رہے تھے۔ سامان اونے پونے بیچ رہے تھے۔ مکان کی فروخت کی بھی بات چیت چل رہی تھی اور پھر اسے یوں لگا جیسے تایا نے مکان بیچ دیا ہو لیکن یہ ساری باتیں تایا تائی نے عینی سے خفیہ رکھیں اور پھر ایک دن انہوں نے عینی کو سلمیٰ بی کے حوالے کر دیا۔

سلمیٰ بی ایک بہت وضع دار بیوہ عورت تھی اور مختلف بنگلوں پر پاکستانی ثقافت اور کڑھائی والی قمیضوں کے گلے، بارڈر، آستینیں اور دوسرے سلے سلائے فینسی کپڑے فروخت کرتی تھی اور اسی کاروبار سے اپنی گزر بسر کرتی تھی۔

عابد صاحب کے گھر میں اس کا بہت آنا جانا تھا اور وہ تقریباً عابد صاحب کے گھر کی ایک فرد کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ بیگم عابد ان سے بہت کپڑے سلواتی تھیں اور بنے بنائے بھی خریدتی تھیں۔ سلمیٰ بی نے اپنے گھر کے اندر ایک درزی خانہ بھی کھول رکھا تھا جس میں ایک پرانے لیڈیز ماسٹر احمد چچا بڑی مہارت کے ساتھ نت نئے ڈیزائن بناتے تھے اور یوں اپنی روزی کے ساتھ ساتھ سلمیٰ بی، احمد چچا کی روزی کا بھی وسیلہ تھی۔ سلمیٰ بی ایک چپاتی خود کھاتی تھی اور دو چپاتیں احمد چچا کے لئے بھی بنا دیتی تھیں۔ وہ کھانا صبح ہی صبح بنا لیتیں اور پھر اس کے بعد رکشہ ٹیکسی پکڑ کے صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جاتیں، ان کے تیار کئے ہوئے کپڑے بیگمات کو پہنچاتیں اور اگر کوئی نیا آرڈر ملتا تو وہ لے آتیں۔ شام

تک احمد چچا نے کافی کام کر لیا ہوتا وہ سلمیٰ بی سے دن بھر کا حساب کتاب کر کے سر شام نیو کراچی سے بھی آگے اپنے گھر کی طرف جانے والی بسوں میں دھنس جاتا۔ سلمیٰ بی گھر میں اکیلی رہتیں کوئی مرد یا دوسرا آدمی گھر میں نہیں تھا لیکن وہ تھیں حوصلے والی کہ نوجوانی میں بیوہ ہو جانے کے باوجود انہوں نے دوسری شادی کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ محنت مزدوری کرتے ہوئے نہ صرف جوانی بتا دی بلکہ بڑھاپے کی دہلیز بھی گزار دی تھی اور گھر میں تنہا رہنے کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھیں کہ اب انہیں تنہائی سے کوئی خوف نہیں آتا تھا۔ وہ خوف سے بے نیاز اور ایک نڈر عورت تھیں بلکہ ایک دن کیا ہوا کہ کچھ نوجوان ڈاکو سلمیٰ بی کے گھر میں اس وقت گھس آئے جب احمد چچا بھی موجود نہیں تھا اور وہ گھر میں اکیلی تھیں۔

"اے بڑھیا نکال تیرے پاس جو کچھ بھی ہے نہیں تو گولی ما دوں گیا۔" ایک ڈاکو نے گن لہرائی اور باقی دو ڈاکو گھر کی تلاشی میں مصروف ہو گئے لیکن سلمیٰ بی بہت آرام اور بے نیازی سے سینے پرونے میں مصروف رہتے ہوئے بولیں۔ "ارے بے غیرتو شرم کرو، تم اس قوم کے سپوت ہو جہاں نوجوان کماتے اور بوڑھوں کو کھلاتے ہیں اور تم ایک بڑھیا کے خون پسینے کی کمائی لوٹنے کے لئے آئے ہو۔ حیف صد حیف...... کیا بنے گا اس قوم کا اور کیا ہو گا اس ملک کا چچ چچ۔" اس نے اظہارِ افسوس کیا اور پھر بے نیازی سے کہنے لگی۔ "لے جاؤ جو کچھ ملتا ہے لے جاؤ، آخر بچے ہو ماں باپ سے نہیں چھینو گے تو کس سے چھینو گے۔" یہ کہہ کر وہ پھر اپنی سلائی مشین میں مصروف ہو گئیں۔ "آ جاؤ یار آ جاؤ" ڈاکو نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا اور پھر سلمیٰ بی سے معافی مانگ کر ڈکیتی ڈالے بغیر واپس چلے گئے۔ سو سلمیٰ بی اس طرح کی ایک بے نیاز اور دردمند عورت تھی اور جب عابد صاحب ملک سے کوچ کرنے لگے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

عابد صاحب نے سلمیٰ بی سے بہت رازداری کے ساتھ کہا۔ "دیکھو سلمیٰ بی ہم ملک سے باہر جا رہے ہیں اور عینی کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ بعد میں اسے ہم بلوا لیں گے۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ۔" سلمیٰ بی نے پوچھا تھا۔ "آپ سے ہم یہ چاہتے ہیں کہ عینی کو آپ جب تک اپنے پاس رکھیں۔ ہم کچھ رقم آپ کو دے جائیں گے اور باقی خرچ ہر مہینے وہاں سے بھیجتے رہیں گے۔"

"دیکھئے عابد صاحب! میں خود بھی سوچتی تھی کہ بڑھاپے کے لئے اب کوئی سہارا ڈھونڈ لوں۔ اللہ نے میری سن لی۔ آپ کے اوپر جو اس وقت زحمت وارد ہوئی ہے وہ

میرے لئے رحمت ثابت ہوگی۔ عینی کو آپ میرے پاس چھوڑ دیں لیکن ایک کام کریں۔'' سلمٰی بی نے کہا۔ ''بولو بولو'' اب کے بیگم عابد بے تابی سے بولی، وہ سلمٰی کا ہر مطالبہ پورا کرسکتی تھیں۔ ''آپ اس کے لئے مجھے کوئی رقم نہ دیں اور نہ وہاں سے کچھ بھیجیں۔ اگر بچی کا کوئی خیال ہے آپ کو تو اس کے نام کا ایک اکاؤنٹ بینک میں کھول دیں اور پھر وہاں سے اس کے بینک میں زرمبادلہ بھیجتے رہیں تاکہ بچی جب جوان ہو جائے تو اس کے کام آئے۔ رہ گیا روٹیوں کا سوال تو روٹی یہ میری نہیں اپنے مقدر کی کھائے گی۔'' سلمٰی بی نے کہا اور بیگم عابد بے تابی سے بولی۔ ''بالکل ٹھیک ہے۔'' اور یہ کہہ کر انہوں نے اسی وقت عینی کا سامان باندھا اس کی انگلی سلمٰی بی کو پکڑائی اور دونوں نے جلدی جلدی عینی کو ایک ایک پیار کر کے رخصت کر دیا اور خود راتوں رات جہاز پکڑا اور ملک سے چلے گئے۔ نہ عینی کے نام کا اکاؤنٹ کھلا، نہ بعد میں عابد اور بیگم عابد نے کوئی رابطہ کیا لیکن سلمٰی بی نے حق ادا کر دیا۔ انہوں نے عینی کو بڑھاپے کی لاٹھی نہیں بنایا بلکہ اسے لکھایا پڑھایا اور سینے پرونے اور کاڑھنے کا کام سکھا کے اُسے معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔

عینی جب بڑی ہوگئی تو وہ ایک عمدہ ڈیزائنر اور اعلیٰ کاریگر بن چکی تھی اور اس کے ہاتھ کا کام ہزاروں روپے میں فروخت ہونے لگا اور سلمٰی بی نے عینی کی کمائی نہیں کھائی بلکہ اس کا ایک الگ بینک اکاؤنٹ کھلوایا اور عینی کی محنت کی تمام رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرواتی رہیں اور عینی کے پاس ٹھیک ٹھاک اپنا ایک بینک بیلنس ہوگیا۔ سلمٰی بی نے اس کی پرورش بیٹی ہی کی طرح کی۔ وہ جب چھوٹی تھی تو سلمٰی بی اس خیال سے کہ عینی خود کو غیر محفوظ نہ سمجھے اپنے پاس سلاتی تھی اور پھر جب جوں جوں بڑی ہونے لگی تو اس کے لئے الگ کمرہ اور الگ بیڈ رکھا اور اب جبکہ عینی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی تو سلمٰی بی کو اس کے رشتے کی بھی فکر لاحق تھی۔ اس نے لڑکے دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ عینی کے ساتھ مل کر کام کرنے میں سلمٰی بی کو بہت مزہ آیا کہ جب عینی تھوڑی بڑی ہوگئی تو اس نے سلمٰی بی کو نئے نئے آئیڈیے دیئے پھر چھوٹے پیمانے پر کپڑے باہر مڈل ایسٹ وغیرہ میں بھجوائے جہاں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور پھر کچھ عرصے کے بعد دونوں مڈل ایسٹ چلی گئیں۔ دبئی میں سلمٰی بی نے اپنا بوتیک کھول لیا۔ وہ پاکستان سے مال منگوا کر بیچتی رہیں اور کاروبار خوب چلا، اچھے پیسے کمائے لیکن انہیں عینی کی بہت فکر لاحق ہوگئی تھی کہ کئی باتیں ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے وہ سمجھتی تھی کہ عینی کے لئے یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے اور پھر یہ کہ اس کے ماں باپ تو مر کھپ گئے تھے لیکن اپنے ملک میں اسے اپنے کھوئے ہوئے بھائی

کے ملنے کی ہمیشہ ایک آس رہتی تھی۔ لہٰذا وہ محض عینی کی خاطر دبئی کا جمع جمایا کاروبار چھوڑ کر واپس کراچی آ گئی۔ پیسہ "ماں بیٹی" کے پاس بہت تھا۔ ایک بوتیک کھول لیا اور فیشن ایبل گھرانوں کے اندر سلمٰی بی کے بوتیک نے بہت شہرت حاصل کی اور کئی لوگوں کی نظر سلمٰی بی کی منہ بولی بیٹی عینی پر رشتے کے لئے تھی۔ سلمٰی بی نے سب کو نظر میں رکھا تھا لیکن سلمٰی بی کو جلدی ابھی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ عینی اور بڑی ہو جائے تاکہ خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکے اور پھر عینی سے بھی سلمٰی بی نے جب ایک دو بار ذکر کیا تو وہ نفی یا اثبات میں جواب دینے کی بجائے رو پڑی تھی کیونکہ ایسے موقع پر اسے گمشدہ ماں اور گمشدہ بھائی بہت یاد آتا تھا اور اس دن جب ڈرامائی انداز میں عینی کو اپنا بھائی علی ملا تو وہ دن بیک وقت علی، عینی اور سلمٰی بی کی زندگی میں ہوش اڑا دینے کی حد تک خوشی کا دن تھا۔ اس دن دونوں بہن بھائی گلے مل کر بہت روئے۔ بہت ہنسے اور جب عینی نے سلمٰی بی کی محبتوں اور شفقتوں کا ذکر علی سے کیا تو علی بہت متاثر ہوا اور عقیدت سے سلمٰی بی کے پاؤں چھو لئے اور اس ملاپ سے فرح کی زندگی میں بھی خوشی کی ایک نئی لہر آ گئی اور فرح کے ڈیڈی اور ممی بھی بے انتہا خوش ہوئے اور پھر دوسرے ہی دن علی نے اپنا بنگلہ ٹھیک کر دیا اور وہاں منتقل ہو گیا کیونکہ اب وہ اکیلا نہیں اس کی بہن بھی ساتھ تھی اور اُجڑا ہوا گھر پھر سے آباد ہو گیا تھا۔

❁

اس دن پھر ایک عجیب اور حیران کن واقعہ پیش آیا۔ سب لوگ علی کے گھر میں جمع تھے۔ علی عینی فرح گپ شپ کر رہے تھے کہ سلمٰی بی بھی آ گئیں اور پھر فرح کے ڈیڈی ممی بھی آ گئیں سلمٰی بی سے گزشتہ روز ہی علی نے ملاقات کروا دی تھی۔ لہٰذا اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں بہت عرصے کے بعد کچھ حقیقی قہقہے بکھر رہے تھے۔ اس دن ہلکی ہلکی بوندا باندھی ہو رہی تھی اور سب کا کچھ چٹ پٹی چیز کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ فرح کے ڈیڈی نے اپنے ملازم کو فون کیا۔ وہ اس وقت گھر سے نکلا ہوا تھا۔ "کہاں اس وقت؟" ارمغانی صاحب نے پوچھا۔ ملازم نے اپنی موجودگی کا پتہ بتایا۔ "اچھا یوں کرو۔" فرح کے ڈیڈی نے کہا۔ "کوئی تم ایک کلو گرم گرم پکوڑے جلدی لے آؤ۔"

"اس بارش میں پکوڑوں کا مزا آ جائے گا۔" علی نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

"عینی چپ چاپ بیٹھی ہے۔ کیوں بھئی تمہیں پسند ہیں پکوڑے بیٹے!" ارمغانی صاحب نے خاموش بیٹھی عینی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں انکل! مما اکثر پکوڑے بناتی ہیں۔" عینی نے کہا۔

''بس ٹھیک ہے، بیٹے آج پکوڑوں کے مزے لو۔ کل ہم فائیو اسٹار ہوٹل میں عینی کو گرانڈ پارٹی دے رہے ہیں۔'' ارمغانی صاحب نے کہا اور فرح نے زور سے تالی بجائی اور دوسروں کے ہاتھ بھی تالی کے لئے اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ملازم ایک شاپر لے کر آیا جس کے اندر ایک اخبار میں ڈھیر سارے گرما گرم پکوڑے تھے۔

''ایک ٹرے اور پلیٹیں لے آؤ۔'' ارمغانی صاحب نے ملازم سے کہا۔ وہ کچن سے بڑی ٹرے اور چھوٹی پلیٹیں لے آیا۔ بیگم ارمغانی نے شاپر کھول کے اخبار نکالا جس کے اندر پکوڑے تھے۔ پکوڑے بڑی ٹرے میں ڈالے اور اخبار خالی کر کے ایک طرف پھینکنے لگی تو اچانک اخبار کے درمیان ایک عورت کی تصویر دیکھ کر عینی چونکی۔

''ایک منٹ آنٹی!'' عینی نے اخبار جھپٹا اور تصویر کو غور سے دیکھنے کے بعد اخبار علی کی طرف بڑھایا۔

''بھائی یہ تصویر کس کی ہے؟'' اس نے علی سے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' تصویر دیکھ کر علی بھی دم بخود رہ گیا۔ اخبار اسکے ہاتھ سے جیسے گرنے لگا تو فرح کے ڈیڈی نے اخبار تھام لیا اور غور سے اخبار میں چھپی تصویر کو دیکھا اور تصویر کے نیچے لکھی سرخی کو باآواز بلند پڑھا۔ ''شائلہ بیگم سماعت کے بعد عدالت سے باہر آ رہی ہے۔''

پکوڑے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ''بھائی ...... بھائی بھائی! اماں، ...... اماں ...... اماں۔'' عینی چلائی اور علی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

''بیٹے اب فکر نہ کرو، سمجھو تمہاری ماں مل گئی ہے......'' فرح کے ڈیڈی نے علی اور عینی دونوں کو گلے لگا لیا۔

❀......□......❀

عورتوں کی جیل کیا تھی ایک کباڑ خانہ، ایک کچرا گھر یا زندہ بکریوں اور گایوں کا کمیلا۔

بڑے سے کمرے میں گنجائش سے بہت زیادہ عورتیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ جن کے نہانے دھونے کا نہ کوئی خاص بندوبست تھا اور نہ ہی قیدی عورتیں نہانے دھونے کی عادی تھیں۔ جس طرح کمیلے میں جانوروں کی گندگی کی بو پھیلی ہوتی ہے اسی طرح کی بدبو جیل خانے کی گھٹن میں اضافہ کر رہی تھی۔ کم و بیش سب عورتوں کے بال ناریل کی کھال کی طرح جڑے اور الجھے ہوئے تھے اور خارش زدہ کتوں کی طرح عورتیں اپنے بدن کو دونوں ہاتھوں سے کھجاتی نظر آتی تھیں۔ ان ہی عورتوں کے بیچ شائلہ بھی تھی۔ اسے کچھ عرصے تک پولیس ریمانڈ میں رکھنے کے بعد جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اس دوران اسے دوسری قیدی عورتوں کے ساتھ دو چار مرتبہ جیل کی جالی دار گاڑی میں بھر کر عدالت بھی لے جایا گیا تھا لیکن ہر پیشی پر، ایک اور پیشی پڑ جاتی تھی اور اب پیشی بھی نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ یہ پیشیاں بھی زرینہ کی دلچسپی کی وجہ سے پڑتی تھیں لیکن زرینہ بھی کہاں تک کرتی۔ بھاگ دوڑ، وکیلوں کے پیسے۔ اس کے اپنے گھر کے مسائل اور پھر شائلہ کی اپنے مقدمے سے عدم دلچسپی کی وجہ سے زرینہ نے بھی مقدمے میں دلچسپی لینا کم کر دیا اور اب جیل میں شائلہ کا نہ کوئی خیر خواہ، نہ پرسان حال، نہ مدعی، نہ وکیل، کچھ بھی نہیں تھا اور اسے کچھ یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کب سے جیل میں بند ہے اور اسے یہ یاد بھی نہیں رہا تھا کہ آخری پیشی کب ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آئندہ پیشی اس کی کب ہوگی۔ وہ بھی دوسری قیدی عورتوں کی طرح بلکہ ان سے زیادہ گندی اور میلی کچیلی ہوگئی تھی۔ بدن پر میل کی وجہ سے دانے سے پڑ گئے تھے۔ وہ جسم کھجا رہی ہوتی تو اچانک سر کی جوئیں کلبلانے لگتیں، تب وہ بدن کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے سر کھجانے لگتی اور اس کے ہاتھوں کے ناخن، بڑھ کر نوکیلے نشتر یا کانٹوں کی طرح ہو گئے تھے اور ابھی جسم کے پہلے زخم بھرتے نہیں تھے کہ وہ کھرچ کھرچ کر دوسرے زخموں کو مزید تازہ کر دیتی تھی اور ابھی چونکہ اسے شاعری بھولی ہوئی تھی ورنہ وہ ضرور

غالب کو یاد کرتی۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

اب اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ غالب کون ہے۔ ذہن ماؤف، بھدا پھیلا ہوا بے ڈھب جسم، اس پر چڑھا ہوا میل، جھاڑیوں کی طرح الجھے ہوئے بال۔ اب نہ تو بینائی پہلے جیسی رہی تھی، نہ سماعت پہلے جیسی۔ ہوسکتا ہے سماعت میں کوئی فرق نہ آیا ہو۔ محض میل کی وجہ سے بند ہوں لیکن سماعت کو آزمانے کا اسے موقع ملا تھا نہ ضرورت تھی۔ کبھی کبھی وارڈن ڈانٹ ڈپٹ کرتی تو وہ آواز اس کے کان پڑ جاتی تھی۔

''اری او اکیس نمبر ٹھیک سے بیٹھو پاجامہ سنبھالو اپنا، گھٹنوں سے نیچے جا رہا ہے۔''

وارڈن کی آواز پر وہ چوکس ہو جاتی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ اکیس نمبر اسی کا ہے کہ اب اسے اپنے نام سے زیادہ اپنا نمبر یاد رہ گیا تھا اگر کوئی پوچھتا۔ ''کیا نام ہے'' تو وہ کچھ سوچتی اور بولتی ''اکیس نمبر۔''

اس کے گزرے ہوئے خوشگوار دن، ماضی کی یادیں، زاہد کے ساتھ بیتے ہوئے خوبصورت دن۔ اس کے پھول جیسے دو بچوں علی اور عینی کی من موہنی صورتیں۔ زاہد سے طلاق کا تلخ سانحہ، زارا اور فرید بھائی کے ساتھ گزارے ہوئے محبت بھرے دن۔ رجب کے گھر میں ملا ہوا ماں جی کا پیار، زاہد کو دوبارہ پانے کی جستجو میں شاہ جی کے ساتھ شادی۔ شاہ جی کی موت کے بعد واپس کراچی آمد۔ ہوسٹل میں تاجکی کے ساتھ گزارے ہوئے یادگار لمحے اور پھر ہوسٹل کا کرایہ ادا کرنے کے لئے عزت کا سودا کر کے باس کے ساتھ گزاری ہوئی لرزہ خیز رات اور شمس کو قتل کرنے کے ہولناک دن کے علاوہ دوسرے کئی واقعات اور لمحات سمٹ کر ایک اکیس نمبر میں جمع ہو گئے تھے اور عورتوں کے اس زندہ کمیلے کے اندر اب اسے صرف ایک 21 نمبر یاد رہ گیا تھا۔

اس کی بینائی کم ہونے کا بھی اسے کوئی احساس نہیں تھا کہ نہ تو اس کا لکھنے پڑھنے سے اب کوئی واسطہ تھا نہ سینے پرونے سے۔ اسے آس پاس کی عورتوں کے چہرے دھندلے دکھائی دینے لگے تھے لیکن اگر صاف بھی دکھائی دیتے تو اس کے لئے کیا فرق پڑتا۔ وہ انہیں صاف دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے لئے تو ویسے بھی پوری دنیا دھندلا گئی تھی۔ جیل تو ایک چھوٹی سی جگہ ہے اگر دھندلی ہوگئی تو کیا ہوا۔ وہ تو یوں ہوا کہ ایک دن جیل کے اندر آنکھوں کا کیمپ لگا تو

دوسری عورتوں کے ساتھ شمائلہ کی آنکھ کا معائنہ بھی ڈاکٹر نے کیا اور تشخیص ہوئی کہ ہلکا ہلکا موتیا اتر رہا ہے اور ڈاکٹر نے معائنے کے بعد آپریشن کی تجویز کو مؤخر کرتے ہوئے چشمہ لگانے کی رائے دی۔ ایک رفاعی ادارے نے ازراہ ہمدردی شمائلہ کو واجبی سا چشمہ بنا کے دے دیا جسے لگا کے اسے قیدی عورتوں کے چہرے صاف نظر آنے لگے تھے لیکن اس تبدیلی سے اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی کہ اسے تو کچھ دیکھنے کی خواہش ہی نہیں رہی تھی اور نہ اب اس کے پاس دیکھنے کو کچھ تھا۔ اس کا چشمہ بھی عجیب سا ہو گیا تھا کہ رات کو سوتے سوتے ایک بدہیئت سی عورت اس سے لڑ پڑی تھی اور پھر نوبت ہاتھاپائی تک آ گئی۔ اس لپاڈکی میں شمائلہ کے چشمے کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی اور اب اس نے کمانی والی جگہ ایک گندی سی ڈور باندھ لی تھی لیکن اسے یاد بھی نہیں تھا کہ برابر والی عورت سے لڑائی کیوں اور کس بات پر ہوئی تھی۔

❁

''قسم خدا کی میں نے بھی ایسی لات ماری کہ وہ دروازے سے باہر گرا اور جنگلے سے جا لگا۔ جنگلا پرانا اور ٹوٹا تھا۔ زور بُرداشت نہ کر سکا۔ اسپکٹر (انسپکٹر) سمیت روڈ پر۔ دوسری منزل تھی بچ گیا چوتھی پانچویں ہوتی تو فنش۔ پر ابھی بھی اہسپتال میں پڑا ہے۔ بارہ تیح اس کے یاد رکھیں گے۔'' وہ بولتے بولتے رکی اور پھر شمائلہ کے کندھے کو کندھا مار کر بولی، کیا بولتے ہیں۔'' بارہ تیح کہ چودہ۔''

''ہونہہ......'' شمائلہ چونکی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ نئی آنے والی عورت کیا بک بک کئے جا رہی ہے۔

''ارے بھاڑ میں گئے بارہ ہوں کے چودہ، جتنے بھی ہیں یاد کر رہے ہوں گے۔ سن رہی ہو ناں۔'' نو وارد عورت نے پوچھا۔

''ہاں۔'' شمائلہ یونہی بولی اور پھر ناخنوں سے بدن کی میل کھرچنے لگی اور نئی آنے والی عورت بولتی چلی گئی۔

نئی آنے والی عورت کا نام شیریں گل تھا۔ بہت بانکی اور نقشے دار عورت تھی۔ جیل کے اندر آج ہی آئی تھی اور فل میک اپ میں تھی۔ آنکھوں میں کاجل، چہرے پہ غازہ اور سرخی ہونٹوں پر لپ اسٹک کے باوجود پان کی ہلکی سی سرخی منہ سے نمایاں ہو رہی تھی۔ بہت جھٹکے اور ٹیکے کے ساتھ بات کرتی تھی۔ پیشہ ور تو نہیں تھی لیکن اسٹائل پیشہ وروں کا سا ہو گیا تھا۔

''بات یہ تھی کہ مرد نکھٹو تھا۔'' گل نے شمائلہ کو بتانا شروع کیا۔ یہ جانے بغیر کہ شمائلہ سن رہی ہے یا نہیں اسے اس کی باتوں میں دلچسپی ہے یا نہیں وہ بولتی چلی گئی۔

''بس ایک ہی کام تھا اس کا لیکن زندگی میں ایک ہی کام تو نہیں ہے ناں۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لئے تو روٹی چاہئے اور روٹی اس کے پاس تھی نہیں۔ صبح جاتا تھا شام کو خالی ہاتھ لوٹتا تھا اور بچیاں کھانے کو مانگتی تھیں۔ پھر میں نکلی گھر سے تو میں باہر سے کما کے لاتی تھی۔ تب بچے بھی خوش خصم بھی خوش۔'' وہ کہتے کہتے رکی اور پھر کہنے لگی۔ ''سن رہی ہو ناں۔'' وہ شمائلہ کی طرف سے کسی قسم کے جواب کا انتظار کئے بغیر پھر بولنے لگی۔ پھر میں نے سوچا روٹی کمانیکے لئے گھر سے باہر جانے کی ضرورت کیا ہے، دینے والے تو گھر آ کے دینے کو تیار ہیں۔ اس پر میرے شوہر کو اعتراض ہوا کہ گھر کیوں آتے ہیں لیکن وہ جونہی اعتراض کے لئے منہ کھولتا میں کئی بڑے نوٹ اس کے منہ میں ٹھونس کے منہ بند کر دیتی۔ خیر وہ تو اپنے نشے کی گولی لے کر چپ ہو گیا لیکن اسپیشل (انسپکٹر) پھیل گیا۔ ایسے کاموں کے لئے پولیس کو قبضے میں رکھنا پڑتا ہے وہ گھر آنے لگا۔ میں نے کہا چلو ٹھیک ہے اس کی وجہ سے کام چل رہا ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن لالچی کتے کی زبان کہاں اندر جاتی ہے۔ کمبخت آم کھاتے کھاتے کیریوں پر ریجھ گیا اب اس کی میری بڑی بیٹی پر نظر تھی۔ میں نے کہا کمبخت میں نے جن کلیوں کی آبرو بچانے کے لئے اپنی آبرو کو نیلام کیا تو انہیں کو مانگ رہا ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں بدبخت کو مارتے مارتے باہر برآمدے میں لائی اور وہاں سے قسم خدا کی میں نے وہ لات ماری کہ اب ہسپتال میں پڑا ہے۔ پتہ نہیں مر گیا یا زندہ ہے۔ اسی جرم میں میرے کو اندر کر دیا۔''

گل بولتے بولتے ایک بار پھر چپ ہوئی اور شمائلہ کو آہستہ سے ٹہوکا دے کر پوچھا۔ اری سن رہی ہو۔'' پھر کہنے لگی۔ ''ابھی تو تیری کہانی بھی میں نے سننی ہے۔'' لیکن شمائلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شمائلہ لمبے لمبے خراٹے لے رہی تھی۔

''اے اس کے نرخرے تو بھونپو کی طرح بول رہے ہیں اور میں یونہی متھا مار رہی ں۔'' شیریں گل نے کہا اور پھر پورے وارڈ پر ایک نظر ڈالی جہاں تمام عورتیں سو رہی ں یا کھانس رہی تھیں۔

''یہ تو گھوڑے بیچ کے سو رہی ہے۔'' گل نے شمائلہ کو سوتا دیکھ کر خود کلامی کی اور شمائلہ کو پکارا۔ ''اری کیا دام ملے ہیں گھوڑوں کے۔'' شمائلہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور تب نے آہستہ سے ''لاحول'' کہا اور شمائلہ کے قریب سو جانے کے لئے لیٹ گئی۔

وہ مشکل سے بیس پچیس منٹ لیٹی ہوگی اسے لگا جیسے کانٹوں پر لیٹی ہے وہ تو آرا
دہ بستر سے اٹھ کر جیل میں آئی تھی۔ پہلی رات تھی۔ جیل میں نیند آ نہیں رہی تھی اور پھر ما
بھی موافق نہیں تھی۔ شمائلہ کی قربت بھی اس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے
وارڈ کی ملگجی روشنی میں دور دور تک ہر عورت کا جائزہ لیا لیکن سب ایک سی میلی کچیلی جو
سے بھرے الجھے ہوئے بال اور خارش زدہ تھیں۔ اسے گھن سی آئی، نصف رات کے قریب
اس نے شمائلہ کو ہلا کے جگا دیا۔

''اری اُٹھ۔''

''کیا مصیبت آ گئی ہے۔ کیوں عذاب بن کر تو نازل ہوگئی ہے جیل خانے پر۔''
شمائلہ نے کروٹ لئے بغیر خشم آلود لہجے میں کہا۔ ''سوتی کیوں نہیں ہو تم؟'' شمائلہ نے پلٹے
بغیر ڈانٹا۔

''او مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' گل نے کہا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن شمائلہ
تو پھر گہری نیند سو گئی تھی، اب وہ اسی طرح بے خبر سو جایا کرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی
حسیات مکمل طور پر ختم ہو چکی ہیں۔ تب شیریں گل کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے
لگی۔

معلوم نہیں شمائلہ کے حواس خمسہ سو گئے تھے یا ذہنی طور پر اس نے دنیا ہی ترک کر
دی تھی۔ وہ قیدی عورتوں کے درمیان بالکل بے خبر سی ہوگئی تھی۔ نہ کسی سے لڑائی، جھگڑا، نہ
دوستی، نہ دکھ سکھ کی کوئی بات۔ بس ایسے ہی بھیڑوں کے ریوڑ میں جیسے ایک بھیڑ ہو، جو کسی
نامعلوم بیماری کی وجہ سے ہر وقت اونگھتی رہتی ہو۔ وہ رات بھی بے خبر سوتی تھی اور دن میں
بھی اونگھتی رہتی تھی۔ کھانا بھی وہ جانوروں کی طرح کھاتی تھی۔ جب جتنی بار جس نے بھی
آگے ڈال دیا کھا لیتی تھی۔ کبھی کھانے کو انکار نہیں کیا اور اگر نہیں ملا تو دو دو دن بغیر طعام
کے پڑی رہتی تھی۔ کبھی کسی سے کچھ کھانے کو نہیں مانگا۔ بالکل ایک بے حس بھیڑ بن گئی
تھی۔ جیل کے عملے کا رویہ بھی اس کے پس منظر کی وجہ سے ہمدردانہ ہوگیا تھا لیکن خود شمائلہ
کی اب ایسی کیفیت تھی کہ ہمدردی اس کے لئے ایک بے معنی سی چیز ہو کے رہ گئی تھی۔

''چل تیری ملاقات آئی ہے۔'' ایک دن وارڈن نے شمائلہ کے کندھے کو چھو کر
آہستہ سے کہا اس وقت وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔

قیدی عورتوں نے دن کا کھانا کھا لیا تھا اور شمائلہ نے اپنے حصے کا ڈبل کھایا تھا

کیونکہ گل کا کھانا باہر سے آیا تھا اور اس نے اپنے حصے کی روٹی اور دال چاول شمائلہ کے آگے رکھ دیئے تھے اور شمائلہ جلدی جلدی کھا گئی تھی اور اگر دو چار پلیٹیں اور بھی اس کے سامنے آ جاتیں تو وہ انہیں بھی ٹھونس لیتی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام حسوں نے کام کرنا ہی جیسے ترک کر دیا تھا۔

''چل تری ملاقات آئی ہے۔'' وارڈن نے اونگھتی شمائلہ کو ٹھوکا دے کر کہا۔

''کون آئی ہے۔'' شمائلہ نے غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

''ملاقات۔'' وارڈن نے کہا۔

''کیوں آئی ہے؟'' وہ جیسے نشے میں بولی ہو۔

''تیری حجامت بنانے آئی ہے۔'' وارڈن زچ ہو کر بولی۔ ''کوئی بات تیری سمجھ میں آتی نہیں ہے۔ اُٹھ کے پہلے مل تو سہی۔'' وارڈن نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''آ جا۔ شاباش میری بہن آ جا۔ آ جا اٹھ'' وارڈن نے ہمدرانہ لہجہ اختیار کیا اور پیار سے کہا۔ ''چلو۔''

شمائلہ نے اپنی چندھی آنکھوں سے ممنونیت کے انداز میں وارڈن کو دیکھا اس کی آنکھوں اور ناک سے بھی پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی کمانی والا چشمہ اتارا، اپنی آستین سے آنکھیں اور ناک صاف کی اور وارڈن کے پیچھے پیچھے ملاقات کے کمرے کی طرف چل دی۔

''کون......؟'' ملاقات کے کمرے میں پہنچ کر اس نے ملاقات کی آس میں کھڑی زرینہ سے پوچھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ کمرے میں اچھی بھلی روشنی تھی اور زرینہ اس کے لئے کوئی اجنبی نہیں، اس کی بہترین دوست تھی اور دوستی کا ایسا حق تو، نہ نرس انیسہ نے ادا کیا تھا نہ تاجکی نے۔ جو حق زرینہ نے شمائلہ کے مصائب میں مبتلا ہونے کے بعد ادا کیا تھا۔ شمس کے قتل کے بعد یہ زرینہ ہی تھی جو اخبار میں واردات کا قصہ پڑھ کر بھاگی بھاگی ہسپتال پہنچی تھی جتنی بھی مالی، اخلاقی اور قانونی مدد ہو سکتی تھی وہ زرینہ نے بہم پہنچائی۔ وکیل کیا، جیل میں ملنے کے لئے پابندی سے آتی رہی اور جب بھی ملاقات کے لئے جاتی کوئی اچھی سی ڈش بنا کے لے جاتی۔ پھول لے جاتی، پھل لے جاتی اور اس کی ضروریات کی کئی چیزیں اسے پہنچاتی لیکن شمائلہ ہر شے سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے شمس کو قتل کرنے کے بعد اس کی زندگی کا مشن اور مقصد پورا ہو گیا ہے اور اب وہ مزید جینا نہیں چاہتی۔ لہٰذا اس نے زرینہ کو بھی نظر انداز کرنا شروع کیا۔ وکیل جس کی خدمات زرینہ نے

حاصل کی تھیں۔ اسے بھی شمائلہ خاطر میں نہیں لاتی تھی اور نہ تو قانون کے شکنجے سے خود کو بچانے کی کوشش کرتی اور نہ ہی وکیل کی کوششوں میں اس کی مدد کی۔ اس نے یہ احساس دیا کہ وہ دنیا سے مکمل طور پر بیزار ہو گئی ہے اور اس بیزاری کا مظاہرہ شمائلہ نے اس شدت کے ساتھ کیا کہ ایک دن زرینہ بھی اس کے رویے سے بیزار ہو گئی۔ وہ کتنے جتنوں سے درخواستیں دے کر اور قانونی پیچیدگیوں سے گزر کر ملاقات کا وقت لیتی اور اپنے دس کام چھوڑ کر اس سے ملنے آتی لیکن شمائلہ کے مایوس کن رویے نے زرینہ کو سخت بیزار کر دیا۔ لہٰذا زرینہ نے ملاقاتوں کو کم کرتے کرتے ختم ہی کر دیا۔ وکیل سے بھی زرینہ نے رابطہ کم کرتے کرتے منقطع کر دیا اور یوں شمائلہ کا مقدمہ قانون کے دفتر میں طاقِ نسیاں کی گرد میں دب گیا۔ نہ کوئی پیشی، نہ کوئی آواز، نہ میل ملاقات اور شمائلہ جیل کی دوسری قیدی عورتوں کے ساتھ بے حس ہو کر رہ گئی تھی۔

''کون؟'' ملاقات کے کمرے میں پہنچ کر اس نے ملاقات کی منتظر زرینہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ کمرے میں خاصی روشنی تھی اور زرینہ بالکل شمائلہ کے مدمقابل کھڑی تھی لیکن شمائلہ نے ایسی اجنبیت سے پوچھا جیسے کمرے میں گھپ اندھیرا ہو اور جیسے شمائلہ نے پہلی مرتبہ زرینہ کو دیکھا ہو۔

''میں ہوں شمائلہ؟'' زرینہ نہایت اپنائیت سے بولی۔ وہ آج کئی دن کے بعد آئی تھی اور شمائلہ کی حالت دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا۔ انتہائی گندے اور میلے کپڑے شاید اس نے ضد کر کے جیل والوں کو بھی لباس نہیں بدلنے دیا تھا۔ جسم پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سر کے بال ناریل کی گھاس کی طرح جڑے اور الجھے ہوئے تھے۔ ناک اور آنکھ سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا جسے وہ قمیص کی آستین اور کبھی دامن سے صاف کر لیتی تھی۔ ٹوٹی ہوئی کمانی کا چشمہ، زرینہ نے پہلی بار اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تھا اور اس کے کمرے میں داخلے کے ساتھ ہی بدبو کا بھبکا، شمائلہ سے پہلے اندر آیا۔ بدبو سے زرینہ کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس کا من چاہا کہ وہ فوراً رومال یا دوپٹے سے اپنی ناک ڈھانپ لے لیکن وہ شمائلہ کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ البتہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی لیکن یہ رونا بھی اندر ہی اندر تھا۔ اس نے نظم و ضبط کا مظاہرہ کر کے ایک سسکی، ایک آنسو کو باہر نہیں نکلنے دیا لیکن اندر ہی اندر اس کا کلیجہ چھلنی ہو کے رہ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ وہی شمائلہ ہے جو کبھی اپنے شوہر زاہد کے ساتھ بائیک پر بیٹھتی تو بڑے بڑے پارساؤں کے اعصاب شکن ہو جاتے تھے اور بڑے بڑے نستعلیق لوگ بہانوں بہانوں سے پلٹ کر اسے دیکھتے تھے اور

زرینہ نے یہ بھی سنا تھا کہ زاہد کے بہت سے دوست شمائلہ کو دیکھ کر اس سے حسد بھی کرتے تھے اور رشک بھی اور شمائلہ کی بربادی کا سبب زاہد کا جو دوست شمس بنا تھا اس کے چرچے تو نہ صرف زاہد اور شمائلہ کے دوستوں میں عام ہو گئے تھے بلکہ اخبارات نے بھی چسکے لے لے کر شمائلہ کے حسن و جمال کی تعریف کی تھی اور شمائلہ کو جن لوگوں نے جوانی میں دیکھا تھا ان سے بھی) وہ مل چکی تھی اور اس کی جوانی کی تصویریں بھی زرینہ نے دیکھی تھیں کہ جن کو دیکھ کر ہی اچھا بھلا آدمی لٹو ہو جائے اور اس کی دوست تاجکی نے ایک دفعہ اسے بتایا کہ مرد کیسے نہ مرتے، میں تو عورت ہو کر اس پر مرمٹی تھی اور آج جو زرینہ نے اسے دیکھا تو خون کے آنسو رونے کو جی چاہا اور بے اختیار اس کے اندر ایک آواز ابھر کے رہ گئی۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

''کون......؟'' ملاقات کے روشن کمرے میں آستین سے ناک پونچھتے ہوئے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے زرینہ کو دیکھ کر پوچھا۔'' حالانکہ زرینہ دھندلی نہیں تھی شمائلہ کا کمانی دار چشمہ بہت میلا اور دھندلا ہو چکا تھا۔

''میں ہوں شمائلہ۔'' زرینہ نے بہت درد اور اپنائیت سے کہا۔

''میں کون؟'' شمائلہ نے نہایت اجنبیت سے پوچھا۔

''اوہ شمی شمی۔'' زرینہ تڑپ گئی۔'' کیا ہو گیا ہے تمہیں شمائلہ میں زرینہ ہوں زرینہ۔''

''زرینہ......!!'' شمائلہ نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ عینک اتاری، پھونک مار کے شیشے کو بھاپ دی اور ٹوٹا چشمہ دوبارہ آنکھ پہ لگایا۔

''اوہ زرینہ تم۔ کیا حال ہے تمہارا؟'' وہ بے حسی سے بولی۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟'' زرینہ نے روہانسی ہو کر پوچھا۔

''میں کیسی ہوں؟'' شمائلہ نے جیسے خود سے سوال کیا اور پھر آہستہ سے پوچھا۔ ''میں کیسی ہوں؟''

''تم اچھی ہو اور تم اور اچھی ہو جاؤ گی۔ اب تمہیں بہت اچھی اچھی خبریں ملیں گی آگے۔'' زرینہ نے ڈھارس دی۔

''اچھی خبریں!'' شمائلہ نے سوچتے ہوئے کہا۔'' کہاں سے آئیں گی اچھی خبریں۔''

'''''ہیں ناں۔ دیکھو میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔'' زرینہ نے کہا۔

''نہیں نہیں میں کچھ کھاؤں گی نہیں۔'' شمائلہ کا دھیان کھانے کی طرف گیا۔''یہاں کھانے کو بہت مل جاتا ہے ایک عورت کو الٹیاں لگی ہوئی ہیں، وہ اپنا کھانا مجھے دے دیتی ہے۔ یہ جونئی آئی ہے ناں شیریں گل بڑی اثر ورسوخ والی ہے، اس کا ٹفن روز باہر سے آتا ہے۔ وہ بھی اپنا کھانا مجھے کھلا دیتی ہے۔'' شمائلہ اس طرح زرینہ سے بات کر رہی تھی جیسے کھانے کے سوا دوسرا کوئی مسئلہ اس کے لئے موجود نہ ہو۔

''میں کھانے کی بات نہیں کر رہی شمائلہ وہ چیزیں لائی ہوں جنہیں دیکھ کر تم خوشی سے پاگل ہو جاؤ گی۔'' زرینہ نے پہیلی بوجھنے کے انداز میں کہا۔

''کیا چیز ہے؟'' شمائلہ نے پھر ان کھانے پینے کی پوٹلیوں کی طرف دیکھ کر پوچھا جو زرینہ شمائلہ کے لئے ساتھ باندھ کے لائی تھی۔

''ابھی بتاتی ہوں۔'' زرینہ بہت خوش ہو کر باہر گئی اور دیوار کی اوٹ میں منتظر کھڑے علی اور عینی کو لے کر اندر ملاقات کے کمرے میں آئی۔ اس نے علی اور عینی کو پہلے ہی سے سب کچھ سمجھا رکھا تھا۔ وہ اچانک انہیں شمائلہ کے سامنے لا کر سرپرائز دینا چاہتی تھی لیکن علی اور عینی نے جب شمائلہ کو دیکھا تو دونوں کی بیک وقت ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ جس ماں کی چھاتی سے لگ کر انہوں نے دودھ پیا تھا اور جس ماں کی گود میں انہوں نے پرورش پائی تھی اور جس ماں کے بازوؤں میں کھیل کود کر انہوں نے بچپن گزارا تھا اور جس ماں کے ممتا بھرے بوسوں کے لمس وہ اب بھی اپنی پیشانی اور گالوں پر محسوس کر رہے تھے، اس ماں کو پہچاننے میں انہیں زیادہ دقت پیش نہیں آئی لیکن وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی ماں کا حلیہ ایسا ہو جائے گا۔ علی اور عینی دونوں ماں کو دیکھ کر اس طرح تڑپ گئے جیسے کسی نے اچانک کھولتے پانی کی بالٹی یا تیزاب کی بوتل ان پر پھینک دی ہو۔

''امی!'' عینی اور علی دونوں بیک وقت چیخے اور شمائلہ سے لپٹ جانے کے لئے بڑھے لیکن زرینہ نے دونوں کے پہلو میں آہستہ سے ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ وہ یہاں لانے سے پہلے بھی ان کو سمجھا چکی تھی کہ اب تمہاری ماں ویسی نہیں رہی جیسی تم نے دیکھی تھی اور اس کی حالت زار دیکھ کر تم رونا نہیں، ورنہ وہ اور ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اور زرینہ نے دونوں کو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ لہٰذا دونوں رک گئے۔

زرینہ سے علی اور عینی کی ملاقات کو ابھی تین یا چار دن ہوئے تھے اور اس ملاقات کے لئے عینی کی منہ بولی اور اس کو اپنے والی سلمٰی بی اور فرح کے ڈیڈی سب نے مل کر بہت کوشش کی تھی۔

اس دن جب علی کے بنگلے پر علی، عینی، فرح، فرح کے ڈیڈی، ممی اور سلمٰی بی کا گیٹ ٹوگیدر ہوا تھا اور ایک پرانے اخبار میں انہوں نے شمائلہ کے شمس کو قتل کرنے والی واردات کی تصویر دیکھی تو سب چونکے تھے۔ پھر تفصیل سے خبر پڑھی۔ اس خبر میں زرینہ کا تفصیل سے ذکر تھا کہ شمائلہ کی ایک سہیلی زرینہ نے بہت اہم کردار انجام دیا اور زرینہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کسی بینک میں افسر ہے جس کے اخبارات سے اچھے تعلقات ہیں۔ فرح کے ڈیڈی نے زرینہ کا ایڈریس معلوم کر کے زرینہ سے ملاقات کی تو زرینہ کو شمائلہ کے بارے میں بہت پریشان ہمدرد اور متفکر پایا۔ زرینہ بھی علی اور عینی سے مل کر بہت خوش ہوئی کہ جیسے اسے ایک جنت گم گشتہ مل گئی ہو کیونکہ شمائلہ کے ساتھ جتنی بھی اس کی ودستی رہی تو اس نے یہی محسوس کیا کہ شمائلہ کی زندگی کا مقصد اب صرف اس کے بچوں کی تلاش اور ملاپ ہے ورنہ وہ بالکل نہیں جینا چاہتی تھی اور وہ ایک بار خودکشی کے لئے بھی تیار ہوگئی تھی لیکن زرینہ نے بمشکل بچوں کا حوالہ دے کر اسے اقدام خودکشی سے روکتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا تم نے علی اور عینی کو تلاش نہیں کرنا ہے۔ وہ زندہ ہیں، وہ معلوم نہیں کہاں کہاں مارے مارے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔'' زرینہ نے اس کے جذبات کی کمزور رگ کو چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم نے زندہ رہنا ہے۔ شمائلہ! اپنے لئے نہیں، بچوں کے لئے جینا ہے تم نے۔''

اور بچوں کے نام پر شمائلہ کے مردہ جسم میں پھر ایک جان پڑ گئی تھی اور اس سے پہلے جب باس کے ساتھ اس نے کچھ وقت گزارا تھا تو وہ خودکشی کی نیت سے ایک ٹرک کے آگے کود گئی تھی اور زخمی بے ہوش حالت میں اسے کسی راہگیر نے ہسپتال پہنچایا تھا اور جب وہ ہوش میں آئی تھی تو اسے اس بات سے بھی زیادہ اس بات پر ندامت محسوس ہوئی تھی کہ اپنے بچوں کو تنہا چھوڑ کے خود دنیا سے کس خودغرضی کے ساتھ جا رہی تھی اور پھر اس کو زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور شمس کو مارنے کے بعد تو اس کے جینے کا مقصد ہی ختم ہو گیا اور اگر کسی بات نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا تو وہ ایک سوچ تھی جو علی اور عینی کے بارے میں تھی اور ایک آس تھی جو صرف علی اور عینی کے بارے میں تھی اور اب علی اور عینی دونوں ماں کے سامنے ماشاء اللہ صحیح سلامت اور بھرپور جوانی کے عالم میں کھڑے تھے۔ جنہوں نے ماں کو پہچاننے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا اور ایک لمحے کے اندر جیسے ان کے ماضی کے بیتے ہوئے سارے سن و سال سمٹ کے آ گئے تھے۔ وہ ماں کی حالت زار دیکھ کر ماہیٔ بے

آب کی طرح تڑپ گئے اور تڑپتے ہوئے بے اختیار ماں کی طرف لپکے لیکن زرینہ نے آہستہ سے دونوں کے بازو تھام کے انہیں روک دیا۔ دونوں پر ماں کو دیکھ کے ایک کپکپی طاری تھی۔ وہ چلا کر ماں کو پکار اٹھے تھے لیکن شمائلہ دم بخود کھڑی علی اور عینی کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ بالکل اسی طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''شمائلہ دیکھو کون آیا ہے تم سے ملنے۔'' زرینہ نے بہت پر تجسس لہجے میں کہا۔

''کون آیا ہے؟'' شمائلہ نے بغیر کسی جذبے، بغیر کسی تاثر، بے نیازی اور اجنبیت سے پوچھا۔

''انہیں پہچانو۔'' زرینہ نے شمائلہ کو دعوت دی اور علی اور عینی کا بازو اور مضبوطی سے پکڑ کر انہیں روکے رکھا کیونکہ وہ ماں سے لپٹنے کے لئے بے چین تھے۔

''بھئی چلو ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔'' اچانک ملاقات کے کمرے میں آنے والے ایک سپاہی کی آواز گونجی اور زرینہ نے نہایت تحمل کے ساتھ سپاہی کو آہستہ سے پکارا۔ ''بھئی ادھر آؤ سنتری صاحب!'' سپاہی پاس آیا تو زرینہ نے اسے ایک مسکراہٹ سے خوش آمدید کہا۔ کان میں کچھ نوید سنائی اور ہاتھ میں کسی کاغذ کے لمس سے گرمی پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''ہم ابھی تھوڑی دیر میں چلے جاتے ہیں۔''

''بھلے بھلے۔'' سنتری نے کہا اور چلا گیا۔

زرینہ نے بہت بھاگ دوڑ کر کے بہت اثر رسوخ استعمال کر کے اور بہت کچھ خرچ کر کے ملاقات کا یہ وقت حاصل کیا تھا اور وہ اسے یونہی بے مقصد ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''انہیں پہچانو شمائلہ!'' زرینہ نے اپنی بات پر زور دے کر دوبارہ کہا۔ شمائلہ بہت توجہ سے علی اور عینی کی طرف دیکھنے لگی اور پھر نہایت احمقانہ انداز میں بولی۔ ''تمہارا بیٹا اور بیٹی ہیں ناں۔''

''اُف میرے خدایا!'' زرینہ کا کلیجہ ہل گیا اور علی اور عینی بھی اندر سے ہل گئے۔

''ہاں یہ میرا بیٹا ہے اور میری بیٹی ہے لیکن۔'' زرینہ نے کچھ کہنا چاہا تو شمائلہ نے اسے بیچ میں ٹوک دیا اور ناراض ہونے کے لہجے میں بولی۔ ''تم بہت خراب ہو زرینہ......''

''کیوں......؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''تم جھوٹی ہو بہت ......'' شمائلہ نے کہا۔

''کیوں؟'' زرینہ بولی۔

''تم نے تو کہا تھا تم نے شادی ہی نہیں کی ہے۔'' شمائلہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔

''تو......'' زرینہ نے پوچھا۔

''تو یہ اتنے بڑے بڑے بچے کہاں سے آ گئے۔ ماشاء اللہ اتنے پیارے، ان کی نظر اتارتی ہو کہ نہیں۔'' شمائلہ بچوں کو سراہتے ہوئے بولی جس پر بچے اور زرینہ مزید تڑپ گئی۔

''شمائلہ، شمائلہ، شمائلہ...... کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ انہیں غور سے دیکھو انہیں پہچانو۔'' زرینہ اب آگے بڑھی اور شمائلہ کو کندھوں سے ہلا کر بولی۔ ''یہ علی اور عینی ہیں۔''

''علی اور عینی۔'' شمائلہ علی اور عینی کو سرتاپا غور سے دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولی۔

''ہاں تمہارا علی اور تمہاری عینی۔'' زرینہ نے اپنی بات پر مزید زور دے کر کہا۔

''میرا علی اور عینی۔'' وہ مجنونانہ انداز میں علی اور عینی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''ہاں امی میں علی ہوں۔'' علی آگے بڑھا۔

''اور میں عینی ہوں امی!'' عینی بھی آگے بڑھی اور اس سے پیشتر بچے ماں سے لپٹتے ماں بچوں کو لپٹاتی شمائلہ کو چکر سا آ گیا۔ اس نے پیشانی کو چھوا، قدم ڈگمگائے، لڑکھڑائی اور دھڑام سے زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

ملاقات کے کمرے میں افراتفری مچ گئی۔ زرینہ جھک کر شمائلہ سے لپٹ گئی اور مدد کے لئے چلائی۔ ''کوئی پانی لاؤ۔ پانی لاؤ جلدی سے۔'' زرینہ نے پکارا۔ شمائلہ کے جسم کی بو کی پرواہ کئے بغیر اسے اپنی چھاتی سے لپٹا لیا۔ علی اور عینی چلانے لگے۔ ''امی امی'' وارڈ سے وارڈن اور دوسرا لیڈیز عملہ بھی بھاگتا ہوا پہنچا۔ سب نے مل کر شمائلہ کو اٹھایا اور وارڈ میں لے جانے لگے تو زرینہ بیچ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی۔

''کہاں لے جا رہے ہو اسے؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''وارڈ میں۔'' وارڈن نے کہا۔

''رک جاؤ، آپ اسے وارڈ میں نہیں لے جا سکتیں۔'' زرینہ نے مداخلت کی۔

''دیکھیں آپ قانونی معاملات میں مداخلت کر رہی ہیں۔'' وارڈن نے دھمکی

دی۔ ’’اگر ذرا بھی ہمیں روکنے کی کوشش کی تو آپ کو بھی اندر کر دیا جائے گا۔‘‘

’’سنئے آپ غلط فہمی میں ہیں۔‘‘ زرینہ نے وارڈن کو الٹا دھمکایا۔ ’’بہت اوپر سے سفارش آئی ہے اس قیدی کے لئے، ایسا نہ ہو آپ کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔‘‘

’’کیا آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟‘‘ وارڈن بگڑ گئی۔

’’دھمکی نہیں دے رہی سمجھا رہی ہوں۔‘‘ قیدی بے ہوش ہو گئی ہے اور اسے اس حالت میں تم اندر لے جا رہی ہو۔‘‘

’’تو میں کیا کروں؟‘‘ وارڈن نے کہا۔ ’’کہاں لے جاؤں؟‘‘

’’ہو سکتا ہے یہ شوگر کی مریض ہو اور شوگر بہت لو ہو جانے کی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئی ہو۔‘‘ زرینہ نے اسے سمجھایا۔

’’مجھے کیا معلوم میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔‘‘ وارڈن نے کہا۔

’’لیکن میں ڈاکٹر ہوں۔‘‘ زرینہ نے یونہی ہانک لگائی اور ڈرانے کے لئے کہا۔ ’’اگر ایسا ہے تو یہ مر بھی سکتی ہے اور اگر مر گئی تو اس کی موت کی ذمے داری آپ کے اوپر آ جائے گی۔ یہ اچھی طرح سوچ لیں۔‘‘

’’لیکن میں اسے کہاں لے جاؤں۔ وارڈ سے آئی تھی وارڈ میں واپس لے جاؤں گی اور پھر جیلر صاحب کو رپورٹ کروں گی جیسا وہ کہیں گے ویسا کروں گی۔‘‘ وارڈن نے وضاحت کی۔

’’اسے وارڈ میں نہیں، اس وقت ہسپتال میں ہونا چاہئے۔‘‘ زرینہ نے مشورہ دیا۔

اتنے میں جیلر صاحب خود ہی ہنگامہ آرائی سن کر آ گئے۔ فوری طور پر صورت حال کو بھانپا اور زرینہ کو ایک جانب لے جا کر سمجھاتے ہوئے کہنے لگے۔

’’دیکھو بی بی! ہمارے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہے کہ ہم قیدی کو جیل سے نکال کے جیل سے باہر لے جائیں۔‘‘

’’لیکن سر! یہاں اس طرح یہ مر بھی سکتی ہے۔ اسے فوراً میڈیکل ایڈ کی ضرورت ہے۔‘‘ زرینہ نے وضاحت کی۔

’’میڈیکل ایڈ ہم دیں گے۔ ہماری جیل میں اپنی ڈسپنسری اور ڈاکٹر ہے۔ ہم پیشنٹ قیدی کو فوراً وہاں پہنچا دیں گے۔ اگر کوئی سیریس بات ہوئی اور اسے شہر کے کسی ہسپتال کی ضرورت پڑتی ہے تو اس کے لئے آپ کو یا ہمیں عدالت سے رجوع کرنا پڑے گا۔‘‘ جیلر نے بہت اطمینان اور آرام سے زرینہ کو سمجھایا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ اسے فوراً جیل کے ہسپتال میں لے جا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کریں۔'' زرینہ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا اور پھر اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''مجھے ڈر ہے اسے کوئی اسٹروک نہ لگ جائے۔''

''ان شاء اللہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ جیل کا ڈاکٹر اس کی فزیکل کنڈیشن سے واقف ہے۔'' جیلر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر زرینہ کے قریب آ کر آہستہ سے کہنے لگا۔ ''آپ نے تو نقشبندی صاحب کو وکیل کر لیا ہے ناں۔''

''جی ہاں۔'' زرینہ نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''وہ سنبھال لیں گے کیس کو۔ ان کی پیرول پر رہائی بھی ہوسکتی ہے۔'' جیلر نے رازداری سے کہا۔ ''اور ہسپتال میں منتقل ہونا تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ نقشبندی صاحب سے بات کریں۔''

''تھینک یو سر!'' زرینہ نے جیلر کا شکریہ ادا کیا اور شائلہ کو اسٹریچر پر لٹا کے جیل کی ڈسپنسری میں پہنچا دیا۔

علی اور عینی دونوں ہچکیوں سے رونے لگے۔ وہ ماں کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن جیل کے عملے نے انہیں روک دیا۔

''آنٹی یہ کیسی ملاقات تھی؟'' علی نے رقت آمیز آواز میں زرینہ سے کہا۔

''آنٹی! امی بچ جائیں گی ناں؟'' عینی کی بھی ہچکی بندھ گئی تھی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے بیٹے!'' زرینہ نے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بات یہ ہوئی کہ تم دونوں کو دیکھ کر پہلے اسے یقین نہیں آیا اور جب اسے یقین آ گیا کہ یہ تم ہو تو اسے شدید شاک لگا۔''

''یہ شاک خطرناک بھی تو ہوسکتا ہے آنٹی! میں میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں اور جانتا ہوں کہ......'' علی نے کہنا چاہا۔

''او نو...... نو علی! تم ابھی ڈاکٹر نہیں، اسٹوڈنٹ ہو۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ شی وِل کم آؤٹ آف اِٹ'' زرینہ نے بات کاٹی۔ ''تم دیکھنا سچویشن بالکل مختلف ہوگی۔''

اگلے دن صبح ہی صبح زرینہ نے علی اور عینی کے ہمراہ ایڈووکیٹ نقشبندی صاحب سے ملاقات کی۔ تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایک تو نقشبندی صاحب کا اپنا نام رعب و دبدبہ اور اثر و رسوخ۔ پھر انہوں نے شائلہ کی بیماری کی بات کو بتنگڑ بنا کے درخواست دائر کی۔ درخواست میں شائلہ کی اپنی تعلیمی صلاحیت کا حوالہ دیا کہ اس نے لٹریچر میں ایم اے

کر رکھا ہے۔ اس کا شوہر زاہد علی پی ایچ ڈی تھا اور درس و تدریس کی دنیا میں ایک نامور استاد کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ مزید برآں عابد علی کا حوالہ بھی آ گیا کہ جو بائیس گریڈ کا افسر تھا۔ لہٰذا اس طرح کی اور موشگافیاں ظاہر کر کے نقشبندی صاحب نے درخواست موو کی تو اگلے ہی دن عدالت نے شمائلہ کو بی کلاس دینے کے احکامات جاری کر دیئے اور شہر کے ایک اچھے ہسپتال میں بھی داخلہ دلوا دیا۔ اس طرح اس کمرے کو سب جیل قرار دے دیا گیا جس میں شمائلہ کو داخل کرایا گیا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر دو مسلح سپاہی متعین کر دیئے گئے تھے۔ کمرے کے اندر اجازت کے بغیر داخلہ ممنوع تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' زرینہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور پرسکون لیٹی ہوئی شمائلہ سے پوچھا۔

''اچھی ہے۔'' شمائلہ نے بھی پُرسکون لہجے میں جواب دیا اور پھر پوچھنے لگی۔ ''بچے کیسے ہیں؟''

''اچھے ہیں۔'' زرینہ نے بھی دھیمے سے انداز میں جواب دیا اور پھر شمائلہ ہی کے بیڈ پر پائنتی بیٹھ کر اسکے ساتھ پیار سے باتیں کرنے لگی۔

شمائلہ دو دن سے شہر کے ایک پرائیویٹ ہسپتال کے کمرے میں تھی اور جیل کے حکام نے اس کے کمرے کے باہر دو پولیس اہلکار متعین کر کے وارڈ کو سب جیل قرار دے دیا تھا اور یہ سب کچھ علی اور زرینہ کی کوششوں سے ہوا تھا۔ وہ ایڈووکیٹ نقشبندی کے پیچھے پڑ گئے۔ علی نے پانی کی طرح پیسے بہائے اور شمائلہ کو ہسپتال میں داخل کرنے کے احکامات جاری کرا کے ہی دم لیا۔

ہسپتال میں شمائلہ کا تفصیلی معائنہ ہوا۔ کئی طرح کے ایکسرے اور کئی طرح کے خون کے ٹیسٹ ہوئے لیکن چھوٹی موٹی پیچیدگیوں کے علاوہ کوئی تشویشناک بیماری نہیں نکلی۔

اس دن علی اور عینی سے ملاقات کے وقت جو غشی طاری ہو گئی تھی طبی طور پر وہ ایک وقتی جھٹکا تھا جو ناقابل یقین اور اچانک پیدا شدہ صورت حال سے لگا تاہم وہ اس بے ہوشی سے جلدی ہی باہر آ گئی تھی۔

اگلے دن جیل کے ہسپتال کے اندر ہی اس کی علی اور عینی سے ملاقات بھی ہوئی۔ خوب رونا دھونا ہوا اور تینوں نے خوب نظریں بھر بھر کے ایک دوسرے کو دیکھا اور اب وہ علی اور زرینہ کی کوششوں سے ایک اچھے پرائیویٹ ہسپتال کے کمرے میں داخل تھی۔ اس وقت علی اور عینی باہر ہسپتال کے گارڈن میں بیٹھے دکھ سکھ کی باتیں کر رہے تھے کہ ان کی

ملاقات کا وقت شام کو تھا اور زرینہ ایک خصوصی اجازت نامے کے تحت شمائلہ کے پاس ایک تیماردار کی حیثیت سے موجود تھی۔ وہ علی کو زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کہاں ہیں بچے؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''وہ دونوں ہسپتال میں موجود ہیں۔ باہر گارڈن میں بیٹھے ہیں، شام کو تم سے ملنے کے لئے آئیں گے۔'' زرینہ نے تفصیل بتائی۔

''اس وقت کیوں نہیں آ رہے؟'' شمائلہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''اس وقت ان کو ملنے کی اجازت نہیں ہے۔'' زرینہ نے کہا اور پھر مزید بتایا۔

''اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ ہسپتال میں ہونے کے باوجود تم قیدی ہو اور باہر پولیس پہرہ دے رہی ہے۔''

''تم لوگوں نے مجھے اتنی سہولتیں یہاں بہم پہنچائی ہیں کہ میں بھول ہی گئی تھی کہ میں ایک قیدی ہوں۔'' شمائلہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اور تکیہ اونچا کر کے لیٹے لیٹے اپنے وجود کا جائزہ لیا۔ اسے اپنا بدن اس وقت بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم لگ رہا تھا اسے احساس تھا کہ وہ جب یہاں لائی گئی تھی تو اس کے جسم پر میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور سر جوؤں سے بھرا پڑا تھا۔

علی نے ایک پرائیویٹ نرس اور ایک آیا کو شمائلہ کی خدمت کے لئے مامور کیا تھا۔ جنہوں نے اٹیچ باتھ میں لے جا کر گرم پانی سے اسے نہلایا تھا۔ جسم کا میل اسفنج سے صاف کیا تھا۔ سر میں کئی بار شیمپو کیا تھا اور اس کے بدن پر نت نئے صابن، کریم اور اوڈی کلون اس طرح استعمال کئے تھے کہ وہ ایک بار پھر نکھر آئی تھی اور اس کا پورا وجود مہک اٹھا تھا۔

''تم نے جو کچھ میرے لئے کیا ہے وہ شاید کسی اور کے بس میں نہیں تھا۔'' شمائلہ نے پائنتی بیٹھی زرینہ کا ہاتھ تھاما اور کسی معصوم بچے کی طرح اس کی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے نہایت پیار سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے میرے جسم سے ایسی بدبو اور سڑاند آتی تھی کہ جیل کی عورتیں بھی ناک ڈھانپ لیتی تھیں لیکن تم نے جو قربانی دی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔'' وہ بھرپور جذبۂ عقیدت سے بولی۔

''یہ بات نہیں ہے شمو! قربانی کی مثالوں کا تو شمار نہیں ہے کوئی۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ لیکن علی نے تمہارے لئے دن رات ایک کر دیا۔'' زرینہ نے کہا۔

''علی تو بیٹا ہے ناں میرا...... لیکن جو کچھ تم نے کیا ہے میرے لئے ...... وہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کا حساب میں نہیں چکا سکتی۔'' شمائلہ نے کہا۔

''تمہیں حساب چکانے کی ضرورت بھی نہیں کہ اس کا حساب تو پہلے ہی چکایا جا چکا ہے۔'' زرینہ نے برجستہ کہا۔

''وہ کیسے؟'' شمائلہ حیرت سے بولی۔

''وہ ایسے کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ آپ کے مرحوم شوہر پروفیسر زاہد علی کی بدولت ہوں۔ وہ مجھے اتنا کچھ سکھا گئے ہیں کہ ان کے احسانات کا بدلہ ایک زندگی میں چکانا بہت مشکل ہے۔''

''بڑے آدمی تھے ناں!'' شمائلہ دھیرے سے بولی جیسے زاہد کی بڑائی کی تصدیق چاہتی ہو۔

''بہت بڑے۔'' زرینہ نے تائید کی۔

''لیکن غلطی کر گئے بہت بڑی غلطی۔'' شمائلہ تاسف کے لہجے میں بولی۔ ''کاش وہ بڑے آدمی نہ ہوتے۔''

''کیوں؟'' زرینہ نے پیار سے پوچھا۔

''جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اتنی ہی بڑی غلطی کرتا ہے۔'' شمائلہ تھوڑی دیر کو ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے بولی۔ ''چھوٹے آدمی ہوتے تو اگر کوئی میری غلطی ہوتی بھی تو مجھے مارتے، پیٹتے، سزا دیتے، ناراض ہوتے، دھکے دے کر گھر سے نکال دیتے اور میں پھر واپس آ جاتی یا جا کر مجھے لے آتے۔ اتنا بڑا فیصلہ تو نہ کرتے کہ جس سے زمین ہل گئی۔ آندھی چلی، طوفان آئے۔ گھر کا گھر برباد ہو گیا۔ میں لٹ گئی، بچے در بدر ہو گئے اور وہ خود جان سے چلے گئے۔''

''بس ان چیزوں کو یاد کر کے اب اور ٹینشن نہ لو، آگے کی فکر کرو۔'' زرینہ نے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

''آگے اب کیا ہے؟'' وہ حسرت و یاس سے بولی۔

''آگے تمہارے بچے ہیں علی اور عینی جنہیں قدرت نے اپنی عنایتوں سے ایک بار پھر تم سے ملوا دیا ہے اور کیا تم نے دیکھا نہیں فرح کتنی پیاری لڑکی ہے اور تمہارے علی کو چاہتی ہے۔ علی بھی پیار کرتا ہے اس سے۔''

''ہاں میں نے دیکھا۔'' شمائلہ خوش ہو کر بولی۔ ''وہ واقعی ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور عینی کے بارے میں بھی سلمٰی بی کچھ بتا رہی تھی۔'' وہ کہتے کہتے رکی کیونکہ سلمٰی بی سے بھی گزشتہ شام اس کی پہلی ہی ملاقات ہوئی تھی اور اس نے عینی کے بارے میں کچھ

ذکر کیا تھا لیکن تفصیل کا وہ موقع محل نہیں تھا۔ وہ تو صرف عینی اور علی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

''میں نے اس لڑکے کو بھی دیکھا ہے جس نے سلمیٰ بی کے پاس عینی کے لئے پیغام بھیجا ہے۔'' زرینہ نے انکشاف کیا۔

''ہاں!'' شمائلہ چونکی۔ ''کیسا ہے؟''

پاکستانی وقار عظیم ڈاٹ کام پوائنٹ

''تم دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ بہت بڑا بزنس مین ہے ٹال ہینڈسم، اسمارٹ ینگ۔'' زرینہ نے کہا۔ ''لیکن اب یہ سب کچھ تو تم خود ہی کرو گی۔''

''میں ...... میں کیسے؟'' وہ انتہائی مایوسی سے بولی۔ ''مجھ پر تو دفعہ تین سو دو لاگو ہے۔ قتل کا الزام اور وہ بھی عمداً قتل کا الزام جس کی سزا پھانسی ہے۔ میں اپنے بچوں کی خوشیوں میں کیسے شریک ہوسکوں گی۔''

''اے لو دیکھو تماشا، آپ ہی ملزم بھی بن گئی، وکیل بھی خود ہی اور جج بن کر فیصلہ بھی خود دے دیا۔'' زرینہ نے بات کو ہلکا پھلکا رنگ دینے کی کوشش کی اور پھر مزید کہنے لگی۔ ''وکیل صاحب کہہ رہے تھے تم یوں چٹکیوں میں باہر آ جاؤ گی ...... ذرا مقدمے کو چلنے تو دو۔''

''ہاہا......'' شمائلہ زرینہ کے جواب میں زہرخند انداز میں ہنسی اور کہنے لگی۔ ''چٹکیوں میں باہر آ جاؤں گی، وکیل صاحب کا بھی جواب نہیں، گویا

کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا۔''

اس نے بہت عرصے کے بعد غالب کو دہرایا شاید اس کی ادبی حس ایک مرتبہ پھر بیدار ہو رہی تھی۔ پھر وہ بہت سنجیدہ ہو گئی ایک لمحے کے لئے اس طرح سوچا کہ جیسے ایک لمحے میں صدیاں گزار دی ہوں۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا کیا۔ بیڈ پر اٹھ کے بیٹھ گئی۔ زرینہ کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھ میں بہت ملائمت سے تھام کر گرمجوشی سے دبایا اور انتہائی وابستگی اور اُمید طلب لہجے میں جیسے التجا کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''زرینہ علی اور عینی کا بہت خیال رکھنا۔ وہ اب میرے سہارے اور مدد کے محتاج نہیں، خدا کا شکر ہے کہ ماں باپ کی محبت اور شفقت اور ممتا کے بغیر بھی آج عزت کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں لیکن آگے آنے والے دن وہ دن ہوں گے جب علی کے ماتھے پر سہرے کے پھول کھلیں گے اور عینی کے ہاتھوں میں مہندی لگے گی۔ ایسے میں ماں اور باپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ تم کم از کم ماں کی کمی انہیں محسوس نہیں ہونے دینا۔'' وہ بولتے بولتے آبدیدہ ہو گئی تھی۔

''نان سینس۔'' زرینہ نے اسے پیار سے ڈانٹا اور اپنے پلو سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''تمہیں اگر بچوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں تو مایوسی کی باتیں بند کردو اور اللہ سے خیر مانگو۔ تم خود اپنے ہاتھ سے علی کا سہرا باندھو گی اور اپنی آنکھ سے عینی کی مہندی کے رنگ دیکھو گی۔ اب رونا بند۔'' زرینہ نے بڑی بن کر شمائلہ کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا اور شام تک شمائلہ کے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے قانون سے اجازت بھی لے رکھی تھی اور کچھ ذاتی وسائل سے بھی انتظام کر رکھا تھا۔ لہٰذا شام کو ملاقات کے وقت شمائلہ کے کمرے میں سب ملاقات کے لئے جمع ہو گئے۔

علی، عینی، علی کے دوست یا منگیتر فرح بھی علی کے ساتھ آئی تھی۔ فرح کے والد ارمغانی صاحب بھی آ گئے تھے۔ عینی کو پالنے والی سلمیٰ بی بھی موجود تھیں۔ کمرے میں گلدستوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ شمائلہ کی صحت یابی کی خوشی میں مٹھائیوں کے ڈبے جمع ہو گئے اور مٹھائی ہسپتال کے عملے اور پہرہ دینے والے پولیس اہلکاروں میں تقسیم ہوئی۔ شمائلہ پلنگ سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور پلنگ پر دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ شمائلہ نے خوب جی بھر کے علی اور عینی کو گلے لگایا۔ ان پر بیت جانے والی وارداتوں کے بارے میں مختصر طور پر معلوم کیا۔ اپنے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا کہ موقع محل بھی نہیں تھا اور زیادہ وقت بھی نہیں۔ پھر وہ اس وقت علی اور عینی کے حوالے سے ان کے مستقبل کے بارے میں زیادہ سوچ رہی تھی۔

اس نے کئی بار فرح کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے پیار کیا اور فرح کے باپ ارمغانی صاحب کی بھی بہت ممنون ہوئی تھی کہ انہوں نے علی کو اپنا بیٹا سمجھا اور گلفام کے لئے مغفرت کی دعا کی تھی کہ جس کا ظاہر برا اور باطن کس قدر خوبصورت اور نیک تھا اور سلمیٰ بی کی بھی بہت ممنون ہوئی تھی کہ انہوں نے نہ صرف عینی کی ماں بن کر پرورش کی ہے بلکہ محافظ بن کر عینی کا ہر طرح کا خیال رکھا اور سلمیٰ بی سے خواہش ظاہر کی تھی کہ کسی دن اس لڑکے کو بھی لے کر ساتھ آئیں جس نے عینی کا ہاتھ تھامنے کی درخواست کی ہے اور سلمیٰ بی نے وعدہ کیا تھا کہ اگلی ملاقات پر وہ یقیناً لڑکے کو ساتھ لے کر آئیں گی۔

ملاقات مقررہ وقت سے بہت زیادہ دیر تک جاری رہی اور جانے کا وقت جب ہوا تو ایڈووکیٹ نقشبندی صاحب بھی آ گئے جن کے آنے سے ایک ہلچل سی مچ گئی۔ انہوں نے بھی شمائلہ سے بہت خوشگوار موڈ میں بات چیت کی اور یہ نوید سنائی کہ اب ہسپتال سے واپس اسے عورتوں کی اس جیل میں نہیں بھیجا جائے گا جہاں عورتوں کو مویشیوں کی طرح

رکھتے ہیں بلکہ اس کے لئے بی کلاس کا انتظام کر دیا گیا ہے اور جاتے جاتے وہ یہ آخری خوشخبری بھی سنا گئے تھے کہ ان کے پاس ایسے پوائنٹس موجود ہیں کہ جن کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ پھانسی کی سزا معاف ہو جائے گی بلکہ وہ بری ہو جائے یا کم سے کم سزا پانے کی مستحق ہو گی۔

❁

''جناب والا!'' ایڈووکیٹ نقشبندی صاحب عدالت میں بول رہے تھے۔ ساعت والے دن عدالت کا کمرہ سامعین و حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ علی، عینی، فرح، فرح کے والد ارمغانی صاحب، سلمیٰ بی اور زرینہ کے علاوہ مقدمے سے دلچسپی رکھنے والے متعدد افراد موجود تھے۔ استغاثہ کی طرف سے شمس کی بیوی اور کاروباری پارٹنر کالٹو بھی موجود تھی جس نے مقدمے کی پیروی کے لئے ایم یو جولانی نام کے ایک معروف ایڈووکیٹ کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ جس نے بہت قاعدے قانون سے شمائلہ کے اوپر فردِ جرم عائد کی تھی اور ثابت کیا تھا کہ شمائلہ نے بقائمی ہوش و حواس عمداً قتل کیا ہے۔ اس سلسلے میں کئی ساعتیں ہو چکی تھیں۔ وکیل استغاثہ جولانی نے بہت مضبوط نکات اٹھائے تھے اور خون کے بدلے خون کے قانونی جواز پر بہت زور دے کر عدالت سے مطالبہ کیا تھا کہ شمائلہ بیگم کو پھانسی کی سزا سنائی جائے تاکہ آئندہ کوئی عورت قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر ایسے سفاکانہ قتل کی مرتکب نہ ہو۔

وکیل دفاع ایڈووکیٹ نقشبندی بھی اپنے دلائل بہت مہارت کے ساتھ مکمل کر کے اب جذباتی طور پر عدالت کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''جناب والا!'' ایڈووکیٹ نقشبندی بول رہے تھے۔ ''جناب والا! ہر ایکشن کا ری ایکشن ہوتا ہے۔ شمس ایک پیشہ ور مجرم اور عیاش آدمی تھا جس نے اپنی قباحتوں پر شرافت کا خول چڑھا رکھا تھا۔''

''آبجکشن جناب والا! میرے مؤکل کی توہین کی جا رہی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے بیچ میں ٹوکا۔

''آبجکشن سسٹین...... ٹو دی پوائنٹ بات کریں۔'' جج نے نقشبندی کو روکا۔

''آئی ایم سوری مائی لارڈ! جیسا کہ حقائق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملزم شمس نے نہ صرف ایک شمائلہ بیگم بلکہ اس کے سارے خاندان کی زندگی تباہ کر کے رکھ دی۔ اس کے شوہر کی موت کے پیچھے ملزم شمس کے رویے اور محرکات کارفرما تھے۔ شمائلہ بیگم کی خوشحال

زندگی شمس کی وجہ سے برباد ہوئی۔ اس کا شوہر اسی کے کارن مرا۔ اس کے بچے اغوا ہوئے، گم ہو گئے۔ اس نے اپنی پوری جوانی در بدر ٹھوکریں کھاتے اپنے شوہر کو اپنے اور بچوں کی تلاش میں گزار دی۔ اس نے اگر شمس کو قتل کیا تو یہ ایک بہت ہی نیچرل ری ایکشن تھا۔ ایک ایسا آدمی جو اس کے شوہر کی موت کا سبب ہو، جو اس کی زندگی کی تباہی کا سبب ہو، جس کی وجہ سے اس کا گھر برباد ہوا، جس نے اس کے بچوں کو گم کرنے میں کردار ادا کیا ہو، جو شخص اپنے گناہوں اور اپنے کرتوتوں کے ساتھ اچانک ایک مظلوم عورت کے سامنے آ جائے تو اس وقت غصے اور قہر کی وجہ سے شائلہ بیگم نے وہی کیا جو ایسی کیفیت کی حامل ایک خاتون کر سکتی ہے۔''

''کیا آپ قتل کو جسٹی فائی کر رہے ہیں۔'' جج نے اچانک ایڈووکیٹ نقشبندی کو ٹوک کر پوچھا۔

''نہیں جناب والا! میں قتل کو جسٹی فائی نہیں کر رہا۔'' نقشبندی نے جواب دیا۔ ''لیکن مذکورہ زیر سماعت قتل کے پیچھے قاتلہ کے پاس ایک بہت مضبوط اور معقول جواز موجود تھا جس کا ذکر اس عدالت میں بار بار آ چکا ہے۔ لہٰذا میری عدالت سے درخواست ہے کہ زیر سماعت مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت قتل کے محرکات، حقائق، جواز اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ ملزمہ ایک بیمار اور مظلوم عورت ہے اور صنفِ نازک ہونا بھی ملزمہ کے لئے ایک مہربانی اور رعایت کا متقاضی ہے۔ دیٹس آل مائی لارڈ!'' ایڈووکیٹ نے لمبی چوڑی بحث کے بعد اپنی بات ختم کی۔

''ملزمہ شائلہ بیگم! تم نے اپنی صفائی میں مزید کچھ کہنا ہے۔'' شائلہ کے وکیل نقشبندی کے بیان کے بعد جج نے شائلہ سے پوچھا تو شائلہ بہت دھیرے دھیرے لیکن اعتماد کے ساتھ چلتی ہوئی کٹہرے میں آئی اور بولنے لگی۔ ''جناب والا! ذاتی انتقام، غصہ اور نفرت اپنی جگہ لیکن میں نے یہ قتل صرف ذاتی انتقام کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ یہ میرا ایک مشن تھا جو میں نے پورا کیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں نے یہ قتل بقائمی ہوش و حواس اور قصداً کیا ہے اور یہ قتل کر کے میں نے صرف ایک آدمی کو نہیں، ایک بدی کو مارا ہے۔ یہ قتل کر کے میں نے صرف اپنے ساتھ کی ہوئی برائی اور زیادتی کا بدلہ نہیں لیا۔ میں نے اور بہت سے معصوم خاندانوں کا بدلہ لے لیا ہے جو بدلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ میں نے ایک شیطان کو مارا ہے جس نے بہت سی عزتیں اور عصمتیں لوٹی ہیں اور میں نے اس شیطان کو مار کر اور بہت سی معصوم عزتوں اور عصمتوں کو لٹنے سے بچا لیا

ہے۔ میں نے ایک ایسے مجرم کو مارا ہے جو اپنی طاقت اور اپنی دولت کے بل بوتے پر نہ صرف قانون کی گرفت سے محفوظ تھا بلکہ قانون کو اس نے اپنے اور اپنے جرائم کے تحفظ کے لئے خرید رکھا تھا۔ جناب والا! میں بہت افتخار اور اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کر رہی ہوں کہ مجھے اس قتل پر کوئی پچھتاوا اور کوئی ندامت نہیں ہے۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب والا!''

''اوہ مائی گاڈ!'' شمائلہ کا بیان سن کر وکیل نقشبندی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے اپنے مؤکل علی اور پھر زرینہ کی طرف دیکھا۔ عینی بھی بے بس لاچار دکھائی دینے لگی۔ شمائلہ کے بیان پس شمائلہ کے تمام طرفداروں کے چہرے اتر گئے اور علی ٹکر ٹکر کبھی ماں اور کبھی وکیل اور کبھی زرینہ کو دیکھنے لگا۔

''فیصلہ اگلی سماعت تک محفوظ کیا جاتا ہے۔'' جج نے فرمایا اور عدالت اگلی سماعت تک برخاست کر دی۔

وکیل صاحب! میں پانی کی طرح پیسہ خرچ کرنے کو تیار ہوں، کسی طرح میری ماں کو بچالیں۔'' علی نے گڑگڑانے کے انداز میں وکیل سے التجا کی۔

''ہماری ماں کو بچالیں سر! کسی طرح ہماری ماں کو بچالیں۔'' اب کے عینی نے التجا کی اور وکیل صاحب خود بھی متفکر ہو گئے۔

''دیکھو بچو!'' انہوں نے عینی اور علی کو سمجھاتے ہوئے بات شروع کی۔

یہ اس دن کی بات ہے جس دن مقدمے کی سماعت ختم ہونے کے بعد فیصلہ اگلی پیشی تک عدالت نے ملتوی کر دیا تھا۔ عدالت برخاست ہونے کے بعد شمائلہ کو جیل کی گاڑی می واپس جیل لے جایا گیا اور شام کو پانچ بجے کے قریب علی، عینی، فرح، فرح کے والد اور زرینہ ایڈووکیٹ نقشبندی کے آفس میں پہنچے اور سب لوگ وکیل صاحب سے مقدمے کے بارے میں صورت حال جاننے کے لئے متجسس ہوئے جبکہ علی اور عینی گڑگڑا کر وکیل سے درخواست کرنے لگے۔

''دیکھو بچو!'' ایڈووکیٹ نقشبندی علی اور عینی کو سمجھانے لگے۔ ''میں وکیل ہوں اور میرا کام اپنی مؤکلہ کو بچانا ہے اور اسے بچانے کے لئے میں اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا لیکن......''

''آپ کے بارے میں تو یہ بات مشہور ہے کہ آپ کبھی کوئی مقدمہ ہارتے نہیں۔''

علی نے وکیل کی بات مکمل ہونے سے پہلے کہا۔
''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ نہ میں کوئی سپر مین قسم کا وکیل ہوں۔'' نقشبندی صاحب کسرِنفسی سے کام لیتے ہوئے بولے۔''البتہ اپنے پیشے سے مخلص ہوں جینوئن کیس لیتا ہوں اور پورے کمٹمنٹ کے ساتھ کوشش کرتا ہوں کہ فیصلہ میرے مؤکل یا مؤکلہ کے حق میں ہو۔ آپ کی امی کے کیس کے حوالے سے بھی میری یہی کوشش ہے اور میں بہت پُرامید بھی ہوں لیکن......''
''لیکن کیا؟'' جب وکیل نے لیکن کہا تو علی نے پھر بے چین اور مضطرب ہو کر پوچھا۔
''لیکن یہ کہ وکیل اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔'' نقشبندی صاحب نے کہا۔
''یعنی......'' علی نے متجسس لہجے میں پوچھا۔
''یعنی یہ کہ اگر کوئی آدمی ڈوب رہا ہو تو اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس وقت تک نہیں بچایا جاسکتا جب تک کہ ڈوبنے والا خود نہ بچنا چاہے۔ آپ نے دیکھا نہیں آپ کی امی کا رویہ کیسا ہے۔ انہوں نے آخری بیان دے کر میرے تمام دلائل کو زائل کر دیا۔'' وکیل صاحب ازراہِ افسوس بولے۔
''وکیل صاحب! شمائلہ دراصل بہت جذباتی ہوگئی ہے۔'' اب کے زرینہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا اور وکیل صاحب، بولے۔''لیکن قانون جذبات کی بات نہیں سنتا، وہ حالات کوائف اور شواہد کو دیکھتا ہے۔ آپ لوگ شمائلہ سے ملیں اور اسے سمجھائیں کہ اپنے رویے میں دفاعی تبدیلی پیدا کرے۔ ہر چند کہ فیصلہ محفوظ ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ فیصلہ کیا ہے لیکن اگلی پیشی پر فیصلے سے پہلے میں پھر کیس کو کھولنے کی کوشش کروں گا۔'' نقشبندی صاحب نے کہا اور مشورہ دیا کہ فیصلے سے پہلے شمائلہ سے جیل میں ایک ملاقات ہونا ضروری ہے۔

❁

''عدالت کا ہر فیصلہ مجھے تسلیم ہے۔'' جب وکیل صاحب علی اور عینی کے ہمراہ شمائلہ سے ملاقات کے لئے جیل میں گئے تو وکیل صاحب کے سمجھانے کے بعد شمائلہ کہنے لگی۔
''وکیل صاحب مجھے عدالت کا ہر فیصلہ قبول ہے لیکن میں اپنی ضمیر کی عدالت کے سامنے ایسا کوئی عذر پیش نہیں کرنا چاہتی کہ میں نے غلطی کی ہے۔''
''ٹھیک ہے تم اپنے ضمیر کی عدالت کے سامنے بے شک ایسا کوئی عذر پیش نہ کرو

جس سے یہ تاثر ملے کہ تم نے غلطی کی ہے لیکن میرا صرف یہ مشورہ ہے کہ قانون کی عدالت کے سامنے اب مزید کچھ مت بولو۔ جو بھی بولنا ہے میں بولوں گا۔ تم چپ رہو۔'' نقشبندی نے کہا اور شمائلہ نے بہت عجز و انکساری سے سر جھکا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے آپ بولیں، میں چپ رہوں گی۔''

فیصلے والے دن واقعی شمائلہ کچھ نہیں بولی اور فیصلہ سنائے جانے سے پہلے وکیل صاحب نے بولنے کی اجازت مانگی، انہیں اجازت ملی۔ وہ کچھ مزید بولے۔ کچھ مزید دلائل دیئے۔ کچھ مزید وضاحتیں کیں اور آخرکار عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔ جج نے لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بعد اپنے فیصلے کے آخری حصے پر آتے ہوئے کہا۔ ''قانون کسی جگہ بھی قاتل مرد یا قاتل عورت کے لئے الگ الگ وضاحت پیش نہیں کرتا اور نہ ہی عورت ہونے کے ناتے شمائلہ کسی خصوصی رعایت کی مستحق ہے۔ عورت کو صرف اس وقت ریلیف دینے پر غور کیا جا سکتا ہے جب وہ بیمار، پاگل یا حاملہ ہو اور شمائلہ بیگم میں اس طرح کی کوئی علامت نہیں ہے۔ یہ ایک سفاکانہ قتل ہے جو ہسپتال کے بھرے وارڈ میں کیا گیا جس کے ایک درجن کے قریب چشم دید گواہ ہیں اور جو عدالت میں آ کر اپنی گواہی پیش کر چکے ہیں۔ لہٰذا تمام حالات کوائف اور شہادتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شمائلہ بیگم کو موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔ ہینگ ٹل ڈیتھ۔''

یہ فیصلہ سناتے ہوئے جج نے قلم کا نب موڑ دیا اور علی اور عینی کی بیک وقت ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ زرینہ، ارمغانی، سلمٰی بی اور دوسرے بہی خواہوں پر ایک سکوت چھا گیا لیکن شمائلہ نے فیصلے کو بہت سکون کے ساتھ سنا اور مطمئن کھڑی رہی۔

❁

فیصلے کے بعد اب شمائلہ ایک ڈیتھ سیل یا کال کوٹھڑی میں بند تھی اور اس رسی کا انتظار کر رہی تھی جو اس کی گردن کے گرد گھوم کر چشم زدن میں اس کی روح کو اس کے جسم سے الگ کرنے کے لئے تیار ہوئی تھی۔ اس روز خصوصی اجازت کے تحت شمائلہ کا وکیل نقشبندی اور شمائلہ کا بیٹا اور بیٹی یعنی علی اور عینی کال کوٹھڑی میں ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے۔

''اب ایک ہی راستہ ہے ہمارے پاس شمائلہ بیگم!'' نقشبندی صاحب نے بہت ملتجیانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''کون سا راستہ وکیل صاحب!'' شمائلہ نے پوچھا۔

''اپیل کا راستہ۔'' نقشبندی صاحب نے جواب دیا۔
''اب میں بھی محسوس کر رہی ہوں کہ ایک ہی راستہ ہے ہمارے پاس۔'' شمائلہ نے جیسے وکیل صاحب کی بات کی تائید کی۔ وکیل صاحب نے متجسس اور سوالیہ نظروں سے شمائلہ کی طرف دیکھا تو شمائلہ جذبات میں ڈوبے ہوئے انداز میں بولی۔ ''ایک ہی راستہ ہے جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔''
وکیل مضطرب ہو گیا اور علی تڑپ کر بولا۔ ''پلیز امی! ضد نہ کریں۔ کر دیں دستخط کاغذ پر تا کہ وکیل صاحب اپیل دائر کر دیں۔''
''رحم کی اپیل۔'' شمائلہ نے استفسار کیا تو وکیل صاحب نے بات کو گھمایا۔
''نظرِ ثانی کی اپیل۔''
''نہیں وکیل صاحب! مجھے کوئی اپیل نہیں کرنی ہے، نہ رحم کی نہ نظرِ ثانی کی۔'' شمائلہ اپنے فیصلے پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے بولی۔
''امی کیا آپ کو ہمارے ملنے کی خوشی نہیں ہے۔'' اب کے عینی نہایت محبت اور معصومیت سے بولی۔
''بیٹے مجھ سے زیادہ خوشی اور کس کو ہو سکتی ہے۔ میری تو زندگی کا مقصد ہی تم دونوں کو تلاش کرنا اور پانا تھا۔'' شمائلہ نے کہا۔
''تو اب جب آپ نے ہمیں پا لیا ہے تو ہم سے دور جانا چاہتی ہیں۔'' علی ترت بولا۔
''ہاں بیٹے! اب میں تم سے دور اور تمہارے باپ کے نزدیک جانا چاہتی ہوں۔'' شمائلہ نے بے ساختہ جذبات بھرے لہجے میں کہا اور پھر مزید کہنے لگی۔ ''اب جب میں یہاں سے جاؤں گی تو زاہد سے ملوں گی۔ ہماری روحیں ایک ہو جائیں گی اور تا قیامت کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ خوب شکوے شکایت ہوں گے، کچھ میں کہوں گی، کچھ وہ کہیں گے، کچھ میں سنوں گی کچھ وہ۔''
''پلیز امی! اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ ہم کہاں جائیں گے؟'' عینی تڑپ کر بیچ میں بولی۔
''تم اپنے گھر جاؤ گی۔'' شمائلہ پیار سے بولی۔ جیسے کسی گڑیا سے بات کر رہی ہو۔ ''سلمٰی بی نے مجھے لڑکے سے بھی ملوایا ہے، بہت اچھا اور پیارا ہے۔ خوب سجے گی تم دونوں کی جوڑی۔'' اور پھر علی کی طرف مڑ کے کہنے لگی۔ ''فرح تو علی کی اپنی پسند ہے۔ کیا

علی کی خوشی میری خوشی نہیں ہے۔''

''نہیں ہے ماں ...... آپ جان بوجھ کے ہماری خوشیوں سے اب دور جا رہی ہیں۔'' اب کے علی جھنجھلاہٹ میں بولا۔

''دیکھو بیٹے! اب میری واپسی تم لوگوں کے لئے خوشیوں کا باعث نہیں بنے گی۔'' وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ علی سے مخاطب ہوئی اور مزید کہنے لگی۔ ''پہلے کی بات اور تھی اور میں فکرمند تھی کہ تم لوگ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہو گے لیکن تم لوگوں سے ملاقات کے بعد میں مطمئن ہو گئی ہوں اور اب میں تم لوگوں کے لئے ٹھیک نہیں رہوں گی۔ میری اب ضرورت بھی نہیں ہے اور اب میں اس دنیا سے خوش جاؤں گی کہ تم خوش ہو۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ مجھے خوشی خوشی رخصت کرو اور اپنے باپ کے پاس جانے دو۔ یہاں اس دنیا میں میری واپسی میرے لئے اور تم لوگوں کے لئے بھی بہت پیچیدگیاں پیدا کر دے گی۔ ضد نہ کرو میرے بچو! میں کسی رحم کی اپیل پر دستخط نہیں کروں گی۔'' وکیل صاحب بے بس ہو کے چپ ہو گئے اور علی اور عینی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''تو پھر علی کو اجازت دو۔'' اچانک وکیل صاحب بولے۔

''کیا؟'' شمائلہ نے پوچھا اور وکیل صاحب نے علی کو اشارہ کیا۔

''میں آپ کی طرف سے اپیل کروں گا۔'' علی نے کہا۔

''تم جو چاہو کرو میرے بیٹے! تمہیں کس نے منع کیا ہے۔'' وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر بولی اور علی کا ہاتھ پکڑ کے چوما۔ آنکھوں سے لگایا پھر عینی کا ہاتھ چوما، آنکھوں سے لگایا اور پھر وکیل صاحب کی طرف مڑ کر اظہارِ تشکر کے طور پر کہنے لگی۔ ''وکیل صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ صرف ایک وکیل کی طرح نہیں، ایک ہمدرد ایک درد آشنا کی طرح میرا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ آپ پلیز میری تمام دوستوں، بہی خواہوں کا شکریہ ادا کر دینا۔ خاص طور پر زرینہ کا، نرس انیسہ کا، تاجکی کا اور جن جن لوگوں نے میرے لئے نیک جذبات کا اظہار کیا ہے، ان کا۔''

''تم خود سب کا شکریہ ادا کرو گی ان شاء اللہ ...... علی کی طرف سے کی جانے والی اپیل منظور ہو جائے گی اور تم زندہ رہو گی۔'' وکیل صاحب نے کہا اور شمائلہ کچھ نہ بولی۔ ٹکر ٹکر اپنے بچوں کی طرف دیکھنے لگی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ علی اور عینی بھی آبدیدہ ہو گئے اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں لے کر کال کوٹھڑی سے وکیل کے ہمراہ نکلے۔ وکیل صاحب نے انتظار نہیں کیا۔ اگلے ہی دن علی کی طرف سے اپیل کی اور

درخواست دائر کر کے منظوری کا انتظار کرنے لگے اور شمائلہ ڈیتھ سیل میں گھڑیاں گنتے ہوئے موت کے پھندے کا انتظار کرنے لگی۔

''میں ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے جیلر سے کہا۔ اس دن جیلر اچانک شمائلہ کی کال کوٹھڑی میں آیا اور ایک اسٹول پر اس کے قریب بیٹھ کر بہت شفقت سے باتیں کرنے لگا۔ ''آپ کیسی ہیں، یہاں کوئی تکلیف، شکایت، کوئی پریشانی۔'' جیلر نے پوچھا اور شمائلہ بہت سکون اور اطمینان سے بے ساختہ مصرع پڑھتے ہوئے بولی

؎ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔''

''آپ کا ادبی ذوق بہت اچھا ہے۔'' جیلر نے کہا۔ ''آپ ہمیشہ موقع محل کی مناسبت سے مصرع یا شعر پڑھ جاتی ہیں۔'' جیلر بھی غالباً تھوڑا بہت ادبی ذوق رکھنے والا آدمی تھا۔

''کہتے ہیں جیل میں آدمی مجرم بن جاتا ہے یا ادیب اور میں تو ہوں ہی ادبی خاندان سے وابستہ۔' شمائلہ بولی۔

''کوئی خواہش؟'' جیلر نے ایک نامکمل سی معنی خیز بات کی اور بات کہتے ہوئے جیلر کے چہرے پر ایک دکھ تھا جس کا وہ زبان سے اظہار نہ کر سکا۔ جسے شمائلہ بھی غالباً سمجھ گئی لیکن ذکر نہیں کیا بس اتنا کہا۔ ''میں ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔''

''کیسی کتاب؟'' جیلر نے پوچھا۔

''قانون کی کتاب، جس میں قانون کی کمزوریوں اور غلط استعمال کی نشاندہی کرنا چاہتی ہوں۔ جس کے اندر میں جیل کی زبوں حالی کا تذکرہ کرنا چاہتی ہوں۔ جس کتاب کے ذریعے میں انصاف اور منصفوں کی تجارت کی پول کھولنا چاہتی ہوں۔ ایسی کتاب جو معاشرے کے چہرے پر چڑھے ہوئے منافقت کے خول کا پردہ چاک کرے، اس کے علاوہ اور بہت ساری باتیں میں لکھنا چاہتی ہوں جو ناگفتنی ہیں لیکن مجھے سہولت چاہیے۔ کاغذ، قلم اور لکھنے کی آزادی۔'' شمائلہ نے بہت اطمینان سے اپنا مطمع نظر بیان کیا۔

''یہ ساری سہولتیں میں آپ کو فراہم کر سکتا ہوں لیکن......'' جیلر نے پھر ادھوری بات کہہ کر جملہ روکا۔

''لیکن......'' شمائلہ نے تجسس سے پوچھا۔

''لیکن یہ کتاب مکمل کرنے کے لئے شاید آپ کے پاس وقت نہیں ہوگا۔''

جیلر نے بہت سنجیدہ اور گھمبیر لہجے میں کہا اور خاموش ہو گیا۔
''ہونہہ۔'' شمائلہ بھی بات کو سمجھ گئی اور آہستہ سے ہونہہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔
چند لمحے کوٹھڑی میں مکمل خاموشی رہی۔ پھر جیلر اور شمائلہ کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ دونوں نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا اور جیسے خاموشی ہی خاموشی سے کچھ سوال جواب ہو گئے۔
''کیا پھانسی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔'' کچھ لمحے توقف کے بعد شمائلہ نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔
''تاریخ تو مقرر نہیں ہوئی لیکن کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔'' جیلر نے کہا۔ ''اسی لئے کوئی ایسی خواہش جو فوری طور پر پوری کی جا سکتی ہو، آپ بتا دیں۔''
''کیا پھانسی سے پہلے میرے بچوں سے ملاقات نہیں ہو گی؟'' شمائلہ نے دکھ سے پوچھا۔
''کیوں نہیں؟'' جیلر نے جواب دیا۔ ''جب ڈیٹ آ جائے گی تو پھر ملاقات کا وقت بھی مقرر ہو جائے گا۔''
''میں ملاقات کے وقت کا انتظار کروں گی۔'' شمائلہ نے خواہش ظاہر کی۔
''اور کوئی بات؟'' جیلر نے پوچھا۔
''اور کچھ نہیں، شکریہ!'' شمائلہ نے کہا اور جیلر مزید کچھ کہے بغیر کوٹھڑی سے باہر نکل گیا اور جالی دار دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔
''اُف میرے خدایا! آسمان کتنا خوبصورت ہے جو میں نہیں دیکھ سکتی اور جس کو جیل کے باہر میں نے کبھی دیکھنے کی خواہش نہیں کی۔ کاش میں نے جیلر سے کہا ہوتا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے آسمان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' جیلر کے کال کوٹھڑی سے نکلنے کے بعد اس نے تنگ و تاریک کوٹھڑی کی بند اور گھٹی ہوئی فضا میں مکڑی کے جالوں سے اٹی ہوئی چھت کی طرف دیکھا اور سوچا اور پھر دیکھتی رہی، سوچتی رہی۔

❁

سر! ایسا لگتا ہے کہ شاید کچھ ہونے والا ہے۔'' علی نے نہایت فکرمند لہجے میں ایڈووکیٹ نقشبندی سے کہا۔ علی اور عینی سرِ شام ہی وکیل صاحب کے آفس میں آ گئے تھے۔ کئی دنوں سے ماں سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ سزائے موت کے فیصلے کے بعد ملاقاتوں کا تواتر پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ وکیل صاحب نے ملاقات کے لئے درخواست

دے رکھی تھی جس کا جواب نہیں آیا تھا سو لیکن انہیں ملاقات کی فکر نہیں تھی، فکر انہیں اپیل کے بارے میں تھی جس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ان کے مخالف وکیل کی مؤکلہ کالٹو جو ایک ارب پتی افریقن عورت ہے اور شمس کے کاروبار میں پارٹنر بھی ہے وہ پانی کی طرح پیسہ خرچ کر رہی ہے تاکہ اپیل کی منظوری کا راستہ روک سکے۔ اپیل کی منظوری کالٹو کے نزدیک خطرناک ثابت ہوسکتی تھی، اسے ڈر تھا کہ شائلہ اگر زندہ بچ گئی تو رہا بھی ہوسکتی ہے اور رہائی کی صورت میں وہ شمس کی باقیات کا صفایا کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ سو نقشبندی کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ کالٹو اور اس کا وکیل اپیل کے راستے میں رکاوٹ بننے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں اور نقشبندی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کر رہے تھے کہ علی کی طرف سے دائر کی جانے والی اپیل منظور ہو لیکن انہیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اپیل کی فائل بھی کسی طاقِ نسیاں کی زینت ہوگئی ہے اور وہ بہت زیادہ فکر مند ہوگئے تھے اور علی اور عینی کی تو نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔

''امید نہ توڑو بیٹے! اللہ نیک سبب کرے گا۔ کل میں خود اسلام آباد جا رہا ہوں، تم دعا کرو۔'' وکیل نے کہا۔

''سر! ہم تو ماں کے لئے سراپا دعا ہیں۔'' اب کے عینی آبدیدہ ہوکر بولی۔

''تم نیک بچے ہو، تمہاری دعائیں قبول ہوں گی ان شاء اللہ۔ حوصلہ رکھو بیٹے!'' نقشبندی نے دونوں کو حوصلہ دے کر گھر بھیجا اور خود اسی شام اسلام آباد چلے گئے۔

❁

وہ ایک عجیب کربناک اور دل ہلا دینے والی صبح تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ مشرق کی طرف افق پر ہلکی ہلکی روشنیوں کی نامعلوم سی کرنیں آسمان پر دکھائی دے رہی تھیں۔ جیل کے عقبی دروازے پر علی اور عینی دو بے جان اور مردہ سایوں کی طرح کسی خوفناک لمحے کے منتظر کھڑے تھے۔ قریبی درختوں پر ابھی رات کے سائے پھیلے ہوئے تھے لیکن کوؤں اور گدھوں کو صبح کاذب کی نوید مل چکی تھی۔ وہ ابھی اڑے نہیں تھے لیکن پرواز کے لئے اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر تیار کر رہے تھے۔ ساتھ ہی وقفے وقفے سے کسی گدھ کی ہولناک آواز یا کسی کوے کی کائیں کائیں فضا میں ارتعاش پیدا کر کے اس بات کی خبر دیتی تھی کہ پرندے تھوڑی دیر میں اپنے گھونسلوں سے پرواز کرنے والے ہیں۔

علی کے سینے میں خوف سے دل دھڑک رہا تھا کہ کسی لمحے جیل کا دروازہ کھلے گا اور سپاہی یا جیل کا کوئی اور کارکن یہ اندوہناک خبر سنائے گا کہ ان کی امی کی روح نہ صرف

جیل کی چاردیواری بلکہ ان کے جسم سے بھی پرواز کرگئی ہے۔

اس نے عینی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دونوں کی غمزدہ نظریں جیل کے عقبی دروازے پر تھیں، اس دروازے پر جو مردہ خانے سے ملحق تھا اور قیدیوں کو پھانسی دینے کے بعد مردوں کو اسی دروازے سے باہر لایا جاتا تھا۔ علی کی سانسیں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے ہو رہی تھیں کہ معاً وہی دروازہ کھلا جسے موت کا دروازہ کہا جاتا تھا۔

''شمائلہ بیگم کا وارث کون ہے؟'' ایک سنتری دروازے سے باہر آیا اور علی اور عینی کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔

''ہم بہن بھائی ہیں اور وہ ماں ہیں ہماری۔ کہاں ہیں وہ؟'' اب کے عینی تڑپ کر بولی۔

''ان کو پھانسی ہو چکی ہے، اندر آ کے لاش وصول کرلو۔'' سنتری نے پیشہ وارانہ انداز میں کہا اور علی کی ایک چیخ نکل گئی۔

''نہیں۔'' وہ گلا پھاڑ کے چلایا۔

''نہیں ...... نہیں۔'' عینی تڑپی اور علی مسلسل چیختا رہا۔ اتنا چیخا کہ اس کا گلا بیٹھ گیا۔ معاً اس کے کان میں دھیمی دھیمی آواز آئی جیسے اسے کوئی پکار رہا ہو۔

''بھائی ...... بھائی ...... بھائی!'' آوازیں اس کے کان میں پڑتی رہیں۔

''یہ تو عینی کی آواز ہے۔'' علی نے سوچا۔

''لیکن عینی تو اس کے ساتھ ہے، پکار کہاں سے آ رہی ہے۔'' علی سوچنے لگا۔ ''یہ تو کوئی نیند میں پکار رہا ہے۔'' اس نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ اس کی بہن عینی اپنے بھائی علی کی چیخیں سن کر بھاگتی ہوئی علی کے کمرے میں آ گئی تھی اور علی کو ہلا کر 'بھائی بھائی' پکار رہی تھی۔ علی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بہن کو دیکھا پھر ٹیبل کلاک پہ نظر ڈالی، رات کے تین بج رہے تھے۔

''کیا ہوا بھائی! کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟'' وہ علی کے پائنتی بیٹھ کر بھائی کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔

''ہاں عینی! بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔''

''بھائی خواب تو خواب ہوتا ہے اور کہتے ہیں خواب جتنا ڈراؤنا اور برا ہو، تعبیر اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔'' علی نے کہا اور پھر بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جاؤ میری بہن جاؤ سو جاؤ۔'' لیکن دونوں بہن بھائی سوئے نہیں ایک وحشت نے صبح تک دونوں کو جگائے رکھا۔

وسوسہ درست تھا اور علی کا خواب بھی درست نکلا کہ کوئی بات تو ہوتی ہے جس کا پرتو خواب میں آتا ہے۔ اگلے دن اسی شام کو وکیل کا ٹیلیفون علی کے پاس آیا اور دونوں بہن بھائیوں کو ایمرجنسی میں اس نے بلایا اور علی نے اس دن جس رفتار سے گاڑی بھگائی اس رفتار سے پہلے کبھی نہیں چلائی تھی۔ جانے کتنی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔

''اب تم دونوں بہن بھائیوں کو حوصلہ کرنا پڑے گا۔ ماں کے سامنے روؤ گے نہیں۔'' نقشبندی نے علی اور عینی سے کہا جو اس کے سامنے اس طرح سانس کھینچے بیٹھے تھے جیسے جسم میں خون کی بوند نہ ہو۔ دونوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ چکی تھیں۔ وکیل صاحب انہیں یہ ہولناک خبر سنا چکے تھے کہ صبح چھ بجے شمائلہ کو پھانسی ہو جائے گی اور یہ کہ اپیل کا ابھی تک کوئی جواب یا ردعمل سامنے نہیں آیا لہٰذا جیل کے حکام نے آج شام کو شمائلہ کے قریبی عزیزوں کو ملاقات کے لئے بلایا ہے۔ قریبی عزیزوں میں کون تھا ایک بیٹا اور بیٹی جو اس شام وکیل صاحب کے ہمراہ ماں سے ملنے سیل میں گئے اور تقریباً دو گھنٹے تک ملاقات جاری رہی۔ علی اور عینی کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ وہ بہت ضبط کر کے ماں کے پاس بیٹھے تھے لیکن شمائلہ نے بہت حوصلہ کر رکھا تھا تاکہ بچے حوصلہ نہ ہاریں، اس نے بچوں سے بہت اچھی طرح ان کے مستقبل کے حوالے سے باتیں کیں اور ان کے ساتھ اس طرح کوئی ذکر نہیں کیا جس سے وہ خود حوصلہ ہار جائے یا بچے زار و قطار رونے لگیں۔

ملاقات کے دوران جیلر اور وکیل صاحب الگ کھڑے رہے اور کئی بار ماں بچوں کے درمیان بہت دلسوز اور جذباتی مناظر دیکھنے میں آئے اور آخرکار بچے جذبات کی اُمڈتی لہروں کو کنٹرول نہ کر سکے اور نصف رات کے وقت زار و قطار روتے ہوئے چلے گئے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے اور شمائلہ کو یہ خبر دی جا چکی تھی کہ صبح اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ رات کو ایک ڈاکٹر اس کا طبی معائنہ بھی کر چکا تھا اور شمائلہ کو ہر طرح سے جسمانی اور ذہنی طور پر مکمل فٹ پایا تھا۔

''آپ کو ایک انجکشن لگا دینا چاہتا ہوں تاکہ آپ کم از کم چار گھنٹے تک سو سکیں۔''

ڈاکٹر نے مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! میری زندگی کی ایک ہی رات تو باقی ہے، وہ بھی نصف۔ میں اسے سو کر نہیں جاگ کر گزارنا چاہتی ہوں۔'' شمائلہ نے بہت پُراعتماد لہجے میں ڈاکٹر کو جواب دیا تھا اور ڈاکٹر جو خود گھبرایا ہوا تھا شمائلہ کے اطمینان اور اعتماد پر بہت حیران رہ گیا تھا۔

وہ جاگتی رہی۔ اس نے کچھ دیر بعد دیکھا کہ دور ایک جگہ دو اہلکار ایک اسٹریچر چھوڑ کر چلے گئے ہیں وہ دیر تک اس اسٹریچر کو دیکھتی رہی پھر پاس ہی گشت کرتے سپاہی سے مخاطب ہوئی۔

''سنتری صاحب! میں نے سنا ہے کہ پھانسی کے بعد ہی نہیں بلکہ پھانسی سے پہلے بھی تم قیدیوں کو اسٹریچر پر لٹا کے پھانسی گھاٹ تک لے جاتے ہو کیونکہ ان کے اعصاب جواب دے چکے ہوتے ہیں اور وہ پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔'' اس نے سنتری سے کہا لیکن سنتری رکا نہیں، نہ اس نے شمائلہ کی بات کا جواب دیا۔ وہ اپنی معمول کی گشت کرتا رہا۔

''میں نے سنا ہے کہ ایک معروف ڈاکو جس نے سو قتل کیے تھے، جب پھانسی کے لئے جانے لگا تو اس کا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟'' اس نے پھر گشت کرتے سنتری سے مخاطب ہو کر کہا لیکن سنتری پھر بھی کچھ نہ بولا اور اپنا گشت جاری رکھا۔

''بات یہ ہے کہ سنتری صاحب! کہ بہادر وہ نہیں ہوتا جس کا سینہ چوڑا ہو، قد لمبا ہو، پیسہ زیادہ ہو، طاقت کے نشے میں مخمور ہو اور چھاتی اور کندھوں پر تمغے لگے ہوں، ناں ناں ناں۔ بہادر وہ ہوتا ہے جو کسی مقصد کے لئے جیئے اور مقصد کے لئے مرے جس کے دل میں سچ ہو جو علم کی دولت سے مالا مال ہو۔ سمجھے ہو کہ نہیں میری بات۔'' وہ پھر سنتری سے مخاطب ہوئی۔

''او چپ ہو جاؤ مائی خدا کے واسطے ...... کلمہ پڑھو۔ اللہ کو یاد کرو۔ تمہارا وقت قریب آ رہا ہے۔'' اب کے سنتری نے گشت کرتے ہوئے ہی اسے ڈانٹ پلائی۔

''بات تو اس کی ٹھیک ہے۔'' شمائلہ نے دل میں کہا۔ ''مجھے یقیناً اس وقت اپنے رب کو یاد کرنا چاہئے۔''

اور یہ سوچ کر اس نے جیب سے ایک تسبیح نکالی اور پڑھنے لگی۔ یہ تسبیح اسے ملاقات کے وقت عینی دے کر گئی تھی۔ وہ زیرِ لب پڑھنے لگی۔ گھڑی بہت تیزی کے ساتھ چھ بجے

کے ہندسے کی طرف جا رہی تھی۔

علی اور عینی بھی کہاں سوتے، نصف رات تک وہ ماں کے پاس رہے۔ نہ ماں نے کچھ کھایا، نہ بچوں نے۔ ماں سے ملنے کے بعد وہ سیدھے گھر آئے۔ فرح اس کی امی اور ڈیڈی منتظر تھے۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ دو نوالے کھا لیں لیکن جب ماں پھانسی چڑھ رہی ہو تو بچے کیسے کھانا کھائیں گے۔ رات کا باقی حصہ انہوں نے رو دھو کے گزارا اور پھر صبح سے بہت پہلے اندھیرے منہ، دونوں بہن بھائی جیل کے عقبی دروازے کے پاس اسی جگہ کھڑے ہو گئے جہاں سے پھانسی دینے والوں کو باہر نکالا جاتا ہے۔

سلمٰی بھی، عینی سے منسوب لڑکا، فرح اور اس کے والدین بھی آنا چاہتے تھے لیکن علی نے سب کو منع کر دیا کہ یہ غم وہ اکیلے جھیلیں گے البتہ ان لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ لوگ گھر کے اندر موجود رہیں کہ ڈیڈ باڈی والی ایمبولینس کو سیدھا گھر ہی لایا جائے گا۔ سو علی اور عینی جیل کے عقبی ویران دروازے پر رات کے اندھیرے میں کھڑے صبح کاذب کا انتظار کر رہے تھے اور ایمبولینس کو انہوں نے جیل کے مرکزی دروازے پر اسٹینڈ بائی رکھا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے پاس موبائل تھا اور علی نے اس کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جونہی وہ اسے موبائل پر فون کرے وہ ایمبولینس عقب میں لے آئے۔

علی آج پھر اسی طرح ڈراؤنے خواب کی شکل میں بہن کے ساتھ اندھیرے میں کھڑا تھا جیسے دو سائے ہوں۔ پرندے اس کے خواب ہی کی طرح بیدار ہو کر وقفے وقفے سے پھڑ پھڑا رہے تھے اور شاید اڑنے سے پہلے شمائلہ کی روح کے قفس عنصری سے اڑنے کے منتظر تھے۔

''عینی! تم تو کہتی تھیں کہ ڈراؤنے خواب کی تعبیر روشن ہوتی ہے لیکن یہ تعبیر تو خواب سے بھی زیادہ ڈراؤنی ہے جو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔'' علی نے عینی کا ہاتھ تھام کر رقت بھری آواز میں کہا اور عینی بھائی کے کندھے سے لگ کر ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''کیا وقت ہوا ہے بھائی؟''

''وقت تقریباً ہو چلا ہے۔'' علی نے کلائی پر بندھی گھڑی پہ نظر ڈالی جہاں سوئیاں چھ کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ جیل کا عقبی دروازہ تو ابھی نہیں کھلا تھا لیکن معاً سامنے سڑک کے نکڑ پر ملگجی روشنی میں کھڑکا ہوا اور ایک گاڑی تیز روشنی پھینکتی ہوئی علی کی طرف آ رہی تھی۔

''اوہ خدا! ایمبولینس؟'' علی چونکا۔ ''یہ کیسے آ گئی میں نے تو ابھی نہیں بلایا ہے اسے۔''

''بھائی یہ ایمبولینس نہیں، کار ہے۔ وکیل صاحب کی کار۔'' عینی نے کہا۔ اتنے میں کار قریب آن کے رکی اور ایڈووکیٹ نقشبندی تیزی کے ساتھ کار سے نکلے، علی اور عینی کی طرف بڑھے اور بے اختیار انہیں گلے لگا لیا۔ گلے لگتے ہی عینی اور علی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔

''اب کیوں رو رہے ہو، خوش ہو جاؤ۔ اپیل منظور ہو گئی ہے اور جیل کے حکام کو پھانسی پر عملدرآمد سے روک دیا گیا ہے۔ تمہاری ماں زندہ ہے۔'' وکیل نے خوشخبری سنائی جو علی اور عینی کی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری تھی۔

''کیا؟'' دونوں بیک وقت چہک اٹھے۔

''ہاں۔'' نقشبندی صاحب بھی جذباتی ہو کر آبدیدہ ہو گئے تھے۔

''عین پھانسی سے تھوڑی دیر پہلے اپیل کی منظوری کا حکم آ گیا اور موت کی سزا کو قید میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔'' وکیل صاحب بولے۔

''کتنی قید وکیل صاحب۔'' علی نے تجسس سے پوچھا۔ ''کتنی قید ہوئی ماں کو؟''

''اس وقت تو صرف یہ جشن مناؤ کہ وہ زندہ ہے۔ قید کا تعین بعد میں ہو گا۔'' وکیل صاحب نے کہا اور اس وقت علی اور عینی خوشی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

❁

دس سال یوں چٹکی میں گزر جائیں گے۔'' نقشبندی نے چٹکی بجاتے ہوئے از راہِ تفنن کہا اور سب ہنس دیئے۔ پھر نقشبندی صاحب شمائلہ سے بولے۔ ''اب تو میری چٹکی پر یقین ہے ناں آپ کو۔ بلکہ میں ان شاء اللہ ان دس سالوں کو مزید چھوٹا کروا دوں گا۔''

''آپ نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ آپ کوئی مقدمہ ہارتے نہیں ہیں وکیل صاحب!'' علی نے از راہ عقیدت کہا۔

''لیکن میں یہ مقدمہ ہار گئی ہوں۔'' شمائلہ از راہ تفنن بولی اور سب ہنس دیئے۔

''شمائلہ کی سزائے موت ختم ہونے کے بعد مقدمے پر نظر ثانی ہوئی۔ سزا کے بعد کئی طبی رپورٹیں اوپر کی عدالت میں پہنچیں جن سے معلوم ہوا کہ اس دوران شمائلہ کی جو میڈیکل ٹیسٹ رپورٹس آئیں ان کی رو سے اپنے ذیابیطس کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ بلڈ پریشر کی تشخیص ہوئی۔ انجائنا کا درد بھی نکلا۔ اس کے دیگر حالات اور کوائف پر بھی غور

ہوا اور اس کی پھانسی کو دس برس قید میں تبدیل کر کے بی کلاس دے دی گئی اور اس کی کوٹھڑی میں غالباً ایک قیدی عورت مزید ہونی چاہئے تھی لیکن سر دست وہ اکیلی تھی۔

اس دن اس کے ساتھ ملاقات کا خصوصی دن تھا اور شمائلہ کے تمام متعلقین ملاقات کے لئے موجود تھے۔ جن میں علی اور عینی، فرح، فرح کے ماں باپ، سلمیٰ بی اور وہ لڑکا جو عینی سے منسوب تھا اور سارا خاندان شمائلہ سے شادی کی تاریخیں مقرر کرنے کی اجازت طلب کرنا چاہتا تھا۔

''شادی کی تاریخ مقرر کریں آپ ...... کیا میرے بچے دس برس تک میرا انتظار کریں گے۔ نہیں نہیں، آپ تاریخیں مقرر کریں۔'' شمائلہ نے فرح کے باپ اور سلمیٰ بی سے کہا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں، یہ شادی آپ کی شرکت کے بغیر ہوگی۔'' نقشبندی بیچ میں بولے۔

''تو......؟'' شمائلہ تجسس سے بولی۔

''تو کیا شمائلہ بیگم! میں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔ باراتوں سے ولیمے تک تین دن ہوتے ہیں اور یہ تین دن میں پیرول پر آپ کو رہا کرواؤں گا۔'' وکیل صاحب نے ڈھارس دی۔

''واقعی؟'' شمائلہ غیر یقینی انداز میں بولی۔

''اور کیا میں کوئی دعویٰ بغیر یقین کے نہیں کرتا۔'' وکیل صاحب کا جواب تھا۔

''تو پھر جلدی کریں ارمغانی صاحب!'' شمائلہ فرح کے باپ سے مخاطب ہوئی اور پھر سلمیٰ بی سے کہنے لگی۔ ''تاریخ ایک ہی ہونی چاہئے، سلمیٰ بی!''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' سلمیٰ بی نے جواب دیا۔

''چشم بددور ماشاءاللہ ان کی نظر اتار دینا۔'' اس نے ایک سرسری سی نگاہ علی، عینی، فرح اور ہونے والے داماد پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' اب کے زرینہ بول پڑی جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔

''اسی طرح ہنسی خوشی کی باتیں کرتے ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور جب سب رخصت ہو کر جانے لگے تو شمائلہ نے علی اور عینی کو روکا۔

''علی، عینی ایک منٹ۔'' شمائلہ نے پکارا تو دونوں رک گئے۔ باقی لوگ بھی ذرا سا

آ گے ہو کر رکے کہ شاید شائلہ نے بیٹے بیٹی سے کوئی خاص پرائیویٹ بات کرنی ہے۔

''جی امی!'' علی پلٹا۔

''جی ماں جی!'' عینی بھی قریب آئی۔

''ویسے تو وکیل صاحب نے یقین دلایا ہے کہ میں شادی میں شریک ہوں گی لیکن قید ہے کیا کہہ سکتی ہوں، اس لئے میری طرف سے پیشگی مبارک ہو بچو اور میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' شائلہ نے بہت سنجیدہ ہو کر کہا۔

''آپ اتنا عرصہ ہم سے جدا رہی ہیں لیکن آپ کی دعائیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔'' علی نے ازراہ تشکر کہا۔

''ہاں ماں جی! آپ کی دعائیں نہ ہوتیں تو آج ہم سب لوگ کبھی نہ مل سکتے۔'' عینی نے بات دہرائی۔

''اب شائلہ کی رگِ ظرافت پھڑکی، اس نے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ بکھیری اور علی اور عینی دونوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ''لیکن تم دونوں ہو بہت خودغرض اور شیطان۔''

''کیا......؟'' علی چونکا۔

''امی......؟'' عینی بھی حیرت سے بولی۔ ''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''اور کیا؟'' شائلہ نے ہنس کر کہا اور پھر علی کی طرف مڑ کر اس سے مخاطب ہوئی۔

''خود تو شادیاں رچا کر اپنے اپنے جیون ساتھیوں سے مل رہے ہو اور میری پھانسی رکوا کر مجھے زاہد کے پاس جانے سے روک دیا۔'' اس پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور جاتے جاتے کال کوٹھڑی کشتِ زعفران بن گئی۔

......ختم شد......